UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224184
UNIVERSAL
LIBRARY

۸۹

مجلۂ مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی

۸۹۱۶۴۲۰۰ (ح)
مکتبہ
۲

مجلۂ مکتبہ

۱۔ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲۔ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳۔ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴۔ قیمت سالانہ (للہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ) فی پرچہ ۶ پائی

۵۔ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (ے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعاتِ مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے انکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلۂ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحتِ بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلۂ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیلِ زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلۂ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

الف

Checked 1975

مجلۂ مکتبہ

جلد (۲) بابتہ ماہ آذر ۱۳۳۸ف مطابق اکتوبر ۱۹۲۸ء شمارہ (۱)

فہرست

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	ج
عکس تحریر	مولانا سلیم مرحوم	و
نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	از جناب ابو محمد عمر صلاح صاحب یافعی	۱
گلستاں و بوستاں کا موازنہ	مترجمہ جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین حیدرآبادی	۴۵
انسان اور کائنات	از جناب میر غوث الدین علی صاحب	۵۴
دو رافتادہ لارڈ بائرن کی ایک نظم کا ترجمہ	از جناب محشر عابدی	۵۷
محب وطن (افسانہ)	از ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور - مترجمہ مسٹر ایس۔ بی۔ اننتا۔	۵۸
ٹالسٹائے اور عوام الناس	از جناب عشرت حسین صاحب زبیری۔	۶۴
نوحۂ غم (نظم)	از جناب ابوالافتخار سید عبدالغفار صاحب شفق مدرس مدرسہ فوقانیہ - چارمحل	۷۲
بادۂ وکن		۷۴
رسیخی (نظم)	از مولوی عابد مرزا صاحب "بینگم"	

۸۹۱۵۴۳۰۵
Checked 1965

مجلۂ مکتبہ

۱۔ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲۔ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳۔ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴۔ قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ) فی پرچہ ۶

۵۔ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (ے) اور چوتھائی کے لئے (عہ) سے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعاتِ مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے انکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلۂ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحتِ بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلۂ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس عنایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیلِ زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلۂ مکتبہ" "مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

الف

Checked 1975

1052

مجلۂ مکتبہ

جلد (۳) شمارہ (۱)

بابتہ ماہ آذر ۱۳۳۷ف مطابق نومبر ۱۹۲۸ء

فہرست

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	ج
عکس تحریر	مولانا سلیم مرحوم	د
نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	از جناب ابو محمد عمر صلاح صاحب یافعی	۱
گلستاں و بوستاں کا موازنہ	مترجمہ جناب ابو المحاسن محمد حسن خاں صاحب فتین حیدرآبادی	۲۵
انسان اور کائنات	از جناب میر غوث الدین سلمی صاحب	۵۴
دو افتادہ لارڈ بائرن کی ایک نظم کا ترجمہ	از جناب مہشر عابدی	۵۷
محب وطن (افسانہ)	از ڈاکٹر راجندر ناتھ ٹیگور ۔ مترجمہ مسٹر لیس ۔ بی ۔ انفنا ۔	۵۸
ٹالسٹائے اور عوام الناس	از جناب عشرت حسین صاحب زبیری ۔	۶۴
نوحۂ غم (نظم)	از جناب ابو الافتخار سید عبد الغفار صاحب شکر مدرس مدرسہ	۷۲
	توفانیہ ۔ چار محصل	
بادۂ دکن		۷۴
ریختی (نظم)	از مولوی عابد مرزا صاحب "بینگم"	

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
تنقیدیں	م۔ ویس	۸۱
فہرست مضامین مجلہ مکتبہ (جلد اول)	منیجر	۸۳

شذرات

اس مہینے سے نئے سال کے ساتھ "مجلہ مکتبہ" کی دوسری جلد کا بھی آغاز ہو رہا ہے۔ رسالہ کی ارتقائی حالت کا اندازہ کرتے ہماری یہ توقع بیجا نہوگی کہ دوسری جلد علمی تحریک کی پیدائش میں پہلے سے زیادہ سرگرم رہیگی اس فضا میں کم و بیش وقت پر اعلےٰ اور دلچسپ مضامین کے ساتھ مصور رسالے کا اپنی پہلی جلد کے ابتدائی مرحلہ کا ختم کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اس کو جس منزل تک پہونچنا ہے وہ بھی خارج از نظر نہیں۔ قلیل مدت میں رسالے نے جو علمی خدمت انجام دی، اسکا اندازہ جلد اوّل کی فہرست مضامین پر نظر بازگشت ڈالنے سے ہوسکیگا۔ جو اسی غرض کیلئے ہم نے رسالے کے آخر میں شامل رکھی ہے۔ اور ملک میں اس کا جو علمی درجہ قائم ہوا اسکی مظہر وہ رائیں ہیں، جو معاصرین نے تحریر فرمائی ہیں۔ فضا کی عدم مساعدت کے فرسودہ شکوہ کو چھوڑ کر، اور اردو دانوں سے بے حسی کے الزام کو دور کرکے ہم اس ناخوشگوار تذبذب کی حالت کا ضرور ذکر کرینگے جس میں بعض مخاطبین کی مسلسل خاموشی نے ہمیں ڈال رکھا۔

معاصرین کی مخلصانہ تنقیدوں کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ "المعلم" نے ہمیں جس راہ پر گامزن ہونے کی تعلیم دی ہے کہ "مجلہ مکتبہ" کو مصنفین اور مصنفات تک محدود ہو جانا چاہیئے، ہم اسکی قدر کرتے ہیں۔ اور یہ تجویز ہمارے اور بعض اہل بصیرت خصوصاً مولانا مناظر احسن گیلانی کے مشورے پر ابتدا ہی سے ہمارے پیش نظر تھی۔ لیکن مرحوم پروفیسر وحید الدین سلیم، جنہوں نے رسالے کی داغ بیل ڈالنے میں ہماری بڑی معاونت فرمائی تھی، اس تجویز کی تحدیدی وقتوں کی وجہ سے اس کو فی الحال ملتوی رکھنے کے حامی تھے۔ اگر تمام اردو مصنفین، اشاعت خانوں کے مالک اور اداروں کے منتظمین اس تجویز کو کامیاب بنانے کی طرف عملی قدم بڑھائیں تو "مجلہ مکتبہ" اس خدمت کو بطیب خاطر قبول کریگا۔

۲۷ اگست ۱۹۲۷ء کو آکسفورڈ میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا انعقاد ہوا تھا مولوی غلام یزدانی صاحب ایم اے اور ڈاکٹر عبدالحق بی لٹ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر عربی کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی طرف سے نمایندگی کیلئے شریک ہوئے تھے جلد چھ سو سے زیادہ نمایندوں کا مجمع تھا جنمیں صرف جرمنی ہی کے ایک سو دس نمایندے موجود تھے۔

مولوی غلام یزدانی صاحب نے ایلورا کی آستر کار نقاشی پر مضمون پڑھا اور ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے "دکن کے تمام کے دیوان کے مخطوطوں کی کیفیت اور اس کے غیر مطبوعہ کلام کی اہمیت" پر ایک مقالہ سنایا۔ ڈاکٹر صاحب

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی مترجمہ کتابوں کی نمائش بھی کرائی ان کتابوں کو مستشرقین نے بے حد پسند کیا اور جامعہ عثمانیہ کی کوششوں کا نہایت گہرا اثر اُن کے دلوں پر بیٹھا۔ ڈاکٹر صاحب نے عربی میں مکمل اور بسیط تاریخی لغت کی تیاری اور مصری حکومت سے یہ درخواست کرنے کی تحریک پیش کی کہ قاہرہ میں مشرقی علماء اور مستشرقین کے اتحاد عمل کی تجویز پر غور کیا جائے خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی دونوں تحریکیں کامیاب ہوئیں۔ قاہرہ یونیورسٹی میں عربی، فرانسیسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں اعلےٰ تعلیم دیجاتی ہے۔ آکسفورڈ جاتے ہوئے مصر کے قیام کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے جامعہ عثمانیہ کو مصر کے علماء، حکومت اور عوام سے روشناس کرانے کی سعی کی۔

اس شمارہ میں دو تصویریں شامل ہیں۔ جن میں سے ایک حیدرآباد دکن کے ایک کہنہ مشق شاعر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کی ہے۔ جن کا ایک بسیط تذکرہ اس رسالے کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ دوسری تصویر اردو کے مشہور دانشور پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی کی ہے۔

مولانا سلیم پانی پت (ضلع کرنال) کے رہنے والے تھے۔ آپ کے دادا ملتان سے آکر پانی پت میں رہ گئے تھے۔ یہیں مولانا سلیم کے والد حاجی فرید الدین پیدا ہوئے۔ خود مولانا کی پیدائش پانی پت میں ہوئی تھی۔ دردبریلوی نے آپ کو شرفائے سادات سے شمار کیا ہے۔ لیکن ہمارے پاس اسکی کوئی قابل اعتماد شہادت موجود نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ مولانا مرحوم نے بھی کبھی اپنے آپ کو سادات میں شمار نہیں کیا۔

حاجی فرید الدین، پانی پت کے بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندر کی مزار کے متولی تھے۔ جب حضرت سید غوث علی شاہ، پانی پت میں وارد ہوئے تو حاجی صاحب نے ان کو اپنے ہی یہاں ٹھہرایا۔ ان کو اُن سے خاص عقیدت تھی۔

مولانا سلیم کی ابتدائی تعلیم مکان ہی پر ہوئی اور اکثر ذاتی شوق سے فارسی کی متداولہ کتابوں کو پڑھا۔ حضرت غوث علی شاہ سے مولانا کو بھی خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ چودہ برس کی عمر میں شاہ صاحب کی مدح میں ایک پرمغز قصیدہ لکھا۔ جو عرفی کے قصیدے پر مبنی تھا۔ یہ قصیدہ "تذکرہ غوثیہ" میں شاہ صاحب کی کرامات کے مظہر کی طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ثانوی درجہ کی تعلیم مدرسہ میں حاصل کرنے کے بعد مولانا لاہور چلے گئے جہاں عربی ادب، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ قانون پڑھنے کا بھی ارادہ کیا تھا۔ لیکن اسکی تکمیل کا موقع نصیب نہیں ہوا۔

آپ کی ابتدائی ملازمت ریاست بھاولپور کے محکمہ تعلیمات میں ہوئی۔ یہاں چھ سال کام کرنے کے بعد، مرض تشنج اور اپنے قدردان عظیم الدین صاحب کے انتقال کی وجہ سے اس جگہ سے علیحدہ ہونا پڑا۔

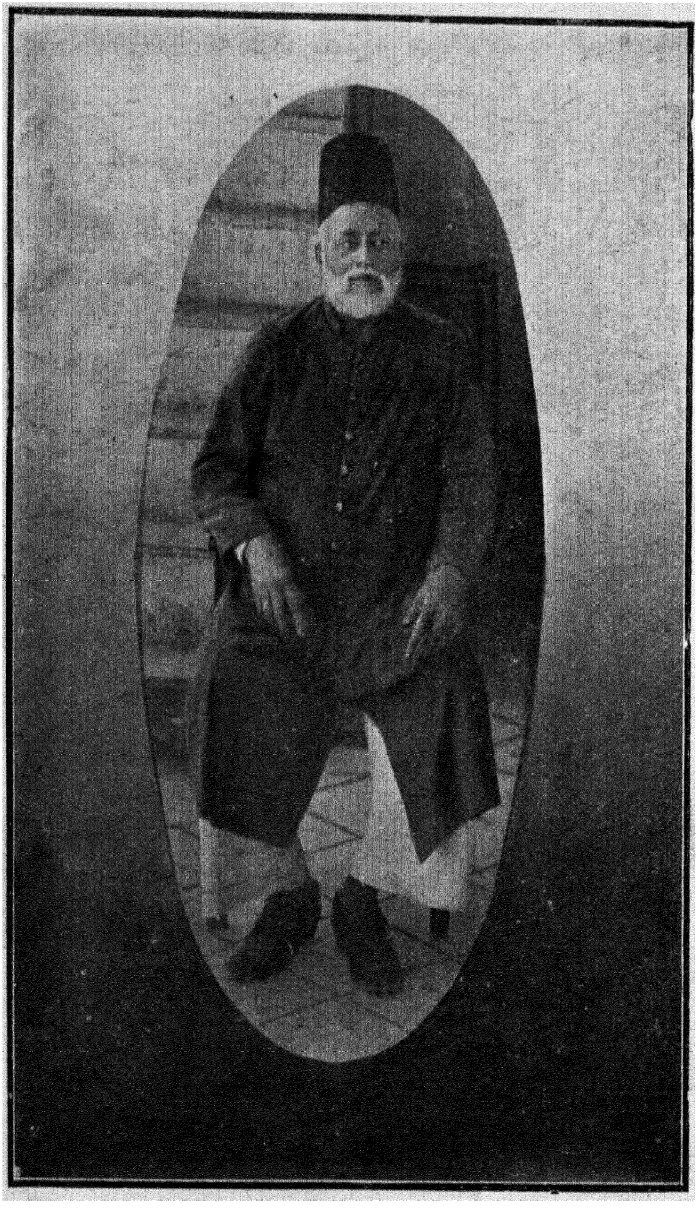
اور جالندھر میں یونانی طب اور ذاتی طور پر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے پانی پت میں مطب شروع کیا۔ اور عرصہ تک یہیں مشغول رہے۔ اسی زمانہ میں حالی نے آپ کو آنریبل سرسید احمد خاں سے ملایا۔ سرسید کی دوربین نگاہ کو ان کے گرد و پیش کا ہر ذرہ 'آفتاب بن کر چمک اٹھتا تھا۔ مولانا تو مجسم ذہانت تھے۔ سرسید احمد خاں نے ان کو اپنے پاس ہی رکھا۔ اور عرصہ تک اپنے علمی ادارے میں کام لیتے رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں مولانا کے علمی اور ادبی کردار کا نشو و نما ہوا۔

۱۸۵۷ء کے واقعہ کے بعد سے ہندوستان میں صحافت اور اس کے ساتھ سیاست کا نشو و نما ہونے لگا۔ اس وقت علی گڑھ کالج کا ترجمان "علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" جاری ہوا' اور مولانا اس کے مدیر مقرر کئے گئے۔ چند سال تک اس کام کو نہایت مستعدی سے چلانے کے بعد بیماری کی وجہ سے' اس سے مستعفی ہو کر' وطن چلے گئے۔ اور اس وقت تک جنبش زندگی بسر کی جب تک "مسلم گزٹ" (لکھنؤ) کی ادارت آپکے تفویض ہوئی۔ اس اہم خدمت کو بھی آپ نے نہایت جوش اور قابلیت سے انجام دیا۔ لیکن آخر کار گورنمنٹ نے اخبار کو ضبط کر لیا۔ مولانا لکھنؤ سے جھپ کر نکل گئے۔ اور "زمیندار" سے اپنے ادارتی خدمات کو متعلق کیا۔ لیکن مولانا کے پرجوش قلم کی یہاں بھی وہ آزاد روی باقی رہی۔ اور کسی بات پر بگڑ کر حکومت نے اخبار ضبط کر لیا۔

جب حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کی داغ بیل پڑی اور دارالترجمہ قائم ہوا تو مولانا کے واقف کاروں نے اصطلاحات پر غور کرنے کے لئے آپ کو یہاں بلایا آپ نے یہاں نہ صرف وضع اصطلاحات کے مشکل کام میں ارکان جامعہ کی مدد کی بلکہ اس کے اصول پر ایک کتاب اسی نام سے لکھی۔ جس میں اصطلاح سازی کے اصول نہایت اچھے کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب اردو زبان میں معرکۃ الآرا بن رہی ہے۔

دارالترجمہ کی خدمات کے ساتھ ساتھ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں اردو کے مدرس کا پروفیسری کی خدمت بھی آپکے تفویض ہوئی۔ اور چار سال بعد جامعہ کے اس معمول کا استثنا قرار دیکر کہ ہر پروفیسر کا یوروپی جامعات کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے آپکو اردو ادبیات کا پروفیسر بنا دیا گیا ہے۔

مولانا شاعری میں بھی کچھ کم رتبہ نہیں رکھتے تھے۔ ابتدائے عمر ہی سے شعر گوئی کا چسکا تھا۔ لیکن آپکی شاعری کا ایک مخصوص رنگ ہے۔ آپ پر حالی کی تلقینات شعری کا بے حد اثر پڑا تھا۔ اسی لئے آپ اگر غزل کی شکل میں شعر موزوں کرتے تو' جدت خیال' جدت تشبیہ یا قومی اصلاح کے مقاصد اس میں خاص طور سے نمایاں رہتے۔ موضوعی نظموں میں اخلاقی اور تمدنی نظمیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ حالی اور دوسرے اردو شاعروں کے برخلاف' حیات اور کائنات کے متعلق آپ کا خیال ہمیشہ رجائی رہا۔ آپ کی نظموں میں بلا کا جوش اور فکر آپ پنہاں ہوتا ہے آپ کے مخاطب اکثر و بیشتر تعلیم یافتہ نوجوان ہوتے ہیں۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی نہایت پرجوش ہوتا تھا



مرحوم پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی

C. K. Press, Hyd.-Dn.

آخر دم تک علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ گذشتہ نومبر میں پائیوریا سے بیمار ہوئے۔ علاج کیلئے رانچی جانے سے ایک روز پہلے "مکتبہ" کے پہلے نمبر کے لئے ایک نظم "دعا" کے عنوان سے اور دو غزلیں عنایت کیں۔ نظم پہلے نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔

رانچی میں ریڈیم کے علاج سے بھی کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوا۔ جس کا حال مولانا کے ان خطوط سے واضح ہوتا ہے جو رانچی سے ہمیں تحریر کیے گئے تھے۔ ۲۹ جولائی ۱۹۲۶ء کو ملیح آباد (قصبہ لکھنو) میں سرسید، حالی اور شبلی کے زمانہ کی یہ یادگار ہمیشہ کیلئے پیوند خاک ہو گئی۔

یہاں ہم مولانا کی تحریر کا عکس بھی شامل کر رہے ہیں۔ تاکہ ناظرین کرام تصویر کے ساتھ تحریر کا بھی مطالعہ فرما سکیں۔

عکسِ تحریر

آتی ہے نظر آج مسرّت سے بھری شام
جلوہ سے مسرّت کے منوّر ہیں در و بام
عثمانیہ کالج کے یہاں جمع ہیں فرزند
تقریب کچھ ایسی ہے کہ دل سب کے ہیں خورسند
کہتے ہیں کہ ہے بحث کی مجلس کا پھر آغاز
غالب ہے نیا اُس کا۔ نئی اُس کی ہے پرواز
سچ یہ ہے کہ مجلس ہے جوانوں کی یہ نادی
مجلس یہ بتاتی ہے اُخوّت کے مبادی
رفعت کا سبق ہے یہ عزیزوں کو سکھاتی
مجلس یہی وحشی کو ہے انسان بناتی
جو رنگہ اظہار لیاقت اسے کہیے
گہوارۂ تعلیم فصاحت اسے کہیے

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

(از جناب ابو محمد عمر صلاح صاحب بافعی)

(نواب) عزیز الدین خاں (نائطی) نام، ماموں لقب، عزیز تخلص، عزیز یار جنگ بہادر خطاب، ابن نواب فیاض الدین خاں، مشرف جنگ بہادر آپ کے جد اعلیٰ محمد سلطان الدین خاں ماموں امرائے نوائط سے ہیں جنھیں پنڈت پردھان والی پونہ کے دربار سے "ماموں" کا خاص لقب مرحمت ہوا تھا اور اس کی وجہ سے آپ کا رتبہ والی ریاست کے ماموں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ محمد سلطان الدین خاں "ماموں" کے جد محمد ابراہیم الدین خاں بہادر کو مغفرت مآب حضرت آصف جاہ اول (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ) کی ہمراہی کا اعزاز حاصل تھا۔ محمد ابراہیم الدین خاں کے نبیرگان محمد بدیع الدین خاں بہادر اور محمد ہاشم الدین خاں بہادر نے اپنے آقائے ولی نعمی کی جاں نثاری میں اپنی عزیز جانوں کو نذر تیغ و تیر کر دیا۔ محمد سلطان الدین خاں "ماموں" اپنے بھائیوں کی شہادت سے برداشتہ دل ہو کر پونہ چلا گئے تھے لیکن پھر حضرت مغفرت مآب کی ایما پر لوٹ آئے، پائگل اور سرنگ پٹن اور شورا پور کے سفر میں بہ حیثیت سرکردہ سواران شاہی رکاب سعادت میں رہے۔ آپ کی وفات کے بعد محمد قایم الدین خاں بہادر اور محمد دایم الدین خاں بہادر دونوں فرزندوں کو آبائی حقوق اور اعزازات کے ساتھ صوبہ برار میں جاگیرات سرفراز ہوئیں۔ محمد قائم الدین کے فرزند محمد عزیز الدین خاں کے زمانہ میں صرف منصبی معاش قایم رہی[1]۔ عزیز الدین خاں کے صاحب زادے فیاض الدین خاں مشرف جنگ ہیں[2]۔ آپ کی ولادت اور نشو و نما حیدرآباد دکن ہی میں ہوی۔ مدرسہ دار العلوم میں تعلیم پائی استاد الوقت حضرت فیض علیہ الرحمہ (۱۴ رجب ۱۲۸۳ھ ہجری) سے کتب دینیہ کی تکمیل کی شعر و شاعری کا بچپنے ہی سے ذوق و شوق تھا۔ اپنے زور فطرت سے شعر کہا کرتے تھے۔ مشق سخن بھی حضرت فیض رح ہی سے رہی۔ رفتہ رفتہ حضرت فیض رح کے فیض صحبت اور توجہ کی برکت سے آپ کا اپنے وقت کے اساتذہ میں شمار ہوتا رہا صاحب دیوان تھے مختلف علوم و فنون میں کتابیں لکھیں جن میں سے بعض کے نام غرائب حسابی، کنز الطرائف قواعد کلیہ وغیرہ ہیں، صرف خاص مبارک میں مدد گار معتمد کی خدمت تھی، خوش خلق و پاک طینت

---

[1] توثیق کے لئے شاہ تجلی کی تاریخ "تزک آصفیہ" دیکھئے ۱۲

[2] تاریخ النوائط ص ۲۵۱ تزک محبوبیہ، منظر الکرام ۱۲

دیانت و امانت میں بے مثل تھے، مولف شعرائے دکن (عبدالجبار خاں) لکھتے ہیں:-

"مولف فقیر ۱۲۸۶ھ میں طالب علمی کی حالت میں مولوی محمد زماں خاں شہید مرحوم کے مکان پر فروکش تھا اس وقت آپ کو دیکھا تھا پھر جب ۱۳۰۰ھ میں سیاحت ہند سے شہر حیدرآباد میں آیا آپ کو دیکھا بجنسہٖ اسی لباس و صورت میں پایا ۔ ص ۸۹۷

حضرت غفراں مکاں میر محبوب علیخاں، آصف جاہ سادس کی تقریب سال گرہ (سنہ ۱۳۱۶ھ) میں خانی و بہادری کے ساتھ مشرف جنگ بہادر کا خطاب سرفراز ہوا تھا۔ ۱۰ جمادی الاول ۱۳۲۶ھ کو انتقال ہوا۔

نواب غریز یار جنگ بہادر کی ولادت حیدرآباد میں بتاریخ ۔۔۔ ۱۲۸۹ھ میں ہوی آپ نواب مشرف جنگ مرحوم کے پہلے صاحب زادے ہیں۔ حکیم رائے بچو لال تمکین[1] نے تاریخی قطعے کہے تھے

زفیاضِ مطلق بہ فیاضِ دیں شد — عطا نور چشمے مبارک خصالے
رقم کرد تاریخِ میلاد تمکیں — ز گل زارِ فیاضِ اول نہالے

(۲)

زغایاتِ خداوندے — چوں عطا گشت بخانِ فیاض
سالِ میلاد بمن تمکیں گفت — گوہرِ نیکوئے کانِ فیاض

نواب غریز نے مولوی احمد علی صاحب عصر[2] مرحوم سے فارسی کی تعلیم پائی۔ مولوی محمد حنیف صاحب مرحوم خلفِ مولوی محمود مرحوم سے فقہ پڑھی۔ تعلیم درسی کے بعد آپ کی طبیعت کو فطری (موروثی) طور پر شعر و سخن سے لگاؤ پیدا ہوگیا اور اس فن میں اپنے قرابت دار بزرگ مولوی حکیم

---

[1] تمکین خوش نویس تھے، اور اپنے وقت کے اساتذۂ شاعری میں گنے جاتے تھے مبنی راجہ باقی متوفی (۲۳ صفر ۱۳۱۴ھ) تلمیذ حضرت فیض رح کے بزرگ خاندان تھے اسی سال کی مشق سخن تھی، راجہ گوبند بخش (وفات ۱۲۵۰ھ) برادر راجہ چندو لال اور راجہ نریندر بہادر پیشکار (وفات ۱۲۳۰ھ) کی قدردانی کے واسطہ ہے انہا پر شاد حکم (شاگرد تمکین) کے اصرار پر جناب باقی نے تمکین کا جس قدر فارسی کلام ملا اس کو فراہم کرکے "نگارستان تمکین" (۱۳۰۲ھ) کے تاریخی نام سے مطبع مرغوب دکن میں چھپوا دیا ۱۲

[2] عصر مرحوم اور مزاج مرحوم حضرت فیض رح کے بڑے نامور اور شاگردوں میں سے ہیں، مزاج مرحوم نے حضرت فیض رح کے دیوان (مرتبہ مشرف جنگ) کو ۱۳۰۱ھ میں چھپوایا اور اپنے فرزند علاج کے (انتقال ۱۲ محرم ۱۳۱۸ھ) کے بعد اپنا دیوان چھپوا رہے تھے کہ ۱۱ ذی حجہ ۱۳۱۸ھ کو خود کا بھی انتقال ہوگیا، دیوان پریس ہی کے قبضہ میں رہ گیا، کوئی خبر لینے والا نہ رہا۔ دیوان کی طباعت (ی) کی ردیف تک آگئی تھی اس کے پروف علاج مرحوم کے نواسے جناب عبدالحلیم صاحب سے مجھے مل گئے ہیں جو اب قلمی دیوان کا حکم رکھتے ہیں، یہ ایک ہی نسخہ تھا جو مجھے دیدیا گیا ہے، اس پر جا بجا تصحیح کی علامتیں ہیں ۱۲

مظفر الدین خاں مزاج مرحوم سے اصلاح سخن کی ابتدا کی اور تخلص بھی عزیز ہی اختیار کیا۔

شمس العلما نواب عزیز جنگ ولا مرحوم (۱۲ ربیع الاول ۱۳۲۳ھ) جیسے محتاط شخصیت کے آدمی آپ کے متعلق لکھتے ہیں:۔ "آپ نہایت لایق اور ذی استعداد شخص ہیں فن سخن سے کامل دل چسپی رکھتے ہیں"[1]

نواب آصف نواز الملک مرحوم (۱۱ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ) معتمد صرف خاص مبارک کی صاحبزادی سے ۱۳۰۶ھ آپ کی شادی خانہ آبادی ہوئی یہ تقریب اس دھوم دھام سے رچی تھی کہ لوگ آج تک مثال دیتے ہیں۔ صاحب اولاد ہیں۔

مسٹر سعد الدین خاں بیرسٹر ایٹ لا ناظم دوم عدالت دیوانی بلدہ آپ کے فرزند ارجمند ہیں جو نواب اظہر جنگ بہادر (پیشی مبارک) کے داماد ہیں

آپ کی صاحبزادی نواب معین الدین حسن اول تعلقدار خلف نواب اقتدار یار جنگ بہادر سے بیاہی گئیں، مولوی فاضل ڈاکٹر نظام الدین صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نواسے داماد ہوتے ہیں، آپ کی ملازمت کا تعلق علاقہ صرف خاص شاہی سے ہے نظامت کی خدمت سے ترقی کرکے اب آپ اول تعلقداری کے عہدہ پر فائز ہیں، صرف خاص مبارک کی جانب سے مجلس وضع قوانین و محکمہ آرایش بلدہ سرکار عالی کی رکنیت کی خدمت بھی ہے۔ حضرت غفراں مکان کی سالگرہ کی تقریب (۱۳۱۶ھ) میں آبائی اعزاز و اکرام کے ساتھ "عزیز یار جنگ بہادر" کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ حضرت جہاں استاد نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی مرحوم (۱۴ ذی حجہ ۱۳۲۲ھ) کے قیام حیدرآباد کے زمانے (۱۳۰۶ھ تا ۱۳۱۲ھ) میں آپ نے شبانہ روز فیض صحبت سے پورا پورا استفادۂ اصلاح حاصل کیا ہے اور آپ کا شمار حیدرآباد کے تلامذۂ داغ کی صف اول میں ہے۔ جناب احسن مارہروی نے یادگار داغ اور جلوۂ داغ[2] میں آپ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے حضرت داغ کے سیکڑوں نہیں بلا مبالغہ ہزاروں شاگرد ہوے لیکن ایسے شاعر بہت کم ملیں گے جنھوں نے حضرت داغ کے رنگ تغزل کی پوری پوری تقلید کی ہو یا بعض اوقات ترقی کی حد تک بھی پہنچ گئے ہوں؛ شاعری فیضان سخن ہے کسی خاص شخص کا حصہ نہیں نواب عزیز حضرت داغ کی تقلید کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں:۔

تقلید داغ باعث شہرت ہوی عزیز! — چرچا مرے کلام کا ہر انجمن میں ہے
بعد استاد داغ آج عزیز! — تیری شہرت کو دیکھتے ہیں ہم
یہ ندا آئی دم فکر سخن مجھ کو عزیز! — شاعری میں روش حضرت استاد نہ چھوڑ

---

[1] تاریخ النوائط صفحہ (۲۵۲) [2] جلوۂ داغ صـ ۱۳۲

گل ریزیٔ سخن پہ نہیں بے سبب عزیز! ہیں فیض یاب بلبل ہندوستاں ہو آپ
حیرت ہے کیوں عزیز یہ ہوتا ہے اشتباہ استاد کی زبان کا تیری زبان پر
داغ کے بعد لطف سخن عزیز! ہم نے تیری زبان میں دیکھا
داغ کے دم سے تھی ساری گل فشانی اے عزیز اب تو نقشہ ہے ہمارا بلبل تصویر کا
سونی پڑی ہے بزم سخن آج کل عزیز! وجہ فروغ اہل سخن تجھ دکن میں داغ

تقلید داغ کی تصدیق مولانا سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی نواب حیدر یار خنگ بہادر بھی فرماتے ہیں

ہیں عزیز خوش بیاں تلمیذ داغ ان کا جادہ بھی اسی میداں میں ہے
ہے وہی رنگ تغزل دیکھئے ان کا نغمہ بھی اسی الحاں میں ہے

شاہد اس دعوی پہ ہے مصراع سال
داغ کا انداز اس دیواں میں ہے (ارمغان عزیز ص ۲۲۲)

اردو کے شاعروں میں میر کے بعد ہندوستان میں ایک داغ ہی ایسے شاعر گزرے جنھوں نے اپنے رنگ تغزل کو عام شعرا سے الگ کر لیا تھا اور بالکل صحیح اصول پر رنگ تغزل کی بنیاد ڈالی، اردو شاعری کا ذکر جب تک صفحۂ دنیا پر قائم ہے داغ کا رنگ تغزل بھی یادگار رہے گا گو آج جدید رنگ کی شاعری کا چار دانگ عالم میں غلغلہ بلند ہو رہا ہے اور آئے دن اس میں نئی نئی جدتوں سے کام لے کر اردو شاعری سے "غزل" کو ایک دم نکال دینے کی جان ہار ٹوہ کیجا رہی ہے لیکن ان کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اردو شاعری کی ساری جان غزل ہے اور غزل ہی اردو شاعری کی لچک ہے۔ آج خدائے سخن میر تقی میر کو گزرے ہوئے تقریباً (۱۲۲) سال کا عرصہ ہوتا ہے مگر اردو شاعری کے رنگ تغزل میں شہ کار اول کی حیثیت سے میر ہی کو پیش کرنا پڑتا ہے جس کے کلام کو ہم نئی روشنی میں "الہامی" کلام کے برابر سمجھ رہے ہیں اس "ملہم غیبی" کی زبان تقلید سے بھی ایک جگہ یہ نکل جاتا ہے کہ ؎

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا
غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

یہ سچ ہے کہ کوئی شخص محض داغ کی تقلید کر کے داغ نہیں بن سکتا یہاں تقلید سے میری مراد داغ کے جذبات دلی اور خیالات عالی سے نہیں ہے۔ جذبات دلی اور خیالات عالی کو شگفتہ بنانے والی باتوں کی تقلید ہے جو روزمرہ اور جدت ادا کے ساتھ بیان کی گھلاوٹ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شاعر کا داخلی حال "آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔"

ہونا چاہئے ورنہ یہ خارجی مصالحہ بے کار ہے پھر شاعری کیا ہے ایک الفاظ کا گورکھ دھندا ہے گویا ایک بے جان تصویر سے کہوایا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ ایسی شاعری میں کیا جان آسکتی ہے!

نواب عزیز کی شاعری خارجی حالات کے ساتھ داخلی واردات سے بھی پُر نظر آتی ہے۔ ۱۳۳۶ھ میں "ارمغان عزیز" کے نام سے آپ کے کلام کا مجموعہ چھپ چکا ہے اگرچہ یہ مجموعہ مختصر ہے مگر اس کو مختصر مفید کہا جاسکتا ہے وہ ایک جگہ خود ہی کہتے ہیں:-

نوکری سے آج کل فرصت نہیں ملتی عزیز — اس لئے تعداد بھی کم ہے مرے اشعار کی

یہ کسی پیشہ ور شاعر کا کلام نہیں ہے جس میں رسمی اصناف سخن کا انبار لگا ہوا ہو اس میں زیادہ تر خود شاعر ہے اور اس کے بے چین دل کا اضطرار ہے یا یہ الفاظ دیگر "ارمغان عزیز" مصر کا بازار ہے اور اس میں نواب عزیز اور ان کا محبوب مفرح القلوب ہے ارمغان عزیز کو شایع ہو کر ابھی دس سال سے زاید زمانہ نہیں گزرا لیکن ارمغان کی طرح بٹ گیا خود نواب عزیز کے پاس بھی اس کا مطبوعہ نسخہ باقی نہیں رہا میرے پاس ایک نہیں دو نسخے ہیں اور یہی پیش نظر ہیں ارمغان عزیز میں حسب رواج قدیم معاصرین کی تاریخیں بھی ہیں جن میں مولوی لطیف احمد صاحب اختر مینائی (خلف حضرت امیر مینائی رح) نواب اختیار جنگ بہادر ناظم امور مذہبی سرکار عالی مولوی سید علی احسن صاحب احسن مارہروی تلمیذ داغ پروفیسر اردو انٹرمیڈیٹ کالج علیگڈھ مولوی حافظ جلیل حسن صاحب جلیل ملک پوری مخاطب فصاحت جنگ بہادر جانشین حضرت امیر مینائی رح مستغنی عن الالقاب مہاراجہ سر کیشن پرشاد بہادر شاد بالقابہ صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی مولوی محمد نوح صاحب نوح رئیس نارہ ضلع الہ آباد تلمیذ داغ شریک ہیں۔

بعض تاریخوں کا اقتباس ملاحظہ کیجئے تو نواب عزیز کے پایۂ شاعری کا رتبہ ان کے معاصرین کی زبان سے معلوم ہو جائے گا۔

اختر

یہ رنگ و بوئے معانی سے ہے عیاں اختر — کہ شاعری کا چمن ہے عزیز کا دیواں

تلاش کی تو ملا ایک مصرع تاریخ

عزیز مصر سخن ہے عزیز کا دیواں

۱۳۳۶

احسن

مرے شفیق جناب عزیز ہیں احسن — جو ہیں خدا کی عنایت سے نامی دوراں

مفرزین دکن میں خطاب یافتہ ہیں — عزیز رکھتے ہیں شاہ و وزیر و خود بکلاں

جو صرف خاص میں وہ ناظم عدالت ہیں — تو عرفِ عام میں ہیں ناظم شگفتہ بیاں
جنابِ داغ کے ہیں فیض یافتہ شاگرد — سخن کے باغ میں ہیں عندلیبِ خوش الحاں
جواں طبیعت و پاکیزہ فکر و پختہ خیال — سلیس طبع و فصیح البیان و شستہ زباں
کہی یہ عمدہ زلیخائے طبع نے تاریخ
غزیز مصرِ سخن ہے عزیز کا دیواں

جلیل

اے خوشا دیوان ذی شان عزیز — اس کو کہتے ہیں کلام انتخاب
مصرعِ تاریخ موزوں ہے جلیل
شعر ہیں دلچسپ شاعر لاجواب

حضرت شاد بالقابہ ۱۳

ہے یہ دیوان عزیز مصر فن — آپ ہی اپنی نظیر اپنا جواب
بندشیں چست اور پاکیزہ خیال — حسن معنی میں زلیخا کا جواب
ہیں خریدار اس کے وہ اہل سخن — خلق میں جن کا نہیں پیدا جواب
مصرعِ تاریخ لکھا شاد نے
ہے کلام بے نظیر و لاجواب
۲۰ ف ۱۳

نوح

کلام عزیز آج شائع ہوا — نرالا ہے تحفہ انوکھی ہے چیز
لکھو نوح ہجری میں یہ سال طبع
خیالات موزوں کلام عزیز

ان تاریخوں میں مولوی غلام رسول صاحب سرور وکیل ہائی کورٹ حیدرآباد کی پُرکیف تاریخ بالکل دیوان کی زبان میں ہے اس لیے میں اس کو بلا اقتباس نقل کر دیتا ہوں کہ تاریخ کیا ہے گویا ارمغان عزیز کی ترجمان ہے:-

دیکھئے دیکھئے کلام عزیز — انتخاب انتخاب ہے گویا
شعر ایک ایک حسن میں اپنے — آپ اپنا جواب ہے گویا
پردے پردے میں ہیں نکات عجیب — صفحہ صفحہ حجاب ہے گویا

مصرع مصرع ہے قامت شمشاد — نقطہ نقطہ گلاب ہے گویا
اوج پر ہے کمال فکر سخن — شاعری کا شباب ہے گویا
یوں ہے پوشیدہ شاہد معنی — حور زیر نقاب ہے گویا
چہرۂ انور عروس سخن — روکش آفتاب ہے گویا
بحر موّاج فکر کے آگے — ہفت قلزم حباب ہے گویا
نظم تاباں سے آج دیواں کا — ہر ورق آفتاب ہے گویا
عقدۂ زلف یار کا مضمون — نافۂ مشک ناب ہے گویا
بندشیں صاف چلبلے مضمون — برق زیر سحاب ہے گویا
حسن کی عشق کی محبت کی — آخری یہ کتاب ہے گویا
اف رے اف رے کلام کی گرمی — حاسدوں پر عذاب ہے گویا
اے انداز شعر مستانہ — ایک جام شراب ہے گویا

منتخب ہے یہ سالِ طبع سرور
ہر غزل لاجواب ہے گویا (۱۳۳۷ھ)

۱۳۴۷ھ میں نواب عزیز کے سلسلہ حیات کی ۵۸ ویں کڑی شروع ہو جاتی ہے اور یہ عمر موجودہ زمانے میں درجہ کہولت سمجھی جاتی ہے کہتے ہیں "چو شصت آمد نشست آمد بدیوار" لیکن احتیاط اور پابندئ اصول صحت نے آپ کی جسمانی حالت کو نوجوان سا بنا رکھا ہے جس کی شہادت عینی میں اس کے ساتھ جو تصویر شائع کی گئی ہے پیش کی جا سکتی ہے یہ تصویر اب سے دو چار سال پہلے کی ہے "جوانی دیوانی" کی مثل مشہور ہے جوانی میں انسان میٹھی نیند سوتا ہے کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سجھائی، بے احتیاطی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ "حوروں کا انتظار کرے کون شرمگ" ..... بھی کہنا پڑتا ہے اور اس رواروی کے عالم میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو عالم جوانی کو عمر انسانیات کی ایک نعمت سمجھیں اور اس کی قدر کریں ؎

قدر کے قابل نہ ہو کیونکر جوانی اے عزیزؔ! — پھر دوبارہ کوئی دنیا میں جواں ہوتا نہیں

حمد، نعت، منقبت، مدح کے ضروری نمونوں کے بعد نواب عزیز کے گل زار خیالات کی سیر کیجئے گا۔

حمد

کچھ اس طرح مرے لب پر خدا کا نام آیا — ہوا یہ شور کہ موسیٰ کا ہم کلام آیا

خبر نہیں کہ میں کس بے نشاں کا ہوں شیدا
کہ میرے ذہن میں مضمون نا تمام آیا

کہو کلیم ہوئیں کیا حضور سے باتیں؟
ہمارا ذکر بھی کوئی دمِ کلام آیا

ترے رسول کے قربان جنکے صدقے میں
مطالعہ میں ہمارے ترا کلام آیا

محمدِ عربی پر ہزار بار درود
خدا کے گھر سے جنھیں ہدیۂ سلام آیا

ہوئے بلند صلوٰۃ وسلام کے نعرے
مری زبان پر ایسا یہ کس کا نام آیا

عزیزؔ حشر میں پہنچا تو یہ پکار مچی
کہ لو وہ احمد مختار کا غلام آیا

میرے لیے یہ کم نہیں سرمایہ ناز کا
میں ہوں نیاز مند بڑے بے نیاز کا

اٹھ جائے درمیان سے پردہ مجاز کا
ہو جائے انکشاف حقیقت کے راز کا

صانع کو دیکھنا ہو تو صنعت کو دیکھیے
حال آئینے سے کھلتا ہے آئینہ ساز کا

کہتی ہے سربلندی و پستی خیال کی
انساں ہے اک طلسم نشیب و فراز کا

یہ سب نیاز مندیٔ عاشق کا ہے اثر
بازار گرم ہے جو ترے کبر و ناز کا

یارب! یہی دعا ہے قناعت نصیب ہو
گھر بن گیا ہے گوشۂ دل حرص و آز کا

سرکارِ حسن کی بھی عجب شان ہے عزیزؔ!
محمود خود غلام بنا تھا ایاز کا

نعت

مداح ہوں میں بھی اُسی ممدوحِ خدا کا
صدقے میں کھنچا جسکے یہ کونین کا خاکا

ہے دھیان دمِ خواب مدینہ کی فضا کا
یہ نیند کا جھونکا ہے کہ جنت کی ہوا کا

جو آپ پہ مرتے ہیں وہ مرتے نہیں ہرگز
ملتا ہے فنا ان کو فنا میں بھی بقا کا

شیرازۂ کونین یہ وابستہ ہے جن سے
اک حلقہ ہے وہ آپ کے گیسوئے رسا کا

ہے ذات نبیؐ باعث تخلیق دو عالم
مضموں یہ کہے دیتا ہے لولاک لما کا

سر پر ہو مرے گردِ رہ وادیٔ طیبہ
سمجھوں گا میں سایہ اُسے کعبہ کی ردا کا

کب تک ملک الموت سے فرقت میں کشاکش
ہو اب تو اشارہ لبِ اعجاز نما کا

میخوارِ محبت ہیں بہت دیر سے پیاسے
ساغر کوئی۔ صدقہ نگہِ ہوش رُبا کا

کیا پرسشِ محشر کا عزیزؔ اب مجھے کھٹکا
جب ہاتھ میں دامن ہے شہِ عقدہ کشا کا

منقبت

دیا سجدے میں سر شہ نے شہادت ایسی ہوتی ہے
قیامت نے کہا اٹھ کر "قیامت ایسی ہوتی ہے"

علی اکبر کو جس نے رن میں دیکھا مصطفیٰ سمجھا
مشابہ اس کو کہتے ہیں شباہت ایسی ہوتی ہے

فرشتے ہو کے قرباں روئے سرور پر یہ کہتے تھے
"جو خاصان خدا ہیں اُن کی صورت ایسی ہوتی ہے"

امام دوجہاں سرور۔ امام انس وجاں سرور
امامت نام ہے اس کا۔ امامت ایسی ہوتی ہے

وہ نقشہ کربلا کا ہائے جس دم یاد آتا ہے
کلیجہ خون ہو جاتا ہے۔ حالت ایسی ہوتی ہے

دیا شبیر سا حاجت روا آقا غلاموں کو
عزیز اللہ کی ہم پر عنایت ایسی ہوتی ہے

(۲)

تعلق ہے غلامی کا مجھے شبیر و شبّیر سے
گداہوں میں اسی در کا۔ بنا ہوں میں اسی گھر سے

دہل جاتے ہیں دشمن دیکھ کر دل بندِ حیدرؓ کو
لرز جاتے ہیں دشمن نعرۂ اللہ اکبر سے

گری پھر طور پر بجلی۔ اٹھا پھر نوح کا طوفاں
ہماری آہ سوزاں سے۔ ہمارے دیدۂ تر سے

ملا کر دیکھ لیتا ہوں میں اپنے دل کے داغوں کو
کبھی مہرِ درخشاں سے کبھی ماہِ منور سے

عزیز اک حشر ہوگا حشر میں جب ماجرا اپنا
کہیں گے شیعگان کربلا ساقی کوثر سے

مدح بادشاہ

بلبل کو ہم صریر دا صحن چمن مبارک
اور مجھ کو آستان شاہ دکن مبارک

رباعیات

پُر نور ضیا بخش جہاں بانی ہے
کیا دور عزیز! دور عثمانی ہے

دفتر کے ہیں اوراق طبق گردوں کے
یہ مہر فلک بھی مُہر سلطانی ہے

حکمت میں معدلت میں افضل تم ہو
دانش میں کمالات میں اکمل تم ہو

گو آصف سابع ہو جہاں میں لیکن
سب شاہوں کی فہرست میں اول تم ہو

(قطعات تہنیت)

خوشا جشن طرب افزا خوشا عقد — کھلے عقدے ہزاروں جب بندھا عقد
عزیز اک مل گیا مصرع پئے نذر — ہمایوں شاہ عثماں کو نیا عقد
۱۳ ۵ ۴۱ ۱۳

کیا جوش پہ ہے رنگ گلستان دکن آج — ہیں مست طرب زمزمہ سنجان دکن آج
ہر غنچۂ گل کی ہے زباں پر یہ ترانہ — ہو عید مبارک تمھیں سلطان دکن آج

شان جم و سلیماں۔ سرکار ہو مبارک — تائید رب سبحاں۔ سرکار ہو مبارک
حاضر ہیں تہنیت کو دربار میں فدائی — تم کو یہ عید قرباں۔ سرکار ہو مبارک

قدر دان علم تو ہی۔ علم تیرا قدرداں — اے نظام الملک آصف جاہ خاقان علوم
ایک تیری ذات سے سرسبز ہے کشت عمل — ایک تیرے دم سے تازہ ہی گلستان علوم
لطف تیرا ہے شہا گل زار عالم کی بہار — فیض تیرا ہے بہار شمع ایوان علوم

مصرع تاریخ کہہ کر نذر کو لایا عزیز
محسن عالم ہے تو اے شاہ سلطان علوم
۱۳ ف ۳۰

حمایت باغ

اعلیحضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ نے جس وقت اورنگ آباد میں باغات شاہی کو ملاحظہ فرمانے کے سلسلے میں ایک باغ کو حضرت شاہ زادۂ ولی عہد بہادر دام اقبالہ کے اسم گرامی (حمایت باغ) سے انتساب فرما کر اپنے قدوم میمنت لزوم سے زمین گل زار کو رشک ارم کا خلعت بخشا تو نواب عزیز نے اس پُر مسرت تقریب پر "حمایت باغ" میں ردیف اختیار کر کے ایک مدحیہ نظم لکھی اور اس میں وہ گل کھلائے ہیں کہ زمین شعر کو بھی گل زار بنا دیا۔

ہو مبارک شاہ کا آنا حمایت باغ میں — بلبلوں میں ہے یہی نغما حمایت باغ میں
خیر مقدم کیلئے نرگس کی آنکھیں منتظر — سرو قد ہے سرو استادا حمایت باغ میں
کہہ رہی ہے آج کچھ سوسن زبان حال سے — بے زباں بھی ہو گئی گویا حمایت باغ میں

جھومتا ہی ہر روش پہ بادہ خوار دنکی طرح — ہر شجر پہنے ہوے گہنا حمایت باغ میں
جلوۂ رخسار آصف دیکھنے کو - بن گئی — چشم نرگس دیدۂ موسیٰ حمایت باغ میں
بٹ رہا ہی کشتی گل میں زر گل ہر طرف — بہہ رہا ہے فیض کا دریا حمایت باغ میں
جم رہا ہی بلبل و گل میں وفاداری کا رنگ — اُڑ رہا ہی عشق کا خاکا حمایت باغ میں
کہہ رہی ہی پتّے پتّے سے نسیم صبح دم — دم بھرے میرا دم عیسیٰ حمایت باغ میں
طائر دل کے لیے مرغ تصور کے لیے — سنبل پیچاں کا ہی پھندا حمایت باغ میں
پھول بھر کر دے رہی ہی ساغر گل میں نسیم — یہ نئی مُے ہی نیا مینا حمایت باغ میں
طائر فکر معیشت کا ٹھکانہ مٹ گیا — آشیانہ ہو گیا عنقا حمایت باغ میں
یہ شگوفہ کس نے چھوڑا جو شگفتہ ہو گیا — پھول کی مانند ہر کانٹا حمایت باغ میں
انتساب شاہ زادہ سے لگے ہیں چار چاند — ورنہ پہلے کیا نہیں کچھ تھا حمایت باغ میں
بن پڑی قسمت سے ایسی بے بنائے بن گیا — سبزۂ بیگانہ بھی اپنا حمایت باغ میں
باڑ مہندی کی ہی یا یہ باڑھ ہی تلوار کی — کٹ رہی ہی گردن اعدا حمایت باغ میں
ہُن برسنے کا یقیں پت جھڑ پہ ہو با ذخراں — ہو اگر آنا تو یوں آنا حمایت باغ میں

خوشۂ پروین ہے یا انگور کے خوشے عزیز
خوشہ چیں حیران ہیں کیا کیا حمایت باغ میں

اسی سلسلے میں حضور پُر نور کی غزل پر نواب عزیز نے جو تضمین کی ہے وہ بھی پیش کر دی جاتی ہے کلام الملوک ملک الکلام سے کون واقف نہیں یوں تو حضرت اقدس و اعلیٰ کی غزل کی غزل مرصع ہے لیکن ج "اعتبار و بہار" کے قافیے ہمیشہ یاد رہیں گے زبان فیض ترجمان سے ارشاد ہوتا ہے ؎

ہزار بار تمھیں آزما کے دیکھ لیا — تمھاری باتوں کا اب اعتبار مشکل ہے
میں اُس چمن کا ہوں مرغ ترانہ سنج جہاں — ترا اگر بھی نسیم بہار مشکل ہے

خمسہ

کہاں تک آہ کرے بار بار مشکل ہے — کہاں تک آنکھ رہے اشک بار مشکل ہے
کہاں تک اور بڑھے انتظار مشکل ہے — "نہاں نظر سے ہوا روئے یار مشکل ہے
اب اپنے دل پہ ہمیں اختیار مشکل ہے"
کسی کے طرۂ زلف دراز نے دل پر — کسی کے عشوۂ جادہ طراز نے دل پر

کسی کے شیوۂ راز و نیاز نے دل پر "کسی کے غمزہ و انداز و ناز نے دل پر
کیے وہ ظلم کہ جس کا شمار مشکل ہے"

نہ اس طرح سے یکایک ہوا تبا نی تھی ذرا ہماری محبت بھی آزمانی تھی
ابھی اُمنگ کے دن تھے ابھی جوانی تھی "غم رقیب میں تم کو نہ خاک اُڑانی تھی
ہمارے دل سے یہ جائے غبار مشکل ہے"

ہزاروں گوہر مقصود کے ہیں گنج جہاں مثال سیب ذقن ہے ہر اک ترنج جہاں
جہاں نہ خوف کسی بات کا نہ رنج جہاں "میں اُس چمن کا ہوں مرغ ترا نہ سنج جہاں
ترا گزر بھی نسیم بہار مشکل ہے"

کبھی بلا کے کبھی آپ جا کے دیکھ لیا گلے لگا کے محبت جتا کے دیکھ لیا
عدو کے سر کی قسم بھی دلا کے دیکھ لیا "ہزار بار تمھیں آزما کے دیکھ لیا
اٹھائے وعدوں کا اب اعتبار مشکل ہے"

چمن بھی ایک قیامت ہی مرغ جاں کیلئے قدم قدم پہ مصیبت ہی مرغ جاں کیلئے
کہاں نصیب فراغت ہی مرغ جاں کیلئے "نگاہ ناز اک آفت ہے مرغ جاں کیلئے
یہ تیر وہ ہے کہ جس سے فرار مشکل ہے"

عجیب چیز ہیں دنیا میں حضرت انساں یہ جس کے ہو گئے پھر اسکو چھوڑتے ہیں کہاں
عزیز بھی ہی ازل سے مرید پیر مغاں "پڑی ہی بادۂ ترکی جو چاٹ اے عثماں
بہار گل میں یہ جائے ہزار مشکل ہے"

نواب عزیز کو اپنے بادشاہ جم جاہ کے بعد وزیر سلطنت کے ساتھ جو ارادت ہے اس کا اندازہ ذیل کی رباعی سے ہو سکے گا۔ مدح کے ساتھ ذرا چوتھے مصرع کی دلیل کو بھی شاعرانہ نظر سے ملاحظہ فرمائیے

مدح وزیر

آصف سے ملی آج وزارت کی سند سرکار مبارک ہو بر آیا مقصد
سلطان کے بعد آپ ذی رتبہ ہیں ہی "شاہ" سے کم شاد میں صرف ایک عدد

مدح خان عزیز سے حمد، نعت، منقبت، مدح شاہ و وزیر کے بعد تصوف، عقاید، وعظ و پند نیرنگ عالم، حسن و عشق، حسرت و یاس۔ رشک و محبت۔ پابندی وضع، بذلہ و مزہ۔ معانی آفرینی مضامین کی شوخی، الفاظ کی کمپت کی تحت مختلف بحور و قوافی کے اشعار درج کیے جاتے ہیں

جن سے غزل میں رنگا رنگی مضامین کا بھی اندازہ ہو جائے،

تصوف

کیوں کر پتا لگائے کوئی پھر قیاس سے — خارج ہیں وہم سے تو ہیں یا ہر گماں سے آپ

یہ نہ سمجھیں مفت مل جائے گا دل — آپ قادر اور میں مجبور ہوں

وحدت کا راز کھل گیا آئینہ خانے میں — مجھ کو دکھائی دی مری صورت کہاں کہاں

قابل دید ہوتا اُس کا حال — دیکھ لیتا کوئی اگر تم کو

یاد تباں بھی ہم کو سفر در وطن ہوا — گھر بیٹھے سیر کرنے لگے دور دور کی

تجلیات انوار الٰہی ہم میں مخفی ہیں — تماشا گاہ عالم ہو گئی تصویر مٹی کی

پہلے مرنے سے جو مرے بیخود — خاک کو اُس کی کیمیا کہیئے

چشم پوشی بھی ہے اُنھیں منظور — میری تقصیر پر نظر بھی ہے

عقائد

اپنی خطا سے بھی بہت بڑھ کے ہے اُسکی مغفرت — تم کو عزیز اس کا لطف روز حساب آئے گا

اجمیر دیکھ آئے مگر دل میں اے عزیز — شوق زیارت شہ بغداد رہ گیا

وعظ و پند

رند ہو زاہد ہو یا مے خوار ہو — چاہیئے سب کو خیال انجام کا
جس کو دنیا موت کہتی ہے عزیز — دوسرا اک نام ہے آرام کا

بحرِ جہاں میں ہو نفس واپسیں کا خوف — مُنہ پھیرتی ہے بادِ مخالف جہاز کا

عزیز! اُٹھو درِ مے خانہ چھوڑ دو — کہیں توبہ کا ہو جائے نہ در بند

یہ حبابِ لبِ ساحل سے بھی نازک تر ہے — کچھ حقیقت بھی بشر کی ہو بشر کچھ بھی نہیں

نیرنگِ عالم

کیا جنوں خیز ہے اِس گلشنِ عالم کی ہوا — پھول بھی میری طرح چاک گریباں نکلا

عجب عبرت سرا ہے خطۂ گور غریباں بھی — ہزاروں گھر بگڑ کر بن رہے ہیں گھر یہاں کیا

پڑھتے تھے کل تک یہاں جو داستانِ حسن و عشق — جائے عبرت ہے کہ ان کا ذکر ہے افسانہ آج
وقت بد میں چھوڑتا ہے ساتھ سایہ بھی عزیز — آشنا جو تھا نظر آنے لگا بے گانہ آج

قرارِ عشق میں تم کو نہ چین ہے ہم کو — پھنسے ہیں گردشِ لیل و نہار میں ہم تم

اپنے دشمن سے بھی ملنا ہو تو جھک کر ملیے — خاکساری نے یہ انداز سکھایا ہے مجھے

حسن و عشق

کرتے ہیں عاشقوں پہ یہ کیا کیا حکومتیں — کہتی ہے ان بتوں کو خدائی خدائے دل
کیا تم نگاہِ شوق کو پہچانتے نہیں؟ — کہنے کی بات ہو تو کہوں مدعائے دل

تیری صورت کو دیکھتے ہیں ہم — اپنی قسمت کو دیکھتے ہیں ہم
جس کو تم آئینہ میں دیکھتے ہو — ایسی صورت کو دیکھتے ہیں ہم

کس تمنا سے تم کو دیکھتے ہیں — دیکھنے والوں کی نظر دیکھو

اور کچھ ہو گئی نگاہ تری — اب وہ پہلی سی شرگیں نہ رہی

شب وصال کے قصے میں ہی اثر ہے کا — زباں پر آتے ہی دل کو سرور ہوتا ہی

اُس نے کچھ اِس طرح پوچھا درد دل — مجھ کو کہنا ہی پڑا آرام ہے

میں روتا ہوں پکڑ کر اُن کا دامن — وہ آنسو پوچھتے ہیں آستیں سے

تماشا ہیں طریقِ عشق میں نیرنگیاں دل کی — یہی کم بخت رہزن ہی یہی کم بخت رہبر ہے

نہو دلِ صاف جب تک لطف ملنے کا نہیں ملتا — ترا یوں کھچ کے ملنا بھی نہ ملنے کے برابر ہے

دل کی پرواہی نہ کچھ جان کی پروا ہی مجھے — آزما کر بھی کبھی آپ نے دیکھا ہے مجھے

بدگمانی یقین کی حد تک — کچھ اُدھر بھی ہے کچھ اِدھر بھی ہی
آنکھ پھر تیری آنکھ او کافر! — عشوہ گر بھی ہے فتنہ گر بھی ہی
وقت پر اپنا نالۂ سوزاں — با اثر بھی ہی بے اثر بھی ہی

میرے دل کو دیکھئے اس میں کوئی — آپ کا ہم شکل ہے ہم نام ہی

حسرت و یاس

جی بھر کے خواب میں بھی نہ دیکھا ترا جمال — اس طرح کچھ خوشی ہوی بیدار ہو گیا
کم بخت پوری بات بھی نکلی نہ تھی ابھی — یہ مُنہ کی مُنہ میں تھی اُدھر انکار ہو گیا

ہم لے رہے تھے قبر میں کیسی مزے کی نیند — اے شورِ حشر! کیوں ہمیں بیدار کر دیا

سسکتا چھوڑ دیا مجھ کو میرے قاتل نے
کیا تھا ذبح تو قصّہ تمام کرنا تھا

پہنچتے ہم الٰہی منزلِ مقصود پر کیوں کر
اُڑی ہے سامنے آنکھوں کے گردِ کارواں کیا کیا

حشر میں کس منہ سے جائیں سامنے اللہ کے
کون سا ہم نے کیا کارِ نکو زیرِ فلک

وہ دیکھتے ہیں چشمِ عنایت سے کس طرف
یہ دیکھتے ہیں بزمِ عدو میں بغور ہم

اور دل کی بے قراری بڑھ گئی
کیوں کہا تھا اضطراب اچھا نہیں
غیر اچھے آپ اچھے لاکلام
میں ہی اک خانہ خراب اچھا نہیں

جب نہ تھا قسمت میں اُس کو دیکھنا
دی خدا نے کس لیئے بے کار آنکھ

نہ کی آخر ہماری پردہ پوشی دستِ وحشت نے
نمایاں ہو گیا چاکِ جگر چاکِ گریباں سے

چمنِ دہر کی کیا خاک موافق ہو ہوا
خار تو خار ہیں پھولوں سے بھی کھٹکا ہی کیجے

رشکِ محبت

دوست بہت ہیں مگر اُن سے غریز
ذکر کسی نے نہ ہمارا کیا

غیر سے ملیئے نہ یوں دل کھول کر
اِس طرح کی سادگی اچھی نہیں

اے ظالم! ترے نقشِ قدم کے فیضِ صحبت سے
زمین کوئے دشمن غیرتِ گلزار ہوتی ہے

کچھ تجھے شرم بھی ہے دیدۂ گریاں آخر
آتشِ ہجر میں کب تک ابھی جلنا ہے مجھے

نکلا ہوں اُس کی بزم سے لے کر عدو کا شک — رکھتا ہوں اپنے ساتھ یہ تحفہ برائے دل

پابندیٔ وضع

یہ وہ نہیں ہے دل جو کسی اور پر مرے — یہ وہ ہے جس کا ہو گیا اک بار ہو گیا

خدا وہ دن دے کہ غم بھی خوشی کے ساتھ کٹے — خزاں بھی آئے نظر تو بہار کی صورت

ہم بے طلب نہ جائیں گے بزم رقیب میں — ہم اس کو روکتے نہیں جاتا ہے جائے دل

کہیں ٹلتے تمہارے درباں سے؟ — اپنی عزت کو دیکھتے ہیں ہم

روزمرّہ

جس کا دل تھا اُس سے پوچھو اس کا حال — تم کو کیا جاتا رہا، جاتا رہا،

عرض مطلب بھی کوئی جرم تھا؟ — آپ نے تو اتنے کو اِتنا کیا

آسان تھا علاج ہمارے فراق کا — دشوار کر دیا اِسے دشوار ہو گیا

وہ تو جھلک دکھا کے اُدھر کو سرک گئے — اک حشر اس طرف پسِ دیوار ہو گیا

کیا اور کوئی دل کو نہ لے گا بجا درست — بے کار تم نے کہہ دیا۔ بے کار ہو گیا؟

جب آپ کے پسند نہیں ہے دل حزیں — میرے بھی کام کا نہیں بے کار ہو گیا

یہ ملا عرض مکرر پر جواب — "جو مقدر کا تھا ملنا مل گیا"

نامۂ شوق دیکھ کر۔ کر دیا اُس نے چاک چاک — نامہ رساں سے کہہ دیا۔ کہہ دے جواب آئے گا"

بنائے ایک کے دو دو کے چار چار کے آٹھ — ٹپک کے شیشۂ دل چور چور میں نے کیا

کان رکھ کے سنتے ہیں وہ مجھ سے میری داستاں
داد ملتی ہے زباں کی لطف ہے تقریر کا

حلق میرا ہے جگر میرا ہے گردن میری
تیغ تیری ہے۔ چھری تیری ہے خنجر تیرا

کون ہے نام نہیں جس کی زباں پر تیرا
کون ہے رسم محبت نہیں جس کو تجھ سے

ہائے اصرار پہ اصرار وہ میرا اپنے وصل
اور انکار پہ انکار مکرر تیرا

نشہ میں جام سے وہ جام بدل لیتے ہیں
اور کہتے ہیں "یہ میرا ہے یہ ساغر تیرا"

دل کی دل میں کہیں رہ جائے نہ حسرت میری
چلتے چلتے کہیں رک جائے نہ خنجر تیرا

رکھ دیا لے کر ہمارا نقد دل
کہہ دیا ہنس کر "مرے کس کام کا؟"

تمھیں سوچو تمھیں سمجھو تمھیں انصاف کرو
کوئی حسرت مری نکلی۔ کوئی ارماں نکلا؟

جو نہ کرنا تھا کیا وہ عشق نے
جو نہ ہونا تھا وہ آخر ہو گیا

اب کہاں دل چھوڑتا ہے عشق کو
ہو گیا جس بات کے سر ہو گیا

آج اُن سے وصل کا وعدہ عزیز
ہو گیا پھر ہو گیا پھر ہو گیا

طریق محبت میں دل کی نہ پوچھو
کسی کا یہ رہبر ہے رہزن کسی کا

وہ تم ہو توڑتے ہو آس پر آس
یہ ہم ہیں کھا رہے ہیں چوٹ پر چوٹ

تم نکالو تو آرزو نکلے
دلِ خانہ خراب سے باہر

دوست دشمن کا سلیقہ دیکھیے
کیجیے تفویض کوئی کام خاص

دل دے کر یہ مجھ کو وہ یوں بگڑ کے بولے
"یہ چیز تیری تجھ کو اے دل شکن! مبارک"

سوال وصل پر بولے بگڑ کر "یہ بے باکی، یہ جرأت، یہ ترا دل؟"

کہنے کو ہم نے کہہ بھی دیا اضطراب میں — سننے کو اُس نے سن بھی لیا ماجرائے دل

قابل دید ہے دیکھو مرے داغوں کی بہار — پھول اور اتنے بہت پھول گلستاں میں نہیں

اپنی محفل میں مجھے دیکھ کے وہ کہنے لگے — کون ہیں؟ کس لیے آئے ہیں؟ یہ کیا کہتے ہیں؟

جانتا ہوں تمھاری باتوں کو — اور پھر اعتبار کرتا ہوں

تری نظریں، تری باتیں، تری چالیں، تری چتون — کوئی ترچھی، کوئی ٹیڑھی، کوئی تیکھی کوئی بانکی

اپنی تقدیر پہ ہر وقت بھروسا ہے مجھے — آج کی فکر نہ اندیشۂ عقبیٰ ہے مجھے

معانی آفرینی

تصور کو دعائیں دے رہا ہوں — لیا ہے کام اس سے دوربیں کا

اُن کا ہے امتحان کہ میرا ہے امتحان — کیوں چلتے چلتے خنجر فولاد رہ گیا

وہ جو مجھ کو کوستے ہیں شوق سے کوسا کریں — کچھ نہیں تو نام ہی ورد زباں ہو جائیگا

بعد فنا بھی ظلمتِ عصیاں نہ کم ہوئی — پتھر سیاہ ہے مری لوح مزار کا

چھوٹ جاؤں قید غم سے زندگی میں کیا مجال — بلبلِ مسکوں ہی احاطہ خانۂ زنجیر کا

جو رمعشوق و گریۂ عاشق — ہیں یہ دونوں حباب سے باہر

یادِ عارض میں نکل آتے ہیں آنسو آنکھ سے
دیکھتا ہوں جب کبھی خورشید تاباں کی طرف

اس میں سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں
دل کی وسعت کو دیکھتے ہیں ہم

یہ کیا کہا کہ ملیں گے اگر ملی فرصت!
تمہاری بات کا تم کو بھی اعتبار نہیں

نوخیز شاعری ہی ہماری ابھی عزیز
جب ہم ضعیف ہوں تو کہیں یہ جوان ہو

مری تربت کو ٹھکرایا تو ٹھوکر سے صدا نکلی
کہ یہ گرد کدورت بھی غبارِ راہِ عقبیٰ ہو

یا الٰہی! جذب کیوں ہوتی ہی ساغر میں شراب
اس میں شامل تو نہیں مٹی کسی مے خوار کی؟

مہتاب میں بھی ہے تپش آفتاب حشر
فرقت کی رات کم نہیں روزِ شمار سے

تمہاری وجہ سے اس کو ملا عروج عزیز
وگرنہ یار کا دروازہ پاسباں کے لیے؟

خدا رکھے تصور کو مزا ہی دید کا حاصل
ہماری آنکھ کا حلقہ تری تصویر کا گھر ہے

ایک مجموعۂ اضداد ہے اپنی ہستی
خاک ہے آب ہے آتش ہے ہوا ہے کیا ہے؟

تجھ سے ہم مل کے رقیبوں سے ملیں گے کیوں کر؟
کیوں یہ فتنہ ستم ایجاد نے لکھا ہی مجھے

میکشو! ظرف پرکھیے یہ موقوف
میکشی عیب بھی ہنر بھی ہے

مضامین کی شوخی

لفظ وصال کیا کسی عاشق کا نام تھا!
کیوں تو یہ سُن کے درپے آزار ہو گیا؟

یوں تو مزے کی بات ہی تھی وعدۂ وصال — لکنت نے اُن کی اور مزے دار کر دیا

آپ کی محفل ہی یا چوروں کا گھر — جس کو دیکھو چغتیا ہے "دل گیا!"

مزا تھا چوک گئے ہم عدو کی محفل میں — ملے تھے اُن سے تو جھک کر سلام کرنا تھا
نہ تھی جہان میں کیا اور کوئی شے زاہد! — شراب ہی تھی؟ اسی کو حرام کرنا تھا؟

مجھ سے نہ پوچھو چھیڑ کر بزم میں دل کا مدعا — کہدوں اگر میں صاف صاف تم کو حجاب آئے گا

بے خود سے ہو گئے اُسے ناصح بھی دیکھ کر — حضرت کا وعظ اور وہ ارشاد رہ گیا

اُڑا دی غیر کے مرنے کی جھوٹ موٹ خبر — اُنھیں بھی اپنی طرح ناصبور میں نے کیا

دل میں جو داغ عشق ہو واخط تو بات ہے — بے کار ہے جبیں پہ یہ گیٹھا نماز کا

خط کتابت میں یہی شرط مقدم ہے عزیز — چست مضمون ہو، خط صاف ہو، پیارا کاغذ

میکدے میں نہ پڑی مجھ پہ کسی غیر کی آنکھ — چھپ گیا ساری خدائی سے پس چشم ہو کر

دم نہ مارا داور محشر کے آگے شیخ نے — کی بہت کچھ زندگی میں واہ ہو زیر فلک

رکھ کے زاہد کے سامنے ساغر — حسن نیت کو دیکھتے ہیں ہم

اپنے بے گانوں سے ہر وقت لپٹ پڑتا ہے — بات کرنے کا سلیقہ ترے درباں میں نہیں
روک دے مجھ کو یہ ممکن ہے یہ ہو سکتا ہے — روک دے دل کو یہ طاقت ترے درباں میں نہیں
ایک پر ایک چلے آتے ہیں مشتاق جمال — روکے کس کس کو حواس آپ کے درباں میں نہیں

ہم سے چھپتی ہے کہیں دل کی لگی بھی ناصح! — وصف کیوں حور کا ہوتا ہے اگر کچھ بھی نہیں
یہ کہہ کے ان کو اپنے گلے سے لگا لیا — کرنی پڑے گی آج ملاقات عید کی

عادت ضرور چاہیے ہر بات کے لیے — پی! جو آرزو ہے شراب طہور کی
وہ گورے گورے گال خدا کی قسم عزیز — قابل ہیں بوسے لینے کے لائق ہیں پیار کے

پئیں گے پلائیں گے تجھ کو بھی زاہد بڑی دھوم سے اک ضیافت کریں گے

الفاظ کی کھپت

آنکھ سے کام لیتے ہیں وہ ٹیلیفون کا تار نگاہ بہر خبر تار ہو گیا

جب دیکھو صورتیں ہیں ہزاروں نئی نئی دیوان خانہ آپ کا بازار ہو گیا

مجھ کو خط بھی نہ بھیجو۔ اور بھیجو غیر کو تار واہ واہ یہ کیا

غیر ممکن ہے کہ کہے وہ میری حالت من و عن یہ غلط ہے نامہ بر میری زبان ہو جائے گا

ساقیا صافی میں چھن کر اور بھی رنگ نکھرا بادۂ گل فام کا

عموماً مطلع اور مقطع زور غزل کا نمونہ سمجھا جاتا ہے اس لیے بعض غزلیات کے مطلعے بھی دیدئے جاتے ہیں:۔

مطلعے

پرسش کے ساتھ حشر میں دیدار ہو گیا داخل ثواب میں یہ گنہگار ہو گیا

حال ابتر ہے شب غم نالۂ شب گیر کا اس اندھیرے میں پتا چلتا نہیں تاثیر کا

خیر سے شیخ بھی ہم مشربِ رنداں نکلا ہم تو کافر اسے سمجھتے تھے مسلماں نکلا

عمر بھر مجھ کو حسینوں سے سروکار رہا اس کو تاکا اسے جھانکا یہی آزار رہا

قہر سے اس کے ڈر رہا ہوں میں موت سے پہلے مر رہا ہوں میں

خدا جانے کہاں سے آ رہے ہیں قدم اٹھتے نہیں شرما رہے ہیں

کدورت کا بُرا ہو مانع دیدار ہوتی ہے کبھی چلمن کبھی پردا کبھی دیوار ہوتی ہے

حُسن پر ناز ازل سے دل مرا دیوانہ ہے پھول پر بلبل ہے شمع بزم پر پروانہ ہے

ہوس دولت دنیا بھی بلا ہوتی ہے جتنا کم کیجئے اتنی یہ سوا ہوتی ہے

گو نواب غزنہ کی طبیعت شعر ہر قسم کے بحر میں غوطہ لگا کے گوہر مراد سے اپنا دامن بھر لیتی ہے لیکن ہیں چھوٹی چھوٹی بحروں میں ان کی طبیعت زیادہ رواں معلوم ہوتی ہے ان میں زبان طرز بیان اسلوب ادا اور تاثیرات کے آثار بھی پورے پورے نظر آتے ہیں بعض غزلیات ملاحظہ ہوں:-

غزلیات

اُس کو تنہا مکان میں دیکھا خود نمائی کی شان میں دیکھا

دشمنوں کو بنا لیا اپنا یہ اثر بھی زبان میں دیکھا

آپ کے حُسن کا جواب نہیں ہم نے سارے جہان میں دیکھا

اُس نے عرض وصال پر اے دل! کیا کہا تیری شان میں دیکھا؟

کعبہ و دیر پر نہیں موقوف اُس کو اپنے مکان میں دیکھا

ایک ٹکڑا مری کہانی کا عشق کی داستان میں دیکھا

بجلیاں کوندتی ہیں آہوں کی ساتویں آسمان میں دیکھا

دیدۂ شوق نے ترا جلوہ ہر جگہ ہر مکان میں دیکھا

اپنے دل کا نشان مرمٹ کر گم شدہ کاروان میں دیکھا

ہر طرح اُس نے آزما کے مجھے امتحان امتحان میں دیکھا

اُن کے ایفائے عہد کا پہلو نامہ بر کے بیان میں دیکھا

نہ ملا تجھ سا دوسرا نہ ملا ہم نے دونوں جہان میں دیکھا

مہر کا لطف دوستی کا لحاظ اپنے اک مہربان میں دیکھا

داغ کے بعد لطف شعر غزنہ

ہم نے تیری زبان میں دیکھا

روگ جی کا فراق ہے گویا سانس لینا بھی شاق ہے گویا

تم سے کب تھی وصال کی اُمید یہ بھی اک اتفاق ہے گویا

اُن سے مل کر بھی مل نہیں سکتے وصل میں بھی فراق ہے گویا

دشمنی تو ہے دشمنی اُن کی دوستی بھی نفاق ہے گویا

اس طرح سن رہے ہیں میرا حال — اُن کو بھی اشتیاق ہے گویا
دل لگانا ہے کھیل غیروں کو — جان دینا مذاق ہے گویا

آئیے جلد آئیے کہ عزیز
ہمہ تن اشتیاق ہے گویا

آپ کا اعتبار کرتا ہوں — اور بھی انتظار کرتا ہوں
حُسن کا اُن کے عشق کا اپنے — تذکرہ بار بار کرتا ہوں
چھیڑ کر اپنے درد کا قصہ — اُن کو بھی بے قرار کرتا ہوں
جان کر بھی جفا شعار انھیں — جان اپنی نثار کرتا ہوں
عشق کا راز تا نہ افشا ہو — گفت و گو پیچ دار کرتا ہوں
جانتا ہوں تمھارے وعدوں کو — اور پھر اعتبار کرتا ہوں
زور قسمت پہ چل نہیں سکتا — خامشی اختیار کرتا ہوں
کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی — کوششیں بار بار کرتا ہوں
وصل کی شام کا تو میں ہر روز — صبح سے انتظار کرتا ہوں
دیکھ کر۔ دیکھتا نہ ہو کوئی — آنکھ اُن سے دوچار کرتا ہوں
"کوئی امید بر نہیں آتی" — آرزوئیں ہزار کرتا ہوں
بہہ نکلتے ہیں بے شمار آنسو — جب خطائیں شمار کرتا ہوں

دیکھ کر اپنا حال آپ عزیز!
شکر پروردگار کرتا ہوں

عقل حیراں دل پریشاں کیا کریں — کیا کریں ملنے کا ساماں کیا کریں؟
ہائے ذکر زلف پیچاں۔ کیا کریں — اور بھی دل کو پریشاں۔ کیا کریں
ہم کدھر جائیں نکل کر اے جنوں! — پھاند کر دیوار زنداں کیا کریں
کر دیا وحشت نے سب کو بے نیاز — آستیں، دامن گریباں کیا کریں
چھیڑ کر گذری ہوئی باتوں کا ذکر — اُس پشیماں کو پشیماں کیا کریں
وہ تو آئے ہیں نہ آئیں گے کبھی — جھوٹے وعدے جھوٹے پیماں کیا کریں
آتے جاتے ہیں عدو۔ چوری چھپے — پاسباں، دربان، نگہباں کیا کریں

بڑھتے بڑھتے دل کی وحشت بڑھ گئی — تنگ ہو صحرا کا میداں کیا کریں
اُن کی شہرت میری رسوائی کے ساتھ — ہو گئی دست و گریباں۔ کیا کریں
جان کا دشمن ہی میری رشک غیر — جان ایسی تم پہ قرباں۔ کیا کریں
کیا دھرا ہے اس دلِ ویراں میں اب — کیا بلائیں اُن کو مہماں۔ کیا کریں

شاعری مہماں ہے کچھ دن کی عزیز
ہم مرتب اپنا دیواں۔ کیا کریں

میں کروں پیار واہ واہ یہ کیا — آپ بیزار واہ واہ یہ کیا
مفت لے لو گے نقد دل میرا — ایسے عیار واہ واہ یہ کیا
مجھ کو خط بھی نہ بھیجو اور بھیجو — غیر کو تار واہ واہ یہ کیا
قتل عشاق کھیل سمجھے ہو — رکھ دو تلوار واہ واہ یہ کیا
وصل کی شب بھی ہے وہی حجت — وہی تکرار، واہ واہ یہ کیا
دم تو لینے دو مرنے والوں کو — وار پر وار واہ واہ یہ کیا

آپ اور آپ کی زباں سے عزیز!
ایسے اشعار واہ واہ یہ کیا

آ چکے یار واہ کیا کہنا — حسب اقرار واہ کیا کہنا
مجھ سے بیزار واہ کیا کہنا — واہ سرکار! واہ کیا کہنا!
یوں تڑپتے رہیں ترے کشتے؟ — اے ستمگار! واہ کیا کہنا
عرض مطلب پہ گالیاں دیجے — اور دو چار واہ کیا کہنا
مجھ کو آسان امتحان وفا — تم کو دشوار واہ کیا کہنا
میرا دامن ہو دامن گل زار — چشم خوں بار واہ کیا کہنا
صبح امید ہو گئی کافور — اے شب تار! واہ کیا کہنا

یوں پریشاں رہے عزیز ترا
واہ اے یار! واہ کیا کہنا!

دل گیا۔ کس کا؟ ہمارا دل گیا — بے وفا تھا بے وفا سے مل گیا
دیکھ کر اُن کو پریشاں خواب میں — کھل گئیں آنکھیں، کلیجہ ہل گیا

سخت جانی نے مجھے تڑپا دیا — نیم بسمل چھوڑ کر قاتل گیا
میکشو! ساقی پہ اپنا زور کیا؟ — ہے بہت گر ایک قطرہ مل گیا
قیس کی آنکھوں میں کیا لیلیٰ نہ تھی؟ — کیوں یہ کہتا تھا کدھر محمل گیا؟
یہ ملا عرض مکرر پر جواب — "جو مقدر کا تھا ملنا۔ مل گیا"
وہ بھی ہیں بیتاب ہم بھی مضطرب — دل لگی کا یہ نتیجہ مل گیا
جو ہونے تھے ستم ہم پر ہوئے — جو نہ ملنا تھا وہ ہم کو مل گیا
آپ کی محفل ہو یا چوروں کا گھر — جس کو دیکھو کھینچتا ہے دل گیا!
مے رہا ہوں میں اصغر کو دعا — جست و جو جس کی تھی مجھ کو مل گیا

اُن کی آمد کی خبر سن کر عزیز
چین آیا۔ اضطراب دل گیا

وہ مجھ پہ وار نہ کرتا تو اور کیا کرتا — میں اس کو پیار نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟
پری سمجھ کے تری تیغ کو میں اے قاتل! — گلے کا ہار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
طریق عشق میں اپنے ہی مضطرب دل کو — صلاح کار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
انھیں تو کھیل تھا وعدہ مگر یہاں دن بھر — میں انتظار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
غرض یہ تھی کہ وہ الجھیں میں اپنی باتوں کو — جو پیچ دار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
تم اپنے حسن پہ بگڑو، مری خطا کیا ہے؟ — میں تم کو پیار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
سمجھ لیا تھا کہ جھوٹا ہے، اُن کا قول مگر — میں اعتبار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
بگڑتے ہیں تو وہ بگڑیں عدو کی محفل میں — میں آنکھ چار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
جواب خط کا کہاں تک میں منتظر رہتا؟ — دوبارہ تار نہ کرتا تو اور کیا کرتا

نہ آئے، تم تو۔ تمھاری شبیہ دل کش کو
عزیز پیار نہ کرتا تو اور کیا کرتا

ڈھونڈھتا پہلو کوئی آرام کا — کام تھا یہ بھی دل خود کام کا
مجھ کو چپ رہنے کی عادت ہو گئی — اُن کو لپکا پڑ گیا دشنام کا
آب حیواں ہو ہمارے واسطے — قطرہ قطرہ بادۂ گلفام کا
اُس نے مجھ کو قبر میں رکھ کر کہا — "یہ ٹھکانہ ہے بہت آرام کا"

رکھ دیا لے کر ہمارا رفتہ دل — کہہ دیا ہنس کر ترے کس کام کا؟
صدمۂ غم سے بدل جاتی ہے شکل — غیر ممکن ہے بدلنا نام کا
اُڑ کے جاتا ہے ہمارا نامہ بر — اس قدر ہے لالچی انعام کا
زہد ہو۔ زاہد ہو، یا میخوار ہو — چاہیئے سب کو خیال انجام کا

جس کو دنیا "موت" کہتی ہے عزیزؔ
دوسرا اک نام ہے آرام کا

وہ کہہ رہے ہیں تجھے ناصبور میں نے کیا — خطا بھی مجھ سے ہوئی یہ قصور میں نے کیا"
یہ اقتضائے محبت ہے شانِ حسن نہیں — پری بنایا تجھے میں نے حور میں نے کیا
بنائے ایک کے دو۔ دو کے چار، چار کے آٹھ — پٹک کے شیشۂ دل چور چور میں نے کیا
سوال وصل پہ روٹھو نہ اس قدر بگڑو — خدا کے واسطے بخشو۔ قصور میں نے کیا
اُڑا دی غیر کے مرنے کی جھوٹ موٹ خبر — اُنھیں بھی اپنی طرح ناصبور میں نے کیا
تمھارے نام سے حوران خلد جلتی ہیں — تمھارا نام بہت دور دور میں نے کیا
متاعِ دل پہ ہوا ناز تم کو یا مجھ کو — غرور تم نے کیا یا غرور میں نے کیا؟
ملے تو پوچھ لوں "ملنے سے کیوں ہوئی نفرت — کوئی خطا ہوئی کوئی قصور میں نے کیا"

نگاہِ شوق اشاروں میں کہہ رہی ہے عزیزؔ
تجھے خراب دل ناصبور میں نے کیا

حالتِ دل ملاحظہ کیجے! — عشق کامل ملاحظہ کیجے!
دعوئے مہر اور غیر پہ جوش — زعم باطل ملاحظہ کیجے!
اور کیا آپ کی تمنا ہے! — چیر کر دل ملاحظہ کیجے!
لوٹتا ہے یہ کس ادا کے ساتھ — رقص بسمل ملاحظہ کیجے!
بوسے، پھر وہ بھی عارض کے — جرأت دل ملاحظہ کیجے!
آپ ہوں میرے گھر خدا کی شان — جذبۂ دل ملاحظہ کیجے!
کون ہے دوست کون ہے دشمن؟ — رنگ محفل ملاحظہ کیجے!
آپ کے لب سے لب ملاتا ہے؟ — ساغرِ گل ملاحظہ کیجے!
دیکھنا ہو جو دل جلوں کا حال — شمعِ محفل ملاحظہ کیجے!

عشق کیا کیا کنوئیں جھکاتا ہے　　حضرتِ دل! ملاحظہ کیجے!
آدمی کیا فرشتے بھی ہیں اسیر　　چاہ بابل ملاحظہ کیجے!

لطف دے گا عزیز کا دیواں
اس کو کامل ملاحظہ کیجے!

تمام اجسام کی نہیں معلوم کیا مصلحت تھی کہ انسان کے بھرے بھرے جسم میں ایک چار انگل کا ٹکڑا لگا کے اس کو اُس کا مطمعِ لیل و نہار بنا رکھا ہے۔ حضرت دل بھی عجیب طرفہ معجون ہیں اگر یہ دم بھر کو خفا ہو جائیں تو دم خفا ہو جائے۔ کسی کے حق میں آبِ حیات ہیں تو کسی کے لئے جان کی گھات عاشقوں کی سراپا حیات اُن کے ہاتھ ہے۔ معشوق، دو حرفی دل کا ٹھنڈے دل سے قصہ سننے کے عادی نہیں بیچارے عشق کے مارے عاشق کو ہزار سوانگ بنانے پڑتے ہیں "دل ہے" والی غزل کو پڑھئے اور ایک قافیے کی پابندی کے ساتھ ہجومِ مضامین کو بھی ملحوظ خاطر رکھئے۔ اسکی نسبت خود نواب عزیز کا فیصلہ خوب ہے ؎

بہت ہی حسن سے موزوں ہوئے ہیں قافیے "دل" کے
عزیز اب یہ غزل تو آپ کی دیوان "بیدل" ہے

دل ہے

حسینوں کی محبت سے رہائی سخت مشکل ہے
اُدھر تلوار لے کر مستعد مقتل میں قاتل ہے

اگر ہمراہ مدفن میں یہی آنکھیں یہی دل ہے
اِدھر مارے خوشی کے جامے سے باہر مرا دل ہے

یہ حوروں کی صفت خالی نہیں مطلب ہے اے واعظ
کسی پر آج کل آیا ہوا حضرت کا بھی دل ہے

میں وہ گم کردہ دل ہوں گر کہیں شیشہ بھی پاتا ہوں
لگا لیتا ہوں سینہ سے سمجھ کر یہ میرا دل ہے

ذرا گردن جھکا کر دیکھ تو چشمِ حقیقت سے
یہ جامِ جم نہیں او بے خبر! آئینہ دل ہے

وہ کہتا ہے "محبت کر" یہ کہتی ہے "نہیں اچھا"
سنوں کس کی پریشاں عقل ہے حیرت زدہ دل ہے

کوئی جامِ شکستہ میکدے میں جب نظر آیا
تو میں نشہ میں یہ سمجھا مرا ٹوٹا ہوا دل ہے

کھٹکتا ہے شبِ فرقت نہیں راحت کسی کروٹ
الٰہی! کوئی کانٹا ہی مرے پہلو میں یا دل ہے؟

شکایت غیر سے کیا ہو شکایت ہو تو اس سے ہے
میرا دشمن میرا دل ہے میرا قاتل میرا دل ہے

کہاں وہ شغلِ میخواری، کہاں وہ صحبتیں اگلی
نہ وہ رنگِ طبیعت ہے نہ وہ چرچے نہ وہ دل ہے

تمہارے ہی ہیں گھر دونوں جہاں چاہو چلے آؤ
اِدھر آرائستہ آنکھیں، اُدھر آراستہ دل ہے

جو شیشۂ مئے کا خالی دیکھتا ہوں بزم ساقی میں
سمجھتا ہوں کسی مے کش کا یہ حسرت بھرا دل ہے

ترے خال سیہ اور عارض پر نور کی یہ سم کو
نئی تشبیہ سوجھی، یہ سویدا اور وہ دل ہے

یہاں کچھ بس نہیں چلتا۔ کروں گا حشر میں رسوا
کہوں گا رو برو سب کے یہی غارت گر دل ہے

ابھی میں پھینک دوں پہلو سے اسکو چیر کر پہلو
نہ ہو الفت اگر اس میں تو پھر کس کام کا دل ہے

چھپائے سے کہیں الفت بھی چھپتی ہے ادھر دیکھو
نگاہیں صاف کہتی ہیں کہیں آیا ہوا دل ہے

بہار آتے ہی دیکھو آپ سے پھر ہو گیا باہر
کہاں قابو ہے اب دل پر کہاں قابو میں اب دل ہے

بہت ہی حسن سے موزوں ہوئے ہیں قافیے دل کے
عزیزؔ اب یہ غزل تو آپ کی دیوان بدل ہے

ارمغان عزیز کے آخر میں رباعیات بھی لگی ہوئی ہیں اور ان میں بھی وہی روزمرہ اور زبان کا چٹخارہ ہے۔ حمد۔ تصویر۔ استقلال۔ فراق معشوق۔ ناامیدی۔ زار نالی۔ معاملات۔ رشک رندی کے مضامین کی منتخب رباعیاں پیش ہیں:۔

رباعیات

(۱)

کس سے کہوں کہ تو کہاں رہتا ہے
تخصیص غلط ہے کہ یہاں رہتا ہے

تیلی بن کر کبھی سویدا بن کر
آنکھوں میں عیاں۔ دل میں نہاں رہتا ہے

(۲)

بے مثل ہے بے عیب ہے ساری تصویر
خود پیارے ہو کیوں نہ ہو پیاری تصویر

تکتا ہوں میں ہاتھوں سے دبا کر سینہ
دل چھین نہ لے کہیں تمہاری تصویر

اغیار تماشے کے ہیں بے حد ہیں شریر
یوں تیرے جانے کی نکالی تدبیر

کیوں خط پہ لگایا ہے ٹکٹ سمجھا بھی؟
بہتر ہے کہیں تجھ سے یہ کہنہ تصویر

---(۳)---

ہو جائے گا بت وہ رام رفتہ رفتہ
نکلیں گے عزیزؔ کام رفتہ رفتہ

مایوس ابھی سے کیوں ہوئے جاتے ہو؟
ہوتے ہیں یہ انتظام رفتہ رفتہ

میری اُن کی بہم جدائی کب تک ۴ کب تک یہ مقدر کی برائی کب تک؟
تھک تھک گیا ہائے ہائے کرتے کرتے اے آہِ رسا! یہ نارسائی کب تک؟

ہم دل کو شبِ ہجر میں بہلاتے ہیں جس طرح سے بن پڑتی ہے سمجھاتے ہیں
دھوکے ہی دیا کرتے ہیں اس کو اکثر کہتے ہیں ٹھہریے وہ ابھی آتے ہیں

معلوم نہ تھا باتوں سے کیسا ہوگا مرمر کے تمام عمر جینا ہوگا
اس دردِ جدائی کا بُرا ہو یارب! گر یوں ہی رہے تو زہر پینا ہوگا

اے عمرِ رواں یہ بے قراری کب تک اے دیدۂ تر! یہ اشک باری کب تک؟
اُن کی تو یہی رہے گی "ہاں ہاں ہر دم" اے دل، اے دل! امیدواری کب تک؟

(۵)

اس بانیِ جور سے محبت توبہ! امید وصال عیش و عشرت توبہ!
یہ خبط ہے یہ خیالِ باطل ہے عزیز! دونوں ہاتھوں سے کیجیے حضرت توبہ!

کب اس نے بجھ ارمان نکالے میرے کب اس نے گلے میں ہاتھ ڈالے میرے
کہتا ہوں "گلے ملو تو اللہ رے ناز کہتے ہیں: "بڑے چاہنے والے میرے!"

(۶)

کیا بات ہے، آج کیوں ہو اتنا روتے؟ بے فائدہ جان کس لیے ہو کھوتے؟
یہ جھوٹ ہے بہتان ہے تہمت ہے غیر اوروں کو وہ چاہیں گے تمہارے ہوتے!

کہتے ہیں "تجھے اور ستائیں گے ابھی آٹھ آٹھ آنسو نہیں رلائیں گے ابھی
آسان نہیں ہے دل لگانا ہم سے یہ یاد رہے اور جلائیں گے ابھی"

(۷)

عیار ہو۔ ظالم ہو ستم آرا ہو بدعہد ہو بے مہر ہو بے پروا ہو
مجھ کو دیکھو کہ جب سے دیکھا ہے تمھیں آنکھیں پھوٹیں"۔ جو اور کو دیکھا ہو!

اک دن بھی ملا نہ وہ مہینے بھر میں — حیران ہوں۔ مضطر ہوں اسی چکر میں
جب جاتا ہوں درباں یہی کہتا ہے غریز — "پھر آئے گا۔ اب وہ نہیں ہیں گھر میں"!

وہ آفتیں جھیلیں ہیں محبت کر کے — اک عمر گزاری ہے یونہی مر مر کے
لیتا ہے اگر کوئی بھی معشوق کا نام — کہتا ہوں "ستمگر تو نہیں ہے؟" ڈر کے

پھر اُن سے بگڑ کے بن رہی ہے اب تو! — غیروں سے عزیز تن رہی ہے اب تو
ہم ہیں وہ ہیں مزے مزے کے شکوے — گہنری اس طرح چھن رہی اب تو!

(۸)

دل رنج و مصیبت میں گھلا جاتا ہے — پانی پانی لہو ہوا جاتا ہے۔
میں دور رہوں یہ ہے یہ تیرے ہمراہ — سایہ پہ بھی مجھ کو رشک آجاتا ہے

(۹)

پیاسا ہوں کہاں تک کہوں "ساقی ساقی"! — یہ صحبت سے ہے اتفاقی ساقی!
برسات کا موسم ہے گھٹا چھائی ہے — ساغر میں مرے ڈال دے باقی باقی!

نواب عزیز نے ایک واسوخت بھی لکھا ہے ایاغ شباب (۱۳۱۷ھ) اس کا تاریخی نام ہے یہ نام مہاراجہ سر بہین السلطنۃ بہادر شاد بالقابہ (صدر اعظم باب حکومت) کا مجوزہ ہے یہ واسوخت ممدوح ہی کے نام پر معنون بھی ہے۔ تاریخ گوئی میں پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار لکھنوی متوفی (۱۶ شوال ۱۳۱۹ھ) بھی نظر آتے ہیں، مطبع فخر نظامی حیدر آباد میں طبع ہوا ہے جس کو تیس سال کا عرصہ ہوتا ہے (۱۲۲) بند (۹۶۶) اشعار ہیں۔ واسوخت میں محبوب سے شکوہ شکایت کر کے اپنا سوز و گداز دکھایا جاتا ہے اور بے پروائی ظاہر کر کے لجاجت کی جاتی ہے اس کے لئے یہ ضرور نہیں کہ مسدس ہی کہا جائے بلکہ شاعر جس صنف نظم میں چاہے یہ مضمون ادا کر سکتا ہے اس کو "واسوز" بھی کہتے ہیں۔ واسوخت شاعر کا عشق نامہ ہوتا ہے اور یادگار شباب، شاعر کو اس میدان میں اپنے دل کی لگی بہت بے تکلف بنا دیتی ہے اس میں بہت سے شاعر بدنام ہیں "واسوخت امانت" کا نام تو بچہ بچہ جانتا ہے واسوخت میں

آغاز سے انجام تک حضرت عشق کی نیرنگیاں ہوتی ہیں، اس میں شاعر اول سے آخر تک واردات عشق کو بے تکلف بیان کر دیتا ہے اپنے جذبہ میں اس کو کسی کا خیال تک نہیں رہتا وہ ایسی ایسی باتیں بیان کر دیتا ہے کہ جلوت کو بھی خلوت سمجھتا ہے، گویا سارا عالم اس کا معشوق ہے کہ کسی کے ماتھے پر شکن تک نہ آئے گی!

ساقی نامے سے یہ واسوخت شروع ہوتا ہے:۔

ساقیا دیر نہ کر ساغر الفت بھر دے — مے وصلت سے مرا شیشۂ فرقت بھر دے
ساغر چشم دوئی میں مئے وحدت بھر دے — مختصر یہ کہ مرے دل میں محبت بھر دے

جس طرف دیکھوں اُسی حور کا جلوہ دیکھوں
ناریں بھی میں اُسی نور کا جلوہ دیکھوں

نشہ ایسا ہو کہ کثرت میں بھی وحدت دیکھوں — لاکھ آئینے ہوں تو ایک ہی صورت دیکھوں
خار و خس میں بھی اُسی گل کی ثباہت دیکھوں — کیف مستی میں بھی میں ہوش کی حالت دیکھوں

چشم بینا سے مری پردہ دوئی کا اُٹھ جائے
لوح خاطر سے مری نقش خودی کا اُٹھ جائے

پھر طبیعت کی روانی میں دکھاؤں ساقی! — پھر نئے سر سے جوانی میں دکھاؤں ساقی!
اپنی پھر سحر بیانی میں دکھاؤں ساقی! — شان الفاظ و معانی میں دکھاؤں ساقی!

رنگ جم جائے مضامیں کے گل ایسے پھولیں
بلبلیں فصل بہاری کے ترانے بھولیں

(ابتدا)

پیش ازیں عاشق شیدا نہ کسی کا میں تھا — جیسا اب ہوں نہ کبھی محو تماشا میں تھا
کو بکو خاک بسر پہلے نہ ایسا میں تھا — باہر آپے سے نہ تھا ہوش میں رہتا میں تھا

کر دیا بے خودیٔ شوق نے برباد مجھے
آج کی بات نہیں رہتی ہے کل یاد مجھے

آفت عشق سے پہلے میں خبردار نہ تھا — نرگسی چشم کا بیمار دل زار نہ تھا
لذت درد سے آگاہ میں زنہار نہ تھا — آہ و فریاد سے کچھ مجھ کو سروکار نہ تھا

اب یہ حالت ہے کہ لب خشک ہیں رنگت فق ہے

تیر کاری وہ لگا ہے کہ کلیجہ شق ہے

باغ

دیکھئے دیکھئے گھر بیٹھے یہ شامت آئی — مایۂ عیش کے لٹ جانے کی نوبت آئی
سچ تو یہ ہے کہ مرے حق میں قیامت آئی — دفعتاً سیر گلستاں پہ طبیعت آئی

حیف مانی ہی نہیں دل نے کوئی بات مری
مفت برباد ہوئی عشق میں اوقات مری

باغ محبوب میں لے جا کے مجھے چھوڑ دیا — شام کے چار بجے تھے کہ وہاں جا پہنچا
قدرت حق کا نیا میں نے تماشا دیکھا — گہ اُدھر گاہ ادھر چار طرف خوب پھرا

کچھ عجب رنگ کے اس باغ میں گل بوٹے تھے
پھول مرجھائے تھے اس کے نہ ثمر ٹوٹے تھے

غنچے پھولوں کے نمایاں دُرِ دنداں کی طرح — سرو استادہ روش پر قدِ جاناں کی طرح
روشنی تھی زرِ گل میں رُخِ تاباں کی طرح — بکھری سنبل تھی کہیں زلف پریشاں کی طرح

قابل دید تھی جادو نگری نرگس کی
ایک کی دو کی ہو تعریف کروں کس کس کی

چہچہے کرتے تھے ہر شاخ پہ مستی سے طیور — ہلکی ہلکی سی وہ دھوپ آنکھ ہو جس سے پُرنور
مالنیں پھرتی تھیں بن ٹھن کے نہایت مسرور — باغبان ازلی کی وہ عنایت کا ظہور

قمریوں کا وہ سرِ سرو پہ خوش خوش رہنا
بلبل و گل کی محبت کا تو پھر کیا کہنا

گردانِ عشق

عشق وہ صرف ہے صرفی کو ہے سرگردانی — عشق وہ نحو ہے نحوی کو بھی ہے حیرانی
بھرتے ہیں ہیئتی اور ہندسی اس جا پانی — منطقی کی نہیں تقریر یہاں طولانی

عشق سے عاشق و معشوق اگر مشتق ہے۔[۵]

۵ یہ ٹیپ حضرت امیر مینائی رح کی ہے ۱۲

اس کو کیوں مشق جفا ہو اُس کا جگر کیوں تشنہ ہے؟

وحشت مصر کو زنداں میں پھنسایا اُس نے — قیس کو نجد میں آوارہ پھرایا اس نے
کوہ آفت سر فرہاد پہ ڈھایا اس نے — الغرض کیا کہوں کس کس کو ستایا اس نے

خون گردن پہ ہی سب کا لیا کرتا ہے
بے سبب موت کو بدنام کیا کرتا ہے

حضرت دل

سُن کے تقریر یہ سب دل نے کہا آہستا — آپ نے عشق کے بارے میں بہت خوب کہا
روبرو آپ کے کچھ کہنا سراسر ہے خطا — پر ذرا غور سے اس بات کو سنیے قبلا

عشق جس دل میں نہیں دل نہیں ویرانہ ہے
کسی میخانہ کا ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے

کور وہ آنکھ ہے جس آنکھ میں اس کا نہیں نور — خاک اُس دل پہ کہ جس دل پہ نہیں اس کا ظہور
قبلۂ من! ہو جسے آدمی بننا منظور — حضرت عشق سے ہے رسم ملاقات ضرور

آدمی بحر محبت میں اگر غرق نہیں
پھر تو انسان میں حیوان میں کچھ فرق نہیں

نام ور اس کی بدولت ہوے کیسے کیسے — رونق بزم محبت ہوے کیسے کیسے
صاحب شوکت و عظمت ہوے کیسے کیسے — اس سے اعجاز و کرامت ہوے کیسے کیسے

دی زلیخا کو نئے سر سے جوانی کس نے؟
اور کی قیس کی مشہور کہانی کس نے؟

پہلا آمنا سامنا

الغرض دل نے ابھی ختم نہ کی تھی تقریر — آ گئی سامنے اک چاہتی پیاری تصویر
باغ میں ایک روش پر تھا کھڑا وہ بے پیر — رُخ تاباں میں تھی خورشید سے بڑھ کر تنویر

بال بکھرے تھے چمکتے ہوے رخساروں پر

ہلکی ہلکی سی گھٹا چھائی ہوئی تاروں پر

. . . . . .

سر جھکا لیتے تھے کچھ بات جو فرماتے تھے
رُخ سے آنچل کو کسی دم نہیں سرکاتے تھے
اوڑھے لپٹے ہوئے گلشن کی ہوا کھاتے تھے
آنکھ نرگس سے لڑاتے ہوئے شرماتے تھے

دور ہی سے جو مجھے آنکھ چرا کر دیکھا
کچھ عجب ناز سے آنچل کو ہٹا کر دیکھا

چار ہوتے ہی نظر دل ہوا بے تاب مرا
نار سا ہونے لگی دیکھتے ہی عقل رسا
ہوش کے ہوش اُڑے دیکھ کے اس کا چہرا
بے خودی میں یہی مطلع مرے منہ سے نکلا

آنکھ اک شمع تجلی سے لڑا بیٹھے ہم
دل کو پروانہ کی مانند جلا بیٹھے ہم

. . . . . .

سراپا

دو ورق روئے کتابی کے تھے دو نو خسار
شکل تشدید نظر آتی تھی مژگاں کی قطار
مثل غنچہ کے خمیدہ تھے وہ گیسو خم دار
الغرض دید کے قابل تھی جوانی کی بہار

کچھ نہ بن آئی مجھے دیکھ کے اس کا چہرا
دور سے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر پھونکا

. . . . . .

تو ہی اے روشنی طبع ذرا کر انصاف
کب ہیں آئینۂ خورشید میں ایسے اوصاف
حیرت انگیز خط سبز ہے رُخ کے اطراف
کہ یہ ہے جوہر آئینۂ روئے شفاف

خط ہے یا کاتبِ قدرت نے یہ لکھدی ہے سند
ہم نے بخشا تجھے بخشا تجھے حُسنِ بے حد

. . . . . .

ہاتھ وہ ہاتھ جو دل لینے کو بڑھتا ہے مدام
ہاتھ وہ ہاتھ جو ہٹتا نہیں بے سیل مرام
ہاتھ وہ ہاتھ ہی اٹھتا نہیں جو بہر سلام
ہتکھنڈے ایسے کہ حاصل ہے جنھیں شہرت عام

اس صفائی سے چرا لیتے ہیں دل اور جگر

ایک کی ایک کو ہونے نہیں پاتی ہے خبر

. . . . . .

رجوع

سیر کرتے ہوئے پھرتے تھے اِدھر اور اُدھر — ہر روش پر وہ چلے جاتے تھے بے خوف و خطر
محوِ دیدار پہ اپنے جو پڑی اُن کی نظر — سر سے آنچل کو ذرا اور بڑھایا رُخ پر
راہ کترا کے روش سے وہ چمن میں آئے
دیکھ کر شکل مری دور ہی سے گھبرائے

. . . . . .

اس نزاکت پہ میں قربان مری جان فدا — دو قدم تیز چلا - چار قدم آہستہ
چلتے چلتے جو لبِ نہر گیا ماہ لقا — اپنا پرتو نظر آیا تو یہ شوخی سے کہا
"مجھ کو دھوکا ہے یہ چشمہ چہ کنعاں تو نہیں؟
حضرتِ یوسف مصری کا یہ زنداں تو نہیں؟"

جب کہ وہ پردہ نشیں ہو گیا کشتی میں سوار — سات ہی دل بھی روانہ ہوا سوئے دل دار
غش پہ غش آنے لگے چلدئے سب صبر و قرار — تھا زباں پر مری یہ مطلع مومن ہر بار
"وہ چلا جان چلی دو تو یہاں سے کھسکے
اُس کو روکوں کہ اسے پانو پڑوں کس کس کے"

دست و پا بھول گئے عقل ہوی دم میں ہوا — ہوش برجا نہ رہے عشق کا بیٹھا سکا
گرمیِ ہجر سے گھل گھل کے جگر آب ہوا — آتشِ حسن کے شعلہ سے جلا دل کیا کیا
ہاتھ دامن سے چلے جیب و گریباں کی طرف
پانو وحشت کے لگے بڑھنے بیاباں کی طرف

. . . . . .

قامتِ یار نے سولی پہ چڑھایا مجھ کو — چشمِ میگوں کے تصور نے رُلایا مجھ کو
الغرض یاد نے اُس بت کی ستایا مجھ کو — چین شب بھر کسی کروٹ نہیں آیا مجھ کو
کبھی لیٹا کبھی بیٹھا کبھی ٹہلا ہے ہے
دل مضطر کسی پہلو نہیں بہلا ہے ہے

مدتوں وقفِ فراقِ رخِ دل دار رہا — تختۂ مشقِ غم و آلام و صد آزار رہا
بے خطا جور و جفا کا میں سزاوار رہا — اک نئی روز مصیبت میں گرفتار رہا
گاہ زلفوں کے تصور میں پریشانی تھی
گاہ یادِ رخِ پُر نور میں حیرانی تھی

کششِ عشق

دوست تھے ایک جو تصویر کے فن میں اُستاد — غیرتِ مانی انھیں کہیئے کہ رشکِ بہزاد
تھا میں بے خود مگر اتنا تو مجھے خوب ہے یاد — لائیں تصویریں حسینوں کی جو تھیں حد سے زیاد
دل اُڑا لینے میں استاد ہر اک تھی تصویر
غیرتِ حور پری زاد ہر اک تھی تصویر

ایک سے ایک تھی تصویر نہایت بہتر — کوئی خورشید کوئی حسن میں مانندِ قمر
وقتِ نظارۂ تحیر نے دکھایا یہ اثر — دیکھنے والوں کو کچھ بھی نہ رہی اپنی خبر
محو تھے مردمِ دیدہ بھی وہ تصویریں تھیں
پا نوبیں پیکرِ تصور کے بھی زنجیریں تھیں

خوبیٔ بخت نے ناگاہ دکھائی تاثیر — چمکی تقدیر تو آنکھیں بھی ہوئیں پُر تنویر
انھیں تصویروں میں اُن کی نظر آئی تصویر — جن کی تصویر خیالی تھی مرے دامن گیر
للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
از پسِ پردۂ تصویر کنوں جلوہ نماست

وہ مرے چہرے کی رنگت وہ خوشی وہ فرحت — وہ مرا چیخ کے کہنا کہ زہے خوش قسمت
وہ پتا پوچھنا میرا وہ ہجومِ حسرت — وہ مرے دوست کا انکار وہ میری منت
نوبت آنے کو تھی ہر بار خوشی میں غم کی
آ گئی کام جو دی مرنے کی اپنے دھمکی

جب گوارا نہ ہوا دوست کو مرنا میرا — جیتے جی گلشنِ جنت میں مجھے پہنچایا
یعنے اس صاحبِ تصویر کا گھر بتلایا — دور سے گھر کو جو دیکھا تو یہ حسرت سے کہا
جس جگہ کھینچنے ہم آئے تھے یارب تصویر

کھینچ کر لائی ہے خود ہم کو وہاں اب تصویر

. . . . . .

اثرِ عشق

سچ تو ہے او اثرِ عشق! ترے ہیں قرباں
تو اگر چاہے تو یوں ہوتی ہے مشکل آساں

وہ لے آتے ہیں پرستار طلب کا فرماں
اس طلب گاری پہ کیوں کر نہ ہو صدقے مری جاں

کچھ سنا آپ نے؟ کیا بھیجا ہے پیغام مجھے
"تو نہ آئے گا تو آئے گا نہ آرام مجھے"

یہ تو ممکن ہی نہ تھا یوں انھیں مضطر رکھتا
اُڑ کے جاتا میں سرِ بام اگر پَر رکھتا

پھر اٹھاتا نہ کبھی پا نہ پہ جب سر رکھتا
لے کے آتا میں انھیں گھر میں اگر گھر رکھتا

دل پہ مجبوری سے ہر چند کہ صد پہ پہنچا
حسبِ فرمانِ حضوری میں مگر جا پہنچا

جب مقابل ہوئے ہم دونو لڑی جب کہ نگاہ
بولے کچھ خیر ہے؟ "کیوں آپ کا ہے حال تباہ"

ہائے کیوں دل پہ ہی اور لب پہ ہی کیوں نالہ و آہ
مجھ سے دیکھی نہیں جاتی ہے یہ حالت واللہ

آپ بھی میری طرح والہ و شیدا تو نہیں
ہیں مروں آپ پہ آپ اور پہ ایسا تو نہیں؟"

ہائے اللہ ہو عاشق سے جب اس طرح خطاب
غیر ممکن ہے کہ آئے دلِ بیتاب کو تاب

حال جب یہ ہو تو پھر کون کرے خوفِ عتاب
اُن کی باتوں کا نہ تھا اس کے سوا کوئی جواب

اُٹھا اور اٹھ کے تصدق ہوا منھ چوم لیا
وہ اشاروں ہی میں کہتے رہے ہاں ہاں کیا

اُن کا وہ عشق کا اظہار وہ حسرت میری
اُن کی وہ چھیڑ وہ بے تاب طبیعت میری

اُن کی وہ طرزِ سخن اور وہ جرأت میری
اُن کے وہ لطف و کرم اور وہ عجلت میری

دیکھ کر سارے پرستار پریشان رہے
منھ سے کچھ کہہ نہ سکے جان کے انجان رہے

. . . . . .

. . . . . .

. . . . . .

"ایسے کیوں مست ہو شامت نے ہی گھیرا تم کو
سوجھتا ہے نہ اُجالا نہ اندھیرا تم کو"

. . . . . .

ہنگامۂ وصل

اب کہاں صبر کہاں تاب کہاں دل کو قرار — دل میں لاکھوں ہیں تمنائیں امیدیں ہیں ہزار
اب بھی کیا اُن کی جوانی کی نہ لوٹوں میں بہار — کیا میں چھیڑوں گا تو اب بھی وہ کریں گے انکار
اُس سے کیوں پوچھوں کہ اب قصد تمہارا کیا ہے
ہو چکا پہلے ہی ارشاد دوبارہ کیا ہے؟

. . . . . .

سچ تو یہ ہے کہ نہ تھے رسم جہاں سے واقف — نہ نہیں سے ابھی واقف تھے نہ ہاں سے واقف
عمر ہی کیا تھی ابھی ہوتے کہاں سے واقف — اب انھیں کرتے ہیں ہم رازِ نہاں سے واقف
وہ سمجھتے تھے گلے مل کے لپٹنے کو وصال
کچھ خبر ہی نہ تھی کیا وصل کی شب کا ہے وبال

. . . . . .

. . . . . .

"ہائے چھوڑو بھی یہ کیا ظلم ہے ہم مرتے ہیں
کہیں معشوق پہ ایسا بھی ستم کرتے ہیں؟"

. . . . . .

ہائے اللہ اگر ہے یہی انجام وصال — مرتے دم تک بھی نہ لیں گے کبھی ہم نام وصال
کم کبھی صبح قیامت سے نہیں شام وصال — سچ تو یہ ہے وہی اچھے جو نہیں کام وصال
ہم کبھی وصل کے مضمون سے آگاہ نہ تھے
ایسے صدموں سے خبردار تو واللہ نہ تھے

. . . . . .

ہائے سوسن کی زباں لال نہیں تھی یارب — کہہ تو دیتا تھا مصیبت کی ہے شب وصل کی شب
عمر میں مجھ سے بڑی جانتی ہوگی یہ سب — اُس نے کچھ بھی تو زباں سے نہ کہا ہائے غضب

اُس کا کس وقت کہا ہم نے نہیں مانا تھا
دوست جانا اُسے دشمن تو نہیں جانا تھا

دیدے پھوٹیں کہیں اللہ کرے نرگس کے — رنگ اس نے بھی تو دیکھے تھے مری مجلس کے
تھی خبر دار مزے سے رطب و یابس کے — کہہ تو دینا تھا پڑے آپ ہیں پالے کس کے

رات دن کھیلتی تھی آنکھ مچولی مجھ سے
رہی اس رات پہ چپ کچھ بھی نہ بولی مجھ سے

جی میں آتا ہے کہ سنبل کو میں کوڑے ماروں — صدمے دینے ہیں کروں سعی نہ ہمت ہاروں
ایڑی چوٹی پہ لسے اپنی میں ہر دم واروں — کہہ کے قحبہ اسے کس طرح نہ میں للکاروں

کہہ تو دینا تھا اگر وصل کا ساماں ہوگا
تار تار آپ کا بے وجہ گریباں ہوگا

بکپیو شاد نے قد کیا ہی نکالا ہے بلند — یوں ہی چپ چاپ یہ استادہ رہے گی تا چند
اادب اس کا کھڑے رہنا نہیں مجھ کو پسند — یہ تو کہنا تھا کہ ہے وصل کا انجام گزند

دل میں آتا ہے کہ سولی پہ چڑھا دوں اس کو
ماما حوا کی سی ہے گالیاں کیا دوں اس کو"

. . . . . .

یہ تو فرمایئے گا میں نے خطا کونسی کی — بس یہی نا کہ ہوی وصل کی شب گستاخی
جب زمانہ کی یہی رسم ہو دستور یہی — آپ ہی کہیے کہ پھر اور کرے کیا کوئی

رسم عالم کی یہ ہے - یہ کوئی تقصیر نہیں
کچھ خطا اس میں مری اے بت بے پیر نہیں

کیا دلاتے ہو یقیں اپنی نزاکت کا مجھے — نازنیں تم ہو تو شکوہ ہے نقاہت کا مجھے
تم کو دعوی ہے شرافت کا نجابت کا مجھے — تم تو نگر ہو اگر نشہ ہے دولت کا مجھے

مجھ سا عاشق نہ ملے گا تمھیں دنیا بھر میں
تم سے کچھ کم نہیں میں منصب و مال و زر میں

عذر بے جا کی عوض لاو بجا شکر خدا — تم کو قسمت سے ملا چاہنے والا مجھ سا
مال و منصب میں شرافت میں برابر والا — اس پہ طرہ یہ ہے رکھتا ہوں معزز عہدا

اجی سررشتۂ انعام کا افسر میں ہوں
تم نہیں جانتے کیا؟ ڈپٹی کمشنر میں ہوں

ہیں وہ ہوں میرے ہیں مخدوم وزیر افواج[1] وہ نہ سُن پائیں کہ مرنے پہ ہوں آمادہ میں آج
سُن کے یہ قصۂ غم اُن کا نہ برہم ہو مزاج تم سے اس برہمنی طبع کا ہوگا نہ علاج

پھر تمہارا نہ یہ رتبہ ہی رہے گا نہ یہ اوج
گھر کے اطراف میں دیکھو گے فقط فوج ہی فوج

آنے پائے نہ کوئی آپ کے گھر میرے سوا ڈالنے پائے نہ عارض پہ نظر میرے سوا
اس جگہ ہو نہ فرشتے کا گزر میرے سوا اس طرف دیکھ تو لے کوئی بشر میرے سوا؟

کھائی ہے تم نے قسم اس کو نبھا ہو تو سہی
تم بھلا میرے سوا اور کو چاہو تو سہی

میری اس دھمکی نے واللہ بڑا کام کیا نہ رہے اس بتِ کمسن کے ذرا ہوش بجا
ڈر گئے کانپ گئے تھا یہ تقاضا سن کا کچھ افاقہ جو ہوا مل کے گلے فرمایا

"ظلم ہم پر نہ گوارا کر و پیارے ہو کر
ہم تمہارے ہیں رہو تم بھی ہمارے ہو کر"

آ گئے راہ پہ وہ کیوں نہ کروں شکر و سپاس اب تو دل ہو نہ پریشاں نہ طبیعت ہو اداس
نہ تردد ہے کوئی اور نہ کوئی وسواس نہ کسی کا ہمیں کھٹکا نہ کسی سے ہے ہراس

دن کی ہے قید نہ کچھ رات کی پابندی ہے
وصل ہی وصل ہے ہر وقت یہ خرسندی ہے

شکر ہے شکر کہ بر آ گیا ارمانِ عزیز بھر گیا پھر گلِ مقصود سے دامانِ عزیز
ہے عزیز اُن پہ فدا وہ بھی ہیں قربانِ عزیز ایسے معشوق پہ صدقے نہ ہو کیوں جانِ عزیز

وصل کے لطف اُٹھاتا ہوں کرم سے اُن کے
گھر ہے آباد مرا۔ یُمن قدم سے اُن کے

داسوخت کے ساتھ حضرت غفراں مکاں آصف کی ایک مشہور غزل پر خمسہ بھی ہے جس کا مطلع ہے

سوال وصل پہ نیچی نظر تھی کیا اُن کی ہماری آنکھ میں پھرتی ہے وہ حیا اُن کی

---

[1] مہاراجہ بہادر کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت وزیر افواج تھے۔

اس غزل پر تقریباً ہند و دکن کے شعرائے مشاہیر نے خمسے کئے تھے جن کا سلسلہ گلدستۂ "محبوب الکلام" میں ایک عرصہ تک چلتا رہا۔ بعض شعرائے مقامی کو خود بارگاہ شاہی میں حاضر آکر سنانے کی بھی عزت حاصل ہوی۔ ساری غزل میں ان دو شعروں پر مصرعے پہنچانے میں بڑا زور دکھایا جاتا تھا۔

یہ اُن کا قول ہے میری بلا ملے تجھ سے — بلائیں اُس کی بھی لوں گر ملے بلا اُن کی
ملے تھے آج تو ہم بھی جناب آصف سے — عجیب رنگ میں ہیں پوچھتے ہو کیا اُن کی

نواب غریز نے مقطع پر جو مصرعے پہنچائے ہیں وہ سُن لیجے ؎

غریز اور مصاحب تھے ہاتھ باندھے کھڑے — جب اُن کے آگے پڑھے شاعروں نے یہ خمسے
سخن کی داد وہ دیتے تھے لے رہے تھے مزے — "ملے تھے آج تو ہم بھی جناب آصف سے
عجیب رنگ میں ہیں پوچھتے ہو کیا اُن کی"

ارمغان غریز کے چھپنے کے بعد سے جو کچھ کہا ہے اُس پر نواب غریز نے تاریخ تصنیف بھی لکھ دی ہے یہ بہت اچھا کیا ہے۔ زمانی اعتبار سے شاعر کی طبیعت کے نشیب و فراز کا پتا چل جاتا ہے اگر اسی اصول پر ارمغان غریز کا دوسرا ایڈیشن نکلے تو اصول متقابلی میں بڑی آسانی پیدا ہو جائے گی۔ ارمغان غریز کے دوسرے ایڈیشن کے متعلق تو ہماری رائے یہ ہے لیکن نواب غریز کا خیال ہے کہ ؎

چھپنا دشوار ہے پھر رازِ محبت کا غریزا — چھپ کے مطبع سے اگر آپ کا دیواں نکلا
شاعری مہماں ہے کچھ دن کی غریز — ہم مرتب اپنا دیواں کیا کریں؟

نواب غریز کی شاعری کے مختلف نمونے انتخاب کرکے دیدیے گئے ہیں جن سے آپ کی شاعری کی نسبت عام رائے تو قائم کرلی جاسکتی ہے۔ پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ؎

لطف دے گا غریز کا دیواں — اس کو کامل ملاحظہ کیجے!

اور اس تنگ نائے میں اتنی وسعت کہاں کہ ارمغان غریز کو سامنے رکھ دوں ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے — سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

نواب غریز کے کلام میں پختگی اور کہنہ مشقی کے علاوہ قدیم رنگ کے ساتھ ساتھ جدت مذاق کی ترکیب زیادہ نمایاں ہے ؎

مضمون نئے، مذاق نیا، بندشیں نئی — رونق ہوی غریز سے طرز جدید کی

اس کے ساتھ ہی زمانے کے مذاق کو دیکھ کر کہتے ہیں ؎

بدلا ہوا ہے ذوق سخن آج کل عزیز! غزلیں نئی نئی ہیں! سخنداں نئے نئے!

شاعری کا مذاق تھا پہلے شاعری اب مذاق ہے گویا

ایک جگہ تو اپنے رنگ شاعری کے متعلق دیکھیے کس قدر سچ کہا ہے ؎

ہی طبیعت میں جو آزادہ روی اپنی عزیز! اک زمانے سے الگ ہے مرے اشعار کا رنگ

دیوان کا دیوان پڑھ جائیے کہیں بھی آپ کو ثقیل، غریب، مغلق الفاظ اور زمانوں کی ترکیبیں نظر نہیں آئیں گی۔ دیوان میں شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ اور بیان کی جدت ادا ہی ادا ہے۔ کلام عزیز نے زبان اور سلاست و فصاحت اور اسلوب بیان کے لحاظ سے ایک خاص رنگ اختیار کر لیا ہے اور یہی نواب عزیز کی خصوصیت شعری کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے

عکس تحریر نواب عزیز یا جنگ بہادر عزیز

عزیز میرٹھ

جناب من

مجکو افسوس ہے کہ آپ کا بیلد خط مجکو
نہیں ملا۔
آپ نے اپنے جس کام کا ارادہ کیا ہے
اسکی کتاب بیتے فن شاعری کی، دلازہ
ہو جائی۔
آپ کسی بھی جمعہ کو صبح کے وقت سے دیر
تک تشریف فرما ہو سکتے ہیں میں آپ کی
ملنے کا بیحد مسرت کے ساتھ منتظر
رہونگا والسلام

خاکسار
عزیز جنگ

۱۸ دسمبر ۱۳۳۷ھ

گلستاں و بوستاں کا موازنہ

(مترجمہ جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین حیدرآبادی)

فارسی کے مشہور علمی رسالہ "ایران شہر" میں گلستان و بوستان سعدی رح پر یہ دلچسپ موازنہ میرزا حسن خاں بدیع نامی ایک فاضل ایرانی کے قلم سے شائع ہوا۔ فارسی کی ان دو مشہور ترین کتابوں کا بالمقابل مطالعہ ادبی نقطۂ نظر سے ایک پرلطف چیز ہے مولوی محمد محسن خاں صاحب نے اس مفید مضمون کے ترجمہ سے اردو دانوں کے آگے ایک عمدہ چیز پیش کی ہے امید ہے کہ ارباب ذوق اس کو لطف اندوز ہونگے "مدیر مکتبہ"

وہی شخص کچھ گلستاں اور بوستاں کی خوبیوں سے لطف اٹھا سکتا ہے جو فارسی جیسی شیریں زبان میں گفتگو کا ملکہ رکھتا ہے۔ یہ دونوں ادبی شاہکار اُن دو چمکدار تاروں اور اُن انمول موتیوں کی مانند ہیں جن سے ہماری ادبیات کی افق جگمگا رہی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ہمارے مقدس شاعر "شیخ سعدی" کی متوالی طبیعت کی بھٹی کی کھچی ہوئی شراب کے دو چھلکتے ہوئے ساغر ہیں۔

یہی وہ دو بہترین "باقیات الصالحات" ہیں جو سعدانی کے فن اور مضامین و معانی کی جدت طرازی میں ہمارے "نابغہ"[1] کی قادرالکلامی، دقیق الخیالی اور عمیق الفکری کا ثبوت دیتی ہیں آج ہم اپنی جس قدر بڑائی کریں اور اپنا جس قدر بھی فخر جتائیں کم ہے ہمارا یہ دعوا، بالکل بجا ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ اس ایرانی عنصر کے پردے میں ایسے ایسے نوابغ (بلند پایہ شاعر) وجود میں آئے ہیں کہ جن کی افکار کے نتائج کو۔ مشرق اور مغرب کے مبصرین آج حیرت اور استحسان کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور دنیا کی اکثر و بیشتر زندہ و ہمہ گیر زبانوں میں اُن کے ترجمے بھی ہو گئے ہیں۔

گلستاں اور بوستاں کے موضوع پر اظہار خیالات کرنے کا مقصود اصلی، فکاہت اور تفنن ہے جس کو ہم ایک مناظرہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں یا اس مناظرہ سے ہمارا مقصد ایک شئے کی ستائش اور دوسری چیز کی مذمت کرنا، نہیں ہے اور نہ ہمارا یہ مطمح نظر ہے کہ یہ دونو ادبی شاہکار ایک لالہ و

[1] نابغہ عرب کے مشہور شاعر و خطیب کا نام ہے جو نعمان بن منذر کا مداح تھا لیکن اس سے مراد یہاں شیخ سعدی ہیں ۱۲

گل سے سجی ہوئی اور دوسری نسرین و سنبل سے آراستہ گلستاں و بوستاں ہیں اور یہ دونوں کے دونو، اپنی دل کشی و دل ربائی کی وجہ سے دنیا کے فاضلوں اور ادیبوں کے مرغوب طبع ہیں، بلکہ ہماری غرض یہ ہے کہ ان دونو "جواہر پاروں" کو پرکھیں، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں اور ہمارے شاعر کی حکم و بلند پایگی کو ظاہر کریں۔ چونکہ اس ناچیز نے گلستاں کو بوستاں پر ترجیح دی ہے؛ اس لئے محترم ادیبوں سے یہ میری تمنا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو اس کام کا اہل اور ادبی دنگل کا پہلوان سمجھتا ہے وہ اپنی طبیعت کو لڑا کر بوستاں کے ادبی فضایل اور اس کی ترجیح کی وجوہ کے بارے میں ایک مدلل مضمون تحریر کرے۔

کوئی صاحب ذوق اس امر کا انکار نہیں کر سکتا کہ دنیائے ادبیات میں گلستاں اور بوستاں دونوں کے دونو اعلیٰ رتبگی میں ایک ممتاز خصوصیت رکھتے ہیں، لیکن گلستاں بہت بڑا ادبی تفوق رکھتی ہے اور بوستاں باوجود ان تمام خوبیوں کے اس کی لطافت و ظرافت کو نہیں پہنچ سکتی ہم بوستان کی قدر و قیمت سے بغیر کسی چیز کو گھٹائے دلایل کے ذریعہ اس مدعا کو ثابت کرنے والے ہیں:۔ اس سبب سے کہ ہر پھول ایک خاص قسم کی بو رکھتا ہے اور ہر حال ایک خاص قسم کی کشش گلستاں دو چیزوں کی حامل ہے۔ ایک اس کی نثر ہے جو قطب شمالی کے فرقد اور برج اسد کے ثریا نامی تاروں کی مانند بکھری ہوئی ہے۔ دوسری اس کی نظم ہے جو موتیوں کی لڑی کی مانند ایک دوسرے پر چنی ہوئی ہے، لیکن بوستاں میں فقط منظوم شعر ہی شعر ہیں جو بڑی محنت سے بالکل الگ ہیں، اسی نقطہ کے لحاظ سے گلستاں کمالیت کے درجہ میں اس سے بڑھ گئی ہے۔ گلستاں میں چونکہ اکثر حصہ نثر کا ہے اور وہ فصاحت و بلاغت کی وجہ سے بوستاں پر فوقیت رکھتی ہے اس لئے کہ عبارت آرائی شعر گوئی سے بہت آسان ہے درکلام منثور چونکہ وزن اور قافیہ کی پابندیوں سے آزاد ہے، اس باعث سے وہ خیالات کے اظہار اور مطالب کی ادائی کے لئے کلام منظوم سے زیادہ تر مفید ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ گلستاں اپنے موضوع پر ایک بالکل اچھوتی چیز ہے، اب تک اساتذہ سخن میں سے کسی نے اس قسم کی کتاب[1] تصنیف نہیں کی ہے، لیکن بوستاں جیسی کتابیں بیسیوں شعرا نے لکھی ہیں، انتہا یہ کہ بوستاں ان سب سے بہتر ہے لیکن اس کو گلستاں کی مانند اولیت کا تفوق حاصل نہ ہو سکا۔

[1] بہارستان اور خارستان کو جو گلستان کے جواب میں لکھی گئی ہیں غالباً ان کو ہمارے فاضل مقالہ نگار نے نظر انداز کر دیا ہے۔

بوستاں کے اشعار چونکہ تمام کے تمام بحر تقارب میں ہیں اس لئے خواہ وہ کتنے بھی لطیف و آبدار ہوں لیکن اُن کے پڑھنے سے انسان کی طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ جس طرح سے کہ ایک قسم کی غذا خواہ وہ کتنی ہی پسند خاطر اور ذائقہ دار ہو، جوں ہی انسان اس میں سے چند بار کھا لیتا ہے بار بار اُس کی جانب رغبت نہیں کرتا۔ منہ کا مزا بدلنے کے لئے دوسری غذا کی خواہش کرتا ہے۔ شعر بھی ایک روحی غذا ہے اگر وہ مختلف طرزوں اور مختلف اوزان میں ہوگا تو طبیعت کو بہت پسند آئیگا یہ تنوع و برتری بوستاں سے مفقود اور گلستاں میں موجود ہے کیونکہ اس کے دل کو موہ لینے والے مختلف بحروں کے اشعار اور اُس کی تمام رنگین عبارت، قطعوں، رباعیوں، مثنویوں اور منفرد بیتوں سے مزین ہے جن میں سے ہر ایک چیز ایک بلند پایہ نصیحت اور ایک اخلاقی اور اجتماعی نکتہ کی حامل ہے یہ امر مسلمہ ہے کہ شعر جس قدر بھی مختصر اور کم ہونگے وہ بہت پسندیدہ اور زود زباں ہونے میں آسان تر ہونگے۔ اسی نقطہ نظر سے گلستان کے اشعار بوستاں کے اشعار سے زیادہ خاص و عام کی زبانوں پر جاری ہیں۔ ایران میں عالموں اور جاہلوں میں سے کوئی ایسا شخص نہیں ملے گا جو گلستان کے اشعار میں سے کم و بیش کچھ نہ جانتا ہو لیکن بوستاں کے اشعار اس قدر شائع اور مشہور نہیں ہیں اور بہت کم لوگ اس کے حفظ کی جانب رغبت کرتے ہیں۔

ہم جو عام طور پر لوگوں کا گلستاں کی جانب رجحان پاتے ہیں اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایران کے تمام مدارس میں گلستان کا درس دیا جاتا ہے اور اسی طرح ہندوستان۔ سندھ ترکستان۔ افغانستان اور بلاد عثمانیہ میں بھی آج کل گلستاں السنہ قدیمہ (CLASSICS) کے درس کا ایک بڑا جزو سمجھی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اہل فرنگ بھی پڑھتے ہیں۔

میں نے بارہا دیکھا ہے کہ بعض یورپین ہم کلامی کے ضمن میں گلستاں کے اشعار کو ثبوت میں پیش کرتے ہیں لیکن بوستاں نے اس درجہ عام قبولیت اور توجہ حاصل نہیں کی ہے۔ اور یہی نکتہ گلستاں کے بوستاں سے مفید تر ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ چونکہ بوستاں کی تصنیف ۶۵۵ھ میں ہوئی ہے جیسا کہ حضرت شیخ نے فرمایا ہے:

بدور ہمایوں دسال سعید — بتاریخ فرخ میان دو عید
ز شصد فزوں بود پنجاہ و پنج — کہ پُر در شد ایں نامبردار گنج

گلستاں میں فرمایا ہے۔

"ہر کہ راز در ترا زواست زود در باز د"

"اے مردان بگوشید تا جامہ زناں نہ پوشید"

"حیف است کہ ہنرمنداں بمیرند و بے ہنراں جائے ایشاں بگیرند"

"مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"

"آنرا کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک است"۔۔۔ انتہیٰ

اگر قرآن فارسی زبان میں ہوتا تو اس کی آیتیں ان مختصر جملوں سے زیادہ فصیح نہ ہوتیں اس نکتہ کو کچھ نکتہ سنج ہی جانتے ہیں کہ ان چھوٹے سے جملوں میں کس قدر گہرے مطالب اور کس قدر دقیق سے دقیق اخلاقی نکات بیان کیے گئے ہیں۔

ہم خود حضرت شیخ کے کلام کے وثیقہ سے ثابت کر سکتے ہیں کہ گلستاں بوستاں پر فوقیت رکھتی ہے۔ ہمارے بزرگ شاعر نے بوستاں کے نظم کرنے کے اسباب میں کچھ اسکے حلق روشنی ڈالی ہے اور آخر میں کہتا ہے۔

کہ در بحر لولو صدف نیز ہست	درخت بلند است در باغ و پست
الا اے خردمند پاکیزہ خوے	ہنرمند نشنیدہ ام عیب جوے
قبا گر حریر است و گر پرنیاں	بنا چار خشت بود در میاں
تو گر پرنیانی نیابی بجوش	کرم کار فرما و خشت بپوش

اگرچہ ان ابیات میں ہمارے شیریں زبان شاعر نے ازراہ ادب و انکسار معذرت چاہی ہے اور بوستاں کے زوائد کی نسبت اس کا اعتراف، تواضع کے باب میں آیا ہے، لیکن وہ چیز جو اس کے کلام سے مفہوم ہوتی ہے یہ ہے کہ خود شیخ نے اپنی بوستاں میں سہو اور لغزش کا گمان کیا ہے اور اس کو اس امر کا بھی احتمال ہوا ہے کہ یہ ادبی شاہکار اپنے زمانہ کے ادیبوں اور سخن سنجوں کے انتقاد اور نکتہ چینی کا مورد بنے گا۔ اسی وجہ سے اپنی بوستاں کو دریا کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ دریا میں صدف بھی پائی جاتی ہے اور موتی بھی، اسی طرح سے باغ میں بلند درخت بھی ہیں اور پست بھی اور مجبوری "قبائے حریر" کے جیسی خشو کو درمیان رکھ کر خواہش ظاہر کرتا ہے کہ اس "خشو" سے چشم پوشی کریں اسی سبب سے فرماتا ہے:۔

ے ہمارا فاضل مقالہ نگار کی اس حسن عقیدت سے متفق ہونا کچھ ضرور نہیں (مدیر)

تنازم بہ سرمایۂ فضل خویش — بدریوزہ آوردہ ام دست پیش
شنیدم کہ در روز امید و بیم — بداں را بہ نیکاں بخشد کریم
تو نیز اے بدی بینیم در سخن — بخلق جہاں آفریں کار کن
چو بیتے پسند آیدت از ہزار — بمردی کہ دست از تعنت بدار

ان ابیات کے مضمون کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے خداوند تبارک و تعالیٰ قیامت کے دن گناہگاروں کو نیکو کار اشخاص کی وجہ سے بخشدیگا۔ تم بھی خلاق عالم کے اخلاق کی پیروی کرکے اگر میرے کلام میں کچھ لغزش نظر آئے تو اس سے چشم پوشی کرو! میرے خراب شعر سے اچھے شعر کے بدلے میں درگزر کرو۔ بوستاں کے بارہ میں شیخ کا یہ عقیدہ ہے۔

اب دیکھنا چاہئے کہ شیخ بزرگوار گلستاں کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ .....
.... گلستاں کے تصنیف کرنے کے اسباب میں فرماتے ہیں۔

رات کے وقت مجھے ایک دوست کے ساتھ باغ میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک ایسی سرسبز و شاداب جگہ تھی جس میں بڑے بڑے تناور اور گنجان درخت کمال جاذبیت سے ناظرین کے دلوں کو اپنی جانب کھینچ رہے تھے، درختوں کے تلے مٹی پر رنگ برنگ کے پتے سبز رنگ مینا کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ منڈوے سے انگور کے خوشے عقد ثریا کی مانند لٹک رہے تھے جب صبح ہوئی تو واپسی کا ارادہ، قیام کرنے کی رائے پر غالب آیا۔ اس کو میں نے اس حالت میں دیکھا کہ وہ اپنے دامن کو گلاب، ریحان سنبل اور ضمیران سے بھرے کر شہر کے ارادہ سے چل کھڑا ہوا۔ میں نے کہا بوستاں کے پھول جیسا کہ تو جانتا ہے اس کے عہد اور اس کی حیات کو ابدیت حاصل نہیں ہے۔ جس کے متعلق حکماء نے بھی کہا ہے جو چیز فانی ہو وہ دل لگانے کے قابل نہیں اس نے کہا وہ کونسی چیز ہے جس کو ابدیت حاصل ہے! میں نے کہا ناظرین کے دل کی شگفتگی اور حاضرین کی وسعت معلومات کے لیے میں ایک ایسے گلستاں کی بنیاد ڈال سکتا ہوں جس کے اوراق باد خزاں کی دست درازیوں سے بچے رہیں گے اور زمانہ کی گردش اس کی زندگی کی بہار کو خزاں کے سخت حملے کے ذریعہ سے تاراج نہ کر سکے گی۔

بچہ کار آید ست ز گل طبقے — از گلستاں من بہ ورقے

گل ہمیں پنج روز و شش باشد ویں گلستاں ہمیشہ خوش باشد

جوں ہی میری زبان سے یہ الفاظ نکلے اس نے اپنے دامن سے پھول پھینکدئے اور میرے دامن کو یہ کہہ کر پکڑ لیا کہ "الکریم اذا وعد وفا" (کریم جب وعدہ کرتا ہے اس کا ایفا بھی کرتا ہے)

مجھے اسی دن ایک فصل لکھنے کا اتفاق ہوا جو حسن معاشرت اور آداب مجلس میں ایک خاص پیرایہ کے ساتھ مقررین کے کام آئے گی اور انشا پردازوں کی بلاغت و بلند پروازی میں ایک زبردست اضافہ کرے گی گلستاں میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

گر التفات خداوندش بیار آید نگار خانہ چینی و نقش ارژنگی ست

امید ہست کہ روئے ملال در نکشد ازیں سبب کہ گلستاں نہ جائے دلتنگی ست

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

بماند سالہا ایں نظم و ترتیب زما ہر ذرۂ خاک او فتادہ

کسی دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

تمام ایں روضۂ رعنا و حدیقہ علیا چوں بہشت مشہت بابا اتفاق افتاد ... انتہی

ان بیانات کے ذریعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گلستاں شیخ کی نظر میں نہایت مقبول اور پسندیدہ واقع ہوئی تھی۔ اور وہ اس کے موضوع کو ایک لطیف و اعجوبہ خیز تصور کرتے تھے جیا کہ وہ کئی مقامات پر مختلف اسلوب بیان کے ساتھ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ باد خزاں کا "دست تطاول" اس گلستاں کے اوراق پر نہ پہنچ سکیگا اور یہ گلستاں "ہمیشہ بہار" ہے۔

کبھی گلستاں کے ایک ورق کو ایک "طبق گل" سے بہتر خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "پھول پانچ چھ روز سے زیادہ عرصہ تک نہ رہیں گے اور یہ گلستاں ہمیشہ کے لئے تر و تازہ رہے گا" کبھی کہتے ہیں "یہ گلستاں ادیبوں کے بھی کام آئے گی اور محرروں کو بھی انشا پردازی سکھلائے گی"۔ دوسرے موقع پر گلستاں کو خوبی اور آراستگی میں "نگار خانہ چین" اور "نقش ارژنگ" تصور کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ اس کتاب کے مطالعہ سے پڑھنے والے کا دل کسی قسم کی تکان محسوس نہ کرے گا۔ وہ اس کو قدرتی گلستاں کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں جو سیر کے لئے "جائے دلتنگ" نہیں ہے۔

سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ شیخ نے گلستاں کو بہشت کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ ہمارا محترم شاعر اپنی گلستاں سے جس قدر خوش تھا اس قدر اس نے اپنی بوستاں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا، اس کا سبب بھی وہی چیز ہے جس کو شیخ نے اپنے اشعار میں ظاہر کیا ہے یہ کہ اس نے بوستاں کو یا تو اپنی مسافرت اور سیاحت کے زمانہ میں نظم کیا ہے یا یہ کہ اس عجلت میں جبکہ وہ سیاحت سے واپس ہوا ہے اور ابھی اس کا دل بحر و بر کے سفر اور سیاحت کی تکان کی وجہ سے آسودہ نہ ہوا تھا۔ اور اس کی فکر تھکی ماندی تھی۔ تصنیف فرمایا ہے جیسا کہ وہ بوستاں میں فرماتے ہیں:-

در اقصائے عالم بگشتم بسے	بسر بردم ایام با ہر کسے
تمتع ز ہر گوشۂ یافتم	ز ہر خرمنے خوشہ یافتم
چوں پاکان شیراز خاکی نہاد	ندیدم کہ زحمت برآں خاک باد
تولائے مردان ایں خاک و بوم	برانگیختم خاطر از شام و روم
دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں	تہی دست رفتن بر دوستاں

لیکن انھوں نے گلستاں کو شیراز میں جس وقت وہ بے تکلف دوستوں اور ہم مذاق ساتھیوں کے ساتھ بے فکری کی حالت میں بوستاں کے عیش اور دوستوں کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف تھے، تصنیف کیا ہے۔ اس کتاب میں اپنی انتہا درجہ کی شاعرانہ مہارت کو خرچ کیا ہے پس ان روشن دلایل کے پیش کرنے کے بعد کہ گلستاں بوستاں پر تفوق رکھتی ہے پھر کسی تردید کی گنجائش نہیں۔

انسان اور کائنات

(از جناب میر خوشی الدین علی صاحب)

موجودہ تحریک روحانیت نے زندگی کی غرض و غایت اور اس کی قدر و قیمت کے متعلق عام طور پر انسان کے خیال و قیاس میں ایک تغیر عظیم برپا کر دیا ہے اس وجہ سے یہ لازمی ہے کہ ان نئے مطمح نظر کے حامل جو مسئلات ہیں ان میں قدم رکھ کر محققین کرام کے خیالات اور دقایق کے ہر پہلو پر نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھیں تو شاید اصلی راز منکشف ہو۔ فلسفہ سے مدد لی جائے اور فلسفہ کی روشنی میں ان واقعات کو دیکھا جائے تو ممکن ہے کہ کچھ کام بنے۔

فلسفہ کی بنیاد واقعات اور شہادات ہیں اور فلسفہ کی غایت اور مقصد واقعات کو ہم آہنگ کرنا اور ایک دوسرے کے ساتھ انکا صحیح تعلق بتلانا ہے۔

عہد قدیم میں یہ باور کیا جاتا تھا کہ انسان کائنات سے کچھ جدا نہیں ہے بلکہ اس کا ایک جزو ہے اور مذہب جو ایک اعلیٰ ترین اور بلند پایہ اصول ہے۔ حقیقت میں یہی ایک واسطہ ہے جس کے ذریعہ انسان زندگی کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور یہی ایک واحد ذریعہ ہے جو وجود کلی کے ساتھ اتحاد شعوری پیدا کر سکتا ہے۔ اور اسی کے وسیلہ سے زندگی کی ممتاز ترین حالت یعنے کامل آزادی کا مرتبہ الوہیت کے ساتھ میل جول ممکن ہے۔ اور اس کی بدولت ہم اس امر کے سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں چنانچہ فلسفہ کے بہترین اصول اور کلیے ذہن انسانی اور روح انسانی کے عمیق سوالات یہ ہیں کہ زندگی یا وجود کا منبع کیا ہے؟ خود زندگی کیا چیز ہے؟ اور ہم اپنے مادی اجسام میں کیوں آباد ہیں؟ جب دنیوی زندگی ختم ہو چکتی ہے تو پھر ہم کہاں جاتے ہیں یا اور اس کے بعد کونسی قسمت ہماری منتظر رہتی ہے؟ غور و خوض کے دوران میں تصور اور خیال کے وقت بیداری کی حالت میں اور ادی گرد و پیش سے غیر حسی کی صورت میں یہ اہم ترین روحانی سوالات پیدا ہوتے اور حل طلب کرتے ہیں اور مبلغ علم کے موافق اور پیدا کردہ صبر و استقلال کے حسب قابلیت اور باطنی صفائی کی استعداد کے مطابق یہ جوابات صحیح اور مکمل ہوتے ہیں۔

ان جملہ تحقیقات کا اصل اصول اور تمام فلسفیانہ خیالات کی کنجی موقوف ہوتی ہے اس رائے

حل پر کہ زندگی کیا چیز ہے؟ بیشتر محققین نے مادی اور غیر مادی عاملوں کے واقعات اور انکے نتائج کو ایک خاص مسلک اور طرز میں منسلک کرنے کی کوشش کی بعضوں نے صرف قریب ترین منظر پر ہی اکتفا کیا اور مادی حدود کے اندر خود کو مقید سمجھا اور دوسروں نے مادی حدود کی ناقص حالت کو پہچانا اور اس کے آگے بڑھ کر روحانیات کے اندر اپنے کو پایا ہے۔

پروفیسر ٹنڈال جو ایک عام خیال کے تحت مادہ پرستوں کے بھی مادہ پرست تھے اپنے ایک خطبہ میں اس طور پر اقرار کرتے ہیں "میں نے اپنے سالہا سال کی تحقیقات کے دوران میں معلوم کیا کہ طاقتور ذہنیت قوی اور پاک خیالات کے گھنٹوں میں یہ اصول یعنے مادیت اور دہریت میرے دماغ میں پھٹکنے تک نہیں اور ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ طاقتور اور پاک خیالات کے وقت وہ بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس راز کا کوئی حل نہیں ملتا جس کے اندر ہم اپنا وجود پاتے ہیں اور جس کے ہم ایک جزو ہیں" ایک ممتاز فلسفی کا خیال ہے کہ تعصب نے جس طرح سے مذہب کو نقصان پہنچایا اسی طرح سے مادہ پرستی نے بھی فلسفہ کا مضحکہ اڑایا" چنانچہ مادہ پرست ہمیشہ اس امر کے امتیاز کرنے میں ناکام رہتے ہیں کہ کونسی چیز عارضی یا فانی ہے اور کونسی دایم یا باقی رہنے والی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی پبلک فائدہ پیش نظر ہو ایک گروہ کا اجتماع ہو جاتا ہے بعد ازاں جب وہ منشا یا مقصد پورا ہو چکتا ہے تو مجمع بھی منتشر ہو جاتا ہے لیکن ہم کو نظر آتا ہے کہ وہ خوشی پیدا شدہ احساس جو انسانی اجتماع کی بدولت پیدا ہوا تھا مجمع کے انتشار کے بعد بھی باقی رہ جاتا ہے آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں اس کے بعد بھی نیلا آسمان دکھائی دیتا ہے۔ شبنم پتے پر نمودار ہوتی ہے کچھ دیر کے بعد غائب ہو جاتی ہے لیکن ہم بخوبی جانتے ہیں کہ غیر محسوس اور نامعلوم طور پر وہ پیدا ہوتی اور پھر نہاں ہو کر دوبارہ غیر محسوس طریقہ پر نمودار ہو گی اس اثناء میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہی شبنم کا قطرہ آفتاب کی روشنی میں چمکتا ہے اور اپنے اندر تمام اطراف و اکناف کی دنیا کو منعکس کرتا ہے اور اس دوران میں اظہار حسن عالم کا وہ حصہ لے لیتا اور اپنی ذمہ داری کو پورا کر لیتا ہے جو اس کی تخلیق کی غایت اور علت تھی اس کا غیر محسوس مادی وجود عارضی ہوتا ہے ایک قطرہ کی حیثیت سے وہ پیدا ہوتا اور ایک قطرہ کی حیثیت سے نابود ہو جاتا ہے لیکن بخارات آبی کی حیثیت سے وہ قائم اور باقی رہتا ہے جو فی الحقیقت ایک غیر فانی طبعی چیز ہوتی ہے پھر دیکھنا چاہئے کہ آخر زندگی کیا چیز ہے؟

کیا وہ ایک عدم یا مفقود الوجود ہے جس نے کاربن۔ ہیڈروجن اور آکسیجن کے اجزا کو ترکیب دے کر ایک دیو ہیکل درخت یا ایک پرند یا انسان کی شکل کو پیدا کر دیا ہے؟

ظاہر ہے کہ کوئی شخص دنیا کے جملہ حالات پر عبور نہیں حاصل کر سکتا۔ اگر اطمینان اور غور کے ساتھ ان ہزاروں تغیرات پر نظر ڈالیں جو روزمرہ ہمارے گرد و پیش مادی دنیا میں وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں مثلاً کیمیائی تغیرات۔ کیمیائی تعاملوں کی باقاعدگی اور جلدار چیزوں کی باقاعدہ صورت پذیری، نباتات کی روئیدگی اور حیوانات کا تحرک اور پھر سب سے بڑھ کر جسم انسان کی پیچیدہ ترکیب، یہ سب واقعات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ تمام مادی تغیرات کی پشت پر کوئی ایسی زبردست طاقت موجود ہے جس کی اصلیت اور کنہ تک انسانی عقل کی رسائی ناممکن ہے۔

ایک روشن خیال مصنف نے کیا خوب کہا ہے کہ جب ہم اپنے خیالات کے اس درجہ تک پہنچتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ الوہیت مادہ کے وہ تمام دعوے کس قدر کھوکھلے اور بے بنیاد تھے اور وہ سب کوششیں بے سود تھیں جو ذہنی قابلیتوں کو بے اصل ثابت کرنے کے لئے کیجاتی تھیں جس کے اوپر ہزاروں ہی نے اپنی عمریں تباہ کیں اور جب کبھی مایوسی سے سابقہ پڑتا تو تنگ نظری کی بدولت اُن کا ذہن رسا بے شمار غلطیوں کی طرف اُن کی رہنمائی کرتا۔ اس نوبت تک پہنچنے سے پہلے ہی مادی عالم ان کے نزدیک موہوم اور دھندلی سی شکل اختیار کر لیتا اور صرف ایک سایہ ہی سایہ باقی رہ جاتا ہے۔ اور وہ مادی وجود سے پرے غیر محسوس عالم میں داخل ہو جاتے ہیں اس وقت ان کے دماغوں میں ایک ٹھوس خیال جاگزیں ہوتا ہے اور نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا عمل شروع کر دیتا ہے اور ان کو یقین دلاتا ہے کہ اس تغیرات کی دنیا میں صرف میں ہی باقی رہ گیا ہوں اور یہاں سے تمہارا رہبر بنکر تم کو اصلی راستہ کی طرف لئے چلتا ہوں اس کے بعد بقا کے اصول کو وہ سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں چنانچہ انکی سمجھ میں آجاتا ہے کہ پھول، درخت، بادل، شعاع آفتاب یا ایک پتھر کی چٹان اپنا کوئی ذاتی وجود نہیں رکھتی سوائے اس کے کہ وہ اس ذات واجب الوجود کی وجہ موجود ہیں اور گویا کہ فطرت کے حروف ہجا کی حیثیت سے اپنا وجود رکھتے ہیں۔ ہجا کے حروف کی طرح وہ ایک دوسرے کے ساتھ الفاظ کی صورت میں ملے جلے اور ترکیب کھائے ہوئے ہیں حروف ہجا کی طرح وہ موجود ہیں اپنی ذات واحد کے لئے نہیں بلکہ عناصر کی طرح جن کے ذریعہ کلمہ اور کلام ذہن اور عقل ظاہر ہوتے اور خیالات وضع کئے جاتے ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب فانی اور غائب ہونے والے اور تغیر پذیر ہیں

اگر کسی چیز کو قیام حاصل ہے اور باقی ہے تو وہ غیر متغیر طاقت ہے جو اس جملہ مادی تغیرات کی پشت پر واقع ہے اور اگر کسی کو بقا حاصل ہے تو اس عقل کل کو حاصل ہے۔ جو ان تمام تغیرات کے دوران میں کسی خاص منزل کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور جن چیزوں کو قوانین فطرت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ انکشافات ہیں ان جملہ قدرتی اسباب و علل کے اور عمل ہیں اس دائمی محبت و ارتباط کے جیسا کہ انسانی جسم کے حرکات و سکنات انسانی ارادے کے تابع ہیں اسی طرح سے عقل کل بھی رہبر ہے اس کائنات کے جملہ انتظامات کے برقرار رکھنے میں۔

دور افتادہ

(لارڈ بائرن کی ایک نظم کا ترجمہ)

از جناب محشر عابدی:۔

ہوئے جب ہم جدا دونوں خموشی تھی رواں آنسو (۱) شکستہ قلب و وارفتہ تھے ہم محو فغاں ہر سو
ہماری سحر ہائے ہم جیسی بیتتی جاتی تھیں شب فرقت کی گھڑیاں وحشت افزا ہوتی جاتی تھیں
تمہارا رنگ بدلا طرز بدلا، غم کی صورت تھی تمہارا جسم ٹھنڈا اور سکتہ کی سی حالت تھی
میرے دل نے کہا مجھ سے شگوں اچھا نہیں ایسا خدا جانے کہ دکھلائیگی قسمت کب کیا

(۲)

خیال بے وفائی ہے مگر خاموش رہتا ہوں تمہاری یاد میں لیکن عبث مدہوش رہتا ہوں
تمہارا ذکر میری موت کا پیغام ہوتا ہے محبت اُف محبت کا یہی انجام ہوتا ہے
مجھے بھولے تو کیا تم ایک ہی میرا تصور ہو نہ آؤ بھی تو کیا موجود میرے دل کے اندر ہو
گزرتا عمر غم کی داستاں کہتا رہوں گا میں سناؤں گا تمہیں اور تم سے پھر سنتا رہوں گا میں

(۳)

مسرت جب بھی تم سے اب میں تنہائی میں ملتا ہوں نہ دن کو چین آتا ہے نہ میں راتوں میں سوتا ہوں
ستایا تم نے لیکن اب تصور بھی ستاتا ہے رولایا تم نے لیکن اب تصور بھی رولاتا ہے
اگر برسوں میں قسمت پھر کبھی تم سے ملائیگی تو خود ہی دیکھ لینا جو میری حالت دکھائیگی

ملوں گا کس طرح تم سے ابھی تبلاؤں تم کو کیا
رواں ہونگے وہی آنسو خموشی اور وہی سکتا

محبِ وطن

(از ڈاکٹر راجندر ناتھ ٹیگور)

(مترجمہ شیریں بی اے)

چترگپتا جو موت کے دروازہ پر بیٹھے ہوئے بلا رو رعایت دنیا کے اعمال قلم بند کیا کرتا ہے مجھے یقین ہے کہ اس نے میرے متعلق بھی ایسے الزامات نہایت جلی قلم سے لکھ رکھے ہوں گے جو بالکل لاعلمی کے عالم میں مجھ سے سرزد ہوئے ہوں لیکن ساتھ ہی اکثر گناہ جن کے وقوعہ سے دیگر حضرات ناواقف ہیں میرے حافظہ میں نہایت واضح طور سے محفوظ ہیں میرے جادہ راست سے ہٹنے کی کہانی جو میں سنانا چاہتا ہوں آخر الذکر میں داخل ہے۔ اپنے گناہ کے سچے اقرار سے مجھ کو امید ہے کہ قبل اس کے کہ میرا گناہ کتاب تقدیر یا صحیفہ اعمال میں لکھا جائے اور سزا مقرر ہو شاید اس کی سزا میں کمی ہو جائے۔

یہ واقعہ کل ہی ہمارے محلہ میں پیش آیا یہ دن جنمیوں کے کوئی تہوار کا بھی تھا اور جس وقت کہ میں اپنی بیوی کاکا کے ساتھ نائن موہن کے ہاں جو میرے ایک عزیز ہیں چائو شی کے لئے جا رہا تھا۔

میری بیوی کے نام کے لفظی معنے 'کلی' کے ہیں' یہ نام میرے خسر کا رکھا ہوا ہے اگر میری بیوی اور اس نام کے مفہوم میں کوئی نسبت نظر نہ آئے تو اس کے واحد ذمہ دار میرے خسر ہی ہیں۔ میری بیوی کے نزدیک کوئی بات ناشدنی غور طلب نہیں رہی بلکہ اکثر مسئلوں کے متعلق تو اس کی رائے حد تمام تک پہونچ چکی ہے ایک مرتبہ جبکہ وہ بورا بازار میں غیر ملکی کپڑا خریدنے والوں کو روکتے ہوئے نہایت دلیری سے پہرہ دے رہی تھی تو اسکی جماعت کے دہشت زدہ اراکین نے اس کے اس شجاعانہ کارگزاریوں پر دھرو دا رتا کا لقب دیدیا یعنے وہ عورت جس کے قول و فعل میں کبھی تزلزل نہیں ہوتا۔

میرا نام گرندرا ہے یعنے چٹانوں کا دیوتا یہ نام میرے ملکی بھائیوں میں عام تو ہے لیکن اس کا اسم بامسمی شاذ و نادر ہوتا ہے کاکا کے ثنا خواں کو میرے متعلق صرف اس قدر علم ہے کہ میں اپنی بیوی کا شوہر ہوں ورنہ میری ذات کو تو وہ بالکل ناقابل التفات سی تصور کرتے ہیں لیکن خوش قسمتی سے میرے ساتھ چند ایسی آبائی خصوصیات چلی آرہی ہیں جو میری بیوی کے ساتھیوں کو چندہ جمع کرتے

وقت بہت مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

میاں بیوی میں پوری طرح سے موافقت کے بہ نسبت اگر اُن کی خصلتوں میں اختلاف ہو تو میرا خیال ہے کہ یگانگت کا بہترین موقع ملتا ہے جس طرح کہ خشک زمین میں ابر باراں کا برسنا! میری فطرت میں بے اعتنائی ہونے کی وجہ سے زیادہ غور و تفکر کا عادی نہیں ہوں لیکن میری بیوی کی ذہنیت میں کچھ ایسا استحکام ہے کہ کوئی بات اس سے نظر انداز نہیں ہو سکتی لیکن یقین کیجئے کہ یہی غیر مشابہت ہمارے امور خانہ داری میں انضباط قایم رکھنے میں بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔

ہاں! ہم میں ایک تنازعہ فیہ مسئلہ ہے جس پر آج تک کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا وہ یہ ہے کہ میری بیوی مجھ کو حب وطن کے جذبہ سے عاری سمجھتی ہے۔

یہ نہایت پریشان کن بات ہے کہ میری بیوی کے نزدیک صحیح وہ ہے جو اُس کے وہم و گمان میں صحیح ہے حالانکہ میرے حب وطنی کے ثبوت کے لیے اس کے پاس بہت سے اندرونی (دوسروں کی نظر سے اوجھل) شواہد موجود ہیں۔ لیکن چونکہ اس کے ہم شربوں کی طرح مجھ پر کوئی ایسا لبادہ نہیں ہے جس پر قومیت کی کوئی مہر ثبت ہو۔ اسی سبب سے شاید اس کو انکار ہے۔

مجھ کو بچپن سے کتابوں سے گہری محبت رہی ہے۔ کتابیں خریدنے کا تو مجھے ایک جنون ہے اس حقیقت سے میرے دشمنوں کو بھی انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ میں ان کا مطالعہ بھی کیا کرتا ہوں، میرے دوست تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے مضامین پر کیسی دلچسپی سے اُن کے ساتھ بحث کیا کرتا ہوں۔ اس طرح سے میرے اکثر دوستوں کو علمی روشنی حاصل ہوئی، اخیر میں بن بہاری اکیلا ساتھی رہ گیا جس کے ساتھ تنہائی میں خوب گفتگو ہوا کرتی ہے، ہم ابھی ایسے واقعات میں سے گذرے ہیں کہ ایک طرف عہدہ داران کو تو الی نے ہمارے نزدیک گیتا کی موجودگی کی وجہ سے ہمارے ساتھ انتہائی نفرت انگیز سلوک کیا۔ دوسری طرف ہمارے محبان وطن کو یہ بات محال نظر آتی ہے کہ ایک شخص کسی غیر ملکی ادبیات کا دلدادہ رہتے ہوئے اپنی مادر وطن کے ساتھ عقید تمندی کا دم بھرے۔ سرسوتی جو ہمارے یہاں روایتاً شاعری کی دیوی کہلاتی ہے، محض اس کا رنگ گورا ہونے کی وجہ سے ہمارے نوجوان قوم پرست اس کے متعلق شک کرنے لگے ہیں اور انھوں نے کالج کے لکچروں کو ترک کر کے یہ بات صاف طور سے ظاہر کر دی کہ اُس مقدس جھیل کا پانی جس میں سرسوتی کنول کے پھول پر جلوہ افروز ہے ہمارے ماں بھارت لکشمی میں اُس تباہ کن آگ کو بجھانے کے ناقابل ہے۔ جو صدیوں سے بربادی اور خرابی مچاتی چلی

آرہی ہے۔ بہرحال دماغی شائستگی سیاسی زندگی کی نشوونما کے لیے ایک روک تصور کی جاتی ہے۔

میری بیوی کے شدید اصرار اور خود اس کے عملی نمونہ کی موجودگی میں بھی میں کھدر نہیں پہنتا، اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی عیب ہے یا اپنی خودنمائی میں کسی قسم کی کمی ہو جائے گی۔ بلکہ اس امر کو کہ مجھ کو کس قسم کا لباس اختیار کرنا چاہیئے، میں اس بات کو میری ان عادتوں میں شامل نہیں کرسکتا جو خود ہمارے قومی خصایل سے بالکل مختلف ہیں۔ واقعہ ہے کہ کالکا کی اس جدید تبدیلی سے کہیں پیشتر میں چینیوں کے دوکان سے چوڑے سرے والے جوتے خرید کر پہنا کرتا اور ان کو جلا کرنے کی بھی مجھ کو پروا نہیں تھی۔ مجھ کو تو پائتابے بھی استعمال کرنے کے لیے تامل ہوتا تھا۔ میں پنجابی قمیصوں کو اُن کے گڑبڑیاں لگانے میں نقائص کو نظر انداز کرتے ہوئے انگریزی قمیصوں پر ترجیح دیتا تھا۔ میری ایسی عادتوں سے فانگی زندگی میں ایک قسم کی تلخی پیدا ہوگئی یہاں تک کہ ہم میں ایک دوسرے سے مستقل طور سے جدا ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا۔ کالکا نے کہنا شروع کیا کہ پبلک میں اس کے ساتھ میری موجودگی سے اسے شرمندگی ہوتی ہے اگرچہ یہ بیوی کے فرائض میں داخل ہے کہ جس مجلس میں وہ جائے شوہر کو ساتھ لیجائے! لیکن میں نے اُن مجلسوں میں جہاں میری موجودگی سے بدمزگی کا احتمال ہو جانے سے پرہیز کیا۔

زمانہ بالکل بدل چکا ہے۔ لیکن میری شومئی قسمت حسب سابق باقی ہے کالکا کی زبان پر اب تک یہی درد ہے "تمہارے ساتھ کہیں چلنے کے لئے مجھے شرم آتی ہے" پہلے جبکہ اُس کا تعلق قومی کشمکش کے پیشتر کے زمانہ سے تھا مجھ کو اُس کی جماعت کے ساتھ ہم رنگ بننے میں پس و پیش رہا؛ اور اب بھی جبکہ وہ موجودہ طریق عمل پر چلنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ مجھ کو اُسکی جماعت کی طرح لباس اختیار کرنے میں تامل ہے۔ یہ عیب میری ہی فطرت میں نہایت گہرے طور سے متمکن ہے میں اپنی شخصیت کے لئے تمام ظاہری خودنمائیوں سے پرہیز کرتا ہوں۔

میری اس کشیدہ مزاجی سے گھریلو دنیا میں لگاتار ناچاقیاں پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ میری بیوی کو اپنی جبلی قابلیت کے باعث، اپنے شریک زندگی میں ایک ناقابل ترمیم افتراق کو تسلیم کرنے سے عار ہے اُس کا ذہن ایسی پہاڑی ندی کے مانند ہے، جو ایک چٹان کے اطراف نہایت تندی سے گردش کرتی اور اس کو اپنے دھارے کے ساتھ بہا لیجانے کی سعی لاحاصل کرتی ہے کوئی بات اس کے نقطۂ نظر سے اگر مختلف ہو جائے تو گویا وہ اپنے آپ سے باہر ہو جاتی ہے۔

کل جس وقت باہر جانے کی تیاری ہو رہی تھی، غیر کھدر لباس کی مخالفت کرتے وقت میری بیوی کا لہجہ نہایت دلکش تھا۔ بدقسمتی سے مجھے اپنی قابلیت پر انتہائی غلط زعم تھا جس کی وجہ سے میں اپنی بیوی سے مباحثہ کرنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ مباحثہ بالکل ناخوشگوار تھا بلکہ مہمل۔

"عورتیں اس میں نہایت آسانی خیال کرتی ہیں" میں نے اس سے کہا کہ آنکھ بند کئے کسی مقتدر کی رسی پکڑے ہوئے چلے جائیں اور جب اُن کی تمام آزادی سلب کر لیجائے انھیں سخت پردہ میں مقید کر دیا جاتا ہے تو تب بھی وہ اپنے کو مطمئن پاتی ہیں آج ہماری عورتیں نہایت آسانی سے کھدر کے استعمال میں جو گرم جوشی ظاہر کر رہی ہیں وہ محض اس وجہ سے ہے کہ ہمارے ظاہری نام و نمود کے اظہار کے معیاروں کی فہرست میں ایک اور چیز کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس سے ہمیں ایک قسم کی تسلی بھی حاصل ہوتی ہے" کالکا نے تقریباً غصہ سے جواب دیا "وہ دن میرے ملک کے لئے ایک عظیم الشان دن ہوگا جبکہ لوگ جس طرح دریائے گنگا میں غوطہ مارنے کو اندھا دھند ایک مقدس عمل سمجھتے ہیں ایسا ہی ایمان کھدر پوشی کے متعلق رکھیں۔ عقلی معاملات میں تناسب پیدا کیا جائے تو وہی رسم و رواج میں ہویدا ہو جاتے ہیں آزاد خیالی ایسی روح کی مانند ہے جس کا مسکن (نام نہاد) انجمنیں ہیں اور وہ آسانی فضا میں مارے مارے پھرتے رہنے کو ترک کر دیتے ہیں چونکہ انھیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے معقول ذریعہ ہاتھ آجاتا ہے۔"

میں تاڑ گیا کہ یہ دانشمندانہ اقوال ٹاگور موہن کے ہیں، پھر نام کا حوالہ نہیں لیکن کالکا کو یہ اقوال اپنے طرف منسوب کر لینے میں کوئی پس و پیش نہیں تھا۔

جس آدمی نے یہ قول "خاموش پسندی تمام کھیڑوں کا علاج ہے" ایجاد کیا ہو وہ ضرور مجرد ہوگا کیونکہ میرے سکوت نے میری بیوی کے جوش کو اور برافروختہ کر دیا۔ "تمھاری ذات پات کی مخالفت" اس نے کہا "صرف زبان کی حد تک ہی ہے برخلاف اس کے ان تمام رنگی امتیازوں کو مٹانے کیلئے سب کے سب ایک سفید وردی پہن کر ہم تو عملی ثبوت دیتے ہیں"۔

میں یہ جواب دینے والا تھا کہ درحقیقت میری ذات پات کی مخالفت کی ابتدا کی اصلیت میری زبان سے ہی ہے چونکہ جب کبھی کوئی مسلمان عمدہ کھانا پکاتا ہے تو میں بخوشی مزے لیکر کھاتا ہوں یہ ایک غیر تحریر شدہ بات ہے لیکن زبانی نہیں فی الواقع یہ امور باطنی ہیں ایک ظاہری پردہ ان امتیازات کو پوشیدہ تو کر سکتا ہے لیکن اس سے ان کا استیصال ممکن نہیں۔

مجھ کو کامل یقین ہے کہ میرا استدلال ایسا وزنی تھا کہ اس کو ضرور پیش کیا جاتا لیکن میں اپنی

کمزوری اور بزدلی کی وجہ سے غیر جانبدارانہ خاموشی میں اپنی سلامتی سمجھا کیونکہ مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ ایسے ہی کئی ایک مباحثے اُن سے تنہائی میں ہوئے لیکن بعد کیا دیکھتا ہوں کہ میری بیوی ہی کے ذریعہ سے اُس کے دوستوں میں یہ خبریں پہنچ جاتی ہیں اور وہاں میری باتوں کا نہایت بُری طرح سے مضحکہ اڑایا جاتا ہے اس میں ایک ناخوش گوار عادت یہ ہے کہ وہ نائن موہن کے چند فقرے سن سنا کر میرے سامنے بارش کی طرح برس پڑتی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کوئی جواب دینے سے پہلے مقابلہ کے میدان سے چمپت بھی ہو جاتی ہے۔

پروفیسر کی چائے کی میز پر جو کچھ بھی ہوگا اس سے میں بخوبی واقف تھا کچھ رسمی ہندو ہتھ اور آزاد خیالی کا دکھڑا ہوگا۔ اور کچھ صدیوں کے نسلی تجربات اور حقایق پر دو آنسو بہائے جائیں گے جو اس وقت تنزل اور انحطاط کے منجدھار میں بہے چلے جا رہے ہیں، اتنے میں مجھ کو اُس نئی کتاب کا جس کی جلد مراکو کے چمڑے سے نہایت خوبصورت بنی ہوئی ہے خیال آیا۔ جو میرے کاغذ میں عجیب طور سے لپیٹے ہوئے میرے مطالعہ کے انتظار میں پلنگ پر پڑی ہوئی ہے لیکن ان الفاظ کے خوف سے جن میں سے کچھ بیان کر دئے جائیں گے اور کچھ بیان کرنے سے رہ جائیں گے اور ایسے حرکات و سکنات سے جن سے مصیبت کا سامنا ہو جائے میں اپنی شغولیت پر قایم رہنے کیلئے مجبور ہو گیا

ہم مکان سے تھوڑا ہی فاصلہ طے کر کے ایک گلی میں سے گزرے جہاں ایک کوئلی سے چھائی ہوئی جھونپڑی میں ایک دوکاندار بدھنی کے متعلق اُبلے ہوئے سرسوں کے تیل میں مختلف اشکال نبلا رہا تھا کہ یکایک خوفناک چیخوں نے ہمیں چوکنا کر دیا۔

مارواڑیاں اپنے عبادتی قیمتی نذر و نیاز کی اشیاء لئے ہوئے مندر کو جا رہے تھے یکایک اس مقام پر رک گئے غصہ کی آواز سنائی دی جس کے ساتھ مار پیٹ کی بھی آواز شامل تھی میں نے خیال کیا کہ شاید کسی جیب کترے کی مرمت ہو رہی ہے اور غصہ کی زیادتی کی وجہ سے لوگ اپنے ہی ایک ہم جنس کے ساتھ آزادی سے یہ بے رحمانہ سلوک کر کے لطف اٹھا رہے ہیں ہم ہارن کو جلد جلد بجاتے ہوئے جب اس مشتعل مجمع میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے ضلع کا بوڑھا مہتر بُری طرح پٹا گیا ہے وہ ابھی دوپہر کا غسل کر کے بیدھے ہاتھ میں ایک بالٹی میں صاف پانی لئے اور بغل میں جھاڑو دبائے جا رہا تھا اس وقت وہ چاک کا کوٹ پہنے اپنے بالوں کو اچھی طرح کنگھی کئے ہوئے تھا جو اب تک ترتھے ایک سات سالہ پوترے کو اس طرح لئے ہوئے جاتے وقت وہ شاید کسی سے چھو گیا یا اور کوئی بات ہوئی جس کی وجہ سے اس غریب پر یوں آسمان ٹوٹ پڑا۔

لڑکا لوگوں سے روتے ہوئے منت کر رہا تھا کہ اس کے نانا کو نہ ماریں اور یہ بوڑھا بھی ہاتھ جوڑ کر لوگوں سے گڑگڑا رہا تھا کہ اس کے اس غیر ارادی جرم کی بخشش کی جائے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک دریا بہہ رہا تھا اور اس کی ڈاڑھی خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔

یہ نظارہ میرے لئے ناقابل برداشت تھا اور میں نے اس بات کا تہیہ کر لیا کہ میں اس مہتر کو اپنی موٹر میں بٹھالوں گا اور اپنے اس عمل سے اس مقدس جماعت پر یہ ظاہر کر دونگا کہ میں تمہارے طریق کا نہیں ہوں۔

میری مضطربانہ حرکات کو دیکھ کر کالکا نے بھانپ لیا کہ اس وقت میرے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے میرے شانوں کو دبا کر اس نے کان میں کہا "تم نے یہ کیا نازیبا حرکت پر کمر باندھی ہے کیا تمہیں نظر نہیں آرہا ہے وہ تو مہتر ہے"۔

میں نے کہا "کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ مہتر ہے لیکن ان لوگوں کو اس غریب کو اس طرح سے پیٹنے کا حق کہاں سے آگیا"۔

"اجی میاں یہ تو اسی کمبخت کا قصور ہے" کالکا نے جواب دیا "اگر وہ موا بیچ راستہ میں سے نہ ہٹتا تو کیا اس کی شان میں کوئی فرق آجاتا"۔

"مجھ کو علم نہیں" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ خواہ کچھ ہی ہو میں تو اسکو موٹر میں ضرور بٹھالونگا

"تو میں اسی وقت تمہاری موٹر پر تف بھیجتی ہوں" میری بیوی نے برہمی سے کہا "میں ایک مہتر کے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتی"۔

"کیا تم اندھی ہوگئیں دیکھو اس نے ابھی غسل کیا ہے اور کپڑے کیسے صاف ستھرے ہیں بلکہ حقیقت میں وہ ان لوگوں سے زیادہ پاک صاف ہے جو اس بیچارے کو پیٹ رہے ہیں"۔

"وہ مہتر ہے"۔ میری بیوی نے بطور فیصلہ کہا اور شوفر سے یوں کہا "گنگا دین موٹر کو بڑھاؤ" مجھ کو شکست نصیب ہوئی اور یہ میری محض بزدلی تھی"۔

سنا کہ این موہن نے عمرانیات کے متعلق نہایت بہترین خیالات کا اظہار کیا خاصکر پیشے اور اور قدرتی کمزوری کی وجہ سے غیر مساوات اور عدم رواداری کی نسبت۔ لیکن ان الفاظ سے میرے کان نا آشنا رہے اور اس روز تمام شام مجھ پر ایک خاموشی طاری رہی۔

ٹالسٹائے اور عوام الناس

(از جناب عترت حسین صاحب زبیری)

انیسویں صدی یورپ کی مذہبی اور ادبی تاریخ میں ایک نمایاں اہمیت رکھتی ہے سائنس کی حیرت انگیز ایجادات اور فلسفہ کی ہنگامہ آرائیوں نے لوگوں کے عقاید اور خیالات میں ایک ہیجان بپا کر دیا تھا۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ جب ڈارون نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "سلالت انسان" شائع کی تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب مذہب اور اخلاق کی دنیا کو کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔

جب تمام یورپ اس مذہبی بے چینی میں مبتلا تھا اور گزشتہ صدی کے عقاید کی عمارتیں منہدم کیجا رہی تھیں اس کے ایک گوشے سے ٹالسٹائے ایک عالمگیر پیغام لیکر اٹھتا ہے اس کا پیغام یورپ کے مادی رجحانات اور سرمایہ داری کی تہذیب کا ایک لازمی نتیجہ تھا اس نے ان قومی روایات اور مذہبی عقاید کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جن پر یورپ کی مادی تہذیب کا دارومدار ہے لیکن ٹالسٹائے سائنس داں نہیں تھا کہ اس کے خیالات کو لوگ اہمیت دیتے وہ فلسفی نہ تھا کہ لوگ اسکی رسائی فہم اور نکتہ چینی پر سر دھنتے پھر وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے ٹالسٹائے کی مقناطیسی شخصیت کے خطوط قوت کا ایک جال یورپ کی فضا میں بچھا دیا۔ قدرت کاہیابی کے لئے خود بخود اسباب مہیا کر دیتی ہے ٹالسٹائے اپنے مذہبی رنگ میں اس وقت ظاہر ہوتا ہے جبکہ اس کے ادبی کارناموں کا چرچا یورپ کے قہوہ خانوں اور کلبوں کو گرما چکا تھا اس کی ادبی فتوحات کے اثرات ابھی ہلکے بھی نہ پڑنے پائے تھے کہ اس کے مذہبی عقاید نے یورپ کی سوسائٹی کی بنیادوں کو متزلزل کرنا شروع کر دیا اس کی ادبی عظمت اپنا سکہ جما چکی تھی لہذا یورپ اس کے پیغام کے سننے پر مجبور ہو گیا۔ اگر ٹالسٹائے ادیب نہ ہوتا تو قرین قیاس یہی ہے کہ یورپ کے خود سر سرمایہ دار اس کے پیغام کو "دیوانے کی بڑ" کہہ کر ٹھکرا دیتے۔ یورپ کی قوموں میں فرانسیسی غیر ملکی ادبی کارناموں کی بہت کم داد دیتے ہیں لیکن ۱۸۸۵ء میں ہی ملکیر ڈی وو (MELCHIOR DE VOGUE) اپنی مشہور کتاب رومن روسے (ROMAN RUSSE) میں لکھتا ہے "اگر در اصل وہی کتابیں دلچسپ ہوتی ہیں جو کسی خاص عہد کے عوام الناس کی زندگی کا بہترین مرقع ہوں تو ہماری انیسویں صدی نے ٹالسٹائے سے بڑا کوئی ادیب پیدا نہیں کیا مجھ کو یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ٹالسٹائے کو

اس صدی کے تمام ادیبوں پر فوقیت حاصل ہے۔"

فلوبرٹ (FLAUBERT) نے جب ٹالسٹائے کی کتابوں کو پڑھا تو وہ چلا اٹھا "یہ شیکسپیر ہے یا اللہ! یہ شیکسپیر ہے"۔ مشہور فرانسیسی مصنف رومن رولند (ROMAN ROLLAND) جسکو نوبل انعام مل چکا ہے کہتا ہے ٹالسٹائے کی ناولوں کی ہمارے لئے وہی اہمیت ہے جو ورڈ (WERTHER) گیٹے کا مشہور ناول) کی گزشتہ نسل کے لئے تھی یہ ہمارے جذبات خیالات کمزوریوں کامیابیوں اور امیدوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

اس کی ہر دلعزیزی نے اس کے پیغام کو یورپ کے کونے کونے میں پہنچا دیا۔ اور ان لوگوں کو جو بچوں کی طرح سائنس کے خوشنما کھلونوں کو اپنا دل دے چکے تھے اپنی حالت پر دوبارہ سوچنے اور غور کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔

جب ہم ٹالسٹائے کے مذہبی عقاید اور سیاسی نظریات کے اثرات کا اندازہ کرتے ہیں جو نہ صرف یورپ بلکہ تقریباً تمام مہذب دنیا پر مرتب ہوئے تو اس کے ادبی کارنامے پھیکے پڑ جاتے ہیں اور ہمارے لئے ادیب ٹالسٹائے نہیں بلکہ یورپ کی مادی تہذیب کا نقاد ٹالسٹائے دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے، یوں تو ٹالسٹائے کے مذہبی اور سیاسی خیالات ہر اس شخص کے لئے اہمیت رکھتے ہیں جو ٹالسٹائے کی دماغی نشوونما کو سمجھنے کا خواہشمند ہے لیکن ہندوستان کے لیے ان میں ایک نمایاں خصوصیت اور دلچسپی پنہاں ہے۔ اگر ہم ہندوستان کے عہد حاضرہ کی سیاسی زندگی کے عناصر معلوم کرنے میں کوشاں ہوں تو گاندھی کی عجیب و غریب شخصیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے یہ ایک ایسا بیّن اور روشن امر ہے جس کا اقرار گاندھی کے مخالفین بھی کرتے ہیں۔ گاندھی کی زندگی کے تدریجی ارتقاء کا مطالعہ کرنے کے لیے ہم کو ان اثرات کو بے نقاب کرنا پڑے گا جنھوں نے گاندھی کو گاندھی بنا دیا۔ ہم کو ان اثرات میں سب سے نمایاں اثر ٹالسٹائے کا معلوم ہوگا جو گاندھی کی ذہنیت کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہے اور اس امر کا خود گاندھی کو بھی اقرار ہے۔ اس طرح ٹالسٹائے ہندوستان کے لئے ایک خاص دلچسپی کا مرکز بن گیا ہے یہ بظاہر حسن اتفاق ہے کہ ٹالسٹائے کے ادبی کارناموں اور مذہبی عقاید کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور یہ نہایت سادہ الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

"کسانوں اور مزدوروں کی زندگی سے انتہائی رغبت و محبت"

اس مختصر مضمون کا مقصد اس محبت کی ابتدا اور اس کی غرض و غایت بتانا ہے اور اس کے

اثرات جو ٹالسٹائے کی زندگی پر پڑے ان کو ظاہر کرنا ہے نیز ان اثرات سے ٹالسٹائے کے نظریات کی نشو ونما کو بھی دکھلانا ہے۔

کسانوں اور مزدوروں کی زندگی سے جو دلچسپی اور اُنس ٹالسٹائے کو عمر بھر رہا اسکی ابتدا اور تدریجی ارتقاء کو ظاہر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ٹالسٹائے کے بچپن اور لڑکپن کا سرسری خاکہ کھینچ دیا جائے کیونکہ انسان کا دماغ ہر جاندار شئے کی طرح اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ بچپن کے اثرات کے دھندلے خاکے ہی جوانی میں ابھرے ہوئے نقوش کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اس طرح بچپن کے ارتسامات سے زندگی کے اصول اخذ کیئے جاتے ہیں۔

کاونٹ لیو ٹالسٹائے ۱۸۲۸ء میں ایک امیر خاندان میں پیدا ہوا۔ اس قدیم خاندان میں روسی زمینداروں کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ٹالسٹائے نے ناز و انداز میں پرورش پائی۔ اس کے بچپن کا زمانہ وسط روس کی خاموش فضا میں گزرا اس زمانہ میں جن آدمیوں میں اس نے پرورش پائی وہ سادہ لوح کسان یا گریشا (GRISHA) کی طرح نیم مذہبی دیوانے تھے جنکی دلچسپ تصویر ٹالسٹائے نے اپنی کتاب بچپن (CHILD HOOD) میں کھینچی ہے ٹالسٹائے کی عمر ابھی ڈیڑھ سال ہی کی تھی کہ اس کی ماں شہزادی میاری ویال کناس کی (MARIE VOLKONSKY) کا انتقال ہوگیا۔ ٹالسٹائے اور اس کے تین بڑے بھائیوں کی پرورش اسکی رشتہ کی چچی ٹلیا وارگوسکی (TALYANA YERGOLSH) کے سپرد کر دی گئی۔ اپنی چچی کی زندگی کا دلکش مرقع ٹالسٹائے نے صلح و جنگ[1] میں کھینچا ہے ٹالسٹائے نے متعدد بار اس امر کا اقرار کیا ہے کہ اسکی زندگی پر سب سے گہرا اثر اس کی چچی کا ہوا۔ "اس نے (چچی نے) مجھ کو محبت کی روحی لذت سے آشنا کیا۔ اس محبت کا درس الفاظ کے ذریعہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ اسکی تمام زندگی اس قسم کی محبت کی درخشاں مثال تھی میں نے اسکو محبت کرتے اور محبت سے مسرور ہوتے ہوئے دیکھا اور میں نے محبت کی روحانی مسرت کو پالیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا سبق تھا" یہ شاید اسکی چچی کی سادہ اور محبت آگیں زندگی کا ہی اثر تھا جس نے ٹالسٹائے کے دل میں بنی نوع انسان کی محبت کا بیج بویا اس کی تصانیف اور زندگی دونوں میں سب سے نمایاں شئے اسکی عالمگیر محبت ہے جس نے ٹالسٹائے کو کسانوں اور مزدوروں کا گرویدہ بنا دیا اس کے بچپن میں دوسری نمایاں خصوصیت جو ہم کو ملتی ہے وہ اس کی قوت تیزی ہے۔ فطرت نے شروع سے ہی اسمیں برائی کو پہچاننے اور اس سے نفرت کی طبعی عادت ودیعت کی تھی وہ اپنے بچپن کے ایک

[1] WAR AND PEACE

واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "ہمارے ساتھ بہت سی عورتیں بھی تھیں جن سے میں ناواقف تھا ہم سب نے مل کر گھومنا اور کودنا شروع کیا۔ اور ٹس ڈور۔ ایونوک (TESDOR IVNOVITCH) (یہ جرمن استاد تھا) نے اپنی ٹانگوں کو بہت بلند کر کے کودنا اور شور مچانا شروع کیا، میں نے فوراً محسوس کیا کہ یہ درست نہیں، میں رونے لگا، تمام لوگ پریشان ہو گئے"

تیسری خصوصیت جس کا اس زمانہ میں پتہ چلتا ہے وہ تشدد اور ناانصافی کی نفرت ہے، ایسے کسان اور مزدور جن پر ہر قسم کا تشدد روا رکھا جاتا ہے اور جن کے ساتھ ہر جگہ ناانصافی کا سلوک برتا جاتا ہے ٹالسٹائے کی محبت کے سب سے زیادہ حقدار تھے۔ وہ اپنے بچپن کی طالب علمانہ زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "مجھ کو ٹھیک طور پر یاد نہیں کہ کس قصور پر (لیکن وہ کوئی ایسی خطا نہ تھی جس پر کہ میں سزا کا مستحق تھا) میرے فرانسیسی استاد سنٹ تھامس (ST: THOMAS) نے مجھ کو کمرے میں بند کر دیا۔ اور کوڑے لگانے کی دھمکی دی۔ میرے دماغ میں (ST: THOMAS) کے خلاف نہیں بلکہ اس تشدد کے خلاف غم و غصہ کے جذبات پیدا ہو گئے۔ ممکن ہے کہ یہی واقعہ میری تشدد کی نفرت کا باعث ہوا ہو جس کو میں نے اپنی تمام عمر محسوس کیا ہے"

چوتھی قابل غور خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا تھا ایک دن جبکہ عمر آٹھ سال کی تھی اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ پیروں کو ہاتھوں سے پکڑ کر کھڑکی میں سے کودنا چاہئے اس خیال کے آتے ہی وہ فوراً اپنے مکان کی سب سے اونچی کھڑکی کی چوکھٹ سے کود پڑا تھوڑی دیر کے بعد وہ زمین پر بے ہوش پایا گیا اور اس کے سر میں خفیف زخم بھی تھا۔

لڑکپن میں اپنے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے ایک دن اس نے یہ محسوس کیا کہ حقیقی خوشی خارج میں نہیں بلکہ وہ انسان کے اندر موجود ہے اس کے حصول کے لئے مصیبت برداشت کرنا ضروری ہے لہذا اس نے اپنے آپ کو مصیبت اٹھانے کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا اور اپنی برہنہ پیٹھ پر اتنے کوڑے لگائے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد موت کا خیال اس کے دل و دماغ پر اتنا غالب آ گیا کہ اس نے دنیا کی تمام مسرتوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور وہ تین دن تک اپنے بچھونے پر پڑا رہا۔

ٹالسٹائے کے بچپن کے اس دھندلے خاکے سے ہم کو ان خصوصیات کا پتہ چلتا ہے جو نشوونما پا کر اس کی زندگی کے اہم ترین اصول بن گئے۔ لیکن ان تمام خصوصیات کا مرکز وہی کارخانے کے گرد و غبار میں کام کرنے والے مزدور اور تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں زندگی بسر کرنے والے

BOYHOOD

کسان ہیں جیسے جیسے ٹالسٹائے کو دنیا کے تلخ تجربات کا سامنا ہوتا گیا اس نے محسوس کیا کہ مغربی تہذیب اور سوسائٹی کے آئینی قواعد نے غریبوں اور امیروں کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا کر دی ہے جس کا پاٹنا مشکل ہے۔ ترقی حقیقی ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ وہ انسانوں کے دلوں کو ایک رشتۂ الفت میں منسلک کر دے اور دنیاوی امتیازات کو ایک حد تک مٹانے کی کوشش کرے لیکن جدید تہذیب نے رنگ اور قوم کی خصوصیات کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ خود تہذیب معرض خطر میں ہے۔ اس خیال کو مدنظر رکھ کر ٹالسٹائے نے انسان کی تاریخ کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانی مسرت کا مفہوم تہذیب کی ترقی کے ساتھ ہر عہد میں بدلتا رہا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جبکہ انسان کی فطرت میں خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس انفرادی خود غرضی میں اس کو ایک مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اپنی ہی خواہشات کو پورا کرنا اسکی زندگی کا مقصد تھا۔ اس کا زاویہ نگاہ تنگ تھا اور اس کی فطرت ارتقاء کے ابتدائی منازل طے کر رہی تھی۔ زمانہ بدلا۔ تہذیب نے ترقی کی اور انسان اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کو اپنے خاندان، ملک و قوم پر بخوشی قربان کرنے لگا۔ تیسری اور آخری منزل پر ابھی ہم نہیں پہنچے اس درجہ پر انفرادیت عوام الناس کی محبت میں فنا ہو جاتی ہے یہ محبت ملک، قوم اور مذہب کی قیود سے آزاد ہے، یہ محبت معصوم اور ملکوتی رنگ لئے ہوتی ہے۔ اس لئے ٹالسٹائے انفرادیت کی شکست کو خدا کی بادشاہت قرار دیتا ہے۔ اور خدا کی بادشاہت کے پانے کے لئے ٹالسٹائے اپنی خودی کو عوام الناس کی زندگی میں گم کر دینا چاہتا ہے۔ مجھ میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں حقیقی معنوں میں زندہ رہوں اور زندگی کے اصلی مفہوم کو سمجھوں لیکن اس کی تلاش ایسے لوگوں کی زندگی میں نہیں کرنا چاہیئے جو زندگی سے تنگ آکر خودکشی پر آمادہ ہوں اس کا پتہ ان سادہ کسانوں کی زندگی میں ملے گا جو خود زندہ رہتے ہیں اور ہماری زندگی کا بھی بار اٹھاتے ہیں میں نے ایسے لاکھوں غریب آدمیوں کو دیکھا ہے جو زندہ رہ چکے ہیں اور زندہ ہیں ٹالسٹائے نے زندگی کے قوانین کی بنیاد ان سادہ انسانوں کے طریقۂ زندگی پر رکھی ہیں اور اس نے ہر اس چیز کو زندگی سے جدا کرنے کی کوشش کی ہے جو انسانوں میں تفریق پیدا کرتی ہے اور چونکہ مغربی تہذیب نے خصوصیت اور رنگ کے زہریلے اثرات کی اشاعت میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اس لئے ٹالسٹائے اس کو مجرم قرار دیتا ہے اس کی نگاہ میں وہ تہذیب تہذیب ہی

ہی نہیں جو مساوات کا خون کرنے پر تلی ہو۔ اس طرح ٹالسٹائے کا پیغام گاندھی کی طرح "نیچر کی طرف واپسی ہے"۔

"وہ ہمارے[1] عہد کی غلامی" میں لکھتا ہے "تفریحی باغات، برقی روشنی، نمائش اور تھیٹر اچھی چیزیں ہیں۔ سگاروں، دیاسلائیوں، قیمتی باروں اور موٹروں میں بھی کوئی برائی نہیں لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ ان چیزوں کے تیار کرنے کے لئے ۹۹ فی صدی کی جانیں کارخانوں کی گرد آلود فضا میں تباہ ہو رہی ہیں اور لاکھوں مزدور غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تو میں ان چیزوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا اگر لندن اور پیٹرس برگ میں برقی روشنی کا اہتمام کرنے کے لئے نمائش گاہیں تعمیر کرنے کے لئے اور خوبصورت روغن تیار کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ چند انسانوں کی بھی زندگی کم یا تباہ ہو (اور اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ ایسا ہو رہا ہے) تو لندن اور پیٹرس برگ میں گیسی چراغ ہی جلنے دو ان دلچسپ نمائشوں اور دلکش روغنوں کو فراموش کر دو لیکن خدا کے لئے انسانوں کو غلام بنا کر انکی زندگی کو کارخانوں میں تباہ مت کرو"۔

اس طرح ٹالسٹائے کسانوں اور مزدوروں کو غلامی سے بچانے کے لئے ان آرام و آسائش کو بھی قربان کر دینا چاہتا تھا جو سائنس کی ایجادات کا نتیجہ ہیں۔ لیکن سائنس کی تخریبی ایجادات اور نمائشی تہذیب کی موشگافیوں پر ہی یورپ کی عظمت کی بنیادیں رکھی ہوئی ہیں۔ اور انھیں کے زور پر یورپ حکومت کر رہا ہے۔ لہٰذا ٹالسٹائے یورپ کی مملکت کے خلاف صدائے احتجاج اس لئے بلند کرتا ہے کہ اس نے عوام الناس کو غلام بنا رکھا ہے اور تمام طاقت و حکومت سرمایہ داروں کے ایک طبقہ تک محدود ہے ایک طرف تو اپنے سیاسی اقتدار کی وجہ سے وہ عوام الناس کو ابھرنے نہیں دیتے اور دوسری طرف دنیا کے تمام تجارتی بازار ان کے ہاتھ میں ہیں جس کی وجہ سے انھوں نے مزدوروں اور کسانوں کو معاشی غلام بنا رکھا ہے۔ ٹالسٹائے نے حکومت کو "تلغراتی چنگیز خاں" کا مضحکہ خیز نام دیا ہے یعنے ایسا چنگیز خاں جس نے اپنے ظلم و تشدد کے دائرہ اثر کو وسیع اور مستحکم کرنے کے لئے سائنس کی ایجادات کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔

وہ اپنی کتاب (KINGDOM OF GOD IS WITHIN YOU. خدا کی بادشاہت تمھارے دل میں ہے) میں لکھتا ہے موجودہ حکومت اور حکمراں طبقہ میں انصاف نام کو

---

[1] THE SLAVERY OF OUR TIME

بھی نہیں۔ سائنس کی ترقی کی بنا پر انھوں نے ملک کو تشدد کے ایک ایسے زبردست دائرے میں مقید کر دیا ہے جس سے کسی شخص کا باہر نکلنا ناممکن ہے۔"

لیکن حکومت کے خلاف تشدد آمیز کارروائیوں کا وہ قایل نہیں اس کا خیال ہے کہ جب لوگ ترک موالات کی حقیقت کو سمجھ جائینگے تو وہ خود بخود حکومت کی مدد روپیہ اور سپاہیوں سے کرنا بند کر دیں گے جب ملک کے افراد کی ایک بڑی تعداد اس اصول پر کاربند ہو جائے گی تو حکومت کا یہ طلسم ٹوٹ جائے گا۔ غلامی سے آزادی کا صرف یہی ایک طریقہ ہے اس بیان سے ٹالسٹائے کے ترک موالات کے نظریہ کی نشوونما بخوبی ظاہر ہے۔

سرمایہ دارانہ سوسائٹی کے متعلق وہ واٹ ٹوڈو (WHAT TO DO) میں لکھتا ہے آرام و خوشی حاصل کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ جدید پیچیدہ ذرایع اور طبی امداد نہیں بلکہ جسمانی آرام اور روحانی اطمینان کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ سادہ زندگی بسر کرنا اور اپنی روزی خود کمانا ہے، جو دنیا میں کام نہیں کرتے ان کو کھانے کا کوئی حق حاصل نہیں، ان کو اتنا کام کرنا چاہیئے جتنا کہ وہ کھاتے ہیں"۔ ٹالسٹائے کی نکتہ چیں طبیعت اس بات کو بھی گوارا نہیں کرتی کہ نوکروں سے عدم مساوات کا سلوک کیا جائے۔ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں میں جو صفائی کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "آج صفائی کا مفہوم صرف دن میں ایک مرتبہ قمیص تبدیل کرنا ہے کل دو دفعہ تبدیل کرنا ہوگا۔ آج نوکر کے ہاتھ صاف ہونے چاہئیں دوسرے دن اس کو دستانے پہننا ضروری ہے اور اپنے ہاتھوں سے خط نقرئی تھالی میں رکھ کر پیش کرنا چاہیئے اس صفائی کی کوئی حد و انتہا نہیں اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انسانوں میں باہم تفریق پیدا کی جائے۔ صفائی وہ صفائی نہیں جس کا انحصار دوسرے کے کام پر ہو۔ ٹالسٹائے ان رہبران قوم و ملک میں سے نہ تھا جو خود آرام و عیش کی زندگی بسر کرکے دوسروں کو تکلیف اٹھانے کی تعلیم دیتے ہیں، جن اصولوں کو اس نے دنیا کے سامنے پیش کیا ان کی سچائی کو اس نے خود کاربند ہو کر ثابت کر دکھایا۔ وہ امیر خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں شہزادی تھی لیکن اس نے اپنے اصولوں کے مقابلہ میں تمام عیش و آرام کو خیرباد کہہ دیا چنانچہ ۱۸۸۱ء میں وہ خانقاہ (OPTIN) کی زیارت کے لئے

اس شان سے پا پیادہ گیا کہ اس کا جوتا دہقان کی دوکان کا بنا ہوا تھا اور اس کا لباس روسی کسان کا تھا اس کے پڑھنے کے کمرے میں آلاتِ کاشت رکھے رہتے تھے وہ کاشت کرتا اور ہل چلاتا تھا انیا سیاون (ANNA SEUVON) جو ٹالسٹائے کے بچوں کی نگہداشت کے لئے ملازم تھی کہتی ہے کہ "۱۸۸۳ء میں ٹالسٹائے نے جوتے بنانا شروع کر دئے اور وہ شخص جس نے ہمیشہ ریشمی موزے پہنے اب معمولی کسانوں کی طرح اپنی پنڈلیوں پر پٹیاں باندھنے لگا" یہ تمام باتیں دنیا میں مشہور ہو چکی ہیں آخری عمر میں ٹالسٹائے اور اس کی بیوی (SOUYA) کے تعلقات تلخ ہو گئے۔ ٹالسٹائے کی دلی خواہش یہ تھی کہ اپنی تمام جائداد غریب کسانوں میں تقسیم کر دے۔ اور اس کی بیوی و بچے غریب کسانوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ لیکن (SOUYA) اس پر رضامند نہیں ہوی۔ ٹالسٹائے اپنے ۲۱ جولائی ۱۹۰۹ء کے روزنامچہ میں لکھتا ہے "میری خواہش یہ ہے کہ میں گھر سے چلا جاؤں میری موجودگی سے کسی کو بھی فائدہ نہیں اے میرے خدا مجھ کو سچائی کا راستہ دکھا میری تمنا صرف یہی ہے کہ میں تیرے احکام کو بجا لاؤں" میں لکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کیا یہ درست ہے میں اپنے آپ کو دھوکا تو نہیں دے رہا ہوں۔ میری مدد کر۔ میری مدد کر۔ میری مدد کر" اس واقعہ کے پندرہ مہینے بعد ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو آٹھویں صدی کا سب سے بڑا ادیب کسان کے لباس میں اپنے گھر کو خیرباد کہہ دیتا ہے صرف اس لئے کہ وہ غریب کسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتا ہے جو اس کو گھر پر میسر نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ اسی سفر کے دوران میں ٹالسٹائے کا انتقال ایک معمولی ریلوے اسٹیشن اسٹاپورو (ASTAPORO) پر ہو گیا۔

نوحۂ غم

از جناب ابوالافتخار سید عبدالغفار صاحب فخر مدرس مدرسہ فوقانیہ چارمحل

بیقراریٔ سکوں برباد کیوں ہی جوش پر — کیوں ہجوم نوحۂ غم ہے لبِ خاموش پر
آہ کیوں تھمتا نہیں یہ گریۂ بے اختیار — آہ کیوں یہ ٹوٹنے پاتا نہیں اشکوں کا تار
کیوں عروسِ شب کے تن پر ہی لباسِ ماتمی — چادرِ ظلمت میں ہی سرتاپا کیوں لپٹی ہوئی
ٹھنڈی سانسیں بھر رہی ہی آج کیوں بادِ سحر — چاک داماں صحنِ گلشن میں ہیں کیوں گلہائے تر
دلربا شیریں ادا دریا ہی کیوں طوفاں بدوش — کیوں ہیں موجیں مضطرب ساحل ہی کیوں خاموش
خاک کیوں سر پر اڑاتے ہیں بگولے دمبدم — آندھیاں چل چل کے پیہم کیوں پٹکھاتی ہیں سر
کیا ہوی وہ دلفریبیٔ فضائے کہسار — کیا ہوی وہ دلکشیٔ نغمہ ہائے آبشار
کیا ہوی وہ دیدہ زیبیٔ بہارِ سبزہ زار — کیا ہوی وہ جانفزائی نسیمِ خوشگوار
صورتِ ماتم کدہ ہی کیوں یہ صحنِ گلستاں — نغمہ سنجانِ چمن ہیں آہ کیوں صرفِ فغاں

آج بے رونق ہی کیوں نکھرا ہوا رنگِ چمن
شامِ غربت سے ہی بدتر آج کیوں صبحِ وطن

وجہِ ماتم پوچھتے کیا ہو بتائیں کیا تمھیں — قصۂ بربادیٔ قسمت سنائیں کیا تمھیں
تارِ برقی نے کیا ہشیار ہم تھے بے خبر — گوشِ شنوا میں یہ پہنچا دی خبر وحشت اثر
شاعرِ شیریں بیاں یعنی سلیم باصفا — کہہ گیا لبیک داعیٔ اجل کو حسرتا

آہ اک انسانِ کامل دورِ ہم سے ہوگیا
گوہرِ نایاب ہاتھوں سے ہمارے کھوگیا

آہ اے روشن دماغ اے کاشفِ اسرارِ فن — آہ اے شمعِ ادب اے شاعرِ رنگیں بیاں

تیرے اوصافِ حمید کب ہیں محتاجِ بیاں — تیری علمی خدمتوں سے خوب واقف ہے جہاں
اف تری وہ قابلیت وہ ترا فضل و کمال — اف وہ مضمون آفرینی اور وہ پرواز خیال
اف وہ تیری جدتِ فکر رسائے ذہنِ تیز — اف وہ تیرا فطرتی جوشِ طبیعت حشر خیز
بھر دیا رنگیں خیالی نے تری اردو میں رنگ — کھودیا آئینۂ الفاظ سے جدت نے زنگ
پُر اثر پُر سوز تو اردو ادب کا ساز تھا — تیری ہستی پر بجا اردو زباں کو ناز تھا

وہ فروزاں تھا توجہ سے تری اردو ادب
شمع بزمِ عالمِ اردو تجھے کہتے تھے سب

طبعِ جدت آشنا سے تو نے اے فردِ فرید — کیا نہ کی تکمیلِ وضعِ اصطلاحاتِ جدید
کیا نہیں ہے یہ ترا اردو پہ احسانِ عظیم — وادیٔ پُر خار ہے اب رشکِ باغِ نعیم
شاعرانِ باسلف نے شانِ اردو کی رفیع — تو نے زورِ علم سے میداں کیا اس کا وسیع
بے کدورت قلب تیرا علم کا آئینہ تھا — سینۂ بے کینہ معلومات کا گنجینہ تھا
غدر کا دیکھا طفولیت میں تو نے انقلاب — گزرا اعلیٰ صحبتوں میں تیرا ہنگامِ شباب
ہمرکابِ مصلحِ قومِ مسلماں تو رہا — ہمنشینِ مایۂ نازِ سخنداں تو رہا

طالبِ علمانہ تو نے اپنی کاٹی زندگی
جستجوئے علم ہی میں تو نے اپنی جان دی

آہ اے آزادِ غم اے بے نیازِ زندگی — آہ اے آسودۂ آغوشِ خاکِ نیستی
تشنۂ فریاد لب، نالہ کناں دل چشم نم — دردانگیز آہ تیرا نوحہ کیا ہوگا رقم
موبر آوردہ زبانِ کلک شعلہ خیز ہے
قاصر از مضمون طرازی طبعِ گوہر ریز ہے

بانیٔ دکن

مجلہ مکتبہ کی شش ماہی جلد کے ساتھ شیر محمد خاں ایمان کے سلسلۂ کلام کو بھی ختم کر دیا گیا۔ ایمان کے کلیات میں ابھی بڑی گنجائش ہے کم از کم فرصت کے وقت اُن کی شاعری پر ایک اختتامی مضمون لکھنے کی ضرورت ہوگی۔ مجلہ مکتبہ کی دوسری جلد کے ساتھ ایک دوسرے شاعر بھی نراین شفیق (وصاحب) اورنگ آبادی کے کلام کے نمونے شروع کیے جاتے ہیں صاحب اپنی ایک تالیف "چمنستان شعرا" کی وجہ سے مشہور ہیں۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) اس تذکرہ کو چھاپ رہی ہے رسالہ اردو (جولائی ۱۹۲۷ء و جنوری ۱۹۲۸ء) میں ان کے کلام کے نمونے آچکے ہیں اور رسالہ تجلی حیدرآباد (جنوری ۱۹۲۸ء) میں بھی صاحب کی مثنوی "تصویر جاناں" پر میرا ایک مضمون چھپ چکا ہے۔ اس میں ان کی تصانیف اور حالات سے روشناس کرانے کی ایک حد تک کوشش کی گئی تھی۔ اب جو کلام کے نمونے پیش کیے جائیں گے اُن کے کلیات سے منقول ہوں گے۔ یہ کلیات ایک عنایت فرمانے عنایت کیا ہے۔ کلیات کے سرسری مطالعہ سے میری اگلی معلومات میں ایک گونہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس میں صاحب نے خود اپنی "سوانح عمری" منظوم لکھی ہے اگرچہ کہ یہ سوانح عمری ناقص سی معلوم ہوتی ہے تاہم موجودہ معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ پہلے کلیات ہی کے معلومات کے اقتباسات دئے جائیں گے تفصیل کے لئے "رسالہ تجلی" دیکھنے کی زحمت گوارا کیجئے۔

(منظوم سوانح عمری)

.....	.....
نام صاحب سے اب بجا ساز	ایجاد کی داستاں ہے آغاز
سال ہجری کا تھا بڑا ٹھاٹھ	گیارہ سو پچاس اور آٹھ
تاریخ صفر کی دوسری تھی	یک شنبہ کے شام کی گھڑی تھی
.....	.....
میزان کے بیچ مشتری تھی	برج ہفتم کو بہتری تھی

تب حق نے کیا کرم سا بجا	مولد ہی مرا انجستہ بنیاد
دیکھے پنجتن اور سترا ان	سب نے کہے بھی خزائن
جب عمر کے چار برس بیتے	مکتب مجھے بھیجنے کو چلے
استاد و ادیب نیک اطوار	عبدالقادر مشیت آثار
تعلیم پہ میری ہو کے ماؤ	بہبود رکھے تھے میری منظور
از بس کہ تھی مجھ کو طبع موزوں	رہتا تھا مجھے تلاش مضمون
نو سالگی میں جب عمر آئی	فکر اشعار دل پہ چھائی

جس دم میں لیا عیار دانش منظوم کیا بہار دانش اس کا جب منتخب کیا میں نام و اشعار لکھ لیا میں
اُستاد سے لے سبق کو ہر روز موزوں کرتا تھا سخت جاں سوز "اشعار چہستاں" رکھا نام جب سال دگر کیا میں اتمام
اس طور سے دس ہزار اشعار دہ سالگی میں ہوئے نمودار پھر میں نے لکھا نسب میں نامہ سیراب ہو جس سے روح خامہ
نثر رنگیں میں کئی حکایات تحریر کیا میں شوق دل سات روآئینہ کا مناظرہ لکھ زلف ورخ کا مکابرہ لکھ
جس وقت ہوا وہ نسخہ اتمام "گلدستہ انجمن" رکھا نام .....
پھر تذکرہ ریختہ لکھا میں اس فکر میں مدتیں رہا میں لکھا گل رعنا تذکرہ کو تحفے ہند میں جو کہ فارسی گو
.... احوال جناب شاہ آزاد خوش وقت لکھا میں دل شاد
شعرا کا چمن ستاں رکھا نام ہوئیں سات ہزار بیت اتمام نام اس کا "جواہر زواہر"
یہ نام تو حاوی عدد ہے سال ہجری پہ جد و کد ہے ہی پانچ ہزار بیت ظاہر

(نام، تخلص، وطن)

مرا اچھی نزاین نام ہے صاحب تخلص ہے دکن کی سرزمیں میں مجھ سے سو اندکور ہے کس کا

(آزاد کی شاگردی)

کیوں نہ صاحب نام ہو عالم کی محفل میں ترا ہوں غلام اب حضرت آزاد سے سلطان کا

(عالی جاہ کا توسل)

ارادہ تذکرہ کا ہو اگر صاحب ترے دل میں مجھے اس میں غلام آزاد عالی جاہ کا لکھنا

عالی جاہ کے علاوہ ان کے چھوٹے بھائی میر جہانگیر علی خاں سلیمان جاہ سے بھی ربط معلوم ہوتا ہے۔

میں وہی بندۂ درگاہ سلیماں جاہ ہوں تم نے ہر چند غلامی سے اب آزاد کیا

(آزاد کے بھتیجے میر اولاد محمد ذکا سے مراسم)

روٹھنا بندہ سے صاحب کا عبث ہے اے ذکا حیف ہے آقا ہونا خوش جاں نثاں نوکر کے ساتھ
تمہارا اے ذکا بندہ ہوا صاحب اگر دل سے تکلف برطرف سرکار کا کیا اس میں نقصان ہے
ذکا کے امر عالی سے تجاوز نہیں مجھے صاحب مکرر اس سخن کا کر لیا ہے امتحاں تو نے
عقیدت ہے ذکا سے میرے تئیں از بس کہ اے صاحب مجھے ورد زباں ہے رات دن یا پیر یا ہادی
اک آن جدائی نہو صاحب سے ذکا کو اللہ کرے میری جو نیت ہے بر آوے
صاحب تو بندگی سے ذکا کی نہ جائے گا کیا فایدہ ہے اس کو مفسد کرے ہے

کلیات میں تقریباً جملہ اصناف سخن نظر آتے ہیں۔ غزلیں عموماً پانچ پانچ شعر کی ہیں کہیں کہیں حسب ضرورت زیادہ بھی وہ خود کہتے ہیں ؎

میں نے ابیات تامل سے کہا ہوں کم کم حسب احوال کہا ہوں گا میں اشعار بہت

(لفظ گورنر کا استعمال)

ٹوپی کے پہرے[1] سے اے کافر تری سج اور ہے تو گورنر ہے کلہ پوشوں کا یا ہے پاشاہ

جب ولی دلی میں پہنچے ہیں تو شکایت کی ہے کہ

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین[2] جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

شرف الدین علی خاں پیام بھی دلی کے دل لوٹنے والوں کا پیام پہنچاتے ہیں۔

دلی کے کج کلاہ لڑاکوں نے کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا[3] ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

اور مرزا علی لطف بھی ایک آواز کہ دیتے ہیں۔

ہُوا آوارہ ہندستاں سے لطف آگے خدا جانے[4] دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے

لیکن صاحب "از دست خویشتن فریاد" ہیں۔

بے وفا ہیں گرچہ سب جا خوب رو لیکن اُن میں حیدر آبادی خصوص

سودا کی تاریخ ایک عدد کے تخرجہ سے کیا خوب کہی ہے:۔ ع

"ہائے سودا جہاں سیں گذرے"

ب "صاحب کے آبا و اجداد پنجاب کے کھتری[5] اور لاہور کے مشوطن شہنشاہ عالمگیر نے"
"جب دکن پر فوج کشی کی تو اُن کے دادا لالہ بھوانی داس لشکر کے ساتھ آکر خجستہ بنیاد"
"اورنگ آباد میں سکونت پذیر ہو گئے صاحب کے والد لالہ منارام اور صاحب"
"کی ولادت اورنگ آباد میں ہوی منارام حضرت آصف جاہ اول کے پیش کار تھے"
"تخلص نراین کا اردو میں صاحب اور فارسی میں شفیق تخلص تھا نواب آصف جاہ ثانی کے"
"فرزند دلبند میر احمد علی خاں عالیجاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے، مولانا میر غلام علی آزاد"
"بلگرامی سے تلمذ تھا، بہار دانش، گلدستہ انجمن، چمنستان شعرا، اشعار چمنستان، نسب نامہ"
"رو آئینہ زلف و رخ، گل رعنا، جواہر زواہر کے علاوہ تنمیق شگرف، حقیقت ہائے ہندوستان"
"مآثر آصفی، دیوان صاحب (یقین کے دیوان کا جواب) حالات حیدر آباد، لباب الغنائم"

---

[1] آب حیات صفحہ ۹۳ [2] تذکرہ میر حسن صفحہ ۶۷ [3] مقدمہ گلشن ہند صفحہ ۱۲

تنقیدیں

تندرستی تقطیع ۷½ × ۵ ۔ صفحات ۱۰۰ ۔ مطبوعہ مطبع برقی (چارکمان) قیمت ۱؎ مصنف یا محمد علی احمد حسین تاجر کتب گلزار حوض (حیدرآباد دکن) سے ملسکتی ہے۔

یہ کتاب جناب واجد علی صاحب قادری صدر مدرس تحتانیہ قصبہ پرہ پلی ضلع کریم نگر کی مؤلفہ ہے۔ مولف نے یہ کتاب طبی اصول کو پیش نظر رکھکر لکھی ہے۔ کتاب موضوع کے اعتبار سے مفید اور بلحاظ طرز بیان دلچسپ ہے۔ اردو میں کم عمر بچوں اور صنف لطیف کے پڑھنے کیلئے بہت کم مواد موجود ہے۔ اسلئے یہ کتاب قابل توجہ ہے۔ ضلع مذکور کی انجمن اساتذہ اس باب میں مبارکباد کے قابل ہے کہ اسنے اس مفید کتاب کو اپنے زیر سرپرستی شائع کرکے نہ صرف مولف کی محنت کو ٹھکانے لگایا بلکہ طبقہ مدرسین میں تصنیف و تالیف کے مشغلہ کو جاری رکھنے کی تحریک پیدا کردی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دیگر حلقوں کی انجمنیں بھی لائق مدرسین سے طلبہ کے استفادہ کیلئے مفید و پر از معلومات کتب لکھوانے کی کوشش کرکے علمی ثبوت پیش کرینگی۔

حمایت المصلیین تقطیع ۷½ × ۵ ۔ صفحات ۵۰ ۔ مطبوعہ مطبع برقی ۔ قیمت کا اندراج نہیں ہے۔

یہ کتاب بھی جناب واجد علی صاحب کی مرتبہ اور انجمن مذکور کی علمی دلچسپیوں کا نتیجہ ہے۔ مرتب نے اس کتاب میں معرفت خدا کا بیان، نماز، تشہد، اذکار اور ادعیہ کے علاوہ پانچوں کلموں اور صفت ایمان مجمل و مفصل وغیرہ کو ان کے اردو ترجمہ کے ساتھ درج کیا ہے۔ مرتب صاحب نے جہاں طلبہ کی خاطر اتنی محنت و جانکاہی کرکے اس کتاب کو لکھا ہے اگر اس کے ساتھ ساتھ سلاست بھی ان کے پیش نظر ہوتی تو شاید کتاب کو مفید سے مفید تر بنانے میں انہیں کا حصہ ہوتا۔

لعقائد حمایت ا تقطیع ۷½ × ۵ بیچ ۔ صفحات ۶۵ ۔ مطبوعہ مطبع برقی ۔ قیمت درج نہیں ہے۔

یہ منظوم رسالہ بھی جو در اصل احسن المسائل اور کیمیائے سعادت وغیرہ سے ماخوذ و منتخب ہے واجد علی صاحب کی جدت طبع کا نتیجہ ہے جس طرح مولانا محمد شجاع الدین قادری علیہ الرحمہ کا رسالہ "کشف الخلاصہ" تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں بلحاظ اپنی جامعیت کے مقبولیت حاصل کرچکا ہے اسی طرح لائق مولف نے بھی اس مختصر سے رسالہ میں شرعی مسائل کو حصر و نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ رسالہ بلحاظ زبان و بیان، قدیم اسالیب کا حامل مگر مفید اور قدر کے قابل ہے۔

جیون چرتر تقطیع ۸½ × ۵½ ۔ صفحات ۸۰ ۔ مطبوعہ مطبع تاج حیدرآباد دکن ۔ یہ نفیس

اور مصور کتاب رائے تیجرائے سرکیاشی کی سوانحعمری ہے۔ جنکی تصویر گذشتہ نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ اسکے مرتب رائے صاحب کے نوجوان نواسہ مسٹر ڈی گرووس متعلم بی۔ اے (عثمانیہ) ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں رائے صاحب کے بلاک کی تصویر ہے۔ رائے ہری لعل صاحب ایم۔ اے نے تعارف لکھا ہے۔

مسلمانوں کی سلطنت ہند کے دور میں فارسی زبان کا رواج تھا۔ اور اس زبان میں جس طرح کایستھ قوم کے افراد نے کمال پیدا کیا اسیطرح چھتری بھی اس میں پیش پیش تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی زبان کے ہندی دور میں ان اقوام نے اسکی ویسی ہی خدمت کی جیسی ایرانیوں نے عربی کی کی تھی۔ اس باہمی ارتباط اور تعاون کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اکثر ہندو بزرگ بھی اعلےٰ ترین سرکاری خدمات پر فائز کئے جاتے تھے۔ راجہ مان سنگھ راجہ ٹوڈرمل۔ راجہ چندولعل اور خود رائے تیجرائے کی مثالیں سرسری طور پر پیش ہوجاتی ہیں۔

رائے گرووس صاحب نے کتاب کے مواد کی ترتیب میں سلیقہ سے کام لیا ہے۔ خاندان، ملازمت، قومی خدمات، علمی خدمات اور تمام ضروری امور پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کو ختم کرنے کے بعد پائیگاہ کے میر مجلس اور "صحیفہ آسمانجاہی" کے مصنف کی زندگی اور اہمیت کا خاکہ ذہن نشین ہوجاتا ہے۔ یہ سوانح نگاری کی خوبی ہے۔ سوانح نگار درحقیقت آیندہ مورخ کیلئے مواد فراہم کرنیوالا ہوتا ہے "جیون چرتر" بھی چھتری قوم کی تاریخ میں ایک کڑی کا اضافہ ہے۔ قوم کے باعظمت بزرگوں کی سوانحعمریاں، نہ صرف قوم کے کردار کو درست کرنے میں کام آتی ہیں۔ بلکہ ان کے ذریعہ مستقبل بعید پر حکومت کیجا سکتی ہے۔

ہونہار مولف کا اپنے بزرگوں کے ساتھ یہ جذبہ احترام نہایت قابل تعریف اور سبق آموز ہے امید ہے کہ وہ اپنی علمی کوششوں کو اسی طرح جاری رکھینگے۔

عروج عثمانی

تقطیع ۲۲×۲۸-انچ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد کی قیمت بلا فریم ۳ روپے مع فریم ۱۰ روپے

حضرت سلطان العلوم کے دور مسعود میں حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں جو تمدنی ترقیاں ہوئیں ان کے اجمال کا ایک نقشہ چارٹ کی صورت میں تیار کیا گیا ہے نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹرایٹ لا مشیر امور عامہ اسکے محرک اور مولوی محمد سلطان الدین خانصاحب اس کے مرتب ہیں۔ تمام مواد کو "ملک پر اگریسو کونسل کی حکومت" اور "ملکی آمدنی کا ملک پر خرچ" کے دو اہم عنوانات پر تقسیم کیا ہے۔ اور تقریباً سلطنت کے تمام ضروری شعبوں میں جو ترقیاں ہوئی ہیں انکا اجمالی ذکر کیا ہے۔ بیچ میں حضرت اقدس و اعلیٰ کی شبیہ مبارک ہے۔ مولوی سلطان الدین خانصاحب کی یہ جدت طرازانہ سعی قابل تحسین ہے اور یہ چارٹ ہر گھر اور ہر دارالمطالعہ بلکہ ہر دفتر و ہر مدرسہ میں آویزاں کئے جانے کے قابل ہے۔ تاکہ ہمیں اپنا بڑا ملک کے متعلق ضروری معلومات سے ہر وقت آگاہ ہوتا رہے۔

"م" اور "س"

فہرست مضامین مجلہ مکتبہ

(جلد اوّل)

مضمون	مضمون نگار	مضمون	مضمون نگار
۱۔ سائنس		اشارات اعجام	جناب محمد محسن خاں صاحب نصاحتیں
شناسیں اور اشعاع	جناب فیض محمد خاں صاحب صدیقی بی اے	تاریخ ادبیات اردو اور دور تحریک	مدیر
میکل فیراڈے اور اسکے افادی سائنس	عبید الوہاب صاحب	نسوانی شاعری (منظقانہ نقطہ نظر میں)	جناب ابو العرفان فضائی
انتخاب واقعات	محمد انتصار الدین صاحب بی اے	کرنل میکنزی کا مجموعہ ادبیات مشرقی	مدیر رسالہ کیف
۲۔ فلسفہ اور مذہب		محمد حسین آزاد اور جدید شاعری	جناب غلام محی الدین صاحب حیدرآبادی
فلسفہ کا تاریخی نشو و نما	جناب میر نجم الدین صاحب بی اے ال ال بی	بہار ستان عشق یا لیلیٰ مجنوں	جناب سید غلام محی الدین صاحب فیضی زور
ضمیر اور اسکا دائرۂ عمل	بی۔ بی انشا صاحب	اردو شاعری اور جدید عروض	احمد عبد اللہ المدنی صاحب بی اے
ہندوستان کے مذاہب (الفہرست کا ایک مقالہ)	مرتبہ علیصاحب مولوی کامل		سید محمد صاحب ایم۔ اے
۳۔ تاریخ اور معاشیات			جناب سراج الدین صاحب طالب ایم۔ آر۔ اے۔ ایس
ایک قدیم دکھنی شہر اور اسکی درسگاہ	جناب محمد علی خاں صاحب مستعلم بی اے	یورپ میں ادبی نشاۃ ثانیہ اور اردو کی ترقی۔	حمید اللہ صاحب بی۔ اے
نواب نظام علیخاں بہادر اور انگریزوں کے مستقل تعلقات کی ابتداء۔	جناب میر محمود علیصاحب ایم۔ اے	غزل ایک مسخرہ شاعر	جناب مسعود الرحمن صاحب ندوی
حجاز کے فرنگی سیاح	جناب سید علی بشیر صاحب	علامات وقف	پروفیسر سید محمد صاحب ایم۔ اے
ہندی حسن کاری کا اثر چین اور جاپان پر	عمر حسین صاحب زبیری	عربی ارقام کی اصل ہندی ہے	جناب مظہر الحق صاحب صدیقی
یورپ اور ایشیا (معاشی نقطہ نظر سے)	غازی الدین احمد صاحب بی اے۔ ایچ۔ سی۔ ایس	**۵۔ افسانے**	
۴۔ زبان و ادب		شہید تخیل	جناب محمد مظہر اللہ صاحب صدیقی
ڈاکٹر جانسن کل کرسٹ	سید محمد صاحب ایم۔ اے	شب غم	"
نواب الدولہ خان تمیز	جناب تسکین کاظمی صاحب	بھکاری	جناب احمد عارف صاحب
کلیات وطن کا دیباچہ	غلام معین الدین صاحب یوسفی	پنہاری کا کنواں	جناب غلام رسول صاحب
آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر کا ایک نمونہ۔	جناب عمر باقی صاحب	جیسی کرنی ویسی بھرنی	جناب ڈی گرووس صاحب
		لکشمی	جناب ڈاکٹر اعظم صاحب ہریدی
		۶۔ دکھنیات	

انتخاب کلام شیریں زبانیان — جناب عمر یافعی صاحب (مسلسل چھپ نہیں رہی)

۷۔ متفرقات

اردو جھنڈی بولی	محمد حمید اللہ صاحب بی اے

۸۔ منظومات

مجلہ مکتبہ	مولانا سید غلام مصطفےٰ دہلوی
دعا	مولانا وحید الدین سلیم مرحوم
غزل	جناب صفی اورنگ آبادی
حجاب	جناب بوش ملیح آبادی
چاندنی رات اور حسین لڑکی	جناب میر خاطر صاحب عزت بی اے ایچ۔ سی۔ بیس
لب خاموش	جناب بدر الدین خاں شکیب
مہمان کا راگ	جناب سید محمد اکبر صاحب وفا قانی بی اے
نل اور کنول کا مناظرہ	سید محمد حسین صاحب آزاد
سچ ہے	صفی اورنگ آبادی
کیف تغزل	کیفی حیدرآبادی
دل	مولانا سیدہ ابراہیم صفو
جان مضطر	الکلام محمد بدر الدین صاحب بدر
رباعیات	جناب تمثیل حیدرآبادی
ابر کی زبان سے	جناب سید عبد الغفار صاحب فخر
تو ایسے سماں میں آ پیاری	جناب محمد اکبر صاحب وفا قانی بی اے
غزل	پروفیسر ظفر تاباں صاحب دہلوی
غزل	میرزا علی رضا صاحب ماہر شیرازی
ورد دل	جناب میر شمس علی صاحب فغاں
لوگ	جناب صفی حیدرآبادی
غزل	جناب اختر شیرانی
گولکنڈہ	جناب اعجاز حسین صاحب شہرت
پیری	جناب بوش ملیح آبادی
پردہ و پردگی	جناب مرزا نظام شاہ صاحب حبیب تیموری
مطرب سے خطاب	جناب اللہ بخش صاحب تیج بی۔ اے
رباعی	جناب صفی اورنگ آبادی
رباعیات تمثیل	جناب تمثیل حیدرآبادی
محبت الفاریہ	مولانا سید ابراہیم صفو
سخن ہائے گفتنی	جناب ابو الفاضل راز چاندپوری
باقیات فانی	نواب احمد نواز جنگ بہادر فانی

۹۔ تنقیدیں

مصنوعی بیوی	پیر اور دیگر حضرات
تزک بابر	
نگار (مومن نمبر)	
مخزن (سالگرہ نمبر)	
زمانہ (جوبلی نمبر)	
بہشتی زیور	
گدگدی (حصہ اول)	
صراط الحمید	
عصمت (جوبلی نمبر)	
صوفی (عید نمبر)	
سفینہ (مجلہ)	

بہترین افسانے

پریم پچیسی ہر دو حصص از منشی پریم چند ... ۱۲ر
پریم بتیسی " " ... ۱۲ر
بازار حسن " " ... ۱۲ر
خاک پروانہ " ... ۱۴ر
خواب و خیال " از احمد شجاع ... ۱۴ر
چمپا اور دیگر افسانے ... ۱۴ر
جلال الدین خوارزم شاہ از سجاد حیدر ... عال ۱۲ر
خیالستان ... // ... ۱۴ر
اقتباسات ... // ... ۱۴ر
زرین افسانے ... // ... ۱۴ر
ہیبت ناک افسانے از اقتیاد علی تاج ... ۱۴ر
الہامی افسانے از مرتضیٰ احمد خاں ... ۱۴ر
سیر گل از جلیل احمد فدوائی ... ۱۴ر
پس پردہ از آغا حمید حسین ... ۱۴ر
صبح وطن از منشی سدرشن ... ۱۴ر
سدا بہار پھول " ... ۱۵ر
چندن " ... ۱۴ر
بہارستان " ... ۱۳ر
افسانہ جوش از جوش ... ۱۴ر
حفیظ کے افسانے از حفیظ ... ۱۴ر
طوفان زندگی از وحشی ۔ تصویر معاشرت از وحشی ۔ ۱۴ر
زندگی کی صبح و شام از وحشی ۔ درس عبرت " ۱۴ر
عروج زندگی از وحشی ۔ مہب زندگی از وحشی ۱۴ر

تازہ رسائل

نیرنگ خیال ۵ر کلدار معادل ۵ر ۱ر عثمانیہ
ہمایوں ۸ر کلدار " ۹ر ۴ر "
مخزن ۶ر کلدار " ۷ر "
نظام گزٹ ہفتہ وار ... ۲ر ۶ر
عالمگیر ۵ر کلدار معادل ۵ر ۱ر عثمانیہ
معارف ۸ر کلدار " ۹ر ۴ر "
مجلہ مکتبہ ... ۶ر "
رعیت ہفتہ وار ... ۲ر "
عصمت ۷ر کلدار معادل ۸ر ۲ر عثمانیہ
ہمایوں ۸ر کلدار " ۹ر ۴ر "
تحسینی سہ ماہی ... ۱۲ر "
عالمگیر خاص نمبر ۱۴ر کلدار معادل ۱۴ر عثمانیہ
سفینہ سہ ماہی (مدراس) ... ۱۴ر "
نیرنگ خیال عید نمبر ۱۴ر کلدار معادل ۱۴ر "
زمانہ ... ۸ر " " ۹ر ۴ر "
مجلہ عثمانیہ سہ ماہی ... ۱۴ر "
عصمت کا جوبلی نمبر عال کلدار معادل عال عثمانیہ
تازیانہ ہفتہ وار ۱ر " ۱ر ۳ر "
طاقت " ۲ر " ۲ر ۶ر "
زبان خاص نمبر ۱۴ر کلدار ... ۱۴ر "
نیرنگ تیر نمبر ۱۴ر کلدار ... ۱۴ر "

ملنے کا پتہ
مکتبہ ابراہیمیہ ایڈورڈ ہی محمد ڈوشیشن روڈ حیدرآباد دکن

* اضافہ ۱ر ۴ر عثمانیہ ۲ر انگلستان بالجوب ۲ر عثمانیہ

افتخار الحکما نواب حاذق جنگ مرحوم سابق افسر الاطبا فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت اور بڑی خوشی کے ساتھ محض بیماروں کی شفا کی غرض سے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں برص منتشر (یعنی کوڑ اور سفید داغ) کا علاج نہایت مشکل ہے۔ یہ مرض عموماً بڑھتا ہی جاتا ہے حکیم مولوی محمد عبدالقادر صاحب مدگار صدر مخزن الادویہ یونانی سرکار عالی ورکس دارالتشخیص و انجمن اطباء حیدرآباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولیٰ رکھتے ہیں صاحب موصوف نے اکثر مریضوں کے برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور بہ فضلہ کامیاب ہوئے میں نے بچشم خود مریضوں برص کا معائنہ کیا ہے بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہو جاتا ہے حکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور مجرب دوا کا اثر ہے میں حکیم صاحب موصوف کو اپنے کمپنی مرض ہائے برص کی دوا سے مجرب کی ایجاد پر مبارک باد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہیئے کہ وہ اس دقیقہ کو غنیمت سمجھ کر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور اس مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وما علینا الا البلاغ شرحدتخط (افتخار الحکما حاذق جنگ)

بیجیسٹال بام

بیرونی استعمال کی پر تاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی درد اندرونی ہو دوسرے کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے اسکو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد بار آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور کوئی خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہیے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے علی الخصوص نقرس۔ وجع مفاصل۔ دمہ۔ درد سر۔ درد سول۔ بچھو کے زہر کے لئے اور زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال تھوڑی دوا لے کر دن میں تین چار دفعہ مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان دوا طلب فرمادیں۔ بھوٹنی تیسل کیجائیگی۔ نوٹ۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کیے جاتے ہیں۔ فقط المشتہر

جیمس اینڈ کمپنی مرچنٹس کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

مطبوعاتِ مکتبہ

فن میں اُردو مرتبہ مولوی محمد فضیہ الرحمٰن ہاشمی صاحب منشی فاضل۔ نوابی ہندیں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی اورنگ زیب کے دور میں اُردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اُردو کا تذکرہ مع نمونہ کلام ضخامت ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۱۶ کاغذ مکینا بارہ دوم قیمت عمدہ لکھائی چھپائی

جہانِ اُردو مرتبہ جناب محمد عارف صاحب جبیر آبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرائے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۴۵۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت فی جلد مجلد ۱۲ عمدہ

روحِ تنقید مصنفہ مولوی ابو الحسنات سید غلام محی الدین قادری نور ایم اے فن تنقید کے متعلق اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۵۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت فی جلد مجلد ۱۲ عمدہ

تنقیدی مقالات مصنفہ نور صاحب۔ یہ روحِ تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روحِ تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی، فارسی اور اُردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کرکے ہر ایک کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشا پردازوں کے طرزِ تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کیے گئے ہیں ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۱۶ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد ساڑھے ۳ روپے

اُردو کے انشائیہ بیان مصنفہ نور صاحب۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرزِ تحریر و انداز بیان کا تذکرہ۔ خاص طرزِ تحریر کے اُردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ساڑھے ۳ روپے

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ نور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی، ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ر

دنیائے افسانہ مصنفہ مولوی محمد عبد القادر سروری ایم اے ایل ایل بی، افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ۔ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات اُردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۱۸۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عمدہ

ہادیٔ فلسفہ مرتبہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی، ڈاکٹر اے یس رابرٹسن پی۔ ایچ۔ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا ملخص اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۴ر

اربابِ نثر اُردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اُردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ فتح ۴۴۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عام

آثار الکرام جلد اول صفحہ شمس المورخین جناب مکیریٹر شمس اللہ قادری ایم اے۔ ایس۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی مستقل تاریخ ضخامت ۴۴۰ صفحے۔ سائز ۲۷×۱۸ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۴ر

جواہر کلیات نظیر مرتبہ جناب مولانا ذہین وسیم فخار احمد نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے اخلاقی۔ ادبی نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۸۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاص قیمت عمدہ

عقائد امام مترجمہ مولوی محمد عبد الغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اردو ترجمہ۔ قیمت ۴ر

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی محمد عبد اللہ مسدوسی بی اے آئیں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ر

دکنی لغت مولفہ مولوی سید شعار احمد شعار ہاشمی۔ اردوئے قدیم یعنی دکھنیات کی لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ر

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبد الغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحبدل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۱۴۸ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵ر

خزینۂ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبد العزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶ر

سیرت خیر البشر سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱ر

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بدخو شوہر کو ٹھیک کرسکتی ہے۔ قیمت ۲

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ۔ انجمن امدادیا ہی مکتبہ ابراہیمیہ روبرو محکمۂ مالگزاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھوگرافر منیجر مطبع

مجلۂ مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم اے۔ ال ال بی

مجلۂ مکتبہ

۱۔ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲۔ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳۔ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴۔ قیمت سالانہ (للہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عالیں) فی پرچہ ۶

۵۔ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (۵) نصف کے لئے (۳) اور چوتھائی کے لئے (۲) ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُنکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلہ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ اُنکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس عنایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلہ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ مہیسر آباد دکن ہونی چاہیئے۔

رجسٹرڈ نشان پٹہ سرکار آصفیہ (۶۵)

مجلّہ مکتبہ

رجسٹرڈ نشان پٹہ سرکار انگلیشہ (.....)

جلد (۲) بابتہ ماہ دی ۱۳۳۸ف م نومبر ۱۹۲۸ء شمارہ (۲)

تصویر:- مولانا جمال الدین نوری مرحوم پروفیسر عربی نظام کالج

فہرست

	مضمون		صفحہ
۱	شذرات	از مدیر	ب
۲	حالی اور جدید شاعری	از جناب احمد عبداللہ صاحب المسدوسی بی۔ اے۔	۱
۳	قصہ ناتمام	" "اپالو"	۱۰
۴	بہرام گور دکن میں۔	" ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب قادری زور ایم۔ اے۔	۲۷
۵	پروفیسر جمال الدین نوری	" مولانا محمد جعفر صاحب مولوی کامل	۴۶
۶	بادۂ دکن (بچھمی نرائن۔ صاحب تخلص اورنگ آبادی)		۵۷
۷	احساسات (نظم)	از جناب پروفیسر ظفر تاباں صاحب (رامجس کالج دہلی)	۶۲
۸	دکھیاری بلبل	" سید شبیر حسین صاحب قیس	۶۲
۹	خیالات آزاد (نظم)	" سید محمد سین صاحب منشی فاضل آزاد	۶۳
۱۰	تنقیدین	"س"	۶۴
۱۱	(نغمہ راز اور شیب و شباب)		
۱۲	اشتہارات		

*

شذرات

اِس ماہ میں اعلیٰحضرت سلطان العلوم خسرو دکن، دہلی کے نو تعمیر محل کو ملاحظہ فرمانے کی غرض سے شہزادگان بلند اقبال، شہزادیان ہمایون فال اور محلات عالیہ کے ساتھ ہندوستان کی اس قدیم ترین راجدھانی میں رونق افروز ہوئے تھے جو کبھی ہندو مہاراجاؤں اور کسی وقت مغل شہنشاہوں کی تخت گاہ اور ہر وقت مرکز سلطنت رہی۔ اعلیٰحضرت کی یہ روانگی خانگی تھی لیکن اسکے باوجود شمالی ہند کے باشندوں خصوصاً دہلی اور اس کے نواح کے رہنے والوں نے، آپ کی ہر دلعزیزی سے متحرک ہو کر آپ کا غیر معمولی اور تاریخی خیر مقدم کیا۔ اخباروں اور رسالوں نے اپنی دلی ارادت اور عقیدت مندی کے اظہار کیلئے خاص نمبر شائع کئے۔ آپ کا قیام دہلی میں دو ہفتہ سے کچھ زیادہ نہیں تھا۔ اِس دوران میں والیسرائے بہادر اور جن جن حضرات نے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، آپ کی غیر معمولی ذہانت اور استقلال کردار سے بے حد متاثر ہوئے۔

آپکی مراجعت کے موقع پر بلیر میں نہایت وسیع اور مہتمم بالشان پیمانہ پر خیر مقدم کا اہتمام کیا گیا تھا اعلیٰحضرت کی گزرگاہ اور دیگر مقامات پر تیس سے زیادہ عارضی کمانیں ہر قوم اور طبقہ کے جانب سے نصب کی گئی تھیں۔ ۱۹ ردی ۱۳۳۶ف کی شب میں روشنی بھی ایسی غیر معمولی کیگئی تھی کہ جسکی نظیر مشکل سے مل سکیگی۔

۲۰ ردی ۱۳۳۶ف کی صبح کو رعایا کی جانب سے اعلیٰحضرت کی خدمت میں بالمشافہ اظہار عقیدت کرنے کے لئے، اڈریس پیش کیا گیا۔ اس کے جواب میں حضور نے زبان بلاغت ترجمان سے جو کچھ ارشاد فرمایا، وہ بادشاہوں کی نسلوں کے لئے ایک لائحہ عمل بننے کے قابل ہے۔

۱۳۳۷ف کی اشاعت میں ہم نے پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللطیف بی۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) کی انگریزی کتاب "غالب، زندگی اور شاعری پر ریویو کے زیر طبع ہونے کا ذکر کیا تھا بڑی مسرت کی بات ہے یہ اب منظر عام پر آچکی ہے اور ادبی حلقوں میں اسکو خاص اہمیت دی جارہی ہے ڈاکٹر بجنوری کے مقدمہ دیوان غالب کو پڑھنے کے بعد اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں اسکی قیمت تین روپیہ ہے اور منتظم مجلہ عثمانیہ، نظامت منزل نیز مکتبہ ابراہیمیہ (حیدرآباد دکن) اسکی مل سکتی ہے

کچھ دنوں پہلے جامعہ عثمانیہ کے ایک ہونہار فرزند ڈاکٹر سید حسین کے جامعہ لندن سے بامراد و فائز بلدہ ہونیکی خبر بڑی مسرت کیساتھ پڑھی گئی تھی۔ اب اس سلسلہ میں ڈاکٹر ولی الدین ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی، بیرسٹرایٹ لا کی جامعہ لندن ہی سے کامیاب واپسی قابل سبارکباد ہے ڈاکٹر ولی الدین نے جامعہ عثمانیہ کے پہلے امتحان (شعبہ فلسفہ) میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی، اور اسکے بعد یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا تھا۔ انگلستان میں جامعہ لندن سے دو سال کے عرصہ میں آپنے فلسفہ کی ڈگری لی اور اسکے ساتھ ہی قانون میں بیرسٹر بھی ہو گئے ہیں امید ہے کہ یہ تمام نونہالان ملک، اپنی مادر علم جامعہ عثمانیہ، جسکی آغوش محبت میں انہوں نے تربیت پائی ہے، اور جو ملک کی خدمت [illegible]

حالی اور جدید شاعری

از جناب احمد عبداللہ صاحب المسدوسی۔ بی۔ اے

(حالی کی شاعری سے مُراد ذہن نشین رہے کہ ان کی شاعری کا آخری اور انقلابی دَور ہے' ابتدائی دَور جس کو عاشقانہ شاعری کہنا چاہیئے۔ ہمیشہ ان کی شاعری کی عظمت کے ایوان سے باہر سمجھا گیا ہے' حالی کبھی بھی ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور نہیں ہوئے اگرچہ اِن میں صنفِ شاعری کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ بےکھٹکے ان کو اُردو کے عام مسلم الثبوت اُستادوں کے پہلو میں لیجا کر کھڑا کیا جاسکتا ہے' ان کی لوچدار اور برجی سی سلیس زبان' طرزِ ادا کا بانکپن اور قادر الکلامی جن کے ثبوت میں اشعار کے پیش کرنے کا یہ موقع نہیں' یہ ایسی خصوصیات ہیں جو اُن کو اُردو کے بہت سارے اساتذہ غزل سے بھی برتر ثابت کرسکتی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ کبھی بھی تغزل میں میر و غالب پر تفوق نہیں حاصل کرسکتے اور اس کے بغیر اُن کی شاعری کا چمکنا معلوم' ان کے نام کا جس چیز نے ڈنکا بجایا اور جس کے سبب آج ان کا نام ہندوستان میں بچہ بچہ کی زبان پر ہے وہ اُن کی شاعری کا آخری دَور ہے اور اسی آخری دَور کی کامیابی نے ایک بڑی حد تک اُن کی ابتدائی دَور کی شاعری کے محاسن اور خوبیوں پر پردہ ڈال دیا۔ اور کبھی بھی اُن کو ایک اعلیٰ درجہ کے غزل گو شاعر کی حیثیت سے کامیاب ہونے نہ دیا۔ حالانکہ یہی دَور فن اور شاعری کی حیثیت سے غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ نہایت اہم اور اصلی دَور ہے۔ ان کی انقلابی دَور کی شاعری کا آغاز انہیں کے الفاظ میں اس وقت ہُوا "جب آفتابِ شاعری نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہُوا" اس لئے لازمی طور پر اس میں وہ جوش و خروش' امنگ اور زندہ دلی نہیں پائی جاتی جو عہدِ شباب کی اُمنگوں کا کرشمہ ہوتی اور زیادہ تر کسی جدید تحریک کی کامیابی کی ضامن ہوسکتی ہے۔

(اس کے علاوہ جس جدید شاعری کے کوچہ میں اُنھوں نے قدم رکھا ہے اُس کے راہ و رسم سے بخوبی واقف نہ ہونے کے باعث وہ جگہ جگہ پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ابتدا سے جس طرزِ بیان کے وہ عادی ہوگئے تھے وہی طرزِ بیان ہر جگہ اپنی جھلکیاں دکھلاتا ہے' قومی شاعری' نیچرل شاعری اور عاشقانہ شاعری وہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔)

دُوسرے ان کا آخری رنگ فطری نہیں مجبوری اور مصنوعی ہے۔ ضروریات زمانہ سے مجبور ہو کر بتکلف چونکہ انہوں نے اس قسم کی شاعری شروع کی تھی اس لئے اس میں جگہ جگہ پر پھیکا پن پیدا ہو گیا ہے اور آورد معلوم ہونے لگتی ہے۔

تیسرے جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا ہے اُن کی چالیس سالہ زندگی کے بعد خیالات نے پلٹا کھایا اور نیا رنگ بدلا ہے اس لئے ہمیشہ ان کے نئے اور پُرانے خیالات میں ایک قسم کی کشمکش نظر آتی ہے وہ ضروریاتِ زمانہ اور بعض اصلاحی خیالات سے مجبور ہو کر، نہ کہ اپنی افتادِ طبیعت کی بنا پر ایک خاص اور جدید رنگ کی شاعری کی طرح ڈالتے اور اس پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں، پیرانہ سالی اور ضعف کے سبب پہلے تو قدموں میں وہ تیزی نہیں کہ لیلیٰ جدید (شاعری) کے شوق محمل میں تیز گامی دکھلائیں، دوم وہ ان کا "قدیم شاہد رعنائے سخن" ان کا دامنگیر ہوتا ہے۔ ایک طرف سے سالہا سال کی مشق غزل انہیں روکتی ہے تو دوسری طرف سے نئی شاعری کا لپکا انہیں کھینچتا ہے۔ **کعبہ** ان کے پیچھے ہے تو **کلیسا** ان کے آگے ہے۔ اس عالم میں ان کی آخری شاعری کا آغاز و انجام ہوتا ہے۔

چوتھے اپنے دنیوی رہنما سرسید علیہ الرحمہ کی طرح جنھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر **یورپ** کے عائد کردہ الزامات کا جواب دینے کی کوشش میں بغیر اس امر کا اندازہ کئے کہ وہ اس اہم کام کے قابل بھی ہیں یا نہیں نادانستہ چند در چند غلطیاں کی ہیں وہ بھی اُردو شاعری سے "چند محدود، فرسودہ اور غیر شائستہ الفاظ کے مجموعہ" ہونے کا الزام دُور کرنے کے خیال سے جدید طبقہ کی تمام مطلوبہ اصناف پر شاعری کرتے ہیں۔ نیچرل شاعری کا گلدستہ وہ سجاتے ہیں، اخلاقی شاعری کے خارزار سے وہ الجھتے ہیں، قومی شاعری کا راگ وہ الاپتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ من طلب الکل فات الکل۔

اپنے اس دفتر کے ایک بڑے حصہ کے متعلق یہ سُنکر کہ وہ شعریت سے معرا ہے ان کو عذر پیش کرنا پڑتا ہے کہ "گرزانہ کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفریں سننے سے دلشکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے"[1]۔ اور غالباً اسی کو پیش نظر رکھکر شعر سے اس طرح خطاب کیا ہے کہ ؎

اے شعر! دلفریب نہیں تو تو غم نہیں — پر تجھ پہ حیف ہے جو نہو دلگداز تو

ہم یہ نہیں کہتے کہ **حالی** کا آخری دورِ شاعری بالکل نکما اور بیکار ہے لیکن ان کی قومی شاعری کے سوا بقیہ حصہ کے متعلق جدید شاعری کی ابتداء و ارتقاء کی کڑی کے گم ہو جانے اور اُس کی تاریخ کے مٹ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم کو ع ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ است۔ کی صدا لگانے والوں کی اس زور و شور سے مخالفت کرنے کی

---

[1] دیباچہ دیوان حالی صفحہ (۲)

ضرورت نہیں پیش آتی۔

حالیؔ قدیم اور جدید شاعری کے سنگم ہیں۔ انہیں سے جدید شاعری کے وہ سرچشمے سوتیں پھوٹ پھوٹ کر نکلی اور بہی ہیں جو قوم کی دماغی، اخلاقی اور اصلاحی کھیتوں کو ہمیشہ سرسبز و شاداب کرینگی۔ وہ حالیؔ ہی ہیں جنہوں نے اُردو شعراء کو عاشقانہ شاعری کے "دلفریب" باغ سے جس کی مختلف روشوں پر اور کیاریوں میں وہ کائنات اور اس کی نیرنگیوں سے بے خبر گھوما کرتے تھے زبردستی باہر نکالا اور فطرت کے وسیع اور نہایت دلچسپ میدان کے اندر کھڑا کیا ہے جہاں آنے کے بعد اُن کی آنکھوں کے سامنے غیر محدود نیرنگیوں اور دلفریبیوں کے مختلف مرغزار نظر آتے ہیں، ان کے تو سنِ سیع کی جولانیوں کے لئے ایک وسیع میدان اور ان کے طائرِ خیال کی پرواز کے لئے غیر محدود فضاء مہیا ہو جاتی ہے اس لحاظ سے لٹریچر میں حالیؔ کا پایہ بہت بلند ہے اور جب کبھی اُردو شاعری کی تاریخ لکھی جائیگی اُن کا نام سُنہری حرفوں سے سرنامہ پر لکھا جائیگا اور تاریخ ادب کے مورخ کو شاندار الفاظ میں اعتراف کرنا پڑیگا کہ اُردو شاعری کو غیر فطری راستہ سے ہٹا کر فطری راستہ پر ڈالنے والے حالیؔ تھے لیکن اس اعترافِ احسان سے ان اعتراضات کا قلع قمع نہیں ہو جاتا جو ان کی شاعری پر سنجیدگی اور فن کی حیثیت سے وارد ہوتے ہیں۔ اب زمانہ آگیا ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے یہ یقین رکھنے کے بعد بھی کہ

"مولانا کا کلام اُردو میں کلاسک یعنی ادبیات عالیہ کا درجہ رکھتا ہے وہ ایک ایسی تاریخی چیز ہو گئی ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے۔"[1]

اس امر پر غور کریں کہ ان واقعات سے قطع نظر جو حالیؔ کو جدید شاعری میں زندہ رہنے والے بنائینگے اور اس عزیز دور کو مستثنےٰ کر دینے کے بعد جو حالیؔ کی غلطت پر بحث کرتے وقت توجہ اور غور کا بالکل مستحق نہیں سمجھا جاتا اور جسکی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرنا آگے چل کر ضروری اور لابدی ہو جائیگا ان کی جدید شاعری کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہو سکے ہیں؟ ان کی جدید شاعری کی تین اقسام ہیں۔

(۱) نیچرل شاعری (۲) قومی شاعری اور (۳) اخلاقی شاعری

(۱) نیچرل شاعری

نیچرل شاعری کے اندر بعض چھوٹی چھوٹی نظموں کو مستثنےٰ کر دینے کے بعد قابلِ لحاظ برکھارت نظر آتی ہے نظم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فی الجملہ قابلِ تعریف ہے لیکن اس میں وہ تازگی، شگفتگی اور صناعی نظر نہیں آتی جو اسی قبیل کی بعض قدیم شعراء کی نظموں میں پائی جاتی اور ہماری توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیتی ہے نہ اس میں

---

[1] مولوی عبدالحق بی۔اے۔ رسالہ "اُردو" صفحہ ۱۴۴ جلد سوم۔

وہ تخیلی پیکر پیدا ہوتے ہیں جو مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم کے معیار کے مطابق شاعری کا کمال اور شاعر کی کامیابی کا راز ہے۔

نظیر اکبرآبادی اس ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس کی نظموں کا حالی کی یہ برکھارت مقابلہ نہیں کر سکتی یہی نہیں۔ محسن کاکوری کے مشہور نعتیہ قصیدے ع

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

کے اندر جو زور ہے اور ترتیب کے اجمال کے اندر برسات کے موسم کی ایک خاص کیفیت کا جو ہو بہو نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے وہ برکھارت کی تفصیل کے باوجود ممکن نہیں۔ ان کی افسردہ دلی بفحوائے ع افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔ اس نشاط انگیز موسم کی یاد کو بھی منغض کر دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ برکھارت کا سماں کامیابی سے نہیں دکھلا سکے۔ ہندوستان کے لئے "برکھارت" بہار کا موسم ہے اسکی تصویر کو عیش و عشرت، سرمستی و رندی اور فرحت و نشاط کی انتہائی صورت میں جلوہ گر ہونا چاہیئے اس موسم کی تصویر کو اس وقت تک مکمل، کامیاب اور جاندار نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ زندہ دلی اور مسرت کا خیال اس کے اندر مجسم بنا کر نہ پیش کر دیا جائے۔ حالی اپنی مردہ دلی اور ماحول کے سبب ایسا کرنے سے قاصر تھے، زندگی کے متعلق، مسلمانوں کے قسمت کی طرح ان کے خیالات "رجائی" نہیں "قنوطی" تھے، ان کی "مدوجزر اسلام" اس پر گواہ ہے، بعض لوگوں کے توجہ دلانے سے انہوں نے ایک ضمیمہ بعد میں لکھکر اس مد میں شامل کیا ہے تاکہ امید کے آفتاب کے ذریعہ یاس و افسردگی کی شبنم کو فنا کر دیں مگر طبعی رنگ یہاں بھی جھلک پڑتا ہے اور ان کے "قنوطی" نقطۂ نظر کو واضح کر دیتا ہے)

(بہرحال ماننا پڑتا ہے کہ اس میدان میں انہوں نے اپنی کوششوں سے ایک مخصوص صنف کی شاعری کا نمونہ پیش کرنے کے علاوہ اپنی عظمت و شخصیت کے لئے کوئی بنیاد نہیں قائم کی کیونکہ فطرتی شاعری اردو شعراء کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے، اردو شعراء نے مختلف مراسم و مناظر کا اپنے اشعار میں نقشہ کھینچا ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ کھینچا ہے) انیس کے صبح و شام کے زور پر میر سودا کا شنویوں میں جنگل وغیرہ کے مناظر سے ہماری آنکھیں اور غالب کی لطیف بہاریہ غزل ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

سے ہمارے کان آشنا ہیں (اہم حالی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے مناظرِ قدرت کا مستقل عنوان قرار دیکر نظم لکھی ورنہ اس سے پہلے عموماً ان مناظر و مواسم کا ضمناً ذکر آجایا کرتا تھا مگر اس شرف میں ان کے ہم عصر مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی بھی ان کے شریک ہو جاتے ہیں۔ قطع نظر اس کے اوپر بیان ہو چکا ہے

کہ نظیر اکبر آبادی کی نظمیں کس طرح حالی کی نظموں پر فضیلت رکھتی ہیں (حالی کا پایہ لٹریچر میں اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نظیر کے برخلاف ان کا حلقۂ اثر نہایت وسیع ہے اور انہیں کی نظموں نے بعد کے اُردو شعراء کے دل میں اس صنفِ شاعری کی قدر و قیمت کا سکہ بٹھا دیا اس حیثیت سے اگر قطع نظر کیجائے تو حالی کی ترجیح کے لئے اس صنفِ شاعری میں کچھ نہیں رہ جاتا۔)

(اس ناکامی سے حالی پر کسی قسم کا حرف نہیں آسکتا کیونکہ اگر ان کی بجائے کوئی دوسرا ہوتا تو اس کا بھی یہی حشر ہوتا اور ناکامی کا اسکو بھی منھ دیکھنا نصیب ہوتا جیسا کہ ہم نے اوپر نیچرل شاعری کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ نیچر پرستی، خواہ وہ اچھی ہو یا بُری جب تک ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت نہ کر جائے کسی کامیابی اور قابلِ ستائش کارنامے کی اُمید بیجا ہے تعلیم کی توسیع اور انگریزی شعراء کے مطالعہ سے وہ گہرے اثرات نیچر کی خوبی و حسن کے متعلق ہماری لوحِ دل پر ثبت نہیں ہو سکتے جن کی نشو و نما ہمارے ماحول اور ابتدائی زندگی کے بالکل برخلاف نہیں تو کسی طرح موافق بھی نہیں ہے) جب تک ہماری ایک پوری نسل کے دل و دماغ نیچر کی پرستش گاہ نہ بن جائینگے کسی ورڈ سورتھ کی امید بیجا ہے یہی وجہ ہے کہ چالیس پچاس برس کی انگریزی تعلیم انگریزی خیالات کی ترویج اور "نیچر" "نیچر" کی آوازوں اور ہنگامہ آفریں صداؤں نے ہماری بے حسی کو بہت کم توڑا ہے اور ہمارے جاہل اور عوام کا تو کیا ذکر تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی بہت کم متاثر کیا ہے۔

قومی شاعری

(ان کی شاعری کا دوسرا رُخ قومی شاعری ہے جس حیثیت سے کہ وہ آج مدرسہ کے بچوں سے لیکر مسجد کے واعظوں تک مشہور ہیں قومی شاعری میں وہ بلاشبہ کامیاب ہیں اور خصوصاً اس کا وہ حصہ جہاں وہ مسلمانوں کی عظمت گذشتہ کی داستان بیان کرنے پر اُتر آتے ہیں اس قدر پرسوز و گداز ہوتا ہے کہ مبالغہ اگر اس زمانہ میں جائز سمجھا جائے تو "اُردو" کے فاضل ایڈیٹر کے اس قول کی تائید کرنی پڑیگی :-

"مولنا جب قوموں کے عروج و زوال اور مصیبت زدوں کی بپتا بیان کرنے پر
اُتر آتے ہیں تو دُنیا کا کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" [1])

ایسا ہونا ضروری تھا پہلے تو وہ خاندانی طور پر مذہباً شیعہ تھے اور بچپن سے واقعاتِ کربلا کی غمناک داستان اور مراثی کا جو اثر ان کی طبیعت میں رچ گیا تھا وہ آخری زمانے کے تبدیل مذہب سے دُور نہیں ہو سکتا تھا۔ دوم ان کے زمانے میں جیسے ہولناک واقعات غدر کے سلسلہ میں پیش آئے انہوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور اس شراب کو دو آتشہ بنا دیا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کی عظمت گذشتہ کی ہزاروں نشانیاں اس طرح

---

[1]) رسالہ اُردو صفحہ ۱۴۴ جلد سوم۔

سیٹیں کہ وہ ان پر جی کھول کے بھی نہ رو سکے۔ سلطنت کا چھن جانا، بہادر شاہ کے بیٹوں کا اُن کے سامنے بیدردی سے قتل، ان کا قید کیا جانا، لاکھوں خاندانوں کا اُجڑ جانا، شریفوں اور امیروں کا محتاج ہو کر گھر گھر بھیک مانگتے پھرنا ہزاروں شرفا کا قتل اور جنگل جنگل سر چھپاتے پھرنا اور جگہ نہ پانا۔ غدر کیا تھا ایک عذاب الٰہی تھا۔ ان واقعات وحادثات نے ان کے خانگی رنج و آلام، زندگی کی تربیت اور ماحول اور پھر ان کی شاعرانہ حساس طبیعت سے مل کر ان کے دل کو ایک آتشکدہ بنا دیا تھا ایسے حالات میں ان کو سرسید ملتے ہیں ؎

گم کی تھی میں نے راہ مصیبت یہی تھی سخت ۔۔۔ پھر یہ غضب ہوا کہ تم ایسے خضر ملے

اس بڈھے جادوگر نے مطلب برآری کے لئے مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی پستی کے کچھ ایسے تاریک اور بھیانک نقشے دکھا دکھا کر ان کو پریشان کر دیتے ہیں اب تک حکومت کی داروگیر کے خوف نے ان کے ان جذبات و احساسات کو دبا رکھا تھا اب قومی شاعری کی آڑ پکڑ کے اور تعلیمی و اصلاحی مشن کے پردہ میں سالہا سال کے جذبات غم و الم کو جن سے وہ اندر ہی اندر پھنک رہے تھے اپنی مخصوص سیدھی سادھی زبان میں جس کو وہ ہر جگہ استعمال کر چکے اور بے موقع ہونے کے سبب ناکام رہ چکے تھے اور جو فی الحقیقت اسی قسم کی شاعری کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ ایک دفعہ ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگ جاتی ہے اور اسکو وہ قبولیت حاصل ہوتی ہے کہ خود انہیں کے الفاظ میں۔

"مولود شریف کی مجلسوں میں جابجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں، اکثر لوگ اس کو پڑھکر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں۔ کہیں کہیں قومی ناٹک میں اس کے مضامین ایکٹ کئے جاتے ہیں۔"

آج بھی ان کی نظمیں اور ان کے پرسوز نالے محفل عشرت کو مجلس عزا بنا دیتے ہیں ان کے مشہور مسدس "مدوجزر اسلام" کے سوز و گداز اور درد بھری داستان کے لئے یہ رباعی نمونہ کا کام دیگی ؎

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے ۔۔۔ اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد ۔۔۔ دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اسی پر بس نہیں وہ جگہ جگہ پر یہ کہتے ہوئے کہ ؎

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سُن لو ۔۔۔ کچھ چشم جہاں میں اپنی خواری سن لو
افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں ۔۔۔ چاہو تو لکھتا ہم سے ہماری سن لو

کبھی تو "قوم کی سوگواری" کرتے ہیں ؎

یاروں کو تجھ سے حالیؔ اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں

اپنی نظر میں بھی یاں ابتو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

خاور سے باختر تک جنکے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

دیکھا نہیں ابھی تک قحط الرجال تم نے
اس سے بھی سخت آنی آگے گرانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہو تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

کبھی تو "چشمِ جہاں میں اپنی خواری" سناتے ہیں۔

مُنھ سے اُدھواں سا اُٹھا لیتے ہی نامِ اسلام
بارود بچھ رہی تھی گویا لبِ دہن میں

پھر زخم پھوٹ نکلا حالیؔ نہ چھیڑنا تھا
فصلِ خزاں کا قصہ ذکرِ گل و سمن میں

گو رو چکے بہت ہم دکھڑا سو بار قوم کا ہم
پر تازگی وہی ہے اِس قصۂ کہن میں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی
تم نے سنا بھی اُس پر کیا گذری انجمن میں

پائینِ بزم بھی اب ملتی نہیں اُسے جا
روندن میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں

اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اُڑا دی
فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں

ڈالی نہ ہوگی آگے اے دورِ چرخ شاید
جو اب کے تو نے ڈالی ہل چل ہے انجمن میں

فوج اور بہیر دونوں پھرتی ہیں بے سری سے
گویا امیرِ لشکر مارا گیا ہے رَن میں

خورد و بزرگ سارے ہیں بدحواس گویا
لُٹنے کی قافلے کے پہنچی خبر وطن میں

بھولی ہوئی ہیں دوڑیں ہرنوں کی چوکڑی سب
جائیں کدھر کو ہر سُو دوں لگ رہی ہے بن میں

حالیؔ بس اب نہیں یاں سُننے کی تاب باقی
مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن میں

نوکِ زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا
ترکش میں ہے یہ پیکاں یا ہے زبان دہن میں

اور کبھی "اپنی کتھا" دربارِ رسالت میں اس طرح جوشِ گریہ سے شروع کرتے ہیں ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے

وہ دین ہوا جس سے جہاں بزم چراغاں — اب اس کے مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے
جو نفرتِ اقوام کے آیا تھا مٹانے — اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے — اس دین میں خود بھائی سے بھائی جدا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیرِ غنا بھی — اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے
جس دین کی حجت سے سبا دیان تھے مغلوب — اب معترض اس دین پہ ہر ہرزہ درا ہے
ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی — دینداروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے
دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے — اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے
گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی — پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے
ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر — مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے
فریاد ہے اے کشتیٔ امت کے نگہباں — بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی — ہاں ایک دعا تیری کہ مقبول خدا ہے

چشمِ تصور سے کام لیجیے اور غور کیجیے کہ ان اشعار نے مجمع کے غم و الم کے جذبات کی آگ کے لیے کس طرح تیل کا کام کیا ہوگا اور بنظرِ تعمق غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان اشعار نے جن کی غرض و غایت یقیناً براہِ راست اخلاق و موعظت نہیں تھی اور جو ایک درد و الم کے عالم میں بے ساختہ ان کی زبانِ قلم سے نکل پڑے تھے ان کی ان طولانی نظموں سے جن کے اندر نصیحت و غرض پنہاں تھی زیادہ دردناک ہی نہیں زیادہ موثر اور مفید بھی ہے اسی قسم کا کلام ہے جس کے متعلق اُن کی یہ رائے صادق آتی ہے کہ "شعر اگرچہ براہِ راست علمِ اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا۔ لیکن از روئے انصاف اس کو علمِ اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔"[1]

حقیقت یہ ہے کہ حالی داخلی شاعری کے اُستاد اور حزن و ملال کے جذبات کے بیان کے ماہر تھے مشہور انگریزی نقاد اور شاعر میتھو آرنلڈ کے متعلق جو خارجی شاعری کی اہمیت کا بڑا قائل تھا اور ہمیشہ خارجی شاعری کو اپنی کامیابی اور شاعرانہ کمال کا زینہ سمجھتا تھا کہا جاتا ہے کہ اس کی شاعری کا بہترین نمونہ اور اُس کے کمالاتِ فن کے کامیاب مظاہر اس کی داخلی شاعری سے متعلق نظمیں ہیں۔ حالی کے متعلق بھی یہی رائے قائم کرنی پڑتی ہے۔ انہوں نے اپنے اُستاد مرزا غالب کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ اس قدر

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۵

المناک اور حسرت انگیز ہے کہ دُنیا کی زبانوں میں اس کی بہت کم مثالیں مل سکتی ہیں خود اردو زبان کے طویل مراثی کو مستثنےٰ کر دیجیے تو یہ مرثیہ اُردو زبان کا مایۂ ناز کارنامہ ہے۔ میں اس حیثیت سے اس کو سند کے ساتھ ساتھ حالی کا شہ کار سمجھنے پر مجبور ہوں افسوس کے مضمون کی طوالت کے خوف سے پُورا مرثیہ نقل نہیں کیا جا سکتا۔ آخری بند درجِ ذیل ہے اس موقع پر میں ناظرین سے ایک مرتبہ اس کو دوبارہ دیکھنے کی درخواست کرونگا ؎

ہند میں نام پائیگا اب کون؟ سکّہ اپنا بٹھائیگا اب کون؟
ہم نے جانی ہے اِس سے قدرِ سلف ان پہ ایمان لائیگا اب کون؟
اس نے سب کو بُھلا دیا دل سے اس کو دل سے بُھلائیگا اب کون؟
تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش وہ جگہ دل میں پائیگا اب کون؟
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے جا کے دلّی سے آئیگا اب کون؟
مرگیا قدر دانِ فہمِ سخن شعر ہم کو سُنائیگا اب کون؟
مرگیا تشنۂ مذاقِ کلام ہم کو گھر سے بلائیگا اب کون؟
تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک ہمکو چالیں بتائیگا اب کون؟
شعر میں ناتمام ہے حالی غزل اس کی بنائیگا اب کون؟
کَمْ لَنَا فِیْہِ مِنْ بُکًی وَعَوِیْل وَعِتَابٍ مَعَ الزَّمَانِ طَوِیْل

اِس مرثیہ کے پہلو بہ پہلو دہلی مرحوم کے تذکرے کو جس کے چھیڑنے سے بیچارے حالی یہ کہہ کر ع "نہ سُنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز" رو کتے تھے خواجہ امداد حسین مرحوم ان کے بھائی اور حکیم محمود خانصاحب دہلوی کے مرثیوں کو اور اس ترکیب بند کو پڑھیئے جو ۱۸۹۲ء میں بمقام دہلی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں پڑھا گیا تھا تو معلوم ہوگا کہ حالی دُنیا میں رونے اور رُلانے کے لئے پیدا ہوئے تھے اِس نباء پر ان کی نام لیوا پارٹی کے رُوح رواں مولوی عبدالحق بی۔ اے کے قول "مولینا جب قوموں کے عروج وزوال اور مصیبت زدوں کی بپتا بیان کرنے پر اُتر آتے ہیں تو دُنیا کا کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا"۔ تو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اس طرح ہم ان پر منطبق کر سکتے ہیں کہ مولینا جب مصیبت زدوں کی بپتا بیان کرنے اور مرثیہ کوئی پر اُتر آتے ہیں تو دُنیا کے بہت کم شاعر ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں اقبال نے یہ شعر شائد انہیں کے حسبِ حال کہا تھا کہ ؎

اُڑائی بلبلوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

بہر حال حالی قوموں کے عروج و زوال کی بپتا بیان کرنے میں نہیں جسکو ہم آگے چل کر اقبال کی بحث میں شواہد و شعار سے ثابت کرینگے بلکہ مرثیہ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور اس کے اسباب بھی ہم اوپر بیان کر آئے ہیں حالی نے ایسا پُر آشوب زمانہ پایا تھا اور غم و الم کے بادل مسلمانوں کی قسمت پر اس طرح چھائے ہوئے تھے اور افات و مصائب کی بجلیاں اس طرح مسلسل تڑپ تڑپ کر گرتی اور خرمنِ امن و عافیت کو جلاتی تھیں کہ دنیا و مافیہا میں مسلمانوں کا کہیں ٹھکانہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس صورتِ حال کا شاعری پر اثر انداز ہونا ضروری تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ شاعر قومی عزت و حکومت کے گلستان کے اُجڑ جانے پر دلآویز اور یاس آگیں آہیں نہ کھینچے گا؟ حالی خود ایک جگہ نہایت عمدگی کے ساتھ اس طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

پھوٹ پڑتے ہیں تماشہ اس چمن کا دیکھ کر نالۂ بے اختیارِ بلبلِ نالاں ہیں ہم

یہی وجہ ہے کہ ان کے اور ہم عصر شعرا کا لب و لہجہ جو یقیناً شاعرانہ قابلیت کے لحاظ سے ان سے فروتر تھے ویسا ہی دردناک ہے شبلی ہی کو لیجئے ان کی مشہور نظم "شہر آشوب اسلام" جس کا پہلا شعر یہ ہے ۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک چراغ کشتۂ محفل سے آخر ضو فشاں کب تک

کا طرزِ بیان بے انتہا دردناک اور ہلچل مچا دینے والا ہے اگر ڈاکٹر لطیف[۵] کا قول مبالغہ پر مبنی ہو کہ "شبلی کا لب و لہجہ اپنے ہم مذہبوں کے مصائب اور آزادی کی طاقت کے زوال پر زیادہ دردناک ہے" تو اس سے بمشکل انکار کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی طرح حالی سے کم نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ دور جو ابھی ختم نہیں ہوا ہے اور جس نے آلبس و اقبال کی شاعری کو بھی اپنے عالمگیر اور زبردست اثرات میں پوری طور پر رنگ لیا ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا غم و الم کا دور ہے، اس قرن کو مرثیہ گوئی اور ماتم گساری کا دور کہنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ روزانہ سینکڑوں نظمیں رسائل و جرائد میں شائع ہوتی اور قعرِ گمنامی میں روپوش ہو جاتی ہیں جن پر ڈاکٹر عبداللطیف کا تعجب اس لئے بیجا ہے کہ وہ زمانہ کی نیرنگیوں اور فلک کجرفتار کی خوں آشامیوں کے فریادی ہیں جوں ہی یہ تیل و خون اور اسلامی حکومتوں کے سلب فہب کی بارش رُک جائیگی اور جذبات میں سکون پیدا ہوگا وہ صفحۂ دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائینگی

غالباً اسی "مرثیہ گوئی" کے دور کو دیکھکر ان کو اس رائے کا اظہار کرنا پڑا ہے کہ "جدید اُردو نثر ہر سمت میں قابلِ لحاظ ترقی کر رہی ہے۔ اُردو نظم وہیں پر ہے جہاں اس کو حالی اور ان کے ہم عصروں نے چھوڑا تھا")

---

[۴] انگریزی ادبیات کا اردو ادبیات پر اثر مؤلفہ ڈاکٹر سید عبداللطیف بی۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ۔

[۵] ڈاکٹر لطیف سے مراد ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ ہیں جن کا گرانقدر مضمون "مجلۂ عثمانیہ" کے پہلے نمبر میں "غالب کی عظمت" پر شائع ہوا ہے موصوف نے اسکے علاوہ بھی مذکورہ بالا مقالہ لکھا ہے اور اس مضمون میں اسی کتاب سے مراد ہے۔

(حالی قومی مرثیہ گو تھے اور اس موقع پر اس مشہور مقولہ کے دُہرانے کی ضرورت نہیں کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو بگڑا گویا مرثیہ خواں"۔ قومی شاعری خارجی شاعری سے میل کھاتی ہے اور چونکہ حالی داخلی شاعری کے شہسوار تھے اس لئے قومی شاعری میں ان کی ناکامی غیر متوقع نہیں ہو سکتی انہوں نے خود مثنویوں کے ذکر میں جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ قولِ فیصل اور ہر قسم کے کلام کیلئے شمع راہ کا کام دے سکتی ہے "جن لوگوں کی طبیعت پر غزلیت کا رنگ غالب آجاتا ہے ان سے مثنوی کے فرائض اچھی طرح انجام نہیں پا سکتے۔")

(اس کے علاوہ ان کے سامنے کہا جا سکتا ہے کہ خارجی شاعری کی کوئی کامیاب مثال موجود نہیں تھی، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کی نظموں کا تذکرہ سُن لینا یا ایک آدھ نظم کو پڑھوا کر سُن لینا یا کسی ترجمہ کے ذریعہ اندازہ لگا لینا اس صنفِ شاعری میں ان کو صحیح راہِ عمل اختیار کرنے میں کامیاب نہیں کر سکتا تھا چنانچہ یہی ہوا۔ انہوں نے یوں تو عام طور پر اپنی نظموں میں لیکن علی الخصوص "مدوجزر اسلام" میں سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، اس میں اس قدر سخت ناہمواری پائی جاتی ہے اور خیالات اس قدر بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں کہ اس کی اصلی وجہ اس غرض کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فطری ناموزونیت ہے نہ اس لئے کہ وہ انگریزی شاعری سے نابلد تھے اور یورپی زبانوں سے براہِ راست استفادہ نہ کر سکتے تھے بلکہ اس لئے کہ ان کی افتادِ طبیعت کے یہ رنگ مخالف تھا، جس حکیمانہ مذاق اور اعلیٰ فلسفیانہ دماغ کی جو شاعری کے اندر مناسب مقدار میں قوموں کے عروج و زوال کے اساسی و بنیادی اصولوں کو سمونے کی ضرورت تھی وہ حالی کے دل و دماغ کا کام نہ تھا) ان کی خود نوشتہ سوانحعمری کے جو حال میں معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوئی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ (اس خرابی کی ذمہ دار ان کی ادھوری تعلیم اور دل و دماغ کی ناقص تربیت ہے جس کا ثبوت ایک طرح یوں بھی ملتا ہے کہ ان کی تصانیف میں ادبی کتابیں زیادہ ہیں۔ شبلی کی طرح فلسفیانہ، تاریخ اور کلامی مباحث و موضوع پر اُن کا قلم کبھی نہ اُٹھ سکا)

(یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ حالی ان علوم و فنون میں بھی مہارت رکھتے تھے لیکن اپنے محبوب مشاغلِ ادبی کی مصروفیت میں اس طرف توجہ کرنے کا وقت نہ نکال سکے۔ کیونکہ سرسید علیہ الرحمۃ سے جیسی ارادت اور عقیدت انہیں تھی اور جس کو ہم "عشق" کے درجہ سے تعبیر کر سکتے ہیں اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ سید کے مذہبی خیالات کی تائید میں نہ سہی بعض اصلاحی اور تعلیمی خیالات و عقائد کی حمایت ہی میں وہ ان مفید حربوں سے مدد کام لیتے اور ان کے خلاف مخالفت کا جو طوفان برپا تھا اس کو روکنے کی کوشش کرتے جیسا کہ شبلی وغیرہ نے کیا ہے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا حالانکہ ان کی آخری زندگی کی سرگرمیوں کا واحد مقصد جس طرح بنے سرسید مشن کی تبلیغ اور تکفیر کی بجا تصحیک تھا)

(بہر حال مدوجزر کو پڑھئے، اسلام کے عروج کی پُر شوکت داستان کے بیان کرنے کے بعد فطری طور پر

آپ کو خیال ہوگا کہ انہوں نے تنزلِ دلپستی کے ایسے ڈراؤنے اور تاریک منظر دکھلائے ہونگے کہ ع غافلوں کیلئے پیغام ہے بیداری کا لیکن افسوس کا مقام ہے کہ حالی کے مسدس کے اس اہم حصّہ کو پڑھکر ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے، اس نقطہ پر پہنچکر جو ایک جادو بیان اور فطرت شناس شاعر کے ہاتھوں میں قوم کے جذبات کو ابھارنے اور صدیوں کے جمود و سکوت کو توڑنے کے لئے ایک پیغامِ الٰہی بن سکتا تھا حالی اخلاقی اصولوں کی ایسی معمولی معمولی جزئیات پر اُتر آتے ہیں جو غیر موزوں ہونے کے ساتھ ساتھ نظم کی دلکشی کو برباد کر دینے اور اس کے جادو کو ملیا میٹ کرنے والی ہیں، قوم کو اخلاقی سبق پڑھانیکا شوق جس کا انہوں نے بڑے زور و شور سے اپنی جدید زندگی کی ہر تصنیف و تالیف میں ذکر کیا ہے کچھ ایسا اس طرح ان کے مذاق شاعری پر غالب آتا ہے کہ وہ بلا رعایت "ناصح مشفق" بنکر اخلاق کا وعظ شروع کر دیتے ہیں، مسدس کے اس مقام پر پہنچکر جہاں سے مد کے بعد جزر کو شروع ہونا چاہیئے وہ اپنے شاعرانہ اور اعلیٰ مقصد کو بھول جاتے اور تقلید، مجال پسندی، قحط کتب دینیہ، تعصب غیبت، حسد و تکبر، خبث نفس، فتنہ انگیزی، لقب قبیح وغیرہ کے عنوانات قرار دیکر دو دو، چار چار بند لکھنا شروع کر دیتے ہیں، اگر وہ صحیح مذاقی اور سلیقہ مندی کو ذرا زیادہ کام میں لاتے تو سرسید علیہ الرحمۃ کی دانائش کو بھی باحسن الوجوہ پورا کر سکتے تھے اور مسلمانوں کے تنزل کی داستان بیان کرتے ہوئے ان کمزوریوں اور نقائص کو بھی جن کا بیان کرنا اور دُور کرنا وہ قوم کی ترقی کے لئے ضروری خیال کرتے تھے) اس طرح بیان کر جاتے کہ سُننے والوں کی زبان سے تعریف میں بے اختیار ؎

خوش تر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

نکل جاتا (ان کے مسدس کے اندر جگہ جگہ پر پڑھنے والے کے خیالات میں دفعتاً ایسی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے کہ ناگوار معلوم ہونے کے سوا نظم کی دلکشی کے خرمن کے لئے برق سوزاں کا کام دیتی ہے اس طرح دفعتاً وہ اپنے خیالات کے بہاؤ کو روک کر "نصیحت بازی" پر اُتر آتے ہیں کہ ناظرین اپنے دماغ کے اندر بمشکل ایک قسم کا جھٹکا محسوس کیئے بغیر رہ سکتے ہیں۔ نظم کے فطری بہاؤ کو روک کر اخلاقی مسائل کی چٹانوں اور ٹیلوں پر سے بہانے کی کوشش کرنا ایسی فاش اور سخت غلطی تھی کہ شاعری کے دریا کو ان سے سر ٹکرا کر منتشر ہو جانا پڑا اور پھر ان جنگلوں اور پہاڑوں میں نبٹ جانا پڑا، اس "نصیحت بازی" کے مقام پر پہنچ کر وہ اس طرح بھٹکے ہیں کہ راہ پانا مشکل ہے، ان کی شاعری کی کشتی اس تصادم و کشمکش میں ہر ٹیلہ اور چٹان سے سر ٹکراتی اور اپنے بادبانوں اور تختوں کے لئے سامانِ موت مہیا کرتی ہے اس عالم میں چل کر اسلام کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری بھی مدوجزر انجام ہوتا ہے۔ اس بنا پر یہ عقیدہ رکھنے والے شاید غلطی پر نہیں ہیں کہ "مسدس لکھکر حالی نے کوئی ادبی احسان نہیں کیا بلکہ اپنے لئے زادِ راہِ آخرت مہیا کر لیا۔")

حیرت ہے کہ ایک بزرگ اسی نظم کا پشتارہ باندھ اور پشت پر لاد کر اس کو بازارِ ادب میں "سادگی، صفائی، دلکشی، حسنِ زبان و روزمرہ اور صنف و موضوع پر حیرتناک قدرت" کے نمونے اُچھالتے ہوئے لاتے اور سخن سنجوں اور جنسِ ادب کے جوہریوں کی آنکھ میں خاک جھونک کر اپنے نکّے سیدھے کرنے کے لئے صدا لگاتے پھرتے ہیں کہ انمول اور لاقیمت شئے ہے اور اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ سے "جو مصنوعی اور قدیم زبان اور مصنوعی قدیم اسٹائل میں لکھے گئے ہیں بہتر ہے"۔ ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است، ہم آگے انشاء اللہ اقبال کے ضمن میں اس پر تفصیل سے بحث کرینگے (یہاں صرف مسدس مدوجزر اسلام کے متعلق جیمس بیلے (James Bailey) کی نظم "Heroes" جو ابتداءً بڑی کامیاب رہی تھی، کے بارے میں ٹینی سن Tennyson کے اس مشہور قول کو دُہرانا چاہتے ہیں کہ "اثر کے لحاظ سے ایک خشک نظم مگر جس کے اندر بہت سی کارآمد چیزیں بھی موجود ہیں"[1])

اخلاقی شاعری

اب آخر میں ان کی اخلاقی شاعری باقی رہ جاتی ہے جس کا قومی شاعری کے ساتھ جیب و دامن کا تعلق ہے۔ یہ صنف بہت زیادہ بحث و تمحیص کی محتاج ہے ہم کو آزادی کے ساتھ رجال پرستی چھوڑ کر اس پر تنقید کرنا چاہئے ورنہ خود میرے دل میں حالی مرحوم کی اعلیٰ اخلاقی صفات، جرأت و نیکی، عقیدت مندی اور دردمندی کی اتنی قدر ہے کہ شاید اُن کے دم بھرنے والے معتقد بھی نہ کرتے ہوں اور ان کی اعلیٰ انشاء پردازی کی قابلیت کا میں خود ایسا مداح ہوں کہ شاید اُن کا اسکول بھی نہ ہو۔

(اخلاقی شاعری کی حالی کے ہاتھوں میں آکر اس قدر مٹی پلید ہوئی ہے کہ بعض نقادوں اور ادب شناسوں کے اس خیال کی تائید پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے کہ اخلاقی شاعری فی الحقیقت شاعری کا جوفون لطیفہ میں سے ہے کوئی جزو نہیں۔ ان کی اس حسرتناک ناکامی کے کئی اسباب ہیں اور ہم اس خیال کو اس قدر بلند آہنگی کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کرنے کی پاداش میں اس پر تفصیل سے نظر ڈالنے پر مجبور ہیں، کیونکہ آج تک مختلف مرکزوں اور مختلف بااثر بلکہ باجبروت ہستیوں کی طرف سے حالی کی شاعری کا ڈھول اس زور سے پیٹا گیا ہے کہ بزم میں سارنگی و ستار، ہارمونیم و گراموفون کے نغموں کی سریلی آوازیں پست ہو ہو کر رہ گئی ہیں (حالی کی شاعری کا وہ شور و غوغا مچایا گیا ہے کہ بہت سے مستحق تعریف و توصیف شعراء کو خاموش ہو جانا پڑا ہے۔ پس جب تک پبلک کو اس کا احساس نہ کروا دیا جائے آگے کسی کامیاب کارنامے کی امید

---

[1] The Outline History of English Literature by W. H. Hudson Page 282

ہیجا ہے بطور خصوص جب تک حالی کی قدر وقیمت کا اندازہ نہ کریں اس وقت تک اسمٰعیل میرٹھی، الٰہ آباد اور اقبال کی شاعری کی قدر وقیمت نہیں معلوم ہو سکتی، ایک مرتبہ حالی کی شاعری کے اس دشوار گزار اور ناہموار کوہ و بیابان کو طے کرنا ضروری ہے تاکہ اسمٰعیل میرٹھی، الٰہ آباد اور اقبال کی اقلیم سخن میں قدم دھرنے اور میٹھی میٹھی اور پیاری پیاری نظموں، حیات افروز ترانوں اور متانت سوز اخلاقی لطیفوں، حکایتوں اور چٹکلوں سے محظوظ ہونے کا موقع دستیاب ہو سکے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حالی کی نئی زندگی کا حقیقی دور سرسید کے زیر اثر شروع ہوا ہے واقعہ یہ ہے کہ حالی سرسید کے مشن میں شریک ہوتے وقت اپنی زندگی کی اس منزل پر پہنچ گئے تھے جبکہ متعدد اور پیہم دل شکنیوں اور زمانہ کی سرد مہریوں کے باعث کسی جدید تحریک میں حصہ لینے کی جرأت نہ کر سکتے تھے)

جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین
میں محدود ہو ان سے وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا اس کے سوا بیس برس کی بیکا
اور نکمی گردش میں ہاتھ پاؤں چور ہو گئے تھے اور طاقت رفتار جواب دے چکی تھی[1]

لیکن یہ صرف سرسید کی عجیب و غریب شخصیت اور افسون کا اثر تھا کہ حالی کے دل میں پھر نئے سرے سے ولولہ پیدا ہوا اور وہ کچھ کرنے پر تیار ہو گئے۔ ان کی تحریریں پڑھنے سے اور ان کے اشعار کا مطالعہ کرنے سے اس زبردست عقیدہ کا پتہ چلتا ہے جو ان کے دل میں سرسید کی طرف سے تھی اور اس محبت کا ثبوت ملتا ہے جو ان کے کاموں سے رکھتے تھے، ان کے دیوان میں سرسید کی تعریف میں متعدد نظمیں موجود ہیں اور رہے ان کے اغراض و مقاصد تو ان کی شاعری کا یہ مستقل عنوان ہے گویا کہ سرسید اور علیگڈھ کی تحریک ان کی شاعری کے لئے وہی کام دیتی ہے جو مسز جین ولیمس (Mrs Jane Williams) کا پُراسرار طلسمی وجود شلی (Shelley) کی شاعری کے لئے کرتا ہے ایسی حالت میں ہم کو یہ دیکھکر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ حالی سرسید کے خیالات کو اپنے بحر و قافیہ کے رکارڈ میں بھر کر نظم اور مسدس کے گراموفون کے ذریعہ سناتے ہیں، ان کے آخری زمانہ کی شاعری کا مقصد یہ نہایت اہم اور یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ علیگڈھ کی تحریک کے لئے پلیٹ فارم پر مناسب اور حسب مقتضا پیدا کرتی تھی، شاعری کا لپکا ان دنوں گھر گھر پہنچ چکا تھا۔ اس چاشنی کے ذریعہ وہ سرسید کے خیالات کو ہر شخص تک پہنچا دینا چاہتے تھے اور بس۔ اس سے زیادہ ان کی کبھی خواہش تھی اور نہ کوئی غرض۔ قوم پروری اور ملت دوستی کے جذبات حالی کے دل و دماغ پر اس قدر غالب

---

[1] دیباچہ مسدس صفحہ (۳)

آ گئے تھے کہ ان کے لئے یہ سوچنے کا بالکل موقع نہ رہا تھا کہ ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

کہ جس راستہ پر وہ جا رہے ہیں وہ شاعری کے کعبہ کی طرف نہیں بلکہ اصلاحِ مسلمانان کے ترکستان کی طرف جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ محبت والفت اندھی ہوتی ہے اسی اندھی محبت نے جو بلاشبہ ہماری تعریف وتوصیف کی بجا طور پر مستحق ہے ان کو انجام پر غور کرنے سے روکا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے انجام پر غور نہیں کیا بلکہ ایک جوش اور فوری ولولہ کے عالم میں اُس راہ پر چل کھڑے ہوئے جو بجائے کعبہ کے ترکستان کی طرف جاتا تھا ان کی مسدس کے دیباچہ میں جب ہم اس پارہ کو پڑھتے ہیں :-

"قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے (جو اپنی قوم کے سوا تمام مُلک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے) جس طرح خود اپنے پر زور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑی شرم کی بات ہے۔ ؎

رو چو انسان لب بجنبان در دہن ورجمادی لاف انسانی مزن

قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں، علم کا فاتحہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دُہائی ہے، اخلاق بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹائیں قوم پر چھائی ہوئی ہیں، رسم ورواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے، جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل و بے پرواہ ہیں، جن لوگوں کو قوم کی اصلاح میں بڑا دخل ہے، زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں ایسے میں جس سے جو بن آئے تو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاصکر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے قوم کے بیدار کرنیکے لئے اب تک کسی نے نہیں لکھی اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو ہی قسم کے خیالات گزرتے ہیں ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیئے، پہلے خیال کا یہ نتیجہ

ہوا کہ کچھ نہ ہوا دوسرے خیالات دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے"۔ ؎

در فیض است منشیں از کشائش ناامید اینجا
بزنگِ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

وھوالذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا و ینشر رحمتہ[1]

ہر چند اس حکم کی بجاآوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی، دل سے نکلی تھی دل میں جا کر ٹھہری، برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں اُبال آیا، افسردہ دل، بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے انہیں سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی اور دنیا کے مکروہات سے بہت کم فرصت ملی اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہ ہوا مگر ہر حال میں یہ دُھن لگی رہی کہ۔ بارے الحمدللہ کہ بہت سی دقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندہ کی بساط کے موافق تیار ہوگئی اور ناصح مشفق سے شرمندہ نہ ہونا پڑا، صرف ایک امید کے سہارے پر یہ راہِ دُور دراز طے کی گئی ہے ورنہ منزل کا نشان نہ ابتک ملا ہے نہ آئندہ ملنے کی توقع ہے ؎

خبر نیست کہ منزل گہِ آں یار کجاست ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسی می آید[2]

تو اس خیال کی اصلاح کرنی پڑتی ہے (نا دانستہ ان کی شاعری کی بانگ دوسری طرف مڑ گئی تھی بلکہ برخلاف اس کے جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں اس حقیقت پر سے پردہ اٹھتا ہے کہ ان کی شاعری کی غرض و غایت لٹریری خدمت اور اردو ادب کے خزانے میں کسی انمول جوہر کا اضافہ کرنا نہیں بلکہ سرسید کے خیالات کی تبلیغ اور اصلاحِ مسلمانان کی تکمیل میں حصہ لینا تھا۔ یہ غرض پوری ہوئی اور اس دلوں کے بھید اور "اعمال کی نیتوں" کو جاننے والے نے اس کا انہیں بدلہ بھی دیا۔)

[1] وہ خدا ہی جو ناامیدی کے بعد بارش کو بھیجتا ہے اور اپنی رحمت کے بادلوں کو پھیلاتا ہے ۱۲

[2] مقدمہ مسدس صفحہ ۴ و ۵ مطبوعہ ۱۹۰۹ء مطبع انسٹیٹیوٹ پریس علیگڈھ ۱۲

قصۂ ناتمام

(از جناب "اپالو")

رات کے کوئی دو بجے ہونگے، میں اپنے کتب خانہ میں چیخوف کے ایک قصے پر قصہ لکھتا بیٹھا تھا کہ میرا ملازم گھبرایا ہوا، اور دوڑتا اندر آیا اور کہنے لگا کہ بوڑھی بیگم مرجان جسکا دروازہ آپ کے گھر سے ملا ہوا ہے باورچیخانہ میں بیٹھی آپ کو بلا رہی ہے۔ یہ کہتے کہتے اس کا دم پھولنے لگا۔ "اس کے کرایہ دار کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ گولی مار لیا یا پھانسی دے لیا"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا "وہ ڈاکٹر کے پاس جا سکتی ہے یا کوتوالی"

"میاں وہ غریب ڈاکٹر کو بلانے کیا جائیگی۔ اس کا تو دم نکل رہا ہے۔ مارے ڈر کے چولہوں کے اندر گھس گئی ہے۔ خدا کے واسطے آپ مدد کیجیے"

میں نے اپنی شیروانی اور ٹوپی پہنی۔ اور بیگم مرجان کے مکان کو گیا۔ جس دروازے کی طرف میں چلا تھا۔ کسی حریص کے منہ کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہاں کچھ توقف کر کے ڈرتے ڈرتے صحن کے اندر گیا۔ آواز دینے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا۔ اندھیری کمانوں میں دروازہ کو غیر مقفل پایا۔ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ روشنی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ لیکن ایک طرح کی خوشبو آ رہی تھی۔ اندھیرے میں راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلنے لگا۔ میری کہنی کسی سخت لوہے کی چیز سے ٹکرا گئی۔ اور ایک تختہ سے معانقہ ہوا جو زمین پر آتے آتے رہ گیا۔

اس کو دیو و پری کا قصہ نہ سمجھیے۔ میرا مقصد قارئین کو ڈرانا نہیں ہے۔ جو نقشہ میں نے دروازے کے قریب سے دیکھا عجیب و سواس زا تھا۔ ایسا نقشہ موت ہی اتار سکتی ہے میرے سامنے ہی وہ دروازہ تھا جس سے دیوانخانہ کو راستہ جاتا تھا۔ تین پانچ بتی دار شمعدان ایک قطار میں رکھے ہوئے، دیوار کے بھورے بدرنگ کاغذ پر روشنی ڈال رہے تھے کمرے کے درمیان دو میزوں پر ٹکا ہوا ایک جنازہ رکھا ہوا تھا۔ دو شمعون کی روشنی میں وہ مہیب چہرہ نظر آ رہا تھا، جس کا رنگ زرد اور منہ نیم باز، ناک سوتواں

سوتواں ملازم کی زبان میں۔

تھی ململ کی تھیں بے ترتیبی کے ساتھ چہرہ سے لیکر پاؤں کے انگوٹھے تک لپٹے ہوئے تھیں اس میں سے دو بے حس ہاتھ ایک تسبیح لئے ہوئے نظر آرہے تھے۔ دیوانخانہ کے تاریک گوشہ، جنازہ کے پیچھے کی چیزیں اور خود جنازہ ہر چیز، سوائے ٹمٹماتے ہوئے شمعون کے موت سے متاثر بلکہ ایک لحد کا نمونہ بنے ہوئی تھی۔

"کسقدر تعجب ہے!" میں اس غیر متوقع نظارہ موت سے گونگا ہوکر، خیال کرنے لگا "غضب کی تیزی۔ کرایہ دار نے بمشکل مار لیا ہوگا یا پھانسی دے لی ہوگی اور یہاں پہلے ہی سے جنازہ موجود ہے!"

میں مڑکر دیکھا۔ بائیں جانب ایک دروازہ شیشہ کی کمانوں کا تھا۔ سیدھی طرف ایک ٹوٹی کھونٹی جس پر ایک فرسودہ شیروانی لٹک رہی تھی۔

"پانی" ایک کراہنے کی آواز کان میں آنے لگی۔

آواز بائیں جانب سے آرہی تھی۔ جدھر شیشہ والا دروازہ واقع تھا۔ میں دروازہ کھولکر اس اندھیرے اور ایک ایسے دریچہ والے کمرہ میں داخل ہوا۔ جو کوچہ کی قندیل سے روشنی لے کر اجلا ہو رہا تھا۔

"کیا یہاں کوئی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے دیاسلائی جلائی۔ اسکی روشنی میں جو کچھ دیکھا وہ یہ ہے ایک بھلا مانس خون آلود زمین پر میرے قدموں کے پاس ہی بیٹھا ہوا ہے اگر میرا قدم ذرا آگے بڑھتا، تو یقیناً اُس کے سر پر اُترتا۔ پاؤں پھیلے ہوئے اور ہاتھ زمین پر ٹکے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اس خوب صورت چہرہ کو اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جسپر اُس کی گھنی ڈاڑھی میں سے بھی موت کی زردی کے آثار ہویدا تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں جو میری طرف کو اُٹھیں دہشت، تکلیف اور التجا کا نمونہ بنی ہوئی تھیں۔ ٹھنڈے پسینے کے قطرے چہرے پر بہ رہے تھے۔ یہ پسینے کے قطرے، اُس کے تیور، زمین پر ٹکے ہوئے ہاتھوں کی کپکپاہٹ سانس کی تیزی اور مضبوط بندھے ہوئے دانت بتلا رہے تھے کہ وہ ناقابل برداشت تکلیف میں مبتلا ہے۔ سیدھے ہاتھ کے قریب خون کے چھینٹے میں ایک روا لور رکھا ہوا تھا۔

"جاؤ نہیں" ایک ضعیف آواز میرے کان میں آئی، "جب دیاسلائی بجھ گئی یہ میز پر ایک شمع رکھی ہے۔"

میں نے شمع روشن کی۔ اور بھوت بنا کمرہ کے درمیان کھڑا رہا۔ اس خیال میں کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس آدمی کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

"درد ناقابل برداشت ہے" اُس نے آہستہ کہا۔ "اور مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ پھر مارفین طبیعت بھی نہیں چاہتی"

میں نے شیروانی پھینک دی۔ اور بیمار کے پاس گیا۔ اس کو بچے کی طرح زمین سے گود میں اُٹھا کر، قریب کے صوفہ پر بٹھایا اور اُس کے کپڑے احتیاط سے اُتارے۔ اُس کا جسم سردی سے کانپ رہا تھا۔ لیکن زخم پر جب نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ وہ اس کپکپاہٹ اور بدہیبتی کے مناسب نہیں تھا۔ خفیف سا تھا۔ گولی پسلی کی پانچویں اور چھٹی ہڈی پر کہال اور گوشت کے درمیان سے گزر گئی تھی۔ خود گولی اُس کی شیروانی کی بڑی جیب کے پاس اٹک رہی تھی۔ حتی الامکان خون کو روکنے کی تدبیر کرنے کے لئے غلاف، توال اور دو دستیوں کی ایک عارضی پٹی بنا کر باندھ دی زخمی کو تھوڑا پانی پلایا۔ اور ایک قریب لٹکتے ہوئے اوور کوٹ میں اُس کو لپیٹ دیا۔ پٹی باندھتے ہوئے ہم میں سے کسی نے بھی گفتگو نہیں کی۔ میں جب مصروف تھا، تو وہ تصویر کی طرح کہلی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ گویا خودکشی کی اس ادھوری کوشش اور میری زحمت سے وہ شرمندہ ہے۔

"اب میں آپ کو بے حس پڑے رہنے کی زحمت دیتا ہوں" میں نے اس وقت کہا جبکہ زخم کا باندھنا ختم ہو چکا تھا۔ "میں دواساز کے پاس سے دوا لانے جا رہا ہوں"

"ضرورت نہیں" اُس نے دبی زبان میں کہا۔ اور میری آستین کھینچتے ہوئے آنکھیں پھاڑ دیں اُن آنکھوں میں دہشت بھری تھی۔ میرے جانے سے وہ ڈر رہا تھا۔

"ضرورت نہیں۔ پانچ منٹ اور توقف کیجیئے۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو۔ توقف کیجیئے۔ میری درخواست ہے"

اِس التجا کے وقت وہ پھر تھرّا رہا تھا۔ اور اُس کے دانت بج رہے تھے۔ دس منٹ خاموشی کی حالت میں گزرے۔ میں بے حس بیٹھا ہوا اس کمرہ کو دیکھ رہا تھا، جہاں اتفاق نے مجھے اِس غیر متوقع طور پر پہنچا دیا تھا۔ یہ شخص جو ایک پسندیدہ اور نسائی چہرہ اور گھنی ترشی ہوئی داڑھی اور ایسا ماحول رکھتا تھا، جو ایک معمولی کاروباری آدمی کے لئے باعث رشک نہیں ہو سکتا تھا۔ صوفہ پر کے آمریکائی چمڑے کی دھجیاں اُڑ رہی تھیں۔ ایک فرسودہ چکنی کرسی، ایک میز کاغذ سے ڈھکی ہوئی اور ایک بدنما نقشہ دیوار پر لٹکا ہوا اس کمرہ کی

کائنات تھی۔ سکرہ نم، بند اور اُداس تھا۔

"کیسی تیز ہوا ہے؟" مریض نے آنکھیں کھولے بغیر ہی کہنا شروع کیا۔ "کیا سمندر سے چل رہی ہے؟"

"ہاں" میرا جواب تھا۔ "میرا خیال ہے کہ میں تم کو جانتا ہوں۔ کیا تم نے کھٹاؤز کمپنی کے ساتھ برسال کرشنا تھیٹر میں کھیل کیا تھا؟"

"اس کا کیا ذکر ہے" اُس نے آنکھیں کھولکر کہا۔

اس کے چہرہ پر غم کے بادل چھاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"میں نے تم کو یقیناً وہاں دیکھا ہے۔ کیا تمہارا نام وحید نہیں ہے؟"

"اگر ہو بھی تو اس سے کیا سروکار مجھے جاننے سے تمہارا کیا فائدہ ہوگا؟"

"کچھ نہیں یونہیں دریافت کیا۔"

..... وحید نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور اس طرح صوفہ کی دوسری جانب پلٹ گیا گویا کہ وہ رنجیدہ ہوگیا ہے۔

میں تمہاری اس کرید کو نہیں سمجھا۔ اب آگے مجھ سے تم یہ بھی دریافت کرنے لگو گے کہ کس چیز نے مجھے خودکشی پر مجبور کیا۔"

ایک منٹ بھی نہیں گزرا ہوگا کہ وہ میری طرف پھر پلٹ گیا۔ اور آنکھیں کھولکر روتی آواز میں کہنے لگا۔

"اس گستاخانہ لہجے کو معاف فرمائیے۔ لیکن آپ اُس سے انکار نہیں کرسکتے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ایک مجرم سے یہ دریافت کرنا کہ وہ قید خانہ میں کس طرح آگیا یا ایک مرتکب خودکشی سے کہ اُس نے کس لئے اس کا ارتکاب کیا، کوئی ہمدردانہ فعل نہیں ہے۔ کرید کی تشفی کا خیال دوسرے کے سکون کی بربادی پر!

"تمہارے مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں..... وجہ تحریک کے دریافت کا مجھے بالکل خیال نہیں ہوا۔"

"تم وہی پوچھتے ..... یہی لوگ ہمیشہ کیا کرتے ہیں گو اس سے کوئی فائدہ بھی نہو۔ اگر میں تم سے کہوں تو تم کو یقین نہ آئے یا تمہاری سمجھ میں نہیں آئیگا..... میں معترف ہوں کہ یہ چیز خود میری سمجھ سے بالا ہے۔ بعض فقرے کو توالی کی رپورٹ یا اخباروں میں ملتے ہیں

جیسے "ناکام محبت" حد سے بڑھا ہوا افلاس" لیکن اسباب معلوم نہیں ہوتے ..... نہ تم کو معلوم ہیں، نہ مجھے اور نہ اس اخباری کو جو "خودکشی کی ڈائری" لکھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ خدا ہی اس انسان کے دل سے واقف ہو سکتا ہے جو اپنی جان آپ لینے تیار ہو جاتا ہے۔ مگر "نوا گران نخوردہ گزند را چہ خبر"۔

"یہ سب درست ہے۔ لیکن تم کو بات کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے"۔

خوکش خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ مکی پر سرجا کر ایک بڑے پروفیسر کی طرح کہنے لگا۔

"انسان خودکشی کی نفسیاتی نزاکت کو ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔ پھر اسباب و علل کی گفتگو کون کر سکتا ہے؟ آج یہ سبب ایک آدمی کو ایک روالور پکڑنے پر مستعد بنا دیتا ہے۔ اور کل وہی سبب ایک کوڑی کی اہمیت بھی نہیں رکھتا۔ اس کا تمام تر انحصار عموماً کسی خاص موقع میں کسی فرد کی خاص حالت پر ہوتا ہے۔ مثلاً مجھے لیجئے۔ آدھ گھنٹہ پہلے مجھے مرنے کی سخت خواہش تھی۔ اب جب چراغ روشن ہو گیا۔ اور تم میرے قریب بیٹھے ہوئے ہو، میں موت کا خیال تک بھی نہیں کر سکتا اس تغیر کو سمجھاؤ اگر تم سے ہو سکے۔ کیا میں مر گیا یا میری بیوی زندہ ہو گئی۔ کیا یہ روشنی کا اثر ہے یا ایک اجنبی کی موجودگی کا"۔

"روشنی یقیناً ایک اثر رکھتی ہے" میں نے کچھ کہنے کی خاطر کہہ ڈالا۔ "روشنی کا اثر اجسام پر"

"روشنی کا اثر"..... "ہم اسکو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن تم جانتے ہو کہ لوگ روشنی میں بھی اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے ہیں۔ حقیقت میں تمہاری ناولوں کے بڑے شخص قصہ کی بڑی بہتری ہو گی اگر صرف ایک شمع کی روشنی اس کی حیات کے کھیل میں ایسا فوری انقلاب پیدا کر دے یہ تمام بکواس شاید سمجھائی جا سکے۔ لیکن ہم سے نہیں جس چیز کو ہم خود نہیں سمجھتے اس کی وضاحت کرنی یا اس کے متعلق سوالات کرنا فضول سی بات ہے۔

"معاف کرنا" میں نے جواب دیا۔ "لیکن اس وقت تمہارے چہرہ کے تیور سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ تم ہراساں ہو"۔

وحید نے چونک کر کہا۔ "ہاں کیا عجب! میں عادتاً ظاہر پرست اور کمزور فطرت ہوں۔ اچھا اگر تم کو قیافہ شناسی کا ادعا ہے تو اس کو سمجھاؤ تو سہی۔ آدھ گھنٹہ قبل میں نے خودکشی کی کوشش کی۔ اور اب میں اس سے مکر رہا ہوں۔ کیجئے اسکی توجیہ"

یہ آخری الفاظ وحید نے ضعیف اور کمزور آواز میں ادا کئے۔ وہ تھک گیا تھا اور آخر کار

خاموش بھی ہوگیا۔ یہ سکوت کچھ عرصہ تک قائم رہا میں نے اس کے چہرہ پر نگاہ تجسس ڈالنی شروع کی۔ مُردنی چھا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی روح نکل گئی۔ صرف اُس کی بیچینی اور اضطراب کی کیفیت اُس کے زندہ ہونے کا یقین دلا رہی تھی۔ اس چہرہ کی طرف دیکھنا تکلیف دہ تھا۔

لیکن خود وحید کی کیا حالت تھی نہیں معلوم جس میں ابھی تک بحث کرنے کی قوت باقی تھی اور اگر میں غلطی پر نہیں تو ہرانے کی بھی۔

"تم یہاں ..... کیا تم یہیں ہو؟" وحید نے دفعتہً کہنیوں کے بل اُٹھکر دریافت کیا خوب! اچھا سنو"!

میں سہمہ تن گوش بن گیا۔ بارش بغیر ایک منٹ وقفہ لئے ہوئے بھی، سیاہ دریچہ سے ٹکرا رہی تھی۔ ہوا کا زور و شور المناک آوازوں میں سنائی دے رہا تھا۔

"اور میں برف سے زیادہ سفید ہو جاؤنگا، اور میرے کان خوش آہنگی اور خوشخبری سے آشنا ہو جائینگے"۔ بیگم مرجان جواب واپس ہو چکی تھی، کمزور اور تھکی ہوئی آواز سے دیوانخانہ میں پڑھ رہی تھی۔ اس کی آواز میں اُتار چڑھاؤ نہ تھا۔

"کس قدر فرحت خیز ہے؟ کیوں سنتے ہو؟" وحید کے خوف زدہ آنکھیں میری طرف کرکے آہستہ سے کہا۔

"خداوندا! انسان کو کیا کیا دیکھنا اور سنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی اس سمع خراشی کو خوش آہنگی میں تبدیل کردے۔ تو پھر بقول شخصے یہ حالت ہو جائیگی۔

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

اِس وقت اِس ترنم کو میں کسقدر عمدگی سے سن سکونگا۔ اور کیسے محسوس کرونگا اب وقت کیا ہوگا؟

"تین بجنے میں پانچ منٹ ہیں"

"صبح تو ابھی دور ہے، لیکن ادھر ہوئی اور ادھر جنازہ کی تیاری۔ کیا خوبصورت سماں ہوگا۔ جنازہ کے ہمراہ ایک شخص کیچڑ پانی میں جا رہا ہے، اور چلتے ہوئے کچھ نہیں دیکھ سکتا سوائے ابر آلود آسمان اور المناک منظر کے۔

راستہ، دکانیں دیوار و در سب کے سب خاک آلود ..... خود پیامبر بھی گھٹنوں تک بھیگا ہوا۔ راہ ناپید، اکنار۔ بہ تہذیب لوگ۔ اور دل پر پتھر رکھے ہوئے۔

کچھ وقفہ سے اُسنے یک بیک دریافت کیا۔"

"کیا لفٹننٹ کریم کو دیکھے ہوئے تمہیں عرصہ ہوگیا؟"

"گزشتہ گرمیوں کے بعد سے اُسے نہیں دیکھا۔

"وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک سورما تصور کرتا ہے۔ لیکن آدمی اچھا ہے۔ کیا تمہارا لکھنا ختم نہیں ہوا۔

"نہیں کچھ باقی ہے۔"

"اہا ..... کیا تم کو یاد ہے کہ میں زہرا سے محبت کی ابتدا کے وقت کس طرح اُس کے ساتھ سایہ کی طرح پھرتا تھا۔ اور اُس کی خاطر تھیٹر کا کیسا دیوانہ ہو رہا تھا؟ ..... یہ سب بیوقوفانہ حرکات نہیں۔ لیکن بُری نہیں۔ مذاق تھا۔ اسکی یاد کے ساتھ ہی بہار کا سیلاب آتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اب ..... کس قدر دل خراش تبدیلی! یہ تمہارے لئے اچھا موضوع ہے۔ صرف خودکشی کے واقعات لکھنے سے پرہیز کرو۔ یہ تو ایک رسمی اور بدنما بات ہے۔ تم اس سے کوئی ظریفانہ پہلو نکال لوگے۔"

"پھر تم نے ہرزہ درائی شروع کردی" اسنے کہا۔ "تمہارے معاملے میں کوئی چیز مضحکہ خیز نہیں۔"

"کچھ مضحکہ خیز نہیں۔ تم کہتے ہو کہ کچھ مضحکہ خیز نہیں۔" اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنسو آنکھوں میں کھیلنے لگے۔ اُس کے زرد چہرہ سے نہایت تکلیف دہ آثار ظاہر ہونے لگے۔ ہونٹ کانپنے لگے۔

"دغاباز دفتریوں اور بے وفا بیویوں کی تو تم ہنسی اُڑاتے ہو۔" اُس نے کہا۔ "لیکن کون دفتری اور کون بیوفا بیوی نے ایسی دغا کی، جیسی کہ میری قسمت نے دغا کی۔ مجھ سا فریب خوردہ نہ تو بنک میں روپیہ رکھنے والا ہوگا اور نہ کوئی مطیع شوہر۔ صرف اس کے سمجھنے کی کوشش کرو کہ میں بھی کسقدر بیوقوف بنایا گیا۔ تمہارے سامنے کی بات ہے کہ پارسال خوشی کے مارے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے اور اب تمہارے سامنے .....

وحید کاسر تکیہ میں چھپ گیا۔ اور وہ ہنسنے لگا۔ "اس انقلاب سے زیادہ شاید ہی کوئی چیز قیاس میں آسکیگی۔ پہلا باب محبت، شادی۔ شادی حقیقی معنوں میں دوسرا باب علاش معاش، بنیئے کی دوکان، تھیٹر، دواساز کی دوکان اور ..... کل کیچڑ اور

پانی میں چلتا ہوا قبرستان کو"

اُس نے ہنسنا شروع کیا۔ مجھپر بیحد رقت طاری ہوئی۔ میں جانے کے لئے تیار ہو گیا

"میں تم سے کہتا ہوں کہ تم کچھ دیر آرام کر لو۔ میں دواساز کی دوکان ہو آتا ہوں"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اپنا لبادہ پہن لیا۔ اور کمرہ کے باہر چلا۔ آگے بڑھنے پر جنازہ نظر پڑا جس کے قریب مرجان بیٹھی ہوئی تلاوت میں مصروف تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر غور کیا۔ لیکن بہ ہیئت، زرد رنگ زہرا کو نہیں پہچان سکا جو کبھی حسین، دلربا اور کھٹاؤ کی کمپنی کی روح روان تھی۔

"رہے نام اللہ کا" میری زبان سے نکل گیا۔

اِس کے بعد ہی میں باہر نکل گیا۔ روالور کو بھی لیتا گیا۔ دواساز کے پاس پہونچا۔ چلے جانے کا مجھے خیال بھی نہیں آیا۔ جب میں پھر واپس ہوا تو وحید کو بیہوش پڑا پایا پٹیاں بُری طرح پھاڑ دی گئی تھیں۔ اور زخموں سے خون جاری تھا۔ پو پھٹنے سے پہلے میں اس کو ہوش میں لانے میں کامیاب نہو سکا۔ اس پر بحر ان کی حالت طاری تھی۔ جسم کانپ رہا تھا۔ اور دن نکلنے تک اُس کی حسرتناک نظریں کمرہ کے اطراف پھرتی رہیں۔ مردہ کو غسل دینے والوں کی آوازیں ہمارے کان میں آنے لگیں۔

جب وحید کا کمرہ خویش واقارب سے بھرا ہوا تھا۔ اور میت اپنے آخری ٹھکانے کی طرف جا چکی۔ تو میں نے اسکو مکان ہی میں آرام کرنے کی تاکید کی لیکن میری بات وہ کب ماننے والا تھا۔ باوجود شدید درد، صبح کی سردی اور بارش کے وہ اپنی کر رہا تھا۔ ننگے سر قبرستان تک خاموشی کے ساتھ جنازہ کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ قدم اُٹھانا مشکل تھا۔ زخموں کو نوچ پھاڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ حیات سے بیزار معلوم ہوتا تھا کئی دفعہ چھوٹے چھوٹے سوالات کرے اُس کو اس کی محویت کی حالت سے نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک دفعہ اُس نے باڑ پر نظر ڈالی اور کچھ دیر تک اُس کی آنکھوں سے غم وغصہ کے آثار ظاہر رہے۔

"حکیم محمد عبد القدوس سند یافتہ" ایک تختہ پر پڑھا" جاہل نادان انسان انہیں شیطان پکڑلے" قبرستان سے اُس کو میں گھر لے گیا۔

اِس یادگار رات کو اب صرف ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اور مشکل وحید کا وہ جوتا

بھی پھٹا ہوگا جس کو پہنے ہوئے اُس نے کیچڑ پانی میں اپنی بی بی کے جنازے کا ساتھ قبرستان تک دیا تھا۔

اِس قصہ کو اب میں ختم کر رہا ہوں۔ وہ اِس وقت میرے دیوانخانہ میں بیٹھا ہوا ہے اور ہارمونیم کے پردوں کو چھیڑ رہا ہے۔ میں پردہ کا موید نہیں اِسلئے پردہ شکن بیویوں اور لڑکیوں کا اجتماع یہاں اکثر رہتا ہے۔ چنانچہ اِس وقت بھی ایسا ہی ایک موقع ہے۔ کچھ لڑکیاں جو وحید کی دوست ہیں، اُن کو یہ اس وقت دیہاتی لڑکیوں کے گانے کی نقل کرکے بتلا رہا ہے لڑکیوں کی خندہ زنی سے سررشتہ خیال گم ہے۔ وحید کیا کر رہا ہے؟ وہ بھی ہنس رہا ہے اِس کو وہ لطف حیات سے تعبیر کرتا ہے۔

میں اُس کو اپنے کتب خانہ میں بلاتا ہوں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دلچسپ صحبت میں میری صدا مداخلت کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ آتا بھی ہے تو اسطرح کہ میری میز کے سامنے ڈٹ جاتا ہے گویا اہم مشاغل والے آدمی کی طرح اس کو گفتگو کا بھی وقت نہیں ہے۔

مین نے یہ قصہ اس کو پڑھنے کے لئے دیا۔ دنیا میری قدرت قصہ نگاری کی قائل ہو تو ہو لیکن یہ اس کو کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے، اور آرام کرسی پر دراز ہوکر اسپر تنقید شروع کر دیتا ہے۔

"چولھے بھاڑ میں جھونکو۔ کیسے ہوشربا واقعات ہیں!" مُسکراہٹ کے ساتھ گنگنانے لگتا ہے۔ لیکن آگے جس قدر وہ بڑھتا جاتا ہے، چہرہ پر سنجیدگی کے آثار نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ آخرکار دلشکن ماضی کے حالات اس کے چہرہ کو زرد بناکر چھوڑتے ہیں، وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن پڑھنا جاری ہے۔ ختم کرکے ٹہلنے لگتا ہے۔

"قصہ کسطرح ختم ہو رہا ہے؟" مین نے دریافت کیا۔

"قصہ کس طرح ختم ہو رہا ہے"؟ ہون ن ن ن ....."

وہ کمرے کو، مجھکو اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ اس کو اپنی وضعدار نئی شیروانی کا خیال آتا ہے دوست لڑکیوں کی ہنسی کی آوازیں سنتا ہے ..... ایک کرسی پر بیٹھکر وہی ہنسی ہنستا ہے جو اس رات میں دیکھی گئی تھی۔

"کس قدر درست کہتا تھا کہ یہ سب حماقت ہے؟ خدایا! کیا بوجھ اٹھا رہا ہوں جو ایک ہاتھی کی پیٹ بھی توڑ دیگا۔ خدا جانتا ہے مجھے کیا تکلیفیں اُٹھانی پڑی ہیں شاید ہی کوئی

ایسی تکلیفوں میں مبتلا ہوا ہوگا۔ اور اب کہاں ہیں وہ اثرات؟ تعجب ہے۔ ایک سبکسار ساحل یہ خیال کریگا کہ زحمتوں کے اثرات انسان پر ہمیشہ مسلط رہتے ہیں اور کبھی محو نہیں ہوتے۔ لیکن کہ وہ کس طرح آسانی کے ساتھ ایک "مارکٹی"[1] جوتے کی پائداری سے بھی جلد محو ہو رہے ہیں۔ کچھ باقی نہیں۔ گویا میں نے کبھی مصائب اُٹھائے ہی نہیں تھے اور ہمیشہ ناز و نعم میں رہا۔ اِس عالم کی ہر شئے فانی ہے اور فنائیت خود بیکار ہے! ظریفوں کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ لگا ہے۔ یار! کسی ظریفانہ خاتمہ پر قصہ ختم کرو۔"

"وحید! وحید! جلد ادھر آنا۔" لڑکیوں نے بے صبر ہو کر پکارنا شروع کیا۔

"آیا" اِس "تہی مغز کمزور فطرت" کا جواب ہوتا ہے۔ "دوست یہ سب کچھ لغو اور قابل رحم قابل رحم اور لغو ہے۔ لیکن کریں کیا؟ خدا میں بڑی قدرت ہے۔ مادر فطرت کی تعریف کرتا ہوں کہ ہیئت کی تبدیلی میں اس کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ اگر ہمارے دردسر کی تکلیف دہ یاد اور ہر ایک پر گزرے ہوئے مصائب کی یاد تازہ رہے تو یقیناً ہم خاکیوں کی حیات نہایت خسارہ میں رہے۔

میں اس کے خندہ زنان چہرہ پر دیکھتا ہوں تو سال بھر پہلے کی اس کی وہ مایوس اور مہیب صورت یاد آجاتی ہے جب وہ تاریک دریچہ پر نظریں گاڑے ہوئے تھا اور جب اس کی ذہن ہزرہ درائیوں اور تبدیل ہیئت کے متعلق نظریوں کو سنتا ہوں تو معاً اس کا خون کے ڈبرے میں زمین پر بیٹھنا اور مایوس عاجزانہ نگاہوں سے دیکھنا یاد آجاتا ہے۔

"قصہ کس طرح ختم ہوگا؟" میں بآواز اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔

وحید سیٹی بجاتے ہوئے اور اپنی شیروانی کا کالر درست کرتے ہوئے میرے کمرہ سے نکلکر دیوانخانہ میں چلا جاتا ہے۔ میری نظریں اس کے ساتھ جاتی جاتی ناراض واپس ہوتی ہیں۔ چند وجوہات سے مجھے اس کی گذشتہ مصائب پر ترس آتا ہے۔ اس مہیب رات میں اس شخص پر ترس کھانے پر مجھے تاسف ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری کوئی شئے کھو گئی ہے ....."

---

[1] "مارکٹی" سے اس کی مراد وہ کم قیمت جوتے ہیں جو افضل گنج (حیدرآباد دکن) کے قریب مارکٹ میں بیچے جاتے ہیں۔

بہرام گور دکھن میں

ہمارے لایق دوست مولوی ابوالحسنات، سید غلام محی الدین صاحب قادری زور ایم۔اے عثمانیہ یونیورسٹی کے وہ قابل قدر طالب علم ہیں کہ جنھوں نے اپنی غیر معمولی جودت اور اپنے تنقیدی مقالات کی وجہ سے ملک میں ایک خاص امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ اس وقت موصوف انگلستان میں سرکار عالی کی جانب سے "لسانیات" کی تحقیقاتی تعلیم میں مصروف ہیں، وہاں بھی وہ اپنی جودت طبع کے باعث مشہور ہو چکے ہیں، آج کل برٹش میوزم کی فہرستوں کی تنقید میں منہمک ہیں، ان فہرستوں میں جو جو فروگزاشتیں ہوگئی ہیں اُن کی تصحیح کے ساتھ فہرستوں کے بعد کی داخل شدہ کتابوں کی بھی ایک فہرست تیار کر رہے ہیں جو غالباً ان فہرستوں کے ضمیمہ کے طور پر برٹش میوزم کی جانب سے شایع ہوگی۔ یہ مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔" (مجلہ کتبہ)

" یہ وہ مشہور نیم تاریخی شخصیت ہے جس کے متعلق فارسی میں بعض دلچسپ فسانے لکھے گئے ہیں اور جن کی غیر معمولی قبولیت نے دوسری زبانوں کے سخنوروں کو بھی اس موضوع پر طبع آزمائیاں کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔

دکھنی زبان میں، نہ معلوم، اس کے متعلق کتنے قصے لکھے گئے۔ اب تک جن تین کارناموں کا پتہ چلا ہے۔ اُن کی نسبت بھی، افسوس ہے کہ، عام طور پر غلط معلومات کی اشاعت ہوئی ہے۔ چنانچہ اِن اصولی غلطیوں کی تردید بھی اس مضمون کے مقاصد تحریر میں داخل ہے۔

اصل موضوع پر قلم اُٹھانے سے پہلے اس امر کا ذکر شاید نامناسب نہوگا کہ فارسی حصوں میں۔ ۱۔ نظامی کی "ہفت پیکر"، ۲۔ ہاتفی کی "ہفت منظر"، ۳۔ خسرو کی "ہشت بہشت" اور ۴۔ امین کی "بہرام و گل اندام" کے علاوہ برٹش میوزم ہی میں اس موضوع پر (گورمکھی زبان میں ایک، گجراتی میں ایک، پنجابی میں دو اور اُردو نثر میں ایک ـــــ جملہ پانچ

اور کتابین موجود ہیں جن میں سے اکثر کا ذکر دکھنی مثنویوں کے اسی تبصرے میں موقع بموقع آتا رہے گا۔"

(۱)

دکھن میں بہرام کے متعلق سب سے قدیم مثنوی "بہرام و بانوحسن" ہے۔ یہ ۱۰۵۰ھ میں لکھی گئی ہے، جیسا کہ کتاب کے آخر کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے جو بعد میں نقل کئے جائینگے فی الحال یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ مصنف گولکنڈہ کا تھا یا بیجاپور کا۔

برٹش میوزیم کے کیٹلاگ میں (دیکھو صفحہ ۲۰ مخطوطہ نمبر ۴۴) مصنف کا نام دولت لکھا گیا ہے۔ حالانکہ اس کا اصلی مصنف امین ہے۔ جس کے بعض ثبوت یہ ہیں۔

۱۔ حمد کے خاتمہ اور نعت کے آغاز کے وقت لکھا ہے۔

امین کر ثنا بیچ آخر کلام — محمد پر بھیجو درود و سلام (ورق ۲ ب)

۲۔ اپنے مرشد کے ذکر میں۔

امین شاہ عالم ہمارے ہیں پیر — ہیں روز حشر میں میرے دستگیر (ورق ۳ ب)

امین آستانہ کا توں خاک ہو — حشر کے گنہ سے توں بے باک ہو (" " ")

۳۔ وجہ تصنیف وغیرہ کے ذکر میں۔

امین داستانہ قصہ اب کہو — خدا کے ثنا بیچ دایم رہو

۴۔ برٹش میوزیم میں گجراتی تہجی میں جو نسخہ بہرام و بانوحسن کا موجود ہے (دیکھو کیٹلاگ اردو صفحہ ۲۰ مخطوطہ نمبر ۴۴) وہ دراصل یہی مثنوی ہے۔ لیکن گجراتی میں پہلے کے ۳۵ شعر چھوڑ دینے کے بعد حسب ذیل شعر سے آغاز کیا گیا ہے۔

زبان پر بچن خوب آتا چلا — یو مضمون خوشتر بناتا چلا

اور اسی طرح کتاب کے آخر میں ۱۹ شعر چھوڑ دیئے گئے ہیں اور اس کو اس شعر پر ختم کر دیا گیا ہے۔

منگا تخت زریں بھلائے کر — شہنشاہ بانوحسن سوار کر (؟)

لیکن ابتدا میں اتفاق سے امین تخلص ظاہر کرنے والا حسب ذیل شعر بھی آگیا ہے جو ثابت کرتا ہے کہ واقعی یہ مثنوی امین کی ہے۔

امین داستانہ قصہ اب کہو — خدا کے ثنا بیچ دایم رہو

تاہم دولت بھی اس کا مصنف تھا۔ اُس نے غالباً اس کا آخری حصہ لکھا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ کتنے شعر اُس کے نتیجۂ قلم ہیں۔ مرتب کٹلاگ نے صرف آخر کے حسب ذیل شعروں کو دیکھکر دولت کو اس کا مصنف قرار دے دیا تھا۔ حالانکہ انہی میں صاف طور سے بیان کر دیا گیا ہے کہ آئین نے اس کو ناقص چھوڑ دیا تھا اور دولت ایک دوسرے شاعر نے اس کو ختم کیا۔

ہوئے بیت صد چار اور اک ہزار — بیان اس کا دولت کیا آشکار
آئین نے ناقص رکھا تھا اوسے — کہ دولت نے پورا کیا اب اوسے
سنہ ایک ہزار اور پنجاہ میں — جمعہ روز دہ، ربیع ماہ میں
بفضل الٰہی کیا میں نظم — بتاریخ چہارم کیا ختم
پڑے اور سنے جو کرے محبکو یاد — خوشی سیں کرے وہ اپن دل میں شاد
ثنا شعر میرے کی میں نہیں کیا — طبیعت کی زوری سے زینت کیا
غلام ہوں میں ساداتون کا در اصل — میں ہون خاکپا اُن کا از صدق دل
دعا کر یو مجہ حق اے مومناں — چھڑاویں نبی میرے تئیں بے گماں
کیا قصہ دولت نے یہ جب تمام — بحق محمد علیہ السلام

دونو شاعروں (آئین اور دولت) کے متعلق بیرونی ذریعوں سے اِس وقت تک کوئی حالات معلوم نہو سکے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ آئین کے تخلص کے اور دو مصنف قطب شاہیہ دور میں ملتے ہیں۔ لیکن اس آئین سے اُن دونو کو کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا کیونکہ۔

۱۔ شاہ بہرام و بانو حسن کا مصنف غالباً ۱۰۵۰ھ سے پہلے مرچکا تھا ورنہ دولت کو اِس کا شروع کیا ہوا قصہ ختم کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ غالباً وہ خود کر لیتا۔

۲۔ یوسف زلیخا (دیکھو اسپرنگر کٹلاگ اودھ صفحہ ۶۰۱) کا مصنف شیخ محمد آئین اورنگ زیب کے زمانہ میں (۱۱۰۹ھ میں) قصہ لکھتا ہے۔ یہ غیر معمولی بات معلوم ہوتی ہے کہ تقریباً ۶۰ سال تک بہرام والا آئین ہی زندہ رہا ہو۔ نیز یہ کہ ۶۰ سال کے بعد ایک اور کتاب "یوسف زلیخا" لکھے اور خود اپنی شروع کی ہوئی "بہرام و بانو حسن" کو نہ ختم کرے۔

۳۔ قصہ بہرام و شعلہ (دیکھو کیٹلاگ اُردو انڈیا افس صفحہ ۳۴۴) کا مصنف ابوالحسن تاناشاہ کے عہد حکومت میں (یعنے ۱۰۸۰ھ کے بعد) ۱۹ سال کا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص ۱۰۸۳ کے بعد ۱۹ سال کا ہو ۱۰۵۰ میں تو پیدا بھی نہوا ہوگا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ امین نمبر ۲ اور ۳ ایک ہی شخص ہو۔

برٹش میوزیم میں "بہرام و گل اندام" نام ایک مثنوی فارسی میں ہے جس کے مصنف کا تخلص بھی امین ہی ہے۔ (دیکھو مخطوطہ فارسی۔ اور نیٹل نمبر ۱۴۳۳)

امین بگذر ز پوچ خود کہ تا کے — بہ لب کف آوری و بر جبیں خوے

اِس خیال سے کہ شاید دونو ایک ہی مصنف کے ہوں، اُن کا مقابلی مطالعہ بھی کیا گیا لیکن فی الحال کوئی قطعی رائے نہیں قایم کی جا سکی۔ اتنا ضرور ہے کہ ان دونوں قصہ بالکل مشترک معلوم ہوتا ہے متعدد مقامات پر اشعار کے اشعار ہم مطلب ہیں۔ مثلاً

۱۔ دیو اور بہرام کی ملاقات کے وقت بہرام کی گفتگو۔

فارسی میں۔ کہ بنشین پیش من اے دیو مہتر — ز استادن نشستن از تو بہتر
چرا ہستی تو استادہ بہ پیشم — بیا، بنشین، بخور ساغر ز دستم
تو پیش من بخور مے من بہ پیشت — وگرنہ من ہمی ترسم زنیشت
نشست آں دیو پیش شاہ و مے را — بخورد و گوش کرد آواز نے را

اُردو میں دیا شاہ نے دیو کوں تب یہ جواب — کہ آؤ اپن مل کے پیویں شراب
گیا شہ کے نزدیک تسلیم کر — بٹھایا شہنشاہ نے تعظیم کر
دونوں مل کے بیٹھے ہوئے ہم کلام — گئی شاہ کے دل کی دہشت تمام
کیا شاہ اور دیو نیں مے کشی — ہوئے آپ میں آپ دونو خوشی

۲۔ بانو حسن یا گل اندام کی بہرام سے ملاقات کی تقریب۔

فارسی میں۔ ز چشمہ خویش را بیروں کشیدند — نظر کردند و رخت خود ندیدند
بہر سو جست و جو کردند بسیار — ندیدند ہیچ کس را جز بہ یار
پری رخ در تعجب گشت و استاد — پری روے دگر آواز بر داد
کہ ہر کس برد رخت ما ازیں جا — بیاید خود شتاباں بر درما
ہماں کارے کہ دارد ما بر آریم — برائے خاطر او جاں سپاریم

اُردو میں نہ دیکھا اپس رخت کوں ٹھار پر	اوٹھیاں وہ ترت سینہ (پر) بار کر
وو رونے لگیاں وہاں (ہاں) پنٹ زار زار	صبر کر گریباں کے تئیں پھاڑ پھاڑ
وہاں ڈھونڈیاں (یاں) بہوت بیزار ہو	اپس میں وہ سب آپ لاچار ہو
کھڑیاں ہو اُسی ٹھار کیتا او از	کہ اے دزد چھندی وحیلہ دراز
تو ہو آدمی یا فرشتا مگر	کہ ہے جن پری دیو بیداد گر
تو ہوے اپس کی کہے آمراد	قسم ہے خدا کی کریں اُس کو شاد

۳۔ بہرام کو گورخر کا لے اُڑنا۔

فارسی میں برآورد از کمر قحبی وزد شاہ	بجست وخیز آمد گور ناگاہ
بسوے آسمان پرید از جا	بسانِ بازگشت او باد پیما
اُردو میں ماری قحبی شہ نے اُسی آن پر	اڑا شہ کوں لیکر وہ اسماں پر

اگرچہ ان فارسی اور اُردو مخطوطوں میں قصہ بہت زیادہ ملتا جلتا ہے لیکن ان دونوں میں حسب ذیل اختلافات بھی ہیں۔

۱۔ اُردو میں معشوق کا نام بانوحسن ہے اور فارسی میں گل اندام۔

۲۔ اُردو میں بہرام کو بیس برس کی عمر سے بیش کیا ہے اور ایک دم قصہ شروع کر دیا ہے فارسی میں بہرام کے پیدا ہونے سے قبل اُس کے باپ کی بچہ کے لئے خواہش دکھائی ہے۔ پھر بچہ پیدا ہوتا ہے جو بڑا ہوشیار نکلتا ہے۔ لیکن شکار کو جانے اور اُس کے بعد گورخر کے بہرام کو لے اُڑنے کے بعد دونو قصے متحد ہو گئے ہیں۔

۳۔ فارسی میں جب گورخر غائب ہو جاتا ہے تو پہلے ایک سفید پوش انسان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لیکن اُردو میں ایک دم سفید دیو کی شکل میں آنکلتا ہے۔

تاہم اِن اختلافات کے باوجود جو یگانگت ہے وہ زیادہ قابل لحاظ ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ دکھنی آمین نے اِسی فارسی قصہ کا ترجمہ کیا ہو۔

دکنی مثنوی "بہرام و بانوحسن" سے آمین کے متعلق صرف اِس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حنفی مذہب کا پیرو تھا اور شاہ عالم نامی کا مُرید۔ ایک فارسی قصہ دیکھکر اُس کا ترجمہ کرنے کا

خیال پیدا ہوا، اور چونکہ طبیعت میں روانی تھی آسانی سے شعر نکلنے لگے۔ باوجود شاعرانہ قوت کے شاعر نہایت خاکساری اور انکسار سے کام لیتا ہے۔

دولت نے اِس قصہ کو بروز جمعہ ۱۴ ربیع (اول یا دوم؟) ۱۰۵۰ھ میں ختم کیا۔ تقریباً ۴۰۰ اشعر ہیں۔ دولت کے متعلق صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی آپ تعریف کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اور سیدوں کا خاص طور پر معتقد تھا۔

قصہ کا آغاز حمد سے ہوتا ہے۔ جس کے بعد چند شعر نعت اور چار یار، حسن، حسین، اور فاطمہ کی ثنا میں لکھے گئے ہیں۔ زبان صاف ہے نمونہ کے طور پر نیز کتاب کے متعلق کچھ اور معلومات دینے کے لئے چند آغازی شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

کیا حمد اور نعت کوں مختصر — نہیں میں کیا طول یو سر بسر
یکایک میرے دل پر آیا خیال — قصا یک کہوں میں مقیمی مثال
زبان پر بچن خوب آتا چلا — یو مضمون خوشتر بناتا چلا
مرے شعر نادر سنو اے عزیز — زباں کوں کیا ہوں سخن خوش تمیز
زباں پر ہے جس کے موتی آبدار — اُسی کے بچن کا ہے اکثر وقار
مرے شعر کی میں ثنا نہیں کیا — جو ہر مجھ زباں کا عیاں نہیں کیا
قصا میں کیا ہے جو گل نام کا — سو بانو حسن شاہ بہرام کا
جو کوئی پڑے سو کرے مجکوں یاد — تعجب سے دل کوں کرے اپنے شاد
انیں داستانہ قصہ اب کہو — خدا کے ثنا بیچ دایم رہو
قصا فارسی سُن کے پائی خبر — خدا کے جو قدرت میں یک تھا شہر
کہ فارس اُسی شہر کا نام تھا — وہاں بادشاہ شاہ بہرام تھا

(۲)

اس موضوع پر دوسری اہم دکھنی مثنوی ملک خوشنود بیجاپوری کی "ہشت بہشت" ہے۔ یہ محمد عادل شاہ کے زمانہ میں (یعنے ۱۰۳۶ھ - ۱۰۶۷ھ کے درمیان) لکھی گئی ہے۔ زیر نظر مخطوطے سے تاریخ تصنیف کا جو پتہ چلتا ہے اُس کی طرف برٹش میوزیم کے مرتب کٹلاگ کی توجہ منعطف نہیں ہوسکی حالانکہ ایک جگہ مصنف نے اِس کا ضرور ذکر کیا ہے کہ ؎

ملک خوشنود موتی صاف رولیا اپس کے نانو کا تاریخ بولیا

اِس سے بظاہر تو کوئی کام کی بات نکلتی نظر نہیں آتی۔ لیکن غور و خوض سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنے تخلص ہی سے اپنی تصنیف کا سنہ نکالتا ہے۔ یعنے ممکن ہے کہ ملک خوشنود سے تاریخ نکلتی ہو (۱۰۵۶ھ) اِس لفظ کو خوشنود نہیں بلکہ "خشنود" لکھا ہے۔ یہ تاریخ اِس لئے بھی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ مصنف نے محمد عادل شاہ کے عہد حکومت میں اِس مثنوی کے تصنیف پانے کا ذکر کیا ہے اور اُس کا عہد حکومت جیسا کہ اُوپر لکھا گیا ہے ۱۰۳۶ھ سے ۱۰۶۷ھ تک تھا۔

برٹش میوزیم کے کٹلاگ میں (دیکھو صفحہ ۴۲، مخطوطہ نمبر ۵) مصنف کا نام محمد شاہ لکھا گیا ہے یہ غلط ہے۔ کتاب میں متعدد جگہ مصنف نے اپنے تخلص کا استعمال کیا ہے جس کے بعض ثبوت یہ ہیں۔

۱۔ نعت کا آخری شعر دلاتج لطف کا دار و نبی پاک	بندے خوشنود کا جیو ہے دردناک (ورق ۷۶-ا)
۲۔ منقبت کا آخری شعر بندے خوشنود پر شہ کا نظر ہے	مراجنت نگر کے بیچ گھر ہے (ورق ۷۸-ا)
۳۔ مدح بادشاہ کا آخری ملک خوشنود موتی صاف رولیا	اپس کے نانو کا تاریخ بولیا (ورق ۸۰-ا)
۴۔ ایک قصہ کے آخر میں مٹھائی ہے بہوت اِس داستان میں	رہیا ہے یاد توسب کی زبان میں
جو کوئی دیکھے سو پاوے مدعا سب	بندے خوشنود کوں کرنا دعا سب (ورق ۸۰-ا)
۵۔ ایک اور قصہ کے آخر میں بندے خوشنود کوں توں نا بسرنا	دعاے خیر میرے حق پو کرنا (ورق ۱۰۸-ب)
۶۔ ایک اور قصہ کے آخر میں اتنکے جیو کے طوطی کا ہے چارا	کیا خوشنود نے اتمام سارا (ورق ۱۱۷-ا)
۷۔ ایک اور قصہ کے آخر میں بندے خوشنود اوپر لطف دہرنا	بچن سن ملک دعا سوں یاد کرنا (۱۳۰-ا)
۸۔ ایک اور قصہ کے آخر میں بندے خوشنود کا نادر بچن ہے	مجکوں سمجھے اُو سے سب نور تن ہے (۱۴۹-ا)

(جو کوئی)

۹۔ ایک اور قصہ کے آخر میں مٹھائی بات میں جو پاوے سائی — کہے خوشنود کا ہے یادگاری (۱۶۲۔ ل)
۱۰۔ ایک اور قصہ کے آخر میں مرے حق پر سکل کرنا دعا سب — یہی خوشنود کا ہے مدعا سب (۱۷۴۔ ل)
۱۱۔ بہرام کی دقتاں کے کرنے پہلے جوں نیک مرداں چل توں خوشنود — خدا حاصل کریں گا دل کا مقصود (۱۷۶۔ ل)
۱۲۔ کتاب کا آخری شعر بچن نادر ورق سب زرنگاری — ملک خوشنود کا ہے یادگاری (۱۷۸۔ ل)

مرتب کٹلاگ کو غالباً اِس وجہ سے غلط فہمی ہوئی کہ مثنوی کے آخری شعروں میں یہ شعر بھی شامل ہیں:-

کیا میں تو کتاب یو جگ میں مشہور — رہیا دنیا میں یوں جوں کھن اوپر سور
لکھیا کاتب عجب خوش خط زیبا — محمد شاہ ابن حاجی بابا
بزرگاں کے بچن میں کان دھرنا — کسی پر عیب دھر غیبت نہ کرنا
بدی سوں جن مرا غیبت کرے گا — خدا ہور مصطفےٰ کوں ناڈرے گا
رہے گنبد نمن اسمان کا ساز — مُلک بولے وہی آتا ہے آواز

معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف نے کاتب کی تعریف (جو کچھ) میں ایک شعر لکھدیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مصنف نے ابتدا ہی سے مثنوی کو محمد شاہ کے ہاتھ سے لکھایا ہو۔ بہرحال یہ ایک انوکھی بات ضرور ہے کہ متن کتاب میں کاتب کا نام بھی آجائے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بعد کا اضافہ ہوگا۔ کیونکہ اِس شعر کے بعد پندرہ بیس شعر اور ہیں جو حسب ذیل بیتوں پر ختم ہوتے ہیں:-

جو ہے میرا کتاب یوسب جہاں میں — عزیزیوں گرا چھے سب کی زباں میں
اُسے توں خاص کر سار یا کے من میں — کھلے دل یکہ اِس جوں پھول بن میں
پشانی عرض کا ہیں پر دھیرا ہوں — کتاب یو ختم کر سجدہ کریا ہوں
کروں میں شکر حق کا کیا یاداں ہے — جواہر بات کا مُج کوں دیا ہے
کیا ہوں بیت کا نادر شاریو — جو ہے دو سو پچیس اور تین ہزاریو
بچن نادر ورق سب زرنگاری — ملک خوشنود کا ہے یادگاری

اگر محمد شاہ والے شعر کو اضافہ سمجھا جائے تو انہیں بھی اضافہ ہی سمجھنا پڑے گا لیکن انہیں شاید ہی کوئی اضافہ سمجھ سکے۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مصنف نے اشعار کی تعداد ۳۲۲۵ بتائی ہے لیکن زیر نظر مخطوطہ میں ۲۰۰۰ دو ہزار سے بھی کم شعر ہیں۔

مصنف کے متعلق کتاب سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی گم نام شاعر نہیں تھا اُس نے اس سے قبل یوسف زلیخا پر بھی طبع آزمائی کی تھی۔ اُس کا کلام مشہور ہو چکا تھا۔ نیز یہ کہ محمد عادل شاہ اُس کا خاص طور پر قدر داں تھا۔ چنانچہ یہ کتاب بھی اُسی کی فرمائش سے لکھی گئی ہے۔ یہ حالات اُن اشعار سے معلوم ہوتے ہیں جو محمد عادل شاہ کی مدح کے سلسلہ میں کتاب کے آغاز میں لکھے گئے ہیں اور جو آئندہ پیش کئے جائیں گے۔

مصنف اور اُس کی تصنیفات کے متعلق کسی اور ذریعہ سے اب تک کوئی معلومات نہیں

امیر خسرو کی "ہشت بہشت" سے اس کا مقابلہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اُس کا بعینہ ترجمہ ہے۔ بہت کم ملک خوشنود نے اپنی طرف سے اضافہ یا تغیر و تبدل کیا ہے۔

عام مشرقی کتابوں کی طرح حمد سے آغاز کیا گیا ہے، نعت کے بعد دکھنی کی دوسری مثنویوں کی طرح معراج کا مستقل عنوان قایم کر کے اُس کا تفصیلی بیان لکھا ہے۔ پھر منقبت شروع کی ہے جس کے ساتھ ہی اپنے متعلق عجیب طرح سے حالات شروع کئے ہیں جن کے بعض شعر یہ ہیں:-

عجب یک ٹھار میں گلزار دیکھا — نجل (؟) جوں حسن کا بازار دیکھا
رنگا رنگی کھلے پھولاں چمن میں — اوچاے شور بلبل پھولبن میں

اسی سلسلے میں قسم قسم کے پھولوں کی حالت بیان کی ہے اور لکھتے ہیں:-

دعا منگتے چناراں کھول ہاتاں — کھڑے تھے ذکر کرتے پھول باتاں
بڑا اس باغ میں یک پھول تھا لعل — امولک جوں رتن میں قیمتی لعل
کھیا ہاتف سن او پھول باتاں — سچ میرے بچن کے صاف دھاتاں
کھیا تجہ پر نبی کا چم نظر ہے — علی کے لطف کا تجہ پر گذر ہے
کیا مُنج پر نظر او شاہ غازی — رہے تو مُنج بچن کوں سرفرازی

ابل چشمے بھرے میرے بچن کے کہ جوں ساں کوں ابل چلتے رتن کے
کیا گوہر فشانی میں بچن کا کیا تو مدح میں شاہ دکھن کا

چوں کہ محمد عادل شاہ کی بعض امور کے لحاظ سے اہم ہے اِس لئے ذیل میں اُس کے چند اشعار کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

انتخاب اشعار مدح محمد عادل شاہ

(ورق ۹۷)

توں سلطان محمد شاہ غازی جہاں کوں شاہ سوں ہے سرفرازی
سخی عادل بہادر نوجواں ہے قوی طالع ملکیں (؟) ترکماں ہے
بنی کے لطف کا دل ہے خزینا انگوٹی تو فلک چند رنگینا
کہوں ثانی سکندر باک جم ہے نین شاہاں کی جس کے ڈر سوں نم ہے
دیکھت شمشیر ہور سن شہ کی ہامکاں پھاڑاں پھونکر ہوتی ہیں پھانکاں
گگن کا توپ نیزے سوں کیا ہے کرن سورج کا بے پرخم (پرچم؟) کیا ہے
کرے جب شاہ تیراندازی ہنر کا کلنگ تس بھال سوں دھوے چندر کا
فلک چندر ستارے ہے جداں لک جہاں دیں، بادشاہی کر تداں لک
خضر کا دے الٰہی زندگانی جتے دشمن ہیں توں کر آج فانی
کھیا یک روز مُنج شاہ جہانگیر جو انکی کیمیا کا پاک اکسیر
امولک بخ (؟)، دھرتا ہے صافی قلم ہے تیز کرتا موتسکافی
ہنر نادر جو کرتا جیو کوں تازہ سیتا سب ملک میں یو گرم اوازہ
بچن سن دل میں بھرتا ہے سکل نور ملاتا وصل کرتا برہ کوں دور
کہ پھر مجنوں دیلے کا سمایا بچن تیرا یو جگ میں شور اچایا
رتن کا کان ہے گر طبع تیرا ہوس کرتا ہے نادر جیو میرا
ملایک ٹھار گر سارے رتن کوں جگت مشہور کر تیرے بچن کوں
کتاب اُس کا عجب کر زر نگاری اچھے دو جگ میں نادر یادگاری
کہے جب حکم عادل شاہ سجگوں اچنبے (؟) خسروی کا ماہ منجگوں

خزینا کر رکھیا ہون دھیان میں سب — کہ جیوں موتی ہے جیو کی کاں میں سب
لگے دریا اُبلنے شوق کے تو — دِسے اکثر جواہر ذوق کے تو
رکھیا دل کوں عجب ہمت کی کھن پر — کہ جوں نادر چند راو نچے گگن پر
خزینے راز کے کھولیا بچن سوں — کیا عنبر فشانی لاکھ فن سوں
قلم روشن کیا گن کے چراغاں — عطارد کے دیا سینے پو داغاں
کروں میں اس ورق کوں یوں جو بولے — کواڑاں عاشقاں کے دلکے کھولے
کیا باتاں میٹھے جگ میں جیتے ہے — عجایب ہور غرایب جس کتے ہے (؟)
پرت اصلی میں سوں شکر کیا ہوں (؟) — امولک چاشنی سب کوں دیا ہوں
ہر یک میٹھا بچن تازا سو بولیا — بساط اوپر نوا شطرنج کھولیا
عجب اس رنگ کوں خوش باش ہے او — بھی ایسا رنگ ہو خوش باش ہے او
کھوں نا بات سا ہر ایک کہانی — اچھے جم عاشقاں میں خوش زبانی
جسے ہے عقل جگ میں ارجمندی — وہی پنج شعر کا بوجھے بلندی
وہی بوجھے جو دھرتا صاف سینا — دھریا ہوں کس انگوٹھی میں نگینا
اگر کوئی عقل سوں لے یا رجانی — بہوت خوش حال ہوئے سُن کہانی
کہانی آٹھ بولیا سُن سخن ور — کہ جوں ہے اٹھ جنت اٹھ کوثر
بہشت تیوں ہر یکیس کا ایک نام ہے — ملک ہور حور کوثر سب تمام ہے
امولک بیدل جوں زر بگار ہے — جسم (؟) اُس کا نانوں ہو جنت نگار ہے
ملک نو خشنو دموتی صاف رولیا — اپس کے نانو کا تاریخ بولیا

اِس مثنوی کی زبان بہ نسبت اُس کے جو ایسی موضوع کی دوسری مثنوی کے لیے استعمال کی گئی ہے، زیادہ غیر مانوس معلوم ہوتی ہے۔ تاہم بعض بعض جگہ نہایت صاف حصے نظر آجاتے ہیں۔ مثلاً بہرام کی وفات کے بعد دنیا کی بے ثباتی کے متعلق چند عبرت انگیز خیالات اِس طرح سے ظاہر کیے ہیں:-

عجب بے مہر دنیا بے وفا ہے — محبت عین اِس کا سب جفا ہے
جتے ہیں دوستاں فرزند ساتی — سکل ہے گور لگ او سب سنگاتی

پنچھل نیکی کے گھر کا واں بنیاد ترے بعد از کرے سب خلق تجیاد
نکر ایسا بدی جو سر دھنا وے موے پیچھے ترا کوئی غم نہ کھاوے اورق ۱۰۱

ہشت بہشت کا تبصرہ ختم کرنے سے پہلے مناسب ہوگا اُس کے چند اختیامیہ اشعار کا انتخاب بھی دیدیا جائے تاکہ ملک خوشنود کی شاعری کے متعلق اُنہیں کے ذریعہ سے کچھ اور معلومات ہوجائیں :-

ہوا جب یو مرتب نقش گلزار ہوا تو عاشقاں کا گرم بازار
کیا نیناں پو میرا مشتری نہاوں کیا اسمان منج پر لطف کا تھاوں
ہوا جب تے بچن کا گرم اوازا کیا سارے ملک کا مغز تازا
خدا منج خام کو ات بل دیا ہے قلم تو عنبر افشانی کیا ہے
جداں لگ دوت محکم چاند ہو رہو جداں لگ ہے پون دن رات سمدو
رہے گا تو تلک محکم یو بنیاد بندیا منج طبع کا بے مثل استاد
جگجگ جگ میں بشر کا ہے نشانی سو ہے نیکی و بعضے سب ہے فانی
گیا تن خاک میں جب تن ہوا خاک ہوا دنیا سوں اُس کا نام سب پاک
کتک اُن کے پچھیں سب آدمی زاد بسر جاتے، نہیں کرتے ہے کوئی یاد
مگر ایسی کتب کا بات تازا رہیا تازے بچن کا گرم اوازا
طبیعت سب کا جوں کنچن ہریا ہے نہ کہنا کوئی جو یو دفتر بُرا ہے

---

(۳)

اِس سلسلہ کی آخری لیکن بہترین مثنوی طبعی کی "بہرام وگل اندام" ہے۔ اِس کا ایک سرسری مطالعہ ہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ دکھنی زبان کے بہترین کارناموں میں سے ہے۔ اِس کی زبان، اسلوب بیان، شاعرانہ نزاکتوں اور ادبی حلاوتوں پر اِس مختصر سے نوٹ میں تفصیلی نظر نہیں ڈالی جاسکتی۔

طبعی کی تصنیف ظاہر کرتی ہے کہ اِس کا کہنے والا نہ صرف ایک شاعر ہے بلکہ ایک سلیقہ مند مصنف بھی۔ اُس نے اشعار کی تعداد اور عنوانات کی تقسیم اسقدر باضابطہ طریقوں پر کی ہے۔

کہ یہ مثنوی بجائے ایک فسانہ کے ایک علمی اور سائنٹفک کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ساری کتاب یعنے ۱۲۴۰ شعر صرف چالیس ہی دن میں لکھ ڈالے۔

کیا ہوں میں چالیس دن میں کتاب — بہوت فکر کر رات دن بے حساب
یو نامہ پڑیں گے تو بہر خدا — پڑو فاتحہ نام لیکر مرا
گنا بیت بیتاں کو میں اک جو دل — ہزار اور ہے تین سو پر چہل
اتھا سال تاریخہ کا خوب نیک — سنہ یکہزار اور ہشتاد ایک
یو نامے کو طبعی کیا ہے تمام — بحق محمد علیہ السلام

زیر نظر مخطوطے میں تقریباً ۱۲۵۰ شعر ہیں۔ نہ معلوم اور ایک سو شعروں کا کیا حشر ہوا۔

طبعی قطب شاہیہ دور کا آخری بڑا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ اس کو اپنی شاعری کی خوبیوں کا احساس بھی تھا۔ ملک خوشنود، دولت اور امین کے برخلاف اُس نے اپنے کمالات کی تعریف بھی کی ہے۔ اور اپنے مخالفوں اور معترضوں پر سخت سے سخت چوٹیں کیں ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِسی موضوع پر لکھنے والے دوسرے شاعروں کی طرح وہ گوشہ نشین نہیں تھا۔ اُس کی شہرت پھیل چکی تھی اور اُس کی شاعری پر لوگوں کی نظریں اُٹھتی تھیں۔

اظہار خود اعتمادی کے ساتھ ہی طبعی دوسرے بڑے شاعروں کی عزت بھی کرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں وجہی بہت زیادہ مقبول ہوگیا تھا۔ چنانچہ طبعی خواب میں اُس سے اپنی اس مثنوی کی داد حاصل کرتا ہے۔ اور اس خواب کو بھی اپنے کلام کے بہتر ہونے کا ایک ثبوت قرار دیتا ہے۔ بعض اشعار یہ ہیں۔

لگیا میں جو یو مثنوی بولنے — یو موتیاں پھل دھال یوں رولنے
یو وجہی میرے خواب میں اے کر — کہ اپنا سورج ناد دکھلائے کر
سراسر سنیا جو میری مثنوی — کیا بات طبعی ہے تیری نوی
ہو خوشحال سن کر یو باتاں مری — (خاطر کہا) اُپس کے لئے باتاں میں باتاں میری
پرے پیار سوں اپنا یو مثل (؟) — سنیا سو پڑیا خواب سے میں اُچھل

کہا ہوں سنو کان دھر لوگ ہو — کہاوت منے بات ہو آئے سو
اگر کہتا شعر کوئی خوب کہکر جولائے — تو خوباں کوں سن رشک البتہ آئے
یکس کوں سو یک دیکھ سکتے نہیں — یکس کوں سو یک مان رکھتے نہیں
اگر کچھ کہے تو کہ دہر کا کہ دہر — کہے تو کہتے ہیں اُسے ہیچ کر
اگر خوب جو بولے تو ووں ہا ہے — اگر جو بُرا بولے تو یوں اہے
طبعی توں او کام کر اختیار — کہ رہے تا قیامت ترا یادگار

(زیر نظر مخطوطہ میں بعض مصرعے یا اشعار چھوڑ دیئے گئے جن سے مطلب مسلسل نہیں سمجھ میں آتا)

بزرگ شاعروں کے علاوہ طبعی شاہ راجو اور ابوالحسن تاناشاہ دونو کا خاص طور پر عقیدتمند ہے۔ اُس کی بادشاہ کے ساتھ وفاداری نہ صرف اُن اشعار سے ظاہر ہوتی ہے جو تاناشاہ کی مدح میں ایک مستقل عنوان سے لکھے گئے ہیں اور جنکا انتخاب آئندہ نقل کیا جائیگا بلکہ دوران نظم میں بھی اپنی بادشاہ پرستی کا اظہار کرتا ہے مثلاً ایک جگہ کہتا ہے۔

جگت کے شہاں سارے اُس ماہ کے — مرے ناو مداح تھے شاہ کے

ساتھ ہی اس امر کا اظہار نامناسب نہوگا کہ اس کتاب کے لکھنے سے قبل بادشاہ کے یہاں طبعی کی غالباً زیادہ قدر نہیں کی گئی تھی جیسا کہ مدح کے آخری اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

مثنوی حمد سے شروع کی گئی ہے جس کے بعض قابل ذکر شعر یہ ہیں ؎

الٰہی یو طبعی ترا داس ہے — دے ایمان اسکوں ترا آس ہے
الٰہی بچن کا منجے تاب دے — مری جیب کی تیغ کوں آب دے
الٰہی بچن کا پلا منجے شراب — کہ بولوں ہر اک بات جوں آفتاب
الٰہی بچن کا دوانہ ہوں میں — کرم تے ترے گرچہ دانا ہوں میں
الٰہی بچن کی منجے دے عروس — سینے کوں لگا کر اُسے دیوں بوس
بچن کی گگن کا منجے ماہ کر — رتن کر منجے توں کہوں میں کنکر
زباں آشنا کر صلاحت سیتے — فصاحت، بلاغت، ملاحت تے
الٰہی تو میرے اوپر رحم کر — کہ تا نا پجنے عیب کوی بے ہنر

زباں طعن کی دور مجھ تے کریں مرے شعر پہ نا نوچپ نا دھریں
اگر کہیں غلط یو حکایت اہے کہیں گے تو عین عنایت اہے
الٰہی مرے پرتوں ہو مہرباں دُو نادان کے ہاتھ تے دے اماں
اوّل یک غلط خواں بدآوازتے دُوجا عیب جو چور غمازتے

اِن کے بعد نعت اور منقبت کو اِس شعر پر ختم کیا گیا ہے۔

تری مدح بن کچھ نہ دھرتا ہے کام یو طبعی ہے بن دام تیرا غلام

ساتھ ہی شاہ راجو کی ثنا اور پھر تاناشاہ کی مدح یکے بعد دیگرے شروع کی گئی ہے۔ اِن دونو کے بعد وجہ تصنیف کے متعلق جو شعر لکھے ہیں اُن کا انتخاب وجہی کے ذکر میں آچکا ہے۔

قصہ کے اثنا میں ایک غزل بھی آگئی ہے جو بہرام کی زبان سے اُس کے والد کی مدح میں کہلائی گئی ہے۔ اس کی صفائی بیان وغیرہ کے متعلق کچھ لکھنے سے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اُسی کو یہاں نقل کر دیا جائے۔

غزل طبعی

ترے ہات میں شاہ جم جام اچھو ہمیشہ بغل میں دلارام اچھو
جگت کے شہاں میں تو اچہ نیکنام کہ دشمن ترا ہے سو بدنام اچھو
چند رسورکے جام تے آسماں تجے غسل کرنے کوں حمام اچھو
اچھو سب سلامت عزیزاں ترے جہاں لگ عدو ہیں سو گمنام اچھو
اچھے لگ گگن ہور زمین پتروں اں ترے پگ پو قربان بہرام اچھو

طبعی کی طبیعت کی باضابطگی کی ایک دو مثالیں یہ ہیں کہ

۱۔ اُس نے ہر عنوان کے تحت ایک ہی تعداد کے اشعار لکھے ہیں مثلاً مدح ابوالحسن میں جتنے شعر لکھے گئے ہیں اتنے ہی مدح شاہ راجو کے لئے لکھے ہیں وغیرہ۔

۲۔ قصہ کے دوران میں ایک موقع ایسا آتا ہے کہ بہرام کا باپ اُس کو سات مختلف اُمور کی نصیحت کرتا ہے جن میں سے ہر نصیحت کو طبعی نے بالالتزام سات سات شعروں ہی میں ختم کیا ہے۔

طبعی کا قصہ امین و دولت کے قصہ بہرام سے اصولی باتوں میں بہت کم متفرق ہے۔ تاہم ۱۔ سب سے بڑا فرق اس بات کا ہے کہ طبعی نے فارسی قصوں کی غلامانہ تقلید نہیں کی۔ اس کا مقصد صرف قصہ گوئی ہی نہیں بلکہ وہ صحیح طور پر شاعری کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے قصہ میں جگہ جگہ اُچی شان نمایاں ہے۔

۲۔ زاویۂ نگاہ کے اس فرق کے علاوہ دونوں میں زبان اور اُسلوب بیان کا بھی بیحد فرق ہے جس کا ثبوت ایک ہی مطلب کی حسب ذیل دو مثالوں سے بآسانی حاصل ہو سکتا ہے۔

ا۔ مثنوی بہرام و بانوحن از امین و دولت۔

بانوحن کی تعریف میں چند منتخب اشعار۔

عجب سیس پر اُس بلنے بال تھے — بچنگ شاخ مندل پر رکھوال تھے
جبین دیکھ اُس کی چھپے آفتاب — لے مکھ پہ اپس کے رین کا نقاب
بھواں پر اُسی کے نظر کر ہلال — کیا تن کوں لاغر اپس کے کمال
نین دیکھ آہو پریشان ہو — چمن بیچ نرگس سو حیران ہو
عجب اُسکی آنکھوں میں ڈوری تھے لال — کجن نین کا رن بنائی جو چال
ڈوگالاں صفا کی ثنا کی نہ جائے — دیکھت آشنا اُن کے رشکت لیائے
سیہ خال نادر تھا اُس گال پر — بھور ہو کے بیٹھا ہے گل لال پر
دو لب آب حیوان لبریز تھے — کہ با شہد شکر سوں آمیز تھے
اتھے دانت مکھ بیچ ہیرے جڑے — دہن کے صدف بیچ موتی جڑے
جہ ہاں وہ خوشی ساتھ ہنس بولتی — گلاں اور موتیاں گتی رولتی
سینہ پر دو پستان انار تھے — یا دو برج مشکیں تاتار تھے
شکم موج دریائے سیماب ہے — اے ناف تس بیچ گرداب ہے
چرن دیکھ چنپا کھلا باغ باغ — وہ رخ دیکھ لالا ہوا داغ داغ

ب۔ مثنوی بہرام و گل اندام از طبعی

گل اندام کی تعریف میں چند شعر۔

او زعفران دلاں کو ہندو لے اہیں — غلط میں کیا ڈو سنبو لے اہیں

بھنواں باگ نک ہور انکھیاں ہرن — کہ او موہنی ہے عجب من ہرن
اوگالاں کی سرخی سولالی میں نیں — او بالاں کی خوشبوی بالی میں نیں
دسے پہول دو سینوتی کے دوکان — چنپے کی کلی ناک ہے درمیان
عجایب اوچاہ زنخدان ہے — کہ غرق اُسمنے دین ایمان ہے
دو جوبن سو چولی کے دو بات میں — جو امریت پھل چھپ رہے پات میں
اتھا پیٹ جوں آرسی ناوصاف — کہوں کیا جھمکتا اتھا جیوں شفاف

۳۔ ایک اور اختلاف یہ ہے کہ اینؔ کی مثنوی ۲۰ سال کی عمر سے بہرام کو پیش کرتی ہے اور طبعیؔ اُس کی پیدائش سے پہلے ہی قصہ کا آغاز کرتا ہے اور پیدائش تک کے واقعات بیان کرنے کے بعد جب بہرام گورخر کے پیچھے نکل پڑتا ہے وہاں سے ان دونوں کے قصوں میں اتحاد پیدا ہو جاتا ہے اگرچہ جزوی اختلافات کے ساتھ۔

۴۔ طبعیؔ کی مثنوی زیادہ موافق فطرت باتوں کو پیش کرتی ہے فوق فطری باتیں اینؔ کے قصہ کو غیر دلچسپ بنا دیتی ہیں۔ گل اندام اینؔ کی بانو حسن کی طرح ایک پری نہیں ہے بلکہ بادشاہِ چین کی بیٹی وغیرہ۔

اِس موقعہ پر اِس غلط فہمی کا ازالہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ طبعیؔ کی گل اندام کو بادشاہ ہندوستان کی بیٹی بتایا گیا ہے حالانکہ زیر نظر مخطوطہ سے اس کا دختر شاہ چین ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ؎

ولایت منے چین کے شاہ تھا — وہ بہو تیج مقبول جوں ماہ تھا
اُسے ایک بیٹی تھی جوں مشتری — نہیں آدمی زاد، تھی او پری وغیرہ

اِس مضمون کو طبعیؔ کی حسب ذیل دو مدحوں کے انتخاب پر ختم کیا جاتا ہے جن کا مطالعہ اُس کی ذات اور شاعری دونو کے متعلق ناظرین کی معلومات میں غالباً اضافہ کرے گا۔

مدح شاہ راجو

ولی توں برا ہے اکمر شاہ راجو — چل آیا ہے شہ تیرے گھر شاہ راجو
چھیں گا قیامت کے دن روسفید — ترا موں دیکھیا سو کھتر شاہ راجو
فلک پر توں اڑتا ہے شہباز من — کراست کی لا شاہ اپر شاہ راجو
خبر تیری معلوم نہیں بے خبر کون — خبردار جانے خبر شاہ راجو
مریداں سو تیرے کنول کے ہیں پھول[1] — اتمیتی توں بہو کے بہور شاہ راجو
توں مخدوم سید محمد کی کھن کا — بہوت بے بدل ہی گہر شاہ راجو
کراست ہو اسب کوں معلوم یو ظاہر — توں باطن میں کریک نظر شاہ راجو
دکھن کا کیا بادشاہ بو الحسن کوں — ترا تخت دیکر چھتر شاہ راجو
کھڑا ہو کو خدمت میں تیری سوج — اڑاتا کزنکی چنور شاہ راجو
کسی کا نہیں عیب چنتا توں ہرگز — بڑا تجہ میں ہے یو ہنر شاہ راجو

.....

بندا ہو کو کرتا ہے خدمت تری — جد ہر توں چلیا تو او دہر شاہ راجو

.....

مرا دل ہے جیوں چھاؤں سنگات تری — جد ہر توں چلیا تو او دہر شاہ راجو
تیرے عشق کا کیف کھایا سو چڑکر — اترتا نہیں ہے اثر شاہ راجو

.....

.....

قدم تیرے پکڑیا ہوں امید لے کر — میرے بخت تیرے نظر[2] شاہ راجو
خدا پاس اچاہات کرتا ہے طبعی — دعا تجکوں شام و سحر شاہ راجو

---

[1] بو [2] نذر

بادۂ دکن

(۲)

(لچھمی نارائن، صاحب تخلص اورنگ آبادی)

میخانۂ عاشقی

۱۱۸۷ھ

یہ مثنوی کلیات کے سوا ہے۔ کلیات دست یاب ہونے کے بعد یہ مثنوی میرے ہاتھ لگی۔ اِس لئے کلیات کی جدید معلومات کے سلسلے میں اِس کا ذکر نہ آسکا؛

"میخانۂ عاشقی" (۱۱۸۷ھ) تاریخی نام ہے۔ محمد حنیفہ صاحب وردؔ سندیلوی (دکنی) کے مشہور ساقی نامہ کی طرز پر اس کی اُٹھان معلوم ہوتی ہے؛ (عمر یافعی)

حمد

خدا کی ثنا کب ہے حدِ بشر — تو جانے ہے یہ نیم کی آواز ہے
اسی حرف پر ہے سخن مختصر — ولے جوش مے کا تو یہ راز ہے

نعت

محمد کی تھی ذات پاک عین رب — کہ بے میم احمد تھے بے عین عب[1]
سولا اصلی آپھی کہے آشکار — کیے ماء فناک کے تین پکار
خدا جب کیا عین ثنائے خدا — تو ہم سے ہو کیوں کر ثنا یہ ادا
ثنا کب بھرے جائے اندیشہ میں — سماتی ہے یہ مے کہاں شیشہ میں

توحید

اِسی طرح سے اور مذکور ہے — کہ بندہ کبھی طرح مجبور ہے
جزا اُس کے نکلی نہیں ہم سے بات — صراحی کی قلقل ہے ساقی کے ہات
غم مے کی سُن تو صدا کر کے غور — کہ یاں بولتا ہے کوئی شخص اور

سخنِ شیشہ بائے

سُنا بزم مستوں میں میں کل کی رات — کہا شیشہ نے مے سے قلقل میں بات
سولا اصلی آپھی کہے آشکار — کیے ماء فناک کے تین پکار
خدا جب کیا عین ثنائے خدا — تو ہم سے ہو کیوں کر ثنا یہ ادا
ثنا کب بھرے جائے اندیشہ میں — سماتی ہے یہ مے کہاں شیشہ میں

توحید

اِسی طرح سے اور مذکور ہے — کہ بندہ کبھی طرح مجبور ہے
جزا اُس کے نکلی نہیں ہم سے بات — صراحی کی قلقل ہے ساقی کے ہات
غم مے کی سُن تو صدا کر کے غور — کہ یاں بولتا ہے کوئی شخص اور

---

[1] "عین" کا نون (ن)، غنہ پڑھیں تو فصاحت اس کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اور اگر اسی نون (ن) کا اعلان کیا جائے تو "عرب" کا عین (ع)، الف وصل کا ہم نشین بن جاتا ہے!!

[1] دخترِ رز شراب کو سنتے آئے لیکن شیشے کو "فرزندِ سنگ" ابھی سنا!!

پری بھی مرے ہاں کبھی آتی ہے — مرے تن کو جو نخشاول پاتی ہے — دے شیشے پہ شیشے گھڑے پر گھڑے — پلا اس طرح واچھڑے واچھڑے

نہ بس میں ازل سے ہوں تیرا خدا — بلا اس طرح سینکڑوں آچکا — تجھے ناکہوں تو کہوں کس سے آپ — تجھے مجھ سے اغماض کیا ہے سبب

میں قالب ہوں تو تو مری جان ہے — تعجب مجھے تجھ سے ہر آن ہے — ترے سر مری ہے یہی گفت و گو — کہ قبلہ ہے کعبہ ہے والی ہے تو

کہ مجلس میں جس وقت آتی ہے تو — مجھے چھوڑ پیالے میں جاتی ہے تو — نہ پیالے سے مجھ کو نہ مے سے ہے کام — غلاموں میں تیرے ہوں کمترغلام

ترے میں فدائی تنک ظرف نہیں — تجھے پاس اخلاص کی خو نہیں — نہ کہتا ہوں دے مجھ کو جام و سبو — مجھے میکشوں سے سمجھ دے آبرو

نگہ کر چمن میں تنک غور سے — کرانے بہار آئی تس طور سے — بھرا سبزہ و گل سے گلشن تمام — بھرا مے سے شبنم کے لالہ کا جام

میں اور تو تو ہیں غیر کے ہات میں — ہمیں دخل کیا ہے کسی بات میں — بھرا بوسیں غنچہ نے مینائی تیں — چلیں نرگساں بھر کے دریا کے تئیں

کہ جیسا رکھے ہو وہ رہتے ہیں ہم — بتا دے ہی جس طور رہتے ہیں ہم — بھرے کس طرح دیکھتا لا سب — اول کر چلے چشمۂ آب سب

کہاں ہے حنا کے تئیں اختیار — یدِ غیر میں ہے خزان و بہار — نظر کر کے شغل نے آشام کو — بھرے ہی رہے دم بدم جام کو

نہ بوجھ اس کو نکہیں ہے آوازنے — نوا زندہ کے لب سے یہ شور ہے — تعجب ہے تجھ سا مرا والی ہو — مرا جام اس وقت میں خالی ہو

مغنی کے ہاتوں ہوں طنبور دار — صدا نکلے ہے مجھ سے بے اختیار — رہوں ایسے کم میں محروم حیف — کہوں کیا تجھے میرے محدوم حیف!

مرا نام صاحب جو مشہور ہے — بجا نام زنگی کا کافور ہے — بھلا اس طرح فصل گل مفت جائے — بہار ایسی بے جام کل مفت جائے

ولیکن یہاں سرسری مت گذر — مرے حرف وحدت پہ تو کان دھر — یہی دم بدم ابر کا شور ہے — کہ مے نوشی اس وقت میں ضرور ہے

تخلص مرا قابل غور ہے۔ — مسمّی کوئی اسم کوئی اور ہے — یہی ہر زماں شور دو لاب ہے — کہ پُر کیفیت عالم آب ہے

اگر لفظ میں ہوں تو معنے ہی دو — اگر رنگ میں ہوں تو وہ مل لو — اشارت سے نرگس یہ کہتا ہے بات — کہ لے جام زرّیں کہ تیں اپنے ہات

مجھے ایک شب ہوئی پنٹ بے کلی — خم دل سے یہ مے اوبل کر چلی — شہ گل کا یہ اذن اعلام ہے — کہ لب ریز بہتر ہی جو جام ہے

خطاب باساقی

غم مے سے لالہ چمن میں ہو داغ — بھرا اپنے خوں سیتی اپنا ایاغ

ارے ساقیا اے روح بخش جہاں! — ارے ساقی اے جان کی تن کہاں — چنا راب کہے ہر زماں یا مجیب — مرے منجہ کو جام ہوئے نصیب

ترے دیکھ کر یہ تغافل کے ڈھنگ — بھرآتی ہے چھاتی مری بے درنگ — کہے ہے پیا کہ جب تک ہے جی — ارے جام پی جام پی جام پی

تری گردشِ چشم بس ہے مجھے — یہی دَور کی اب ہے بس ہی مجھے — خطِ جام سے ہے مری سرنوشت — ہوی ہے گلِ مے سے میری سرشت

دو پیالے مجھے دے کے مت بھول جا — کہوں بحر و بر میں اب فضل خدا — زباں پر مری ہے دعا قدح — مجھے ورد جاں ہے ثنائے قدح

ارے پیاس کے مارے آب آ کہوا — تنک میرے منھ میں تو پانی چوا

عہ یہ لہجہ دہلی میں بھی بہادر شاہی عہد تک رائج تھا" (غالب)

اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے"

لہ نقل۔ ؟

پلائی ہے تین اس قدر ایک دم کہ بھر لوں میں دنیا و عقبیٰ کا غم
یہ دنیا سراسر غم آباد ہے غنیمت ہے وہ دم کہ جو شاد ہے
نظر کر ذرہ حالت آبشار کہ روتے ہی گذرے ہے لیل و نہار
خوشا کبک خرم دل و شاد ماں کہ انگارے کھاتا ہے خندہ زناں
سراپا اگرچہ میں ہوں پُر قصور ولے لطف تیرا ہے مجھ پر ضرور
بلا آج مجھ کو سے پُر شگال خدا جانے کل چرخ کی کیا ہے چال
مرے موں سے نکلا غلط نام کل زمانہ تو اک پل میں ہے چل پچل
نظر کر بہ بست و کشاد پلک تنک میں اندھیرا تنک میں جھلک
سحر مست رواں ہے یہ باد صبوح کہ نکلی چلی جاتی ہے گل کی روح

نقل

سنا ہوں میں یہ حضرت بایزیدؒ نماز جماعت کے تئیں روز عید
وضو کے ارادے تیمم کیے پھر اٹھ چشمۂ آب کی رہ لیے
کیے چشمہ پر جا وضو کے تئیں دیے شست و شو دست و رو کے تئیں
نگہ کر کے یہ حال اک بے ادب کہا "آب تیمم کا کیا تھا سبب
نہ تھا آب یاں سے تو اتنا بعید مگر چند اقدام اے بایزید!
تری حرکت لغو کو دیکھ کر تحیّر نے گھیرا مجھے سر بسر"

سخن سُن یہ رو کر کہے بایزید کہ فی الواقع پانی نہ تھا کچھ بعید
ولیکن توقع کسے تھی یہاں کہ پہنچے گا تا آب یہ نیم جاں

ارے یار! یہ دم غنیمت ہے دم نہیں آتے ہوئے دل سے پھر ضم
تغافل نہ کر میرے احوال پر مجھے تو ذرہ ایک دم مت بسر[1]

---

[1] بھول ۱۲۔

قسمیہ

تجھے بادہ نوشی کی کی قسم تجھے رنگ اور بوئے مے کی قسم
بطِ مے کے تجھ کو لہو کی قسم تجھے طوطی کی گفت و گو کی قسم
تجھے مست کی چشم تر کی قسم تجھے اُس کی حیراں نظر کی قسم
تجھے مصحف رو کی تیرے قسم تجھے طاق ابرو کی تیرے قسم
تجھے سرکشی کی تری ہی قسم تجھے دل خوشی کی تری ہی قسم
تجھے شیشۂ دل کی میرے قسم تجھے حسن کے مے کی تیرے قسم
تجھے ناز نینی کی اپنی قسم تجھے مہ جبینی کی اپنی قسم
قسم ہے تجھے بارش ابر کی قسم ہے تجھے جانِ بے صبر کی
قسم ہے تجھے جانِ گلفام کی قسم ہے تجھے تاک کے نام کی
تجھے سرو موزوں کی سوگند ہے تجھے غنچۂ خوں کی سوگند ہے
تجھے سینہ چاکوں کے ہنسنے کی سوں اناروں کی تجھ کو بکھرنے کی سوں
زباں کی مری لن ترانی کی سوں تجھے تیرے مے کے پلانے کی سوں
تجھے تیرے ہی غم کی سوگند ہے مرے دیدۂ نم کی سوگند ہے
سخن سُن مرا چپکے رہنے کی سوں سُنا مجھ کو اوروں سے کہنے کی سوں
ترے موں چھپانے کی سوگند ہے مجھے بھول جانے کی سوگند ہے
تجھے غنچے سیں لب چبانے کی سوں تجھے مجھ کو گالی سنانے کی سوں
قسم تیرے تیں روح مجنوں کی ہے قسم تجھ کو لیلیٰ اماں کی ہے
تجھے مجھ سے قسمیں منانے کی سوں تجھے تیرے قسموں کے کھانے کی سوں
بُھلا کر مجھے تیرے لینے کی سوں تجھے میرے اس دل کے دینے کی سوں

جلامت مجھے اس میں حاصل نہیں یہ ناچیز جلنے کا قابل نہیں
جلا کر مجھے چاہتا ہے جو تو بنا دے مری گل سے جام اور سبو
مری تو سعادت ہے اس بات میں کہ پہنچے مری خاک اُس ہات میں
ولے اس ستی کچھ بنے گا نہیں بنا کچھ بھی ہے راکھ سیتی کہیں

خفا ہو کے بچپانے گا تو ندان[1] اسی واسطے عرض میری تو مان ہزاروں ہیں مجھ سے تری مدح گو ولیکن مرے تین کو واعظ ہے تو
نہیں جی چھپانا مجھے مدعا ہے اس بات میں بلکہ تیرا بھلا تو خوبوں کا ہی شاہ ذوالاحترام دل و جاں سے صاحب ہے تیرا غلام
یہی خیر خواہوں کا دستور ہے بھلائی تری مجھ کو منظور ہے ہوی بعد مدت دعا مستجاب کیا باز حق نے سب عشر کے باب
مجھے مت جلا تجھ کو بھی ہے زیاں ہوا جس جو آخر تو شعلہ کہاں شراب و کباب و شب ماہتاب صدائے رباب و لب جوئے آب
تری ہم سے ہے اے میاں اب اجی غلامی نہیں تو کہاں صاحبی مہکتی چمن میں ہی بوئے گلاب خیاباں میں ہے باغباں مست خواب
مری آنکھوں میں اج بستا ہے تو تو کیوں رونے پہ میرے ہنستا ہے تو پھر اب سامنے تجھ سا حاضر جواب سخن سنج شیریں ادا نکتہ یاب
مرے تین رلانا بھلا خوب ہے گھر اپنا ذوبانا بھلا خوب ہے غنیمت ہے یہ چرخ و اژوں خرام ہوا مدتوں بعد حسب المرام
مجھے سخت حیرت ہے اے جان جاں! کہ تہ نشیں کروں میں کہاں یہی عرض میری تو اب مان لے تو اتر تو اس وقت میں جام دے
رکھوں کیوں کے دل میں کہ سودا ہے یہ رکھوں کیوں آنکھوں میں گرد یا ہے یہ
یہ دونو مکاں ہیں نہایت خراب کہیں جوش آتش کہیں جوش آب
مگر ہے ہوجی میں اے جان جاں! کہ بہتر نہیں اس سے کوئی مکاں

فخریہ

وفا میں مشہور آفاق ہوں فن دل ہی میں بہت طاق ہوں ہے اظہار اس کا مجھے فرض ہے
میں وہ شخص ہوں ایک قایم مزاج کہ ہمت مرے تین کو دیتی ہے باج سحر جو نکالے گا سر آفتاب جہاں کے تئیں جب کرے گا کباب
مجھے جام جم کی تمنا نہیں سلیماں کے خاتم کی پروا نہیں سبھی خواب شیریں سے جاگیں گے مست مچاویں گے غل ہر طرف مے پرست
اگرچہ میں بابر و خفقور چیں تو سجھوں ہے کنجلک آستیں جہاں تک ہیں خمخانہ کے بادکش پکاریں گے سب العطش العطش
فریدوں کی یہ شان دیہ کر و فر مرے پاس رکھتی نہیں کچھ قدر مرے تین کو دت بھول تب نے نہا صبوحی پلا تو ز میر اخمار
اگر جوہروں کو کروں اپنی عرض[2] مرے سے صفالیوے آئینہ قرض سبھوں سے مجھے جام دے بیشتر مری آبرو رکھ تو رسوا نہ کر
کہاں ہے زمانے میں میرا نظیر مرے سے فلاطوں ہے اصلاح گیر نکال اس طرح دے کے تین مشک میں کہ جل کر مرے زاہد اس رشک میں

خطاب بازاہد

قسم سر کی تیرے میں ہوں مغتنم کسی چیز میں نین مجھے پائے کم اری زاہد اے بے حیایوں کے پیر جوانوں پہ اتنا نہ خوردہ گیر
مرے حال پر مہربانی سے دیکھ بھلا تو ذرا قدر دانی سے دیکھ کیا فرض میں نے کہ ہو ہے حرام ولیکن تعصب بھلا کب ہے کام
ترے پاس یہ مے جو زمزم ہے یہ ہے آفتاب اور تو بوم ہے
تنفر ہے مے سے تجھ شوم کو کہ نفرت ہے خورشید سے بوم کو
اگر تجھ کو ہوتا دل ہوشیار نہ جاتا تو کعبہ کو ہو خر سوار
تری ریش جو اس طرح ہے طویل حماقت پہ رکھتی ہے تیری دلیل

---

[1] ندان۔ ہمیشہ ۱۲

[2] غالب بادا گئے ہے۔ "عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا ہے۔

تری ڈاڑھی کانٹوں کی جھاڑی ہے یہ — تری گول پگڑی پہاڑی ہے یہ — صدا جنگ سی ہے یہی آشکار — غفور و رحیم است آمرزگار

تری گول پگڑی یہ گنبد[1] نما — دل مردہ پر ہے ترے اب گوا[2]

ترا ہر سخن کمر ہے سر بسر — زباں پر ہو اللہ دل میں ہو زر

خطاب بہ مطرب

تری عقل رسوا کرے گی تجھے — گدھے پر چڑھا لے پھرے گی تجھے — ارے مطرب ای یار زیبا جمال — غزل پڑھ کوئی تو تو اب حسب حال

مرے جی میں آتا ہی جائے خفا — ملوں تیری داڑھی پہ لائے[3] شراب — لب یار سے عاشقانہ غزل

پھر اس داڑھی کی بھوں کی پھوں کی پھوں — تری مونچھ پر خاکسر اس کی ملوں — کرالاتی ہی تقوے میں بیشک خلل — تری شکل زیبا ہی وجہ فتوح

تب اس شکل ہیبوں سے تو خر سوار — اگر ہو تو ہی کیفیت بے شمار — ترا راگ دل چسپ ہے قوت روح

کیا امتحاں میں تجھے بارہا — تری عقل میں ہی سراسر خطا — گلو سوز کیسا نغمۂ عود ہے — صدا تیری الحان داؤد ہے

خدا پاس[4] عبادت سے مانگے ہی حور — عجب عقل دانش عجب یہ شعور — دم عیسوی ہی مگر تیری بات — کہ دل مردہ پاتے ہیں تجھ سے حیات

ارے تو بہ کر ایسی باتوں سے تو — مرے شور و نالہ پہ تو دھیان دے — نوائے ازل جب ہے ہر کان میں — تبھی سے مری جان ہی تان میں

توخیرہ نہ ہو اپنے اعمال پر — بھلا بول تو ایک ستھری سی تان — طنبورہ کے تاروں کو تک چھیڑ بے

ارے فائدہ کیا کیے یوں ہی ضنو — کہ اب دل کے تئیں اپنی توشت و شو — نہ کر ان مجھ سے مری جان مان

یہ ضرب المثل کیا نہیں تو سنا — سہاگن ہی وہ جس کو چاہے پیا — ای مطرب تو اب دل کی گھنڈی کو کھول — ترانہ میں یہ بیت ہر وقت بول

نہ رکھ جگ میں صاحب کے محتاج غیر — الٰہی کر اب خاتمہ کو بخیر

بفضل خدا یہ ہوا اختتام
ہی "میخانۂ عاشقی" اس کا نام
۱۱۸۷

---

[1] گنبد اور گبند دونوں صحیح ہیں جیسے نبید و نبیذ ۱۲۔

[2] گوا۔ گواہ کا مخفف ہے ۱۲۔

[3] لائے شراب۔ شراب کی کاوٹ۔ ذرد۔ مدی ۱۲

[4] عبادت کا عین (ع) تقطیع میں قابل چشم پوشی ہے ۱۲۔

اِحساسات

از جناب ظفر تابان ۔ پروفیسر السنۂ شرقیہ امجد کالج

خلش سی کچھ مجھے دلکے قرین معلوم ہوتی ہے
مگر تیری نگاہِ دل نشین معلوم ہوتی ہے

ہر اک شئے میں تمہارے کچھ نہ کچھ انداز پاتا ہوں
مجھے قوسِ قزح چینِ جبیں معلوم ہوتی ہے

تری صورت حسیں بیشک ہی لیکن واقعہ یہ ہے
تصور میں کہیں زائد حسیں معلوم ہوتی ہے

ہجوم ہر دو عالم میں کیا ہے منتخب تجھکو
نظر بھی کس بلا کی دور بیں معلوم ہوتی ہے

قیامت جبکی برہم سازیوں کا شور برپا تھا
تری رفتار محشر آفریں معلوم ہوتی ہے

بنا دے بیخبر پھر اک نگاہِ کیف ساماں سے
پریشاں خاطرِ اندوہگیں معلوم ہوتی ہے

دُکھیاری بلبل

(سید تسبیر حسن قیس رضوی حیدرآبادی متعلم چادر گھاٹ ہائی اسکول)

مئی کا مسرت انگیز مہینہ تھا۔ میں ایک خوشبودار مہندی کے جھنڈ کے سایہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جانور اچھل کود رہے تھے۔ اور پرند نغمہ سرائی میں مست تھے۔ درخت شاداب اور پودے نمود آور تھے ہر چیز ہشاش وبشاش تھی بجز غمزدہ بلبل کے۔ بیچاری غریب بلبل مجسم غم بنی ہوئی کانٹے پر سینہ رکھے دردناک گیت الاپ رہی تھی۔ "فیا۔ فیا۔ فیا" کبھی وہ گاتی اور کبھی "ٹیرو۔ ٹیرو" کی پر درد صدا دیتی۔

اِس فریاد پر میرے آنسو نکل پڑے۔ میں اس غم کے زندہ اظہار پر اپنے آپ غور کرنے لگا۔

میں نے خیال کیا آہ بلبل تو ناحق سر دھن رہی ہے۔ تیری اس شکستہ حالی پر کوئی غمخوار نہیں۔ کوتہ عقل گلبن تیری فریاد کو نہیں سن سکتے۔ سنگدل جانور تجکو ہشاش نہیں کر سکتے۔ شاہ پنڈین (جو گریک کا بادشاہ تھا) مرچکا اور اس کے رفقا مردہ سیسہ کے صندوق میں بند ہیں تیرے ہمنوا تجھ سے بے اعتنا ہو کر مسرت کے گیت گا رہے ہیں۔

تیری ہی طرح اے دکھیاری بلبل میرا بھی کوئی پرسان حال باقی نہیں۔ (ترجمہ)

خیالات آزاد

(از جناب سید محمد حسین آزاد دکنی فاضل)

لٹیں بکھری ہوئی رخسار جاناں پر ہیں ٹونکی
یہ کیا اندھیر ہے یورش ہے پھر گوروں پہ کالونکی

نہ ان کو کنگ کا کھٹکا نہ ان کو امپیریل کا ڈر
نظر میں کوئی جچتا ہی نہیں اللہ والوں کی

یہ چرچے چرچ کے ہیں شیخ! مسجد کا خدا حافظ
برہمن بھی مناتے خیر ہیں اپنے شوالوں کی

بساط الٹیگی نقشہ مات کا پڑ جائیے گا آخر
کہ گتھی کھل رہی ہے ہر طرف شاطر کے چالوں کی

جواب اک سیدھا سادہ دیکے کیسی راستبازی سے
اڑا دیں دھجیاں یاروں نے پیچیدہ سوالوں کی

انہیں سیراب یورپ نے کیا دریا دلی سے ہے
پھلے پھولے تمنا انڈیا کے نونہالوں کی

یہ کس پر ہے چڑھائی کا ارادہ کچھ نہیں کھلتا
اُدھر ہے پلٹنوں کا کوچ اِدھر آمد رسالوں کی

سدا جو اپنی موٹی کملیوں میں مست رہتے ہیں
وہ پرواہی نہیں کرتے ہیں اوروں کے دوشالوں کی

ہنر سیکھو کوئی اب فیشنبل بن کے کیا حاصل؟
کروائے نوجوانو! ریس لیکن باکمالوں کی

اب ان آنکھوں نہیں جلوے سینما کے روز رہتے ہیں
جنھوں نے پتلیاں دیکھیں ہیں برسوں مالوانوں کی

مسوں کی چشم و مژگاں کا تو آخر ہو گیا گھائل
نکیلی اور چبھتی بات ہے ان بھولے بھالونکی

ہوئے ہیں کیسے کیسے انقلاب اِس دور میں صاحب
ابھی دیکھی نہیں تاثیر تم نے میرے نالوں کی

برائی کا نہ پڑ جائے کہیں سایہ یہاں تم پر
بُری صحبت سے بھاگو دوستو! تم بدخصالوں کی

بلا کے پینے والے ہیں بلانوشانِ بادہ کش
عجب یہ دور ہے گردش پہ گردش ہی پیالونکی

یہ عبرت کا محل ہے باپ کا واں دم نکلتا ہے
اِدھر بیٹے کو سوجھی ہے مکانوں کے قبالونکی

مقدس روز ہے، سرکار کے احکام مانع ہیں
خوشامد کر رہے ہیں پینے والے کیا کلالوں کی

شرافت کا ہے گر دعویٰ شریفوں کی سی باتیں کر
کہ جنٹلمین میں ہوتی نہیں باتیں رذالوں کی

اگر حاوی ہوئی ہیں عورتیں یورپ کی مردوں پر
کرینگے شیر بھی کیا ناز برداری غزالوں کی؟

کلام اکبر کا ہے مشہور جیسا اس زمانے میں
مچی اک دھوم ہے آزاد دکنی کے خیالوں کی

تنقیدیں

انشائے جدید تقطیع مجم ۱۴ صفحہ مطبوعہ مرتبی پریس دہلی قیمت درج نہیں ہے غالباً مصنف سے خود یا غ رام پور سے پتہ سے ملسکتی ہے۔
فارسی زبان خصوصاً جدید فارسی کے تعلیم کے لئے نہایت مفید کتاب ہے ہندوستان میں قدیم فارسی کے بہ نسبت جدید فارسی سے بہت کم وبیش تمام فارسی داں واقف ہیں لیکن ایران میں مغربی زبانوں کے اثرات مسلط ہونے سے بعد سے فارسی زبان میں جو تبدیلیاں۔ فروعی ہی۔ لیکن بڑی تعداد میں پیدا ہوگئی اور ہو رہی ہیں ان سے شاید چند ہی فیصدی فارسی داں واقف ہوں گے اس اعتبار سے اور نیز اس لئے بھی کہ زندہ زبانوں کی حیثیت سے فارسی ہندوستان اور یورپ کی تمام جامعات میں جگہ پائی ہوئی ہے ان کے مختلف اور گوناگوں اسالیب اور جدید الفاظ اور اصطلاحات سے واقف ہونا ان تمام لوگوں کے لئے ضروری ہے جو فارسی قدیم اور کچھ کچھ درک رکھتے ہیں اسی ضرورت کو مدنظر رکھکر مولوی محمد علی خاں صاحب اثر رام پوری نے یہ کتاب لکھی ہے دیباچہ میں کتاب کی ضرورت بتلاتے ہوئے ہر قسم کی مراسلت کے خواہ خانگی ہو یا عمومی یا سرکاری نمونے مرقوم اور مفید خلاصے کے ساتھ پیش کئے ہیں ضمناً ہندوستانی فارسی اور ایران کی فارسی کی مراسلت میں جو اختلاف پیدا ہو گئے ہیں ان کو بھی نمونوں کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو نہایت مستحسن ہے۔
عصر حاضر میں فارسی ادب اور ایرانی ذہنیت کے انقلاب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بھی اس کتاب میں مواد موجود ہے کیونکہ یہ جدید اثرات کے تحت فارسی زبان کی تبدیلیوں کی بڑی حد تک مظہر ہے۔
اس کتاب کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں امید ہے کہ عوام اور خواص فارسی مراسلت کی بہت سی غلطیوں سے بچ جائیں گے۔

شیب و شباب تقطیع ۱۲×۱۸ صفحات ۴۰ مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ قیمت ۱ مصنف کے پتہ پر اورنگ آباد دکن نیز مکتبہ ابراہیمیہ سے ملسکتی ہے
براؤننگ کی ایک نظم "ربیع بن عذرا" کا منظوم ترجمہ ہے جس کا نثری ترجمہ اس سے پہلے مولوی سید قار احمد صاحب ایم اے نے پیش کیا تھا جناب محمد امیر صاحب بی اے بی ٹی نے اس ضرورت کو محسوس کرکے کہ اس نظم کا ترجمہ نظم میں ایران کا ہی اور احتیاط سے کیا جائے تاکہ نقل میں اصل کی روح کھنچ آئے اس کوشش کا آغاز کیا اور توقع ہے کہ یہ کوشش نہایت مشکور ہوگی۔
ترجمہ کا کام یوں بھی آسان نہیں خصوصاً ایک مشکل شاعر کے کلام کا ترجمہ نظم سے نظم میں کرنا اور بھی وقت طلب ہے اہل رائے بزرگوں کا خیال ہے کہ کسی زبان کے ادبی شہ کار کا ترجمہ دوسری زبان میں ہو ہی نہیں سکتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی ایسے ترجمے اصل سے بڑھ نہیں گئے تو کم سے کم ان کے پیچھے بھی نہیں رہے چنانچہ نیشنل کالج (آکسفورڈ) کے شہرہ آفاق صدر نیا من جوک ( ) نے بعض یونانی اور رومی شہ کاروں کے ایسے ترجمے پیش کئے تھے کہ نقاد ان کو اصل سے کم رتبہ سمجھنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکتے مولانا علی حیدر صاحب نظم طباطبائی (نواب حیدر یار جنگ بہادر) کی "گریز ایلجی" کو اردو نظم کا جامہ پہنانے کی کوشش ایسی ہی کامیاب ثابت ہوئی۔ ہمیں یقین ہے کہ جو مصنفین اس میدان میں سرگرم نظر آرہے ہیں وہ بھی ایسی کامیابیوں کی منزل مقصود سے بہت دور نہیں ہیں ان کی وجہ سے ہم اردو دان کم سے کم مغربی طرز خیال سے تو روشناس ہو جائیں گے۔
اس ترجمہ میں ٹرجمی خوبی یہ ہے کہ لفظی ترجمہ کی پابندیوں سے قطع نظر کرکے اصل خیال کو ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے ترجمہ حیثیت سے نہیں معلوم ہوتی نظم خود جائیت سے بڑھے ہوئے ہمارے بوڑھاپے سے مایوس اور قنوطی بزرگوں کے لئے یقیناً ایک بڑی تسلی کا سبب پیش ہوگی۔

مطبوعات جامعہ ملیہ - دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جہاں مسلمانان ہند کے احیاء و بقا کے لئے بہت سے کام اپنے ذمہ لیے ہیں وہاں اس کا ایک اہم کام اردو زبان میں اعلیٰ لٹریچر بہم پہونچانا بھی ہے۔ چنانچہ ابتداہی سے اس نے اپنے ہاں تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ قایم کیا تھا جو اب اردو اکاڈمی کے نام سے موسوم ہے۔ اردو اکاڈمی مختلف علوم و فنون پر چند نہایت مفید کتابیں شایع کر چکی ہے۔ جن کی فہرست ہم آیندہ صفحات میں درج کرتے ہیں نیز ان کتابوں کی بھی ایک فہرست درج کر رہے ہیں جو کتبہ جامعہ نے مفید سمجھ کر خود شایع کی ہیں۔ قدردانان علم سے ہمیں امید ہے کہ ان مطبوعات کی قدر افزائی فرمایں گے۔

سلسلہ اردو اکاڈمی

تاریخ الامت - مصنفہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ صحیح تاریخی اصول اور تحقیق و تنقید کے ساتھ اردو میں پہلی بار شایع ہو رہا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہر شخص نہایت آسانی سے مسلمانوں کے تاریخی کارناموں سے واقف ہو سکتا ہے۔ جامعہ ملیہ اور صوبہ متوسط و برار کے محکمہ تعلیم نے اسے اپنے مدارس کے لیے بھی پسند کیا ہے۔ اب تک چھ حصے شایع ہو چکے ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

(۱) حصہ اول سیرۃ الرسول ﷺ عہ ۱۴
(۲) حصہ دوم خلافت راشدہ عہ ۱۸
(۳) حصہ سوم خلافت بنی امیہ عہ ۱۲
(۴) حصہ چہارم خلافت عباسیہ جلد اول عہ ۱۲
(۵) حصہ پنجم " " جلد دوم عہ ۱۲
(۶) حصہ ششم عباسیہ مصر عہ ۱۲

تاریخ الدولتین | اس کتاب میں خلافت بنی امیہ و بنی عباس کے حالات پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ مصر کے مشہور اہل قلم جرجی زیدان کی تصنیف ہے جسے مولانا نیاز فتحپوری نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ قیمت عہ ۱۲

مبادی معاشیات | یہ علم المعیشت پر ایڈون کینن کی مشہور و معروف تصنیف ہے جس کا ترجمہ پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب نے نہایت سلیس اردو میں کیا ہے یہ کتاب فن کے مبتدیوں کے لیے مفید ہے قیمت عہ ۸

تاریخ ہند قدیم | قدیم ہندوستان کی تاریخ کا ایک مختصر لیکن نہایت جامع خاکہ ہے تصنیف نے کے، ایم، پانیکر صاحب ایم۔ اے (آکسن) سے انگریزی میں لکھا کر اردو میں ترجمہ کرائی قیمت عہ ۱۲

ذکریٰ | تفسیر پارہ عم مصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاذ تفسیر جامعہ۔ سلسلۂ تفسیر "القرقان فی معارف القرآن" کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ کتاب بھی اسی مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں پارہ عم کی تفسیر خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں امت اسلام کے لئے پیش کی ہے۔ قیمت عہ ۱۲

عبرت | تفسیر سورۂ یوسف سلسلۂ تفاسیر کی ایک اہم جلد جس میں احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نہایت خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور اس کے عبرت انگیز نتایج کو بہت موثر

طریقہ پر پیش کیا گیا ہے قیمت عہ

برہان | لاہور نور کی مکمل اور مبسوط تفسیر نہایت پرزور اور دلکش طرز تحریر قیمت عہ

قواعد عربی | (حصہ اول) کتاب الصرف اردو میں عربی صرف کی مستند کتاب جسکو ہندوستان کے مشہور عربی ادیب لغتا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی استاذ عربیات جامعہ نے نہایت تحقیق سے مرتب کیا ہے۔ قیمت۔ عہ

تاریخ فلسفہ اسلام | از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (برلن) ہالینڈ کے مشہور فلسفی اور مستشرق ٹ۔ ج۔ ڈی بویر کی گرانقدر تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ۔ تاریخ فلسفہ اسلام پر اردو میں یہ پہلی قابل قدر کتاب ہے قیمت عہ

عربوں کا تمدن | ڈاکٹر جوزف ہیل پروفیسر میونک یونیورسٹی کی مشہور و معروف تصنیف KULTR DER ARABER کا ترجمہ از سید نذیر نیازی صاحب بی اے (جامعہ) مترجم نے کتاب کی قدر افزائی مفید ضمیمہ لکھکر اور بھی بڑھا دی ہے جو تاریخ اسلام پر یوں بھی نہایت محققانہ اور بصیرت افروز مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے قیمت عہ

دیوان غالب

طبع ثانی

مطبوعہ برلن (جرمنی)

ہندوستان کے مایہ ناز شاعر اردو مرزا غالب کا کلام جو شان رکھتا ہے اور جس قدر وہ منزلت کا وہ مستحق ہے ہم نے اسی حسن و خوبی اور لطافت و نفاست کے ساتھ مرزا کے کلام کا مجموعہ ارباب ذوق کے سامنے پیش کیا ہے۔

یہ دیوان نہایت اہتمام کے ساتھ جرمنی میں طبع کرایا گیا ہے۔ خوبصورت ملایم جلد، اسپر سنہرے دلفریب نقش و نگار طلائی اور اق اور سب سے زیادہ مرزا غالب کی لاثانی عکسی تصویر جرمن ہنرمندی اور کمال کا اعلےٰ نمونہ ہیں۔

ہمارے اس دیوان کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ چند ماہ کے قلیل عرصہ میں اس کا ایک ایڈیشن ختم ہو گیا اور دوسری بار طبع کرانا پڑا۔ دیوان مکمل ہے۔ جس میں مرزا مرحوم کا خود دو شتہ مقدمہ غزلیات قصاید اور رباعیات ہیں۔ جلد مطلا نہایت عمدہ سایز ۸۰ قیمت صرف عہ

دیوان شیدا

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم

کے

فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ

دنیا مسیح الملک کو طبیب، قومی رہنما عالم، ادیب اور حاذق کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن اس کا علم شاید خواص کے علاوہ کسی کو نہو کہ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم فارسی اور اردو کے ایک اعلیٰ پایہ اور کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ آپ کا کلام استادانہ ہے اور رفعت خیالات اور سادگی اظہار کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ اس دیوان کا ایک ایک لفظ حکیم صاحب مرحوم کی ہمہ گیری نکتہ رسی اور قادر الکلامی کا شاہد ہے

مکتبہ جامعہ نے اس دیوان کو جرمنی میں طبع کرایا ہے۔ پاکٹ سایز جلد سنہری منقش نہایت خوبصورت اور اق مطلا رنگ سرخ۔ نیلا۔ سبز۔ قابل دید چیز ہے

قیمت صرف عہ

مطبوعات مکتبہ جامعہ

ہمارے نبی بچوں کے لیے خدا کے پیارے ہمارے نبی کی پاک زندگی کی کہانیاں از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے (طبع سوم) ۵ر

ہمارے رسول خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی نے بچوں کے لیے سہل اور موثر ترین زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک حالات تحریر فرمائے ہیں قیمت ۱۰ر

سرکار کا دربار از احمد الیاس صاحب مجیبی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ذرا بڑے لڑکوں کے لیے بیحد مفید کتاب ۔ عہ

دنیا کے بسنے والے دنیا کے عجیب و غریب باشندوں کے حالات تقریباً ۵۰ تصاویر از سید شیر حسین صاحب زیدی۔ ہیڈ ماسٹر مسلم یونیورسٹی اسکول علی گڈھ قیمت ۶/۶ عہ

ترکوں کی کہانیاں ترک بچوں کی ہمت و جرأت کی سچی کہانیاں جن کے پڑھنے سے بچوں میں قومی جوش پیدا ہوتا ہے قیمت ۔ ۵ر

ازہار العرب ہمت و شجاعت، سخاوت و مروت اور علم و حکمت کے بہترین عربی اشعار کا گلدستہ۔ قیمت ۱۰ر

انتخاب مضامین جوہر طلبا جامعہ کے قلمی سالہ "جوہر" کے منتخب علمی ادبی اور تاریخی مضامین۔ قیمت عہ

اورنگ زیب عالمگیر مولانا شبلی کی معرکۃ الآرا تصنیف، طباعت، کتابت نفیس قیمت عہ

مقدمہ شعر و شاعری خواجہ حالی کے دیوان کا مقدمہ۔ اردو شاعری کے اصناف پر لطیف تبصرہ معہ فوٹو خواجہ مرحوم قیمت عہ

صلاح کار عنوان شباب کے جذبات کے نشیب و فراز پر گہری نظر۔ اور ازدواجی زندگی کے لیے دلسوز مشیر۔ از چودھری محمد علی صاحب تعلقہ دار ردولی قیمت

جمال الدین افغانی اتحاد اسلامی کے داعی اور مشرق کے مصلح اعظم سید جمال الدین افغانی کے حالات زندگی سید صاحب اور ان کے جانشین شیخ محمد عبدہٗ کی تصاویر بھی شامل ہیں قیمت

عرض جوہر مجموعہ کلام مولانا محمد علی صاحب۔ قیمت ۱۰ر

انتخاب میر زبان اردو کے زندہ جاوید شاعر میر تقی میر کے کلام کا ایک خاص نقطۂ نظر سے انتخاب معہ مقدمہ و حالات میر۔ مرتبہ مولوی نور الرحمن صاحب بی اے (علیگ) قیمت عہ

دیوان غالب طلبہ کی سہولت اور روزمرہ کے استعمال کے لیے سستا قیمت ۱۰ر

مسدس حالی طلبہ کے استعمال کے لیے مجلد ہونے کے باوجود قیمت ۱۰ر

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ اس رسالہ میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے تعلیم کی غایت اور مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی ضروریات پر بیحد مفید بحث کی ہے قیمت ۱ر

خطبۂ صدارت شیخ الہند مرحوم کا تاریخی خطبہ صدارت جو بتقریب افتتاح جامعہ پڑھا گیا تھا قیمت ۲/۱ عہ

خطبۂ صدارت مسیح الملک مرحوم کا عالمانہ خطبہ جو جلسۂ اول تقسیم اسناد میں پڑھا گیا۔ قیمت ۵ر

اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب کے خطبہ صدارت

کا اردو ترجمہ مسلمانوں کی حیرت انگیز	نامۂ مشیر	یمنی تال، کشمیر اور یورپ کے پر فضا مقامات
علمی ترقی کا خاکہ۔ قیمت ۵ر	قدوائی کا نظوم خط ایک ست دوست کے نام قیمت ۱ر	میں لکھی گئی ہیں قیمت عہ
قومی و اسلامی تعلیم کا نظام	نالۂ مشیر دیوان کا پہلا حصہ قیمت عہ	الورد والریحان صحیح بخاری و صحیح مسلم
مولانا محمد علی کی تعلیمی اسکیم قیمت ۵ر	کلام مشیر دیوان کا دوسرا حصہ زیر تعلیم	کی حدیثوں کا انتخاب معہ ترجمہ نظم و نثر قیمت ۲ر

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ ابراھیمیہ امداد باہمی (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

حیدرآباد دکن کی مشہور و معروف دوا

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکما اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹیفکیٹ عطا کیے۔ زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ متلی۔ کھانسی دمہ۔ بواسیر۔ خارش۔ سانپ بچھو کے زہر اور ہمہ اقسام کے درد کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے آزمایئے ایک بار ضرور آزمایئے۔ پبلک کے فایدہ پہونچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔ شیشی نمبر (۱) عہ نمبر (۲) ۸ر نمبر (۳) ۴ر ایک درجن کے خریدار کو خرچہ۔ وی۔ پی۔ معاف ہوگا۔

خط اور تار کا پتہ "زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

انتخاب لاجواب لاہور

امریکہ و یورپ کے بیش بہا علمی تجارتی و خانگی معلومات اور سائنس و نیچر کے دنیا بھر کے عجائبات کا اردو زبان میں بنظیر ہفتہ وار مجموعہ اگر آجتک آپ نے نہ دیکھا ہو تو چھ روپے بھیجکر سال بھر کیلئے جاری کروالیں۔ سالانہ خریداروں کو علاوہ سال بھر پرچہ ہم پہنچا نیکے پانچسو صفحہ کی مختلف کتابیں بھی مفت دیجاتی ہیں۔ خط لکھتے وقت اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ مینیجر انتخاب لاجواب لاہور۔

اُردو زبان کا قدیم و مستند ماہوار رسالہ صرف

زمانہ

ہے جو ملک کے مشہور ادیب منشی دیانرائن نگم صاحب بی۔ اے کی ادارت میں پچیس سال سے متواتر اردو زبان کی خدمت انجام دیتا رہا ہے۔ علمی و ادبی مقالات، تحقیقی و تنقیدی مضامین، دلکش سبق آموز افسانے، بہترین نظمیں اور غزلیں، علمی خبریں اور نوٹس، غرض ہر قسم کے بہترین مضامین آپکو صرف "زمانہ" میں مل سکتے ہیں۔ شاہیر ملک و اہل قلم کے علاوہ آرٹ کی اعلیٰ تصاویر بھی ہر ماہ بالالتزام "زمانہ" میں شائع ہوتی ہیں۔ فروری ۱۹۲۸ء میں "زمانہ" کی پچیس سالہ جوبلی کے موقع پر ایک خاص نمبر "جوبلی نمبر" کے نام سے شائع ہو کر قبولیت عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ اگر آپنے ابھی تک "زمانہ" ملاحظہ نہیں کیا ہے تو آج ہی اُس کے خریدار ہو جائیے۔ قیمت سالانہ صرف پانچ روپیہ ششماہی (ڈھائی) روپیہ اور فی پرچہ آٹھ آنہ مقرر ہے۔

منیجر رسالہ "زمانہ" کانپور

قابل قدر و لائق مطالعہ کتابیں

پریم تبسم۔ اُردو کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند بی۔ اے۔ کے دلکش قصوں کا مجموعہ ہے زبان کی سلاست و لطافت قابل دید ہے۔ قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ ۱۲ آنہ

خاکِ پروانہ۔ یہ بھی پریم چند صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اس میں چودہ منتخب جدید افسانے ہیں ہر افسانہ واقعات کی ہو بہو تصویر اور نفسیات انسانی کی بے مثل تمثیل ہے۔ قیمت عہ روپیہ

خیالات عزیز۔ مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔ اے۔ کے دلکش سبق آموز مضامین کا مجموعہ۔ جو باقاعدہ جشری شدہ ہے اور ہمارے علاوہ کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتا۔ قیمت عمدہ روپیہ

سیر المصنفین (حصہ اول) اُردو نثر نگاروں کا تذکرہ۔ از مولوی محمد یحییٰ صاحب بی۔ اے۔ قیمت عمدہ روپیہ

سنسکرت علم ادب۔ سنسکرت کے علم ادب کے متعلق بہترین معلومات کا ذخیرہ۔ قیمت ۴ ؍

گلدستۂ لسان الہند۔ حضرت عزیز لکھنوی کا منتخب دیوان ہر شعر ندرت تخیل و جذبۂ دل کا صحیح نمونہ ہے قیمت عہ روپیہ

اثر ستان۔ خانصاحب مرزا جعفر علی خاں اثر بی۔ اے لکھنوی کے اُردو کلام کا مجموعہ قابل دید ہے۔ قیمت عہ روپیہ

سرمایۂ تسکین۔ حضرت تسکین سورنوی کی منظومات و غزلیات کا مجموعہ۔ قیمت عہ روپیہ

کاس الکرام۔ یعنی شرح رباعیات عمر خیام از میر ولی اللہ صاحب۔ قیمت عہ ایک روپیہ

لسان الغیب۔ اُردو میں دیوان حافظ کی بہترین شرح از میر ولی اللہ صاحب۔ قیمت ہر حصہ (للہ) روپیہ

منیجر زمانہ بک ایجنسی۔ کانپور

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پُرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔ اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پُراثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے۔ کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا فوری اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس۔ وجع مفاصل دمہ۔ دردِ سر۔ دردِ سول۔ بچھو کے زہر کے لئے اور زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال

تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار دفعہ مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور صاف کریں۔ جو احباب بغرض امتحان دوا طلب فرماویں۔ بخوشی تعمیل کی جائے گی۔

نوٹ۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اور نسخہ جات نہایت احتیاط کیساتھ تیار کئے جاتے ہیں

الملتمس: جیمس اینڈ کمپنی پیٹنٹ میڈیسن اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

افتخار الحکماء نواب حاذق جنگ مرحوم سابق افسر الاطباء فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت اور بڑی خوشی کے ساتھ محض بیماروں کی شفاء کی غرض سے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں برص مستنر (یعنی کوڑ اور سفید داغ) کا علاج نہایت مشکل ہے یہ مرض عموماً بڑھتا ہی جاتا ہے۔ حکیم مولوی محمد عبدالقادر صاحب مددگار صدر مخزن الادویہ یونانی سرکار عالی و رکن دارالتشخیص و انجمن اطباء یونانی حیدرآباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ صاحب موصوف نے اکثر مرضاء برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور بفضلہٖ کامیاب ہوئے۔ میں نے بچشم خود مرضاء برص کا معائنہ کیا ہے۔ بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور مجرب دوا کا اثر ہے۔ میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے کٹھن مرض کی دوائے مجرب کی ایجاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہئے کہ وہ اس موقع کو غنیمت سمجھکر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور اس مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

شد حد خط (افتخار الحکماء نواب حاذق جنگ)

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اُردو مؤلفہ مولوی محمد نصیر الدین ہاشمی صاحب فاضل جو بی ہندستان اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی و آصف جاہی دور ان میں اُردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اُردو کا تذکرہ مع نمونہ کلام غیرہ۔ ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰۲/۱۶ کاغذ چکنا بار دوم قیمت کا

جہانِ اُردو مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندستان کے ممتاز اردو انشاپردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے نصابی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۴۲۵ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰۲/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ساد

روحِ تنقید مصنفہ مولوی ابو الحسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے، فن تنقید کے متعلق اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی و حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۳۵۰ سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰۲/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بار دوم قیمت عہ

تنقیدی مقالات مصنفہ زور صاحب۔ یہ روحِ تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روحِ تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی، فارسی اور اُردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی تخلیقات پر تنقید کرکے اصولوں کا استعمال دکھایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشاپردازوں کے طرزِ تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کیے گئے ہیں ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰۲/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد ساد

اُردو کے اسالیبِ بیان مصنفہ زور صاحب۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت سے ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرزِ تحریر و انداز بیان کا تذکرہ۔ خاص طرزِ تحریر کے اُردو انشاپردازوں کے اسالیبِ بیان پر تبصرہ ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ساد عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ زور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی، ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ر

دنیا سے افسانہ مصنفہ مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی، افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ۔ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات یہ اُردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادی فلسفہ مؤلفہ مولوی محمد حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی، آنرز اکنامکس سی راپورٹ پی۔ ایچ۔ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا ملخص ماخوذہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۴ر

ارباب نثر اُردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اُردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ضخامت ۴۲۴ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عال

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ایم اے، ایل ایل بی ہندستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی مستقل تاریخ ضخامت ۴۴۴ صفحے۔ سائز ۲۰۲/۱۶ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۱۲ر

جواہر کلیات نظیر منتخبہ جناب مولانا ذہین وحید نثار احمد نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے اخلاقی۔ ادبی۔ نصیحت آموز اطراف آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۸۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائد الاسلام مترجمہ مولوی محمد عبدالغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور با محاورہ اردو ترجمہ۔ قیمت ۴ر

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی احمد عبداللہ مسدوسی بی اے آئیں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ر

دکنی لغت مرتبہ مولوی سید شاہ احمد شعار ہاشمی۔ اردوئے قدیم کے دکھنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ر

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحبدل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۴۸ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵ر

حزبِ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبدالعزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶ر

سیرت خیر البشر و سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱ر

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بدخو شوہر کو ٹھیک کرسکتی ہے۔ قیمت ۲

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ۔ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ روبرو محکمہ مالگزاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھوگرافر منیجر مطبع

مجلہ

مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم اے، ال ال بی

مجلۂ مکتبہ

۱۔ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲۔ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳۔ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بجوابۂ بنمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴۔ قیمت سالانہ (لاہور) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عالم) فی پرچہ ۶ پائی

۵۔ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (ے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعاتِ مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُنکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلۂ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحتِ بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلۂ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ اُنکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر، مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلۂ مکتبہ" "مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

رجسٹرڈ نشان پٹہ سرکار آصفیہ (۶۵)

مجلہ مکتبہ

رجسٹرڈ نشان پٹہ سرکار انگلشیہ (.....)

جلد (۲) بابتہ ماہ بہمن ۱۳۳۸ف مطابق دسمبر ۱۹۲۸ء شمارہ (۳)

شبیہ مبارک اعلیحضرت سلطان العلوم خسرو دکن

فہرست

	مضمون		صفحہ
۱	شذرات	از مدیر	ب
۲	سالگرہ ہمایونی	" "	۱
۳	کلام الملوک ملوک الکلام	از اعلیحضرت سلطان العلوم	۴
	(پردہ)		
۴	حالی اور جدید شاعری (بسلسلہ گذشتہ)	از جناب احمد عبداللہ صاحب المسدوسی بی اے	۵
۵	خاقانی	از محمد محسن خاں صاحب متین	۲۵
۶	ہندوستانی کاشتکاروں کی معاشی حالت	از قاضی فصیح الدین احمد صاحب صدیقی متعلم بی اے	۳۴
۷	سفرنامہ مصر جدید	از ملا رموزی صاحب	۴۵
۸	فکر عالیہ (نظم)	از سید ابو محمد صاحب ثاقب	۶۰
۹	حسن کار (افسانہ)	مترجمہ جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)	۶۱
۱۰	آمد شاہ (نظم)	از جناب محمد عبدالرحمن خان صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ	۷۲
۱۱	عمل (نظم)	از جناب نواب ضیا یار جنگ بہادر	۷۳
۱۲	یادہ دکن (لچھمی نرائن صاحب وفیق اورنگ آبادی)		۷۴
۱۳	تنقیدیں	" "	۷۶
	اشتہارات		۷۸

شذرات

۱۵ر دسمبر کی شام کو سالگرہ ہمایونی کے دوسرے روز اعلیحضرت سلطان العلوم خلداللہ ملکہٗ بغرض تفریح کلکتہ تشریف فرما ہوئے۔ جاتے ہوئے اعلیحضرت نے نئی قاضی پیٹھ بہار شاہ ریلوے کا افتتاح بھی فرمایا۔ راستہ میں عایائے حضور پرنور اور دیگر باشندگان ہند نے اپنی عقیدت کا اظہار طرح طرح سے کیا۔ آپ کی غیر معمولی سادہ زندگی سے لوگ بیحد متاثر ہو رہے ہیں دعا ہے کہ اس سفر سے اعلیحضرت نہایت کامران مراجعت فرمائے بلدہ ہوں۔

ریاست حیدرآباد کے سابق ناظم تعلیمات نواب مسعود جنگ بہادر کی وظیفہ پر علیحدگی کے بعد اس جگہ پر بذریعہ فرمان خسروی خان فضل محمد خان ایم اے (ریٹگلر) کا تقرر ہوا تھا، خاں صاحب نے ۱۶ دسمبر کو فائز البدہ ہوکر اپنی خدمت کا چارج حاصل کرلیا۔ خان صاحب پہلے بھی اسی سررشتہ کے عہدۂ نائب ناظمی پر کارگزار رہ چکے ہیں لیکن اس وقت آپ کے خدمات کلی نوعیت سے متعلق تھی۔ اب مستقل طور پر آپ ریاست کی تعلیمی خدمت انجام دیں گے آپ کی علمی قابلیت اور انتظامی تجربہ سے امید ہے کہ محکمہ تعلیمات نہایت صحت بخش اصول پر ترقی کرلیگا۔

رسالہ کے کاروبار میں وسعت اور پریس کے گوناگوں دقتوں کے مدنظر یہ مناسب تصور کیا گیا ہے کہ رسالہ کے حلقہ ادارت میں کچھ توسیع کی جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں رسالے کے خریدار بزرگوں کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ آئندہ مہینے سے مولوی عمر یافعی صاحب، جو رسالے کے اجرا سے اس وقت تک انتظامی اور علمی امور میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور جن کو انجمن ارباب اردو (سرد رنگر) کے رسالے "تحفہ" مرحوم سے متعلق رہنے کی وجہ سے ان معاملات کا کافی تجربہ ہے، شریک مدیر کی حیثیت سے "مکتبہ" کی خدمت انجام دیں گے۔ توقع ہے کہ آئندہ رسالے کی دلچسپیوں میں مزید اضافہ اور ٹھیک وقت پر شائع ہونے کا انتظام ہوجائے گا۔

اورینٹل کانفرنس کا پانچواں اجلاس اس دفعہ لاہور میں ۱۹، ۲۰، ۲۱ اور ۲۲ نومبر کو منعقد ہوا تھا مختلف صوبوں سے شریک ہونے والے نمائندوں کی تعداد دو سو سے زیادہ تھی، جن میں پنجاب کے بہت سے قدیم مشرقی علوم وفنون کی ترقی میں دلچسپی لینے والوں کا یہ مجمع پچھلے تمام اس قسم کے مجمعوں پر سبقت لے گیا۔ آخری وقت تک معتمد کے پاس مضامین پہونچتے رہے جن کی مجموعی تعداد دو سو سے زیادہ تھی۔

حیدرآباد دکن سے بھی جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ میں سے ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب مولوی فاضل پی ایچ ڈی (کیمبرج) پروفیسر فارسی، ڈاکٹر عبدالحق صاحب بی لٹ ڈی فل (آکسفورڈ) پروفیسر عربی، مولوی سید سجاد حسین صاحب ایم اے پروفیسر اردو اور سرسبا راؤ بی اے پروفیسر تلنگی جامعہ کی نمائندگی کے لئے بھیجے گئے تھے۔ توقع ہے کہ اس اعلیٰ علمی اور ایک [illegible] اجتماع سے ہندوستان مخصوصاً ریاست ابدمدت کی علمی اور ذہنی ارتقاء بہت سے علمی فوائد [illegible] مترتب ہوسکیں گے۔

سالگرہ ہمایونؒ

اس ماہ میں بتقریب سالگرہ، اس مہتم بالشان ہستی کے ذکر جمیل سے جس کا نام گرامی تاریخ ہند کے اوراق میں عدیم المثال بنا رہیگا، ہم اپنے رسالہ کی زینت کو بڑھانے کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اعلیحضرت سلطان العلوم خسرو دکن کی یہ چوالیسویں (۴۴) سالگرہ کی معہود تقریب ہے۔ آپ کو عنان حکومت ہاتھ میں لئے ابھی صرف (۱۰) سال کا عرصہ ہوتا ہے لیکن ریاست ابد مدت میں جو ایک عظیم الشان تغیر پیدا ہو گیا ہے اور یہ تغیر عجیب ارتقائی ہے کہ باوجود تدریجی ہونے کے ہم ماضی کے اثرات کو تاریخ کے اوراق پارینہ میں ڈھونڈھے مجبور ہیں کہ دنیا ایسا زندگی کا شعبہ ہے جس پر یہ ارتقائی تغیر مسلط نہیں ہوا علمی اور عملی دونوں حیثیتوں میں وجود حیدرآباد گذشتہ کے مقابلہ میں بڑا اہمیت کا مرکز بن گیا ہے۔ یہاں ہم مغرب کے بعض مدبرین کی اس بحث سے قطع نظر کرلیتے ہیں کہ کسی ملک کی ترقی میں آیا حکومت کا حصہ بیش از بیش ہے یا رعایا کا؟ مشرق و مغرب کے خطہ ہمارے مثال میں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے اصولاً اور عملاً مختلف نہیں ہیں۔ اجنبی حکومت کے متعلق یہ بحث زیادہ درست ہو سکتی ہے۔ اپنا ملک اپنی حکومت اور اپنا ہر دلعزیز روشن خیال بادشاہ ہو تو پھر حکومت اور بادشاہ میں امتیاز کو کیا دخل ہے یہی وجہ ہے کہ سطح ارض کے تمام ممالک جن کو اپنے آپ پر حکومت کرنے کی خوش بختی حاصل ہے جب ترقی کرتے ہیں تو اپنے ایک روشن خیال اور ہمدرد بادشاہ کے تحت۔ مثالیں گنانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ موجودہ دور میں ترقی پر گامزن ہونے والے ممالک ہی سے اس حقیقت کا انکشاف ہو سکتا ہے یہی تدبر تھا جس نے کسی مفکر مشرق سے "الناس علی دین ملوکھم" کے اس اصول کی تدوین کرائی۔

اسی کی مطابقت ہمارے پاس آجکل بھی ہو رہی ہے۔ ذات شاہانہ کی توجہ سے جو اصلاحات اور ارتقائی تغیرات ملک میں آئے دن ہو رہے ہیں رعایا اپنے آپ کو نہایت سرعت کے ساتھ ان کے مطابق کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

جس طرح اعلیحضرت کی ذات شاہانہ میں گوناگوں اوصاف اور خوبیاں جمع ہو گئی ہیں، اسی طرح آپ کا عہد مسعود بھی عجیب خصوصیات کا مرکز بن گیا ہے ہم اس اتحاد کو محض اتفاق نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ نگاہ جس دوسری چیز کو پہلی کا لازمی اور ضروری نتیجہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ کافی ہے آپ کی علم دوستی اور علم کی سرپرستیوں نے ہند اور بیرون ہند سے علما، اور فضلا کو سلطنت میں کھینچکر

بنالیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے لئے ایک مرکزی بھی جامعہ عثمانیہ کی شکل میں فراہم کر دیا۔ اس کا نتیجہ اشاعت علوم کی صورت میں جلوہ گر نہ ہوتا تو فطرت کے خلاف تھا۔

ذاتی اعتبار سے آپ کی زندگی ایک عالمگیر کی، ایک سلطان ناصرالدین کی سادہ اور غیر معمولی سادہ زندگی ہے۔ لباس سادہ، خوراک سادہ، بود و باش سادہ، اس سادگی میں خدا کی عظمت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ آپ کے نظام زندگی میں بیشتر وقت ملک کے نظم و نسق کی اصلاح پر غور و فکر کا ہے اس سے جو وقت بچتا ہے۔ وہ دیگر مشرقی — بلکہ مغربی — بادشاہوں کی طرح نغمہ و سرود جیسے حد سے زیادہ دلچسپ مشاغل میں نہیں بلکہ عربی فارسی اردو یا دوسری زبانوں کی علمی خدمت میں بسر ہوتا ہے۔ آپ کی فارسی شاعری کے متعلق بعض مبصرین کی رائے ہے کہ موجودہ ہندی فارسی گویوں میں بلند ترین درجہ رکھتی ہے۔ اردو شاعری کا بھی یہی حال ہے۔

اخبار صبح دکن کے خرد دکن نمبر میں ہم نے آپ کی فارسی شاعری کی خوبیوں پر تفصیلی نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ وہ آپ کی فارسی شاعری کی اہمیت کا ایک بڑی حد تک مظہر ہے۔ اتفاقی بات ہے کہ اس ملک کے اہل رائے بزرگ عالیجناب مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر نے اعلیحضرت کی اردو شاعری پر اچھی بحث کی ہے۔

آپ کا عہد مسعود ملکی نظم و نسق اور اصلاحات میں بھی خاص اہمیت رکھتا ہے علمی کارناموں میں دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ کا قیام اسلامی تاریخ کے شہنشاہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ کر دیتا ہے۔ اشاعت علوم کے لحاظ سے روم کے شاہ آگسٹس کا ماحول پیش نظر ہو جاتا ہے۔

تاریخ ہند میں شاہجہاں کا عہد تعمیرات میں درخشاں ہے مورخ اس کو "عمارت ساز" کا لقب دیتے ہیں تاریخ دکن میں شاہ دکن کا عہد شاہجہاں کے عہد کے مماثل ہے۔ اس "عمارت ساز" بادشاہ کے کارناموں میں موجودہ عمارات عدالت العالیہ چوکھنڈہ مبارک دواخانہ عثمانیہ انٹرمیڈیٹ سٹی کالج..... نوبل کالج ٹولی چوکی اور افضل گنج پارک، عثمان ساگر، حمایت ساگر، نظام ساگر اور دیگر بیشمار تعمیراتی کارنامے عرصہ دراز تک زبان حال سے اپنے موجد کی طرف اشارے کرتے رہیں گے۔ سینکڑوں عمارتیں اب تک بن چکی ہیں اور کئی ایک تیار ہو رہی ہیں۔ آرائش بلدہ شہر کے غلیظ اور تیرہ و تار محلوں کی صفائی میں مصروف ہے۔ شہر کی باطنی تعمیر کے علاوہ ظاہری شکل میں بھی اس قدر تغیر رونما ہو گیا ہے کہ ایک قرن ادھر کا شخص بمشکل اس کو پہچان سکیگا۔

نظم و نسق میں مال، فینانس، امن عامہ، عدالت، پٹہ، زراعت، صنعت و حرفت، تعمیرات وغیرہ میں جو جو ترقیاں اب تک ہوئی ہیں ان کا اجمالی ذکر بھی ایک کافی حجم کی کتاب کی وسعت چاہتا ہے۔ ان محکمہ جات

کے اعلیٰ عہدہ داروں کی رپورٹوں سے ان کی ترقیوں کا ایک اندازہ قایم ہوسکیگا۔

اعلیٰحضرت نے ملک کی معاشرتی اصلاح کی طرف بھی جس تدریجی رفتار کے ساتھ قدم اٹھایا تھا، اس کے مستحسن نتائج اب پوری طرح جلوہ گر ہوچکے ہیں۔ بزرگوں کی خانقاہوں میں عرصہ سے ناچ ورنگ کا دستور چلا آرہا تھا، اس کی بدنمائی میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے؟ اعلیٰحضرت نے اس قبیح دستور کا پورا پورا قلع قمع فرمایا۔ اسی طرح محرم کا قابل احترام مہینہ یہاں ایک بڑی مدت تک طرح طرح سے دلچسپیوں کی پیدائش اور افزائش کا موقع بنا دیا گیا تھا، دن بھر سوانگ اور راتیں رقص وسرود میں بسر کی جاتیں، ملک میں اس کی قباحت سے بہت کم لوگ ہی واقف ہونے پائے تھے کہ اعلیٰحضرت نے ان افعال شنیعہ اور امور منیعہ کا استیصال فرماکر، ملک اور قوم کو ایک بڑے اخلاقی جرم اور مذہبی گناہ کے ارتکاب سے روک لیا۔ اسی قسم کی کئی اور اصلاحات ہیں جو بخوف طوالت چھوڑ دی جاتی ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے "نظام گزٹ" کے ذریعہ ذات شاہانہ کی توجہ شادی بیاہ کی بے جا رسومات کی اصلاح کی طرف بھی منعطف کرائی ہے امید ہے کہ مناسب وقت میں حضور ان کی بھی بوجوہ احسن درستی فرمائیں گے۔

آخر میں ہم اعلیٰحضرت کی ہمدردی، رواداری، انصاف پسندی کو بھی نہیں بھول سکتے جن کی بدولت آپ کو اپنے اسلاف کی روایتی ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی ہے۔ ہر طبقہ اور ہر عقیدے کی رعایا کے ساتھ آپ کے مراحم مساوی ہیں۔ ذاتی قابلیت آپ کی جانچ کا معیار ہے نہ کہ ذات۔ باوجود قلیل ترین تعداد میں ہونے کے پارسیوں میں سے ایک جوہر فرد آپ کے پاس اس قدر قربت حاصل کرتا ہے کہ اعلیٰ ترین عہدوں پر مرتے دم تک فائز رہتا ہے۔ آنجہانی سر فریدوں جی (نواب فریدوں الملک بہادر) عرصہ تک صدر اعظم رہے اور آخری ایام حیات میں اپنی قابلیت ہی کی وجہ سے صدر الہام اخصاصی شمار ہوتے رہے۔ آپ کے فرزند کوڑ گیری کے اعلیٰ عہدہ دار ہیں۔ ایک اور پارسی قابل فرد کے دو سال کا اعلیٰ عہدہ ہے۔ یہ نمونے نمونۂ از خروارے ہیں۔ تلاش کی ضرورت نہیں۔ دیکھنا چاہیں تو سینکڑوں مثالیں پیش نظر ہیں۔

آپ کی رعایا اہل ہنود پر زیادہ مشتمل ہے۔ موجودہ صدر اعظم باب حکومت جو اس ملت کے ایک حق بین جوہر فرد ہیں اعلیٰحضرت کی حق پسندی کے ہر وقت رطب اللسان ہیں۔ دیکھنے والوں کو یہ کچھ دکھائی دیتا اور علانیہ نظر آتا ہے عقل سرخۂ روبرو تماشا دیکھکر بھی نہ دیکھے، تو اس کی مدد کون عقلمند ہوگا جو کریگا۔

عجیب بات ہے کہ آپ کی ہندو رعایا مسلمانوں سے زیادہ آپ کی اور آپکے اسلاف کی گرویدہ ہے۔ اب تک وہ ضعیف العمر بقید حیات ہیں جو اپنے گذشتہ شاہ جمجاہ نواب میر محبوب علی خاں بہادر غفران مکان کے خوارق عادات خصائل اور فرشتہ خصلت ہمدردیوں کا ذکر اس موثر پیرایہ میں کرتے ہیں کہ دل اس کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ ہر گاؤں میں اور ہر قصبہ میں حضرت غفران مکان کے مزار اور چبوترے بنے ہوئے ہیں۔ جن کا احترام وفا شعار ہندو اپنے اپنے طور پر طرح طرح کرتے ہیں جس بادشاہ میں مسلم خواص یکجا جمع ہوں، اس کے متعلق ہم کو یہ کہنے میں کیسے دریغ ہوگا کہ:-

سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

اور ایسے بادشاہ کی درازی عمر و بلندی اقبال کے لئے کون خدا سے دعا نہیں کرے گا کہ یہ خود اپنی فلاح و ترقی ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(مدیر)

کلام الملوک ملوک الکلام

پیرکرد

تلمیذ فخر دوراں متعالی الحضرت سلطان العلوم خداداد ثم مکنہ و سلطنتہ

جہاں شرم و حیا کا کاکل پیچاں ہے پردہ
کھٹکتا انکی آنکھوں میں مثال خار ہے پردہ

گناہ بد کی پیش گفتی نہیں کچھ حاجت اس کے
اگر شرم و بہت کچھ جب بھی ذمہ دار ہے پردہ

حقیقت میں اٹھا سکتی نہیں طاقت کوئی اسکو
بقائے عصمت و عفت کا اک اسرار ہے پردہ

جو نادانی سے کہتے ہیں کہ پردہ ہو نہیں سکتا
حیا کہتی ہے یہ دل ہی کہ کیا دشوار ہے پردہ

جو خوگر بے حجابی کے ہیں کچھ حاجت نہیں انکو
ہر اک پردہ نشیں کے واسطے درکار ہے پردہ

بسر کرتے ہیں اپنی زندگی جو پردے میں
جو سچ پوچھو تو ان کا مونس و غمخوار ہے پردہ

نہ ہوں یاجوج ماجوج اس کے پے کہدو اے عثمان
نہ جاتا جائے گا وہ آہنی دیوار ہے پردہ

حالی اور جدید شاعری (گذشتہ)

(بسلسلہ)

از جناب احمد عبداللہ صاحب المدنی۔ بی اے

دوسری بڑی اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حالی اس مشہور اصول "یہ جاننا نہایت اہم ہے کہ کب خاموش ہونا چاہیئے" کی پروا نہیں کرتے لانگ فلو (LONG FELLOW) کی آخری زمانے کی دو نظموں[1] کے متعلق انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار نے تنقید کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ ان کی ناکامی کا سبب پیرانہ سالی ہے یہ نظمیں وہ ہیں جن کی تعریف میں وہ لکھتا ہے کہ

"ایک قسم کی جذباتی "اخلاقیت" بغیر کسی خوبی کے لیکن نیک اور قابل تعریف ارادہ کی حامل ہیں"[2]

کس قدر عجیب طرح سے یہ رائے مسدس پر صادق آتی ہے۔ حالی کی یہ نظم بھی اس وقت لکھی گئی ہے جبکہ طبیعت بجھ گئی تھی امراض کے متواتر حملوں سے دماغ بوسیدہ اور دل افسردہ ہو گیا تھا۔ باسی کڑھی میں اُبال آیا اور انہوں نے "ناصح" کی "دنیائے شاعری" کے اندر پہلی مرتبہ "نصیحت سنکر" جام و سبو کو توڑ پھوڑ ڈالا مے کشی سے توبہ کر لی، پیر مغاں سے "فسخ بیعت" کی اور زنار توڑ، سبحہ صد دانہ گلے میں ڈال کر زاہدانِ شب زندہ دار کی مجلس میں پہنچکر وعظ و نصیحت شروع کر دی۔ مگر کیا یہ اولین تجربہ کامیاب ثابت ہوا؟

اس بنا پر اگر کوئی شخص یہ صحیح رائے رکھے اور اس کا برملا اظہار کرے کہ حالی اخلاقی شاعری میں سخت ہیٹے ہیں تو کیوں ناک بھوں چڑھائی جائے اور کیوں کوئی آستین چڑھا کر مقابلہ پر اتر آئے ایک طرف وہ ساعی ہیں جو جائز و ناجائز طریقہ سے اپنی چوٹی کا زور لگا کر زبردستی منوانا چاہتی ہیں کہ حالی بڑے زبردست شاعر تھے ان کی شاعری لیریکل انٹلکچوئل (کلاسکل) حصہ ہے اور دوسری طرف خود حالی کے بیانات ہیں کہ وہ شاعر نہیں بلکہ "مشفق ناصح" ہیں، ان کو کلام کی داد لینی نہیں بلکہ اخلاق کی باتیں سکھانی ہیں، جس اخلاقی شاعری کا سو فیصد حصہ علیگڈھ کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک سے متعلق ہو اور جس کے متعلق ذوق[3] نے یہ بالکل صحیح رائے ظاہر کی ہو کہ

"جن خیالات کو سرسید نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ظاہر کیا ان کو مولوی حالی نے مسدس میں گا کر بیان کیا"

اس کو شعر کا حقیقی جادو بنا کر اپنی سحر بیانیوں کے بل بوتے پر پیش کرنا حالی پر دست تصرف دراز کرنا ہے اور ع پیران نمی پرند و مریداں می پرانند کے مصداق ٹھیرتا ہے۔

ایک نہایت اہم سوال یہاں پر پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیوں حالی کی اخلاقی شاعری کو قومی شاعری کے پہلو بہ پہلو وہ حسن قبول حاصل ہوا جس کی وہ فی الحقیقت مستحق نہ تھی۔ اس سوال کے جواب ادا کرنے

---

(1) A play in their acts (2) The Spanish student

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۱۶ صفحہ ۹۸۰ باریاز دہم۔ [3] مصنف روح تنقید مولوی سید غلام محی الدین قادری ذوق ایم اے (ختم)

میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اگر اس امر کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ کل جدید لذیذ حالی نے پہلی دفعہ اس قسم کی شاعری کی مستقل کوشش کی اس لئے حسنِ قبول کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا۔ اس کی مثال میں موجودہ شعراء میں پنجاب کے نوخیز و مشہور شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ آج سے چند سال پیشتر اول اول انہوں نے چھوٹی چھوٹی بحروں میں نئی نئی شاعری شروع کر کے جو شہرت حاصل کی تھی وہ آج انہیں جدید شعراء کے طبقہ میں حاصل نہیں ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اب ان کا یہ رنگ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ متعدد ہونہار مگر تقلید پسند شعراء نے اسی کوچہ میں قدم رکھا ہے۔ اب ہمارا ذوق چھوٹی چھوٹی بحروں کے اندر خوبصورت الفاظ اور مترنم تراکیب کے سوا بھی ایک چیز کا طالب نظر آنے لگا ہے۔ اب ہم ابتداء کی طرح چھوٹی بحر سے جس میں معمولی درجہ کے خیالات ادنیٰ یا متوسط درجہ کے جذبات کے ساتھ ملا کر بیان کئے گئے ہوں مطمئن نہیں ہو سکتے، اب ہم اس شیشہ میں الفاظ و حروف کے تخیل کی لال پری کے جیا میں ہمارے دل کے اندر اب صرف وہی نظم اتر سکتی ہے جو تخیل کے اندر لپٹی اور بسی ہوئی ہو۔ بعینہٖ یہی حال حالی کی شاعری کا ہے۔ اب جبکہ متعدد شعراء نے ان سے زیادہ کامیابی کے ساتھ اخلاقی شاعری کے اس دشوار گزار مرحلہ کو طے کر لیا ہے۔ ایک مرتبہ ہم پھر حالی کی شاعری پر اپنی پرانی محویت کو یاد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے پڑھنے سے وہی کیف دل و دماغ پر طاری ہو تو کیسے ممکن ہے؟

دوسری وجہ یہ ہے کہ حالی کی شاعری وقت کی سب سے اہم ضرورت اور مانگ کو پورا کرنے والی تھی۔ غدر کے بعد اپنی محکومی کی حالت اور برادرانِ وطن کو حصولِ تعلیم میں سرگرم دیکھکر ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

مسلمان ایک دم چونک اٹھتے ہیں تو ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

کا نقشہ نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں بھی بعض خدا کے بندے افسردگی اور یاس کی توسیع و اشاعت کو قومی زندگی کے حق میں سم قاتل سمجھکر "تعلیم تعلیم" کی صدا لگاتے اور اس طرح اس کے اندر ہنگامہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس گروہ کے علمبرداروں میں سب سے آگے رہنے والے اور پیش پیش گروہ کے حالی نقیب ہیں جو "وقت کے حکمِ ناطق" کی فرمانبرداری میں ؎

بس اب وقت کا حکمِ ناطق یہی ہے کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے

یہی آج کل اصل فرماندھی ہے اسی میں چھپا سرِ شاہنشہی ہے
ملی ہے یہ طاقت اسی کیمیا کو
کہ کرتی ہے یہ ایک شاہ و گدا کو

یہ نا اتفاقی ہے قوموں سے کھوتی یہ قومی محبت کا ہے بیج بوتی
یہ آپس کے کینے دلوں سے ہے دھوتی یہ دانے ہیں سب لڑی میں پروتی
یہ لفظوں پہ خط کی طرح ہے گذرتی
کروڑوں دلوں کو ہے یہ ایک کرتی

جہاں یہ نہیں وہاں قوم اور نہ ملت نہ ملکی حمایت نہ قومی حمیت
جدا سب کے رنج اور جدا سب کی راحت الگ سب کی عزت الگ سب کی ذلت
خبر یہ نہیں وہاں کہ ہے قوم شئے کیا
چھپا سرِ حق اس تعلق میں ہے کیا

جنہوں نے نہ تعلیم کی قدر و قیمت نہ جانی۔ مسلط ہوئی ان پہ ذلت
ملوک اور سلاطیں نے کھوئی حکومت گھرانوں پہ چھائی امیروں کے نکبت
رہے خاندانی نہ عزت کے قابل
ہوئے سارے دعوے شرافت کے باطل

یہ ہیں ترکِ تعلیم کی سب سزائیں وہ کاش اب بھی غفلت سے بازآئیں
مبادا رہِ عافیت پھر نہ پائیں کہ ہیں بے پناہ آنے والی بلائیں
ہوا بڑھتی جاتی سرِ رہ گذر ہے
چراغوں کو فانوس بن اب خطر ہے

بس اب علم و فن کے وہ پھیلاؤ ساماں کہ نسلیں تمہاری بنیں جن سے انساں
غریبوں کو راہِ ترقی ہو آساں امیروں میں ہو نورِ تعلیم تاباں
کوئی اُن میں دُنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتیٔ دین و ملت کو تھامے

علم کی دیوی "سرسوتی" کا پجاری بنکر نکلتا ہے۔ تعلیم جدید کی تحریک کی کامیابی کا یہ ثمرہ ہے کہ

حالی کی مسدس اور نظمیں حامیانِ تعلیم کی زبانوں پر۔ جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں پڑھی ہوئی ہیں جو اپنے خطبات اور تقریروں کو رنگین یا موثر بنانے کے لئے ان کو سناتے پھرتے ہیں۔ چونکہ یہ ہنگامہ تعلیم زور و شور کے ساتھ اور ایسے زور و شور کے ساتھ جس کی مثال ہندوستان کی گذشتہ تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ کامل نصف صدی تک گرم رہا ہے جس کے دوران میں حالی کی یہ نظمیں مختلف پلیٹ فارم پر مختلف زبانوں کے ذریعہ اتنی کثرت کے ساتھ دہرائی گئی ہیں کہ شاید ہی آج تک کوئی نظم اس کا مقابلہ کر سکے۔ علماء و واعظین کا طبقہ جو سرسید اور حالی کی تحریک تعلیم جدید کا مخالف رہا ہے اس نے بھی اس شہرت میں حصہ لیا ہے، ان کی مسدس کے نعتیہ اشعار وغیرہ کو گرمی محفل کے لئے خوب گا گا کر سنایا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر مسلمان حالی سے واقف اور انکی شاعری کا مداح نظر آتا ہے اور چونکہ ابھی تک ایک بہت بڑا گروہ اس ہنگامہ کے تماشہ گروں یا تماشائیوں کا موجود ہے اس لئے حالی کی شاعری کا طلسم ٹوٹنے نہیں پایا۔ تعلیم جدید کی طرف سے بیزاری اور دیگر سیاسی، مذہبی اور معاشرتی تحریکوں اور مسائل کی طرف دلچسپی بڑھتی جارہی ہے اس لئے وقت قریب ہے کہ یہ اشعار اور نظمیں اپنی ہنگامہ آفریں زندگی کے لئے خاموش اور پرسکون گوشہ تلاش کرلینگی ع جان بیٹا خلافت پہ دیدو۔ اور ع چل میرے چرخے چوں کا حشر ہمارے سامنے ہے

غور تو کیجئے؟ کیسے ممکن ہے کہ ایک غم انگیز پچھلی رات کو جو بہروپیوں کا راگ اور پرسوز نالہ دن کو بھاگیا تھا وہ جد و جہد کی دوپہر میں بھی سہانا معلوم ہو؟

تیسری وجہ یہ ہے کہ حالی کی شاعری کو ہمارے علیگڈھ کے قابل قدر تعلیم یافتہ بھائیوں نے اچھالا۔ یہ ان کی سادہ مندی کی دلیل ہے۔ حالی نے علی گڈھ کی تحریک کو جس طرح اسٹیم بن کر چلایا تھا اس کا نتیجہ یہ ہونا تھا کہ وہاں کی تعلیم یافتہ پود میں ان کی قدر و منزلت کا خیال جڑ پکڑ جاتا وہ اس عظمت و بزرگی کی عینک لگا کر ان کے اس کلام کو پڑھتے ہیں جو ان کے عزیز مادرِ کالج کے متعلق والہانہ انداز میں لکھا گیا اور جس میں تعریف و ثنا کے پل باندھے گئے ہیں تو ان پر عجیب اثر ہوتا ہے ایک طرف جذبۂ شکر گزاری بیدار ہوتا اور دوسری طرف اپنے محسن کے کلام میں اور اس کلام میں جو سراسر شعریت سے خالی ہے ان کو عجیب عجیب خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں جس طرح کہ آج غالب کے مداحوں اور طرفداروں کو اس کی ابتدائی زندگی کے غیر مطبوعہ اشعار میں جن کو خود غالب نے قلمزد کر دیا تھا ایک عالمِ شاعری نظر آتا ہے۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بے تکلف تحریر اور تقریر میں

حالی کے یاد کئے ہوئے اشعار استعمال کرتے اور رسائل و اخبارات میں ان کی اخلاقی شاعری کے اثرات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے۔ رائی کو پہاڑ بناتے ہیں۔ اور چونکہ گذشتہ سالوں میں علیگڈھ اور وہاں کا تعلیم یافتہ گروہ علمی اور سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کا رہنما رہا ہے اس لئے اس خیال کے دلوں میں جاگزیں کر دینے میں بڑی آسانی سے کامیابی حاصل ہوئی ہے اور آج بدقسمتی سے اس عام مرغوبیت اور رجال پرستی (ہیرو ورشپ) کے خلاف کوئی آواز بلند کرتا ہے تو چونکہ وہ عام عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس لئے گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے۔

مجھے معاف رکھا جائے اگر یہ کہوں کہ اس غلط خیال کے پھیلانے میں اس لئے بھی کامیابی حاصل ہوئی کہ پبلک بے انتہا رجال پرست واقع ہوئی ہے۔ مذہبی مسائل میں تقلید کی ضرورت کے یہ معنی نہیں کہ ادبی معاملات میں بھی ہمیشہ تقلید کا جوا گردن میں پڑا رہے۔ حالی نے قوم پر احسان کیا اور اپنے پرسوز نالوں سے دلوں کو تڑپا دیا ہے تو آپ کو اختیار حاصل ہے کہ آپ ان کو قوم کا محسن اور مرثیہ گو کہیں جسکے ہم بھی کہتے ہیں کہ وہ بجا طور پر مستحق ہیں لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ آپ دنیا بھر کی فضیلتوں اور کمالات ادبی کا طرہ ان کے سر سجائیں اور اگر کوئی ان کی اخلاقی شاعری کو ذوق صحیح کی میزان میں رکھکر تولنا چاہے تو آپ اس کا ہاتھ پکڑ لیں۔

آیئے اس کے بعد ذرا حالی کی اخلاقی شاعری پر نظر ڈالیں۔

حالی سے پہلے غزل اردو و فارسی شاعری میں زیادہ تر داخلی شاعری کے لئے مخصوص سمجھی گئی اور عشق و محبت کے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنی رہی ہے۔ کہیں کہیں اس میں شک نہیں کہ شعرا نے فلسفیانہ، صوفیانہ اور اخلاقی مسائل کو بیشتر تو ع پردہ پردہ میں جو ظاہر ہو وہ حال اچھا ہے پر عمل کرکے رمز و کنایہ، استعارہ اور مجاز میں اور کم تر صاف صاف بیان کیا ہے۔ حالی نے اُردو شعراء کا حال دیکھکر کہ انہوں نے اخلاقی مسائل کا بیان کرنا بالکل ترک کر دیا ہے اس کی تلافی یوں کرنی چاہیئے کہ غزل کو مطلع سے لے کر مقطع تک اخلاقی مسائل کی صدہا جزئیات سے بھر دیا۔ اور اس امر کا بالکل خیال نہ رکھا کہ اس سے غزل کی لطافت اور شیرینی میں فرق آجائیگا۔ اس شربت میں پانی اتنا ملانا چاہیئے کہ پھیکا نہ ہونے پائے۔ مگر اس کے برخلاف وہ عمل کرتے ہیں جس کی وجہ سے "غزل کا اسٹائل بالکل بدل گیا" ؎

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر
جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر
دوست اس کے ہیں جو اسکے آشنا گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر

اور اس ذریعہ کو کھو کر جو قوم میں جوشِ عمل پیدا کرنے کا سب سے کامیاب آلہ ہے اپنے پیروں پہ آپ کلہاڑی ماریں، ہم کو ابھی ابھرنے اور جد وجہد کرنے کی ضرورت ہے ہم جب تک "مصاف زندگی میں سیرت فولاد" نہ پیدا کرینگے "شبستانِ محبت میں حریر و پرنیان ہونے" کا خیال سودائے خام ہے، یورپ جو آج "آرٹ کو آرٹ کی نظر سے جانچنا چاہیے" یا "حسن و خوبصورتی اور شعریت کو بذاتہا مقصود بنانا چاہیے" کا نعرہ لگا رہا ہے۔ اپنی موجودہ پرسکون و روحانی زندگی کو پہنچنے کے بعد اس کا قائل ہوا ہے ورنہ وہ بھی کسی زمانہ میں ہماری طرح جیسا کہ انگریزی زبان کے مشہور شاعر و نقاد میتھو آرنلڈ نے لکھا ہے۔

"شاعری تہ میں زندگی کی ایک تنقید ہے اور کسی شاعر کی عظمت کا مدار اس امر پر ہے کہ وہ کس طرح قوی اور خوبصورت پیرایہ میں حیات پر خیالات کی روشنی ڈالتا اور اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ زندگی کس طرح بسر کیجائے، جو شاعری اخلاقی خیالات سے بغاوت کرتی ہے وہ زندگی سے بغاوت کرتی ہے جو شاعری اخلاقی خیالات سے بے اعتنائی برتتی ہے وہ زندگی سے بے اعتنائی برتتی ہے۔"

اس امر کا قائل تھا کہ اخلاق کو شاعری کی سرحد سے دُور پار نہیں سمجھنا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ خیالات یورپ کی تباہی کے باعث ہیں۔ فنون لطیفہ کی کثرت، اسکی طرف میلان اور اس کی پیداوار قوموں کے زوال کی جیسا کہ لیبان نے اپنی مشہور کتاب "انقلاب الامم" میں ثابت کیا ہے علامتیں ہوتی ہیں۔ قومیں جب اپنی انتہائی رفعت و عروج پر پہنچ جاتی ہیں اور دولت و ثروت کی فراوانی ہو جاتی ہے تو وہ عیش و عشرت کی دلدادہ ہو جاتی ہیں اور داد نشاط دینے کے لئے جہاں مختلف طریقے ڈھونڈ نکالتی ہیں وہاں فنون لطیفہ کی پناہ بھی ڈھونڈھنے لگتی ہیں، ہر طرف فنون لطیفہ کا خیال کثرت کے ساتھ پھیل جاتا ہے۔ رات دن اس دھن میں مستعدی و محنت اور چستی اور چالاکی رخصت ہو جاتی ہیں اور قوم کے قوائے عمل سست پڑ کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر کوئی نوزائیدہ قوم اس کو دبوچ لیتی اور اس کی آزادی کو سلب کر کے اس کے تہذیب و تمدن کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکدیتی ہے۔ یہی حال روما، یونان اور کسریٰ کی سلطنتوں کا ہوا، گذشتہ صدی میں ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتوں کا ہوا اور آج دنیا کے ہر گوشہ میں مسلمانوں کا نظر آتا ہے پلاسیو والڈس لکھتا ہے۔

"ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ فنون لطیفہ کی پیدائش کی طرف اسی وقت توجہ کیجاتی ہے جب وہاں خوش حالی عام ہو جاتی ہے اور اس ملک کے باشندے

اپنی تمام مخالفانہ قوتوں پر غلبہ پاکر زندگی باطمینان گزارنی شروع کردیتے ہیں۔[1]

قصہ مختصر "اخلاق" کو شاعری کے اندر "اچھوت" سمجھنے کی ضرورت نہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ "میتھو آرنلڈ کی زبان میں" شاعر کی عظمت کا مدار اس امر پر ہے کہ وہ کس طرح اور خوبصورت پیرایہ میں حیات پر خیالات کی روشنی ڈالتا اور اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ زندگی کس طرح بسر کیجائے اور اگر بدقسمتی سے "قوی اور خوبصورت پیرایہ" کے اختیار کرنے میں پیروں کو لغزش ہوجائے تو پھر ناکامی کی خندق کا منہ کھلا ہوا ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح حالی جو "حیاتِ سعدی" کی تصنیف کے بعد سے بہت زیادہ سعدی کی اخلاقی شاعری کی نوعیت سے واقف ہوچکے تھے۔ اس قدر حقیقی راہ سے بھٹک گئے ہیں، ان کے لئے سعدی کا کلام مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی طرح نمونہ کا کام دے سکتا تھا اور وہ زیادہ کامیابی کے ساتھ اخلاقی شاعری کے ذریعہ لٹریچر میں کسی مفید عنصر کا اضافہ کرسکتے تھے۔

ہم جب ان کے دیوان میں اس قسم کی بے مزہ اور طویل غزلوں کو پڑھتے ہیں ؎

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ — مبادا کہ ہوجائے نفرت زیادہ
تکلف علامت ہے بیگانگی کی — نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ
کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت — جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ
نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے — نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ
کرو علم سے اکتساب شرافت — نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ
فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو — اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے — نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ
مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا — مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ
کرو ذکر کم اپنی داد و دہش کا — مبادا کہ ہوجائے خست زیادہ
پھراوروں کی تکتے پھرو گے سخاوت — بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ
کہیں دوست تم سے نہ ہوجائیں دشمن — جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ

---

[1] مقدمہ دی انٹرنیشنل لائبریری آف فیمس لٹریچر جلد ۲۰ صفحہ (۱۲) بحوالہ "دنیائے ادب": مولفہ سٹر عبدالقادر ایم اے ایل ایل۔ بی (شمالیہ)

جو جا ہو فقیری میں عزت سے رہنا — نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ
وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا — جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ
نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے — خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ
ہے وحشت بھی الفت بھی دنیا سے لازم — نہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
یکے مفت ہم یاں زانے کے ہاتھوں — جو دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ
ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر — نہیں بس اے عقل مہلت زیادہ
غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی — الا بس نہ بس آپ دھرپت زیادہ

تو کوئی شبہ نہیں کہ بعض بعض لطیف شعر بھی نظر آجاتے ہیں، لیکن عام طور پر یہ خیال ہمارے دماغ پر اخلاقی مسائل کی ان جزئیات کی تفصیل کو دیکھکر مرتسم ہوجاتا ہے کہ مولنا شاید "اخلاقِ جلالی" و "اخلاقِ محسنی" کا نظم میں خلاصہ فرمارہے ہیں ایک اور غزل ملاحظہ ہو ؎

تمہیں خود پرستو طبیعت کے بندو! — ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کاتم کو اندازہ ہر گز — جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس ادھر کے
جو مجرے میں بیٹھو تو اٹھو نہ جبتک — کہ اٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کرکے
اگر پل پڑے چوسر اور گنجفہ پر — تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے
پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو — تو بس ٹھن گئے عزم جنگ تتر کے
چڑھا بھوت عشق وجوانی کا سر پر — تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
جو ہے تمکو کھانے کا چسکا تو سمجھو — تو چھوڑینگے بس آپ دوزخ کو بھر کے
جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی — رہیں پاؤں کے ہوش جس میں نہ سر کے
جو کھانا تو بیحد جو پینا تو ات گت — غرض یہ کہ سرکار میں پیٹ بھر کے

علی الخصوص ان اشعار کو پڑھ کر تو ؎

کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب — کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر
نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے — خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ
جو ہے تمکو کھانے کا چسکا تو سمجھو — تو چھوڑینگے بس آپ دوزخ کو بھر کے

جو کھانا تو بیحد جو بینا تو ات گت غرض یہ کہ سرکار میں پیٹ بھر کے

دماغ یہ سمجھنے سے عاجز رہ جاتا ہے کہ ان اشعار میں شاعرانہ اور ادبی غرض نہ سہی کیا اخلاقی غرض پنہاں ہے۔ غور کیجئے کہ کیا اسی قبیل کے اشعار کا مقصد جن سے ان کا دیوان بھرا پڑا ہے اخلاقی شاعری ہے؟ سچ کہا تھا ایک انشاء پرداز نے کہ

"حالی اس وقت تک شاعر تھے جب کہ انھوں نے یہ شعر کہا تھا کہ ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

سچ پوچھئے تو اس قسم کی شاعری اخلاقی شاعری نہیں بلکہ بناتلا وعظ ہے جو ادنیٰ درجہ کے پیشہ ور واعظین کے ممکن ہے کام آتا ہو۔

شاید آپ کو ان کے قطعات اور ترکیب بندوں سے جہاں ان کو زیادہ آزاد فضا میسر آئی تھی کسی قسم کی کوئی امید ہو۔ اس کا نمونہ بھی دیکھ لیجئے، روسائے عہد کی فیاضی پر ایک قطعہ لکھا ہے ؎

کی رئیس شہر کی تعریف یاروں نے بہت برسبیلِ تذکرہ باہم جو ذکر اس کا چلا
بولے آج اس کا نہیں مہماں نوازی میں نظیر عالمانِ شہر مدعو رہتے ہیں اسکے سدا
ضلع کے حکام کا ادنیٰ اشارہ چاہیئے پھر کوئی دیکھے سخاوت اسکی اور بذل و عطا
یادگاریں جتنی ہیں اعیانِ دولت کی نہیں ان میں صرف اسکی رقم ہے سب کے چندے سے سوا
پالکی یا ٹوبگیٹ ہے جو سواری اسکے پاس اہلِ کاروں کے لئے ہے وقف بیچون و چرا
کیا کلکٹر، کیا کمشنر، کیا سپاہی کیا عسس اس کی ہمت کے ہیں سب مداح بے رو و ریا
جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام جوڑ کر ہاتھ ان سے حالی نے بصد منت کہا
عیب بھی اس کا کوئی آخر کرو یارو بیاں سنتے سنتے خوبیاں جی اپنا متلانے لگا

اگر اس نظم کا مقصد کسی رئیس کی ہجو جس نے علیگڈھ کالج کے لئے چندہ نہ دیا ہو مقصود تھی تو وہ بلاشبہ حاصل ہو گئی اور اگر کوئی ادبی غرض تھی تو افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ وہ حاصل نہ ہو سکی۔

یہ اُن کی غزلوں اور اخلاقی شاعری کا عام رنگ ہے لیکن خال خال ان کے دیوان میں کامیاب غزلیں بھی نظر آتی ہیں جن کا نمونہ یہ ہے ؎

کاٹئے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح — جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
منزلِ دنیا میں ہیں آٹھوں پہر بادر رکاب — رہتے ہیں مہماں سرا میں مہمانوں کی طرح
سعی سے اُکتاتے اور محنت سے کتراتے نہیں — جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو قرباں روا — نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح
شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں — غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا — رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح
پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی — پر بھلا تکتے ہیں اک اک کا یگانوں کی طرح
آس کھیتی کے پنپنے کی انہیں ہو یا نہ ہو — ہے اسے پانی دیے جاتے کسانوں کی طرح
ان کے غصہ میں ہے دلسوزی ملامت میں ہے پیار — مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح
کام سے کام اپنے انکو گو ہو عالم نکتہ چیں — رہتے ہیں تسلیں دانتوں میں زبانوں کی طرح
طعن سن سن احمقوں کے اس طرح دیوانہ وار — دن بسر کرتے ہیں دیوانوں نیاسیانوں کی طرح
کیجے کیا حالی نہ کیجے سادگی کر اختیار — بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

کاش وہ اپنی تمام غزلوں اور اخلاقی نظموں میں "جب رنگیں بیانیوں کی طرح بولنا نہ آئے" کم از کم اسی قسم کی سادگی اختیار کرتے! بہر حال اس قسم کی چند گنتی کی غزلوں کو مستثنےٰ کر دیجیے تو ان کے بقیہ کلام کے متعلق خود اُن کے قول کی تصدیق کرنی پڑتی ہے۔ ؎

کیجے کیا حالی نہ کیجے سادگی کر اختیار — بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

میں نے مسلسل کئی دن تک اس عقدہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیوں اخلاقی شاعری میں حالی کا درجہ اس قدر گرا ہوا ہے حالانکہ ان کا طرزِ تحریر نثر میں تمام پرانے انشاء پردازوں یعنی ان کے ہم عصروں میں سب سے زیادہ بانکا اور البیلا ہے اور انکی غزلوں میں وہ درد و اثر اور سوز و گداز ہے جو میر کی غزلوں کا امتیازی خاصہ سمجھا جاتا ہے۔ ایسے شخص کی اخلاقی شاعری جس کی نظم میں ایسا پریم اور بانکپن ہو اس کی کیا وجہ ہے کہ؟ اس قدر ادنیٰ درجہ کی ہے تو پتہ چلا کہ یہ رنگ انکی افتادِ طبیعت کے بالکل خلاف ہے جیسا کہ ایک قطعہ میں کہتے ہیں ؎

ناصح مشفق ہیں یاروں کے نہ مصلح اور رفیق — دردمندان کے نہ انکے درد کے درماں ہیں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں تماشہ اس چمن کا دیکھکر — نالۂ بے اختیار ہیں بلبلِ نالاں ہیں ہم

زمانہ کی ضرورتوں اور ناصحوں کی نصیحتوں کو پیشِ نظر رکھکر مجبوراً ان کو "ناصح مشفق" بھی بننا پڑا اور "مصلح و فقیہ بھی" "دردمند" بھی بننا پڑا اور "درد کے درمان" بھی اس بناء پر ان کی اخلاقی شاعری سراسر آورد ہے۔ مولٰنا زندہ ہوتے تو دست بستہ نہایت ادب کے ساتھ ان کی جناب میں عرض کرتا کہ آورد کو ڈھکوسلا اور خیالی بات ثابت کرنیکی "مقدمہ" میں آپ نے جو کوشش کی ہے اُس میں اس فدوی کو کلام ہے اور ثبوت میں ان کی اخلاقی شاعری کو پیش کرتا۔ وہ چونکہ وسیع الخیال اور نیک آدمی تھے اس لئے اپنی مخالفت سے کبھی رنجیدہ نہ ہوتے۔

اس خیال کا مزید ثبوت اس طرح مل سکتا ہے کہ آپ ان کے قدیم کلام اور غزلوں کو پڑھیئے معلوم ہوگا کہ اخلاق کا عنصر اس میں ـــــ آٹے میں بھی کم ہے۔ پرانے شعراء نے اخلاقی شاعری کو مستقل عنوان نہیں قرار دیا لیکن جگہ جگہ پر وہ اخلاقی نکات بیان کر جاتے ہیں۔ حالی کو اس کوچہ سے دامن کشاں دیکھکر حکم لگانا پڑتا ہے کہ وہ فطری طور پر اُن اخلاقی مسائل سے اپنی فطرت کو کوئی لگاؤ نہ دیکھتے تھے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ انکی اخلاقی شاعری کا وہ حصہ بھی جہاں "سعدی" کے رنگ میں قصوں اور لطیفوں کے ذریعہ کوئی اخلاقی سبق دینا چاہتے ہیں اگرچہ کہ یہ حصہ بھی کچھ زیادہ نہیں ہے خشک ـــــ ہوجاتا ہے؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ براہ راست ارشاد و ہدایت شروع کر دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اخلاق کے سبق پڑھانے کا یہ طریقہ شاعرانہ نہیں ہوسکتا۔ یہ طریقہ تعلیم بچے واعظوں اور پنڈتوں کے لئے زیبا ہے خود کہتے ہیں۔

"ناصح کی غرض براہِ راست ارشاد و ہدایت ہوتی ہے بخلاف شاعر کے اصلی مقصود فطرتِ انسانی کی کریدہے اور واقعاتِ دہر سے متاثر ہوکر دل کی بھڑاس نکالنی ہے اور بس"۔

براہِ راست ارشاد و ہدایت سے اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر انانیت کا جذبہ ابھر آتا ہے اس لئے ایسی تعلیم و تلقین بجائے مفید ہونے کے نقصان پہنچاتی اور طبیعت میں ضد اور ہٹ پیدا کرتی ہے اسلئے فطرتِ انسانی کے رمز شناسوں کا یہ دستور ہے کہ وہ نصیحت براہِ راست کرنیکے بجائے ہمیشہ رمز و کنایہ اور قصوں اور چٹکلوں کے پیرایہ میں بیان کرتے اور لوگوں کی اصلاح کرنیکے علاوہ اپنی کامیابی کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی اور زیادہ تر اکبر مرحوم۔ ہم دوسری جگہ پر تفصیل سے بحث کرینگے ـــــ اس طرز کے پیرو ہیں۔ حالی نے اس موثر حربہ سے بہت کم کام لیا ہے اور جہاں کام لیا ہے وہاں بھی اپنی فطری ناموزونیت کی بناء پر پوری طرح کامیاب نہ ہوسکے۔ خود کہتے ہیں "بعض قطعات و رباعیات میں اخلاقی مضامین کنایہ میں ادا کئے گئے جو شاید کہیں کہیں معاملہ کی حد کو پہنچ گئے ہوں مگر انوری و سعدی و شفائی کے

مطائبات کے آگے یقیناً بے نمک معلوم ہونگے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی تعلیم کے لئے خصوصاً اخلاقی تعلیم کے معمولی مسائل کے لئے اس سے زیادہ بہتر اور موثر کوئی اور ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ آج سعدی علیہ الرحمۃ کی کامیابی کا سارا دارو مدار اسی پر ہے اس طرز کے اختیار کرنے سے ان کے کلام کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان کے بیسیوں اشعار اور مصرعے زبان زد ہو کر ضرب الامثال کا درجہ حاصل کر چکے اور فارسی اور اردو لٹریچر کا غیر منفک جز بن گئے ہیں لیکن اس کے برخلاف حالی کے اشعار دیوان کی زیب و زینت یا مجمع کو بڑھانے کا کام دیتے ہیں حالی کے اخلاقی اشعار میں کروڑ میں سے زیادہ ایسے اشعار نہیں پیش کئے جا سکتے جو آج لوگوں کی نوک زبان ہوں اور ضرب الامثال کا مرتبہ رکھتے ہوں۔

ضرب الامثال کا یہ ظاہر ہے کہ وہی اقوال و اشعار درجہ حاصل کر لیتے ہیں جن میں زندگی کے اہم اصول اور صداقتوں کو نہایت جامع و مانع الفاظ میں خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اسی سے حالی کی اخلاقی شاعری کی ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت ملتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ اخلاقی مضامین کو ظرافت کے پیرایہ میں بیان کرنے کی کوشش نہیں کرتے جو فروعات کے اظہار کے لئے سب سے کامیاب ذریعہ ہے جیسا کہ اکبر الہ آبادی کا طریقہ ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ حالی نے ان مسائل اخلاق کے بیان کے لئے جو زبان استعمال کی ہے وہ اس کے لئے سخت ناموزوں ہے۔ سلیس، شیریں اور لچدار زبان شاید عاشقانہ جذبات قلبی وارادت اور رونے رلانے کے لئے نہایت مفید ثابت ہو۔ علوم پر اوعا، زور اور طنطنہ کا زیادہ اثر ہوتا ہے نفسیات کا اصول ہے کہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے اور کسی رائے پر چلانے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں مرعوب کیا جائے بہت سے ایسے الفاظ ممکن ہے کہ ان کی تعریف میں کسی کی زبان سے "سلاست پسند" "صاف گو" کے خطابات دلا دیں لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس سے بھی قطع نظر کر کے دیکھئے اخلاقیات (ETHICS) ہر شخص جانتا ہے کہ فلسفہ کی ایک شاخ ہے دنیا کی ہر زبان میں فلسفہ کے بیان کرنے کے لئے مخصوص زبان، ترکیب اور بندشیں استعمال کی جاتی ہیں، نثر میں بھی اور نظم میں بھی کیونکہ اس کے دقیق اور پیچیدہ مسائل کے لئے زبان میں جو اظہار خیالات کا ذریعہ ہے" مخصوص شان کا پیدا ہو جانا یقینی ہے اور جو لوگ اس طرز بیان کو چھوڑ سادہ زبان میں ان معانی و مطالب کو سمونے کی کوشش کرتے ہیں وہ ان معانی و مطالب کی پوری روح کو بیان نہیں کر سکتے، کسی دیکھی رخ اور پہلو کا نظر انداز ہو جانا ضروری ہے اس بناء پر ان فنون کے لئے لامحالہ

مخصوص زبان استعمال کرنی پڑتی ہے نظم میں تو اس کا خاص طور پر التزام کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ بقول سوفٹ (S.W.F.T) موزوں الفاظ کا موزوں طریقہ سے استعمال کرنا نظم ہے"

دنیا کے تمام اخلاقی شاعری کے علمبرداروں نے یہی طرز بیان اختیار کیا ہے۔ براؤننگ کو پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ کس طرح مخصوص تراکیب اور غریب بندشوں کے دامن میں اپنے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لئے پناہ گیر ہونا پڑتا ہے۔ انگریزی کو چھوڑیئے غالب کو لیجئے جس کی فلسفہ دانی کے آج آپ قائل ہیں اس کا طرز بیان کس قدر پیچیدہ اور معلق ہے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

کے بجائے میں یہی عذر پیش کیا جاتا ہے کہ معمولی الفاظ و تراکیب ان نازک معانی کی متحمل نہیں ہو سکتیں کیا شاندار موضوع کے لئے شاندار اسالیب کی ضرورت سے انکار کیا جا سکتا ہے ؟

بہرحال اخلاقی مسائل کے لئے ضروری ہے کہ شاندار اور مخصوص طرز بیان اختیار کیا جائے اقبال نے اس رمز کو سمجھا اور اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے جیب و دامن کو گل ہائے آرزو سے بھر لیا ہے۔ ہم اقبال کے ضمن میں اس پر سیر حاصل بحث کرینگے۔ مولانا حالی ایسا نہیں کرتے اور وہ مجبور بھی تھے۔ یہ مخصوص طرز بیان اخلاقی شاعری کے اندر اس وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ کائنات کے متعلق کسی گہرے قانون قدرت کا اظہار یا زندگی کے کسی مہتم بالشان اصول کو تعبیر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ تمام مسائل اخلاق اور اسکی جزئیات کے لئے یہی معمولی طرز ادا کافی ہے لیکن یاد رکھئے کہ شاعری کو اخلاقی مسائل کی جزئیات اور فروعات سے آلودہ نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی شاعری کو جو لوگ شاعری کا جزو سمجھتے ہیں ان کے نزدیک بھی سچ بولنا اچھا ہے، جھوٹ بولنا برا ہے، تکلف بیگانگی کی علامت ہے اس قسم کی تعلیم فرخرفات سمجھی جاتی ہے شاعر کو آزادی حاصل ہے کہ وہ تمام دنیا کی باتوں کو بیان کرے اس کے لئے کسی قسم کی رکاوٹ اور قید نہیں ہے، ہر جگہ پھرے اور ہر بات بیان کرے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ شاعر باقی رہے ان جزئیات اور اخلاقی مسائل کی فروعات میں شاعر شاعر باقی نہیں رہ سکتا اور شاعری ہیچ ہو کر کوئی اور شئے ہو جاتی ہے شاعری ایک ملکوتی اور لاثانی شئے ہے اسکو اخلاقی مسائل کی یہ بحثیں برباد کر دیتی اور فانی بنا دیتی ہیں جو لوگ اخلاقی شاعری کا یہ مفہوم سمجھے ہوئے نہیں ہیں ان کو شاعری پر رحم کرنا چاہیئے وہ غلطی پر ہیں مناسب ہوگا کہ ان "مسائل مہمہ" سے جہاں قافیہ و ردیف کی عدم پابندی کے سبب ان کو زیادہ آزاد فضا مہیا ہو سکتی ہے نثر ہی کو نوازیں یہ پانچویں وجہ ہے ناکامی کی۔

چھٹی اور آخری وجہ یہ ہے کہ ان کی اخلاقی شاعری دفع الوقتی تھی۔ انہوں نے کبھی بھی اپنی اس

لیکر انتہائی تنقیح و تہذیب تک بہت سے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں جو کہ اب سامعین کو شاذ محسوس ہوں لیکن شاعر کو ضرور پیش آتے ہیں" کیا حالی اس اصول سے مستثنیٰ ہیں؟ یہ ہیں وہ اسباب جنہوں نے مل جُل کر حالی کی اخلاقی شاعری کی ناکامی میں حصہ لیا ہے پس اگر اس سے پہلے حالی کی اخلاقی شاعری کی تعریف کے پل باندھے گئے تھے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ اعلیٰ درجہ کی لذیذ مٹھائیوں کا عادی ہمارا کسی دسترخوان پر جوار کی روٹی تو تنوع پسندی بھوکے پیٹ ان کی خاطر پسند کرنے ایک روز کھالے اور تعریف کرے اس سے یہ امید رکھنا کہ جوار کی روٹی کو وہ روز روز مزے لیکر کھائیگا اسکے اخلاق سے بیجا فائدہ اٹھانا ہے ہم میٹھی غذائیں کھاتے کھاتے یعنی عاشقانہ شاعری سنتے سنتے اکتا چلے تھے حالی نے ایسے عالم میں ہمارے سامنے جوار کی روٹی یعنی اپنی روکھی پھیکی شاعری رکھدی وہی اچھی معلوم ہوئی کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم اب بھی اسی کو زہر مار کریں؟ منظور ہے لیکن تعریف کی امید تکلیف مالایطاق ہے۔

اب گذشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ پڑھ آئے ہیں کہ کس طرح حالی قومی شاعری کے اس حصہ کے سوا جس میں قوم کی تباہی اور بربادی کا دُکھڑا رویا ہے اپنی جدید شاعری میں ناکامیاب رہ چکے ہیں اور آنیوالے شعراء کے لئے اصلاح و تجدید کا راستہ صاف کرنے کے علاوہ انہوں نے اپنی شہرت اور قدر و منزلت کے لئے بہت کم سرمایہ چھوڑا ہے۔ میں اس بنا پر اپنی اس رائے کو ڈرتے ڈرتے ظاہر کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ حالی نے اپنی شاعری سے لٹریچر کو کوئی معتدبہ فائدہ نہیں پہنچایا اور ان کا نام چوٹی کے شاعر کی حیثیت سے جدید شاعری میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ دادیلا مچانے سے پہلے اس امر کو یاد کرنیکی ضرورت ہے کہ میں نے خود ان کو اس حیثیت سے "زندہ جاوید" کہا ہے کہ انہیں سے جدید شاعری کا آفتاب طلوع ہوتا ہے اور جب کبھی اردو شاعری کے نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کی تاریخ لکھی جائیگی حالی کا ذکر شاندار الفاظ میں کرنا پڑیگا مگر اس انقلابی شاعری کے لئے جیسے دل و دماغ تعلیم و تربیت کے آدمی کی ضرورت تھی۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ وہ اس کے ناقابل تھے اگرچیکہ آج تک ان کو اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں شخص سمجھا گیا ہے اور اس خیال کی خوب تبلیغ کی گئی ہے اس لئے مجھے شعرالہند میں یہ غلط الفاظ پڑھکر کوئی تعجب نہیں ہوا کہ "یہ اصلاح صرف وہی شخص کرسکتا تھا جو قدیم و جدید خیالات سے واقف ہو اور خوش قسمتی سے دورِ جدید نے جو مصلح پیدا کئے ان میں مولنا حالی کو یہ شرف حاصل ہوا"[1]۔ اگر شعرالہند کے مؤلف کے ہاں ان کے جدید خیالات سے واقفیت کا کوئی ثبوت موجود ہے تو بڑا احسان ہوگا کہ وہ اس کو پبلک طور پر ظاہر کردیں۔ ان کی زندگی کے واقعات سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ علیگڈھ کے قیام کے زمانے میں شعر و شاعری کے متعلق تراجم کے ذریعہ بعض خیالات سے باخبر ہوگئے تھے اتنی سی واقفیت کسی طرح ان کے لئے رہنمائی کا کام نہ دے سکتی تھی۔

---

[1] شعرالہند جلد اول صفحہ ۳۶۰۔

اس انقلابی تحریک کی کامیابی کے لئے اصل میں ایک ایسے دل و دماغ کی ضرورت تھی جو انگریزی خیالات سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ پرانے مشرقی اصولوں سے بھی واقف ہو، شاعرانہ اپج رکھتا ہو اور عاشقانہ شاعری کے کوچہ کا پرانا پاپی نہیں نیا یارہ نورد ہو تاکہ اس کی شاعرانہ قوت کے اندر ایک خاص قسم کا رجحان غالب نہ آجائے حالی پہلے تو انگریزی شاعری سے کاحقہ واقف نہ تھے دوسرے عاشقانہ شاعری کے دشت کی سیاحی میں تین چار نہیں مگر تین دہائیوں سے زیادہ گذر چکے تھے اس لئے غزل کا رنگ طبیعت میں راسخ ہو چکا تھا اور آفتاب عمر کے ساتھ ساتھ آفتاب شاعری کا بھی زوال شروع ہو گیا تھا! ایسے عالم میں وہ اصلاح کا مطالبہ کرنیوالوں کے ہم نوا ہو کر نئی قسم کی شاعری کرنی چاہتے ہیں لیکن ع ساتھ سازنگی کا بلبل کے لئے دشوار ہے۔ ان کا قدیم رنگ جگہ جگہ پر نمایاں ہو جاتا اور نئی قسم کی شاعری کو برباد کر دیتا ہے۔

کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حالی کے اس اصلاحی قدم سے اردو شاعری کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچا اگرچہ یہ یقین "عین الیقین" کے درجہ کو طے کر کے "حق الیقین" کے درجہ کو نہیں پہنچا تاہم اس کے متعلق بھی اپنے خیالات کا ازادانہ اظہار مناسب سمجھتا ہوں تاکہ پبلک کو مباحثہ کے ذریعہ اس کی تصدیق یا تصحیح ہو سکے۔

اردو شاعری کی تاریخ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہماری پرانی شاعری ترقی کے تمام مراحل طے کر چکی تھی، دکن کی سرزمین میں شعر و شاعری کی جو شمع روشن ہوتی ہے وہ ولی دکنی کے ذریعہ شمالی ہند کی محفلوں میں جا پہنچتی ہے، ولی اور ان کے ہمعصروں کے سادہ اور بے تکلف اشعار کے بعد فغاں، آبرو، شاکر اور یکرنگ کا دور شروع ہوتا ہے جس کی اہم خصوصیت الہام گوئی ہے۔ بعد کے مصلحین اور شعراء میر، سودا، مصحفی و انشا وغیرہم اس خرابی کو دور کرتے اور حقیقی شاعری کے نمونے پیش کرتے ہیں ان کے بعد کے دور میں غالب فلسفہ و تخیل کو لے بھاگتے ہیں، نظیر اکبر آبادی دیہات میں شہروں کو چھوڑ کر جا بستے ہیں، دبیر و انیس مرثیہ گوئی کو معراج کمال پر پہنچاتے ہیں، لکھنوی شعراء کے جدت پسند طبائع عاشقانہ جذبات اور داخلی شاعری کے متعلق یہ دیکھکر کہ ؎

حریفان باد ہا خوردند و رفتند تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

اپنی جولانی کے لئے نیا میدان تلاش کر لیتی ہیں ان کے بعد داغ آتے ہیں اور ؎

ہنوز آں ابر رحمت درخشاں است خم و خمخانہ با مہر و نشان است

کہتے ہوئے خم و خمخانہ کا مہر توڑ کر اپنی مخصوص شراب کا دور شروع کر دیتے ہیں اب میں پوچھتا ہوں کہ قدیم شاعری کے اندر اب کونسا خم و خمخانہ یا مہر و نشان" باقی رہ گیا تھا جس کو کھول کر بعد کے شعراء بادہ خواروں کو پلا کر مست و سرشار کرتے۔ اندازہ کیجئے گا کہ بعد میں آنے والے جدت پسند اور لوالعزم طبائع اپنے لئے "نئی دنیا" دریافت کر لیتے

یہ قدم ترقی کی راہ میں حقیقی قدم ہوتا اور چونکہ اپنے بل بوتے پر شروع کیا جاتا۔ اس لئے زیادہ مضبوط اور اہم ہوتا آپ کہینگے کہ اس سے اصل اعتراض کو کیا واسطہ؟ اس کا جواب ذرا ٹیڑھا ہے۔

حالی کے رنگ کی کامیابی اور پبلک حوصلہ افزائی نے جہاں ایک طرف ہزاروں تقلید پسند طبائع کو اس راستہ پر چلنے کا خوگر بنا دیا۔ وہاں بعض جدت پسند طبائع کی ہمتیں بھی پست کر دیں"۔ کیونکہ جب صلے اور انعام مستحق اور غیر مستحق دونوں کو برابر ملنے لگے اور تحسین و آفرین کی بوچھاڑ محل اور بے محل ہر درجہ کے شعر پر ہونے لگی تو جو لوگ فی الحقیقت صلہ و تحسین کے مستحق تھے۔ ان کے دل بجھ گئے اور شاعری کی اعلیٰ لیاقتیں جو ان کی طبیعت میں ودیعت تھیں خریداروں کی بے تمیزی کے سبب جیسی چاہیئے ویسی ظاہر نہ ہونے پائیں اور جو مستحق نہ تھے اُن کے دل بڑھے اور ان کو قوم میں اپنی لیاقت پھیلانے اور شاعری پر ظلم کرنے کا موقع ملا[1]" حقیقت میں ہر شخص غالب کا سا دل گردہ تو نہیں لاتا کہ ع ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ کہکر ابنائے زمانہ کی سرد مہری سے بد دل ہوئے بغیر اپنے دل کو تسکین دے۔

شرق کی سرزمین شعراء کے پیدا کرنے میں بڑی مردم خیز ثابت ہوئی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ پھر کیوں گذشتہ نصف صدی میں کوئی باکمال شاعر اس سرزمین سے نہ پیدا ہو سکا۔ اگر حالی و اکبر کا نام لیا جائے تو میں کہونگا وہ انگریزی تعلیم کی پیداوار ہیں۔ مشرقی تعلیم سے جس نے میر و سودا، غالب و مومن، ناسخ و آتش اور انیس و دبیر کو پیدا کیا وہ قوت سلب کر لی گئی ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جو اولوالعزم اور جدت پسند طبائع تھیں وہ اس رنگ کو دیکھکر روپوش ہو گئیں اگر یہ بے وقت کی راگنی نہ شروع ہو جاتی تو ممکن تھا کہ کوئی خدا کا بندہ ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند کے اصول پر آگے بڑھتا اور اردو شاعری کے اندر کوئی نیا اور کامیاب قدم اٹھاتا اب جو قدم اٹھایا گیا ہے۔ آپ پر۔ اس طویل تبصرے سے واضح ہو گیا ہوگا کہ وہ اصل راستہ سے بھٹکا ہوا ہے۔ جی۔ ایچ۔ میر ایک جگہ پوپ (Pope) کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اگر نہ پوپ کو اپنے زمانہ میں اس کے مداح ہماری زبان کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے لیکن اب کوئی اس قسم کی رائے کے اظہار کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا لیکن اس کی شہرت اور عظمت کو ورڈسورتھ اور اس کے ہم عصر رومانی شعراء (Romantics) کے ذریعہ جو دھکا پہنچا اسکی وجہ سے ہم کو نہیں بھلانا چاہیئے کہ باوجودیکہ وہ ہمارا سب سے بڑا شاعر نہیں ہے بلکہ بڑے شاعروں میں بھی نہیں ہے تاہم وہ ہماری زبان کا عدیم المثال اور فقید النظیر کامیاب ناظم ہے[2]"

یہی آخری رائے حالی کے متعلق آئندہ چل کر قائم کرنی پڑیگی۔

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ (۲۰) [2] English Literature Modern by G. H. Mair Page 123

خاقانی

(سوانح حیات تحفۃ العراقین سے)

از آقا میرزا حسین خاں دانش اصفہانی
(مترجمہ جناب محمد محسن خانصاحب متین)

بارہویں صدی عیسوی کے پیشوایانِ ادب میں خاقانی کو جو درجہ حاصل ہوا وہ کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ وہ ایسا بڑا جامع الاضداد اور بلند خیال شاعر تھا جو اپنے ہم عصروں میں یکتا اور میدان بلاغت کا بے نظیر شہسوار مانا جاتا ہے۔ اس کے قصائد شاہانہ طلاقت و طراق رکھتے ہیں اس کی مثنوی "تحفۃ العراقین" اس کی زندگی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔

اس کا اسم گرامی افضل الدین ابراہیم ابن علی شروانی ہے۔ ابتداء میں اس کا تخلص "حقایقی" تھا لیکن۔ کچھ عرصہ کے بعد جب منوچہر شروانشاہ کی طلبی پر وہ اس کے درباری شعراء میں داخل ہوا تو اس نے اپنا تخلص بدل کر "خاقانی" رکھا۔ اس کی ولادت ۵۵۰ھ ہجری (۱۱۰۶ - ۱۱۰۷ عیسوی) کو قفقاس کے قریب شہر گنجہ (جو تبریز اور شروان کے درمیان واقع ہے) میں ہوئی۔ اس نے خود اپنے مولد و منشاء کا ذکر ایک نئے انداز قیل و قال میں کیا ہے:-

گفتا چہ کسی و چیست نامت؟ اصلت زکجا، کجا مقامت؟
گفتم متعلمے سخنداں میلاد من از بلاد شروان

اس قصیدہ میں جس کی ردیف "صفاہاں" ہے، اس نے اپنی زندگانی اور اپنے عہد پر ادائے خاص کے ساتھ اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

"میں سن "ث د ن" (۵۵۰ھ ہجری) میں موصل کی جانب روانہ ہوا"

ثنائے صفاہاں

پانصد ہجرت چو من نزاد یگانہ باز دوگانہ کنم دعائے صفاہاں

---

۱ ۵۵۰ھ ہجری ۱۲

مبدع فحلم بہ نظم و نثر شناسد کم نکنم تازیم ولائے صفاہاں

اس کے باپ کا نام علی تھا، جو نجاری کا پیشہ کرتا تھا۔ جس کو وہ خود بیان کرتا ہے۔

از بہر خلائقم سبکبار بر مائدہ علیِ نجار
او ضامن من بنان و جامہ من مادحش از بنان و خامہ
ہستم چو خلیل عہد اول فرزند دروگری معطل
در بتکدۂ بلار سیدہ برہم زدہ ہر بتے کہ دیدہ

اُس کے دُوسرے اشعار سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اس کا باپ نرا نجار ہی نہ تھا، بلکہ۔ خاصکر وہ "تابوت گری" کا پیشہ کرتا تھا:

مردے ہنرے خلیل کردار تابوت گرے مسیح کردار
خود تابوتیے کہ او تراشد جز مرقدِ موسوی نباشد

لیکن ۔ اس کی ماں رابعہ جس کا پیشہ طباخی تھا، وہ موبد نژاد، راہبہ، عیسائی عورت تھی، جو بعد کو مسلمان ہوگئی ۔ جس کا ذکر وہ اپنے کلام میں کرتا ہے:

آں پیر زنے کہ مرد معنی است وآں رابعۂ کہ ثانیش نیست
از رابعہ[1] در صیانت افزوں بل رابعۂ بنات گردوں
بگرفتہ زعیش پنج روزہ چوں مریم چہار ماہہ روزہ
نسطوری و موبدی نژادش اسلامی و ایزدی نہادش
بگریختہ از عتاب نسطور آویختہ در کتاب مسطور
بگزیدہ بہ نور عقل و الہام برکیش کشیش دینِ اسلام
از نورِ ضلالت آوریدہ نخاس ہُدیش پروریدہ
تا مصحفِ لا الٰہ دیدہ زانجیل و صلیب در رمیدہ
صافی دم و صوفی اجتہاد است مومن دل و مومن اعتقاد است
باطعنۂ جافیانِ جیفہ بازو قوی ام بداں ضعیفہ

---

[1] اس سے مُراد "رابعۃ العدویہ" ہے ۱۲

حالات من از رضاش مرضی حاجات من از دعاش مقتضی
پندش ہمہ سدّ اختیارم نصحش ہمہ حصن روزگارم
الحق حق خدمتش قدیمست ہمچوں حسنات عم عمیمست

خاقانی کا دادا ایک جولاہہ تھا، جیسا کہ وہ خود اپنے نسب کو دادا سے ملاتا ہے۔ "خیّاط" اور "جولاہہ" کی مخصوص اصطلاح کو، اپنے کلام میں، استادانہ تصرف کے ساتھ استعمال کرتا ہے:۔

جولاہہ نژاد م از سوئے جد در صنعت من کمال ابجد
ہر شب کہ شود بہر کنارے اطراف فلک چو پنبہ زارے
زاں پنبہ کنند ریسمانم آرند بہ کارگاہ جانم
شاگرد ازل بہ کلبہ من ماشورہ کفست وریسماں تن
می بافم و تار و پود معنے از بہر وطائے خضر و موسے
بافم پئے رُوح وقت پوشش دستار سرو ردائے دوشش

باپ کے مرنے کے بعد خاقانی کے چچا عمرو بن عثمان نے (جو طبیب تھا) اس کی تعلیم و تربیت کو اپنے ذمہ لے لیا۔ جس کی خود خاقانی نے تعریف کی ہے، اور اس میں اس نے طبی اصطلاحیں ماہرانہ انداز کے ساتھ استعمال کی ہیں۔ یہ امر، اہل سخن سے پوشیدہ نہیں کہ ادبی کمالات میں یہ ایک مشکل ہنر ہے مگر۔ اس کے لئے۔ طبیعت اور ذوق کا ہونا، اولین شرط ہے:۔

از سوئے عم طبیب گوہر بقراطِ سخن بہ ہفت کشور
عقلم کہ ہزار بحرِ صافست وادی شمالش کوہ قافست
موسے سخنم نہ کوہ آوا عیسے نفسم نہ آسی آسا
ہر ادویہ کآدم از جناں خورد تخمش بزمین طبعم آورد
زاں ادویہ ہائے صحت انگیز ہستم بسخن مفرح آمیز
لفظم کہ شفائے ہمگنانست طاعون رواں طاغنانست
روح اللّٰہم محققاں را محی الروحم منافقاں را
سحر دم من بوقتِ شبگیر تسکین دہ صد ہزار تبگیر
از شربت لفظ من قوی داں شریان حیات اہل شرواں

خاقانی، باوجود اس کے کہ وہ ایک موقع پر اپنے کلام میں، اپنے باپ سے اظہار خوشنودی کرتا ہے

اور کہتا ہے :-

جاں صرف کند در آرزویم — گر خود ہمہ شیر مرغ جویم
مرغِ دلِ من گرفت پرواز — از دانۂ آب آں نکو کار

دُوسری جگہ پر اس کی شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے :-

مسکیں پدرم زجورِ ایام — افگندہ مرا چو زال را سام
غم سیمرغے نمودہ در حال — در زیر پرم گرفت چوں زال
آوردہ بکوہ قاف دانش — پرورد مرا در آشیانش
آں کردہ پدر بمن کہ درپیش — کردند عرب بدختر[1] خویش
ایں حال درست کن زقرآن — آنگہ و اذا المؤدۃ[2] برخوان

اس کے بعد اپنے چچا کی اس طرح تعریف کرتا ہے اور اس کو اپنا حقیقی سرپرست سمجھتا ہے :

بگریختہ ام زدیو خذلاں — در سایۂ عمرو ابن عثماں
ہم صدرم و ہم امام و ہم عم — صدر اجل و امام اکرم
تا بر درِ عم مرا وقوف است — آحاد نہاد من الوف است
بودم چو یکے دقیقۂ خورد — عم زیں درجات رفتم برد
پس زاں درجات برج پرداخت — زاں برج بیوت اختراں ساخت
با من بہ یتیمداری آں مرد — آں کرد کہ عم[3] مصطفےٰ کرد
عم داروے زندگیم دادہ — پستاں رضام درنہادہ
خود بودہ برفق دایۂ من — پروردہ مرا بزیر دامن
حافظ بدہ از پے کمالم — از آتش و آب ہفت سالم

پھر خاقانی آپ خود کہتا ہے کہ اس کے چچا کی رحلت کے وقت، اس کی عمر ۲۵ سال کی تھی، انتقال کے وقت، خود اس کے چچا کی عمر ۴۰ سال کی تھی اور اس نے خود عمر بھر شادی نہیں کی تھی

---

[1] آیت " لاتقتلوا اولادکم خشیۃ املاق" کی طرف اشارہ ہے ۱۲

[2] اس سے مقصود یہ آیت ہے۔ " واذا المؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت" ۱۲

[3] اس سے مقصود جناب " ابوطالب" پدر " علی المرتضیٰ" ہیں، جو رسول صلعم کے عم مکرم تھے ۱۲

اتنی مدت میں، خاقانی بھی تحصیل علم سے فارغ ہو چکا تھا ــــ جیسا کہ وہ خود بیان کرتا ہے :-

چوں دید کہ در سخن تمام — حسّانِ عجم نہاد نامم
چوں پایۂ مرا بگنج در کوفت — سالم در بیت او پنج در کوفت
دانست کز اہل نطق پیشم — از شادی آں بمرد بیشم
زیں کلبہ بکلبۂ بقا رفت — زاں عالم بود باز جا رفت
یک عطسہ بداد و روح بنہفت — صدّیق یرحمک اللہ تمام گفت
آنجا ش نکاح بست جوزا — چل سال غرب نشست اینجا
آنکس کہ چناں عروس بیند — برحق بود ار غرب نشیند

سنہ ۵۴۰ ہجری، سنہ ۱۱۴۵ عیسوی کے قریب، خاقانی نے ترکِ وطن کیا اور شروانشاہ اختسان ابن منوچہر کی بارگاہ میں، جا کر پناہ لی ــــ اس زمانہ میں، شاہ موصوف نے اپنے پایۂ تخت کو، شہر "گرشاسپ" سے آذربائیجان "بادکوبہ" میں منتقل کر دیا ــــ خاقانی کے اکثر کلام سے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ قفقاس میں، اپنی زندگی سے ہمیشہ بیزار رہتا تھا اور جس طریقے سے ہو سکے وہ اپنے وطن سے نکلنا چاہتا تھا، جیسا کہ وہ کہتا ہے :-

طوطی معانی آفرینم — شروان قفسے است آہنینم
تنگ آمدہ بر دلم شماخی — کلخن جائے بدیں فراخی

ایک مدت تک، شروانشاہ کی بارگاہ میں، ملازمت کرنے کے بعد، خاقانی زیارت کعبہ کے ارادہ سے، رخصت ہوتا ہے ــــ شروان سے نکل کر منزل مقصود کی طرف کوچ کرتا ہے، "ساوالان" کی پہاڑیوں اور مدائن، بغداد اور نجف سے ہوتا ہوا مکہ روانہ ہوتا ہے ــــ خاقانی اس سفر میں جو اس کا دوسرا سفر ہے، مختلف منزلیں، مکہ تک طے کرتا ہوا، ہر ایک منزل کی تعریف میں، ایک ایک نظم کہتا گیا ہے، اُن نظموں میں بعض بعض اشعار، ایسے بھی نکلے ہیں، جو شاعر کی بلند خیالی اور قادر الکلامی کے سبب، پڑھنے والے کو حیرت میں، ڈال دیتے ہیں ــــ اس سفر کے تخیلوں میں سے "ایوان مدائن" پر اس نے جو شعر لکھے ہیں، ان کا مجموعہ، ایک بہترین تحفہ ہے ۔ نیز کچھ عرصہ کے لئے، خاقانی نے چاہا تھا کہ خراسان جا کر "سنجر" کے الطاف و نوازش کا مورد بنے، مگر یہ خیال اس کا پورا نہ ہو سکا ــــ جیسا کہ اس نے کہا ہے :-

چہ سبب سوئے خراسانم نگزارند — عندلیبم سوئے بستاں شدنم نگزارند

دوسری جگہ کہا ہے :-

بحر آسان شوم انشاءاللہ ازرہ آسان شوم انشاءاللہ

ایک اور جگہ پر کہتا ہے:۔

رہ روم مقصد امکاں بحر اساں یاہم تشنہ ام مشرب احساں بحر اساں یاہم
چوں زمن اہل خراساں ہمہ عنقا بینند من سلیمان جہاں باں بحر اساں یاہم

اسی قیاس کے مطابق اس کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ خاقانی "شہر رے" تک گیا ہے۔ لیکن ــــ "رے" کی حدود میں سے گزر کر اس طرف جانے کی ممانعت تھی، جس کو اس نے اپنے کلام میں اس طرح سے ظاہر کیا ہے:۔

چوں نیست رخصہ سوئے خراساں شدن مرا ہم باز پس شوم، نکشم من بلائے "رے"
گر باز رفتم سوئے تبریز از جاز نست شکرانہ گویم از کرم پادشائے "رے"

خاقانی کا تعلق، خوارزمشاہیوں کے ساتھ بھی رہا ہے، اس نے ان کی خدمات میں قصائد بھی لکھ بھیجے اس کو رشید الدین وطواط کے ساتھ، مشاعروں میں شریک ہونے کا اتفاق بھی ہوا۔ اس نے اپنے استاد ابوالعلاء گنجوی کے ساتھ مشاعرہ اور جلال الدین عبدالرزاق اصفہانی کے مشاجرہ اور اثیر الدین آخسیکتی کے ساتھ مشاعرے کئے تھے۔

جس وقت خاقانی مکہ سے لوٹ رہا تھا، اس کو اصفہان پر سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ اہل اصفہان کی طرف سے اس کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا، لیکن ــــ چند دن نہ گزرے کہ ایک ہجو اس کے شاگرد مجیر الدین بیلقانی نے اصفہانیوں کی مذمت میں، کہکر شائع کی، اور یہ ہجو، خاقانی کے نام کے ساتھ منسوب کر دی گئی۔ جس پر جمال الدین عبدالرزاق نے خاقانی کا مقابلہ نہایت سخت ہجویات کے ساتھ کیا۔ اس کے بعد خاقانی اصفہانیوں کی دلجوئی کے لئے "صفہاں" کی اس مشہور ردیف میں شعر لکھنے پر مجبور ہوا، جس کی چند ابیات یہ ہیں:۔

این ہمہ کردم برایگاں نہ بر آن طمع کافر زر یایم از عطائے صفہاں
دیو رجیم[1] آنکہ بود دزد بیانم گردم طغیان زد از ہجائے صفہاں
او یقیاست سپید روئے نخیزد زانکہ سیہ بست بر قفائے صفہاں

خاقانی کے شروان واپس ہونے کے بعد، اخستان شروانشاہ نے کسی خاص وجہ سے اس کو معتوب کر کے

---

[1] دیو رجیم سے مراد "مجیر الدین بیلقانی" ہے۔

قید کر دیا۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کتنی مدت تک قید میں رہا، لیکن — اس کا قصیدہ "حبسیہ" بہت مشہور ہے۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ خاقانی، اخستان کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک زندہ رہا۔ اس کے چند دن کے بعد اس کا ایک بیس سالہ لڑکا، جس کا نام رشید تھا، انتقال کر گیا۔ پھر ایک مدت کے بعد اس کے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جو ولادت کے تیسرے دن ہی گزر گئی۔ آخر کار خاقانی کی بیوی بھی ان دونوں بچوں کے غم میں اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئی۔ یہاں وہ اشعار بھی نقل کر دیے جاتے ہیں، جن کو خاقانی نے اپنی بیوی اور بچوں کے فراق میں لکھا ہے:۔

دریغ میوۂ جانم رشید کز سر پائے — بہ بیست[۲۰] سال در آمد بیک نفس بگزشت
مرا ذخیرہ ہمیں یک رشید بود ز عمر — نتیجۂ شب و روزے کہ در ہوس بگزشت
چو دختر آمدم از بعد اینچنیں پسرے — سرشک چشم من از وادیٔ ارس بگزشت
مرا فزود ز دختر غم رشید کہ آں — نہ بر دلِ من و نے بر ضمیر کس بگزشت
چو دختر آمد و ایں سوگ دید صوفیوار — سہ روز عدۂ عالم بداشت پس بگزشت

یہ اشعار بھی اس نے اپنی بیوی اور بچوں کے فراق میں کہے ہیں:

پسر داشتم چوں بلند آفتاب — بناکہ بناری مغاکش سپردم
بدر د پسر مادرش چوں فروشد — بہ خاک آں تن دردناکش سپردم
یکے بکر چوں دخترنعش بودم — بروشندلی ہم بخاکش سپردم
کنوں زانیہہ ماندہ عبدالعزیزے — ودیعت بہ یزداں پاکش سپردم
اگر کس پناہش نباشد بشروں — پناہش بس است ایں خدا کش سپردم

خاقانی کے کلام میں، خاصکر اس کے مشہور "حبسیہ" میں، دین مسیحی سے متعلق اشارات اور تلمیحات بہت ہیں اور اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دین مسیحی سے جس کی ماں کا مذہب تھا اور اس دین کی عبادات کے طریقوں اور اس کی مقدس رسوم سے وہ بخوبی واقف تھا۔ نصرانی مذہب اور اس کی تاریخ سے متعلق اس قدر وسیع معلومات، اب تک کسی ایرانی شاعر نے حاصل نہیں کئے — علاوہ اس کے ایران میں، شاید جس پہلے شخص نے دبدبہ الفاظ کو طنطنہ معانی کے ساتھ ادا کیا ہوگا (ہماری نظر میں) وہ تنہا خاقانی ہی ہوگا، اور بس — قرن آخر میں قاآنی کا طمطراق، خاقانی کی ایک بے موقع اور بے معنی

---

[۲۰] عبدالعزیز خاقانی کے اس لڑکے کا نام ہے جو اس کی باقیماندہ اولاد میں سے تھا ۱۲

خشک تقلید کے سوا اور کچھ نہیں۔

شروان کے شاعر کے منہ سے، وہ شور اور غرور سے بھری ہوئی پھونکیں، جو دنیا میں ہلچل ڈالنے والی صور کی فریاد کی مانند آفاق میں پھیلیں، ان کی مثال، ایک ایسی ندا کی مانند ہے، جس کے سامنے دوسری تمام ندائیں خاموش ہیں۔ اور اس کی اثر آفرینیوں سے ہر صدی اور ہر زمانے کے صحیح المذاق اشخاص کے دل جوش و خروش سے پُر ہیں ــــ اس ادیب کے روشن اشعار آج کے زمانہ میں، عام مشرقیوں کے طبقے کی تاریک فہم و ادراک سے، بالاتر ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ابتک افکارِ عامہ کی کھیتیوں میں اس کے فدق و ذہنیت کی تخم کاری نہیں ہوئی ہے ــــ لیکن ــــ مشرق اور خاصکر ــــ ایران میں، عنقریب اس کے کلام کے سمجھنے اور لطف اٹھانے والے پیدا ہونے لگینگے۔

خاقانی ایرانی احساسات اور اس کی قدیم رسم و رواج کے تعلقات کے اعتبار سے، ایک سچا وطن دوست ہے ــــ کبھی وہ اپنے سمند خیال کو اس طرح جولانی میں لاتا ہے کہ پڑھنے والا روانی میں اس سے عاجز رہ جاتا ہے اور پھر اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ ذرا سی جنبش میں ملکوت کے فاصلے طے کر جاتا ہے اور روحانی آسمانوں کو، جو دنیاوی آسمانوں کے کارفرما ہیں، منزل منزل کر کے طے کر لیتا ہے، ہم کو رہا ملن زمینگیروں کو اپنے پیچھے تکتا اور آرزومند چھوڑ جاتا ہے۔ کبھی وہ مسلمانوں کے ظلم و ستم کے بار سے عاجز آکر چاہتا ہے کہ زنار گلے میں ڈالے اور بار دیگر ناقوس کو چومے، پھر پشیمان ہو کر اس خیال سے باز آتا ہے ــــ باوجود ــــ اس کے، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسے بہت کم شاعر ہونگے، جنہوں نے اسلام کے آداب اور حج بیت اللہ کے مناسک و شعائر اور اس کی پاک منزلیں اور ایمان و توحید کو اپنی عدیم المثال قادر الکلامی اور طلاقت لسانی کے ذریعہ سے بیان کیا اور ترنم ریز ہوا ہو ــــ اس نے یونانی فلسفہ اور زرتشتی مذہب کے اسرار سے کماحقہ آگاہی حاصل کی تھی، لیکن ــــ طبعی لگاؤ کی وجہ سے ان کی جانب سے منہ موڑ کر سمند فکر کو اسلام و ایمان کی وادیوں میں دوڑاتا ہے۔ جیسا کہ اس کے کلام سے ثابت ہے:

زہے دولت کز امکانِ ہدایت یافت خاقانی — کنوں صد فلسفی فلسے نیرزد پیش امکانش
توئی خاقانیا طفلے کہ استادانِ دیں بہتر — چہ جائے زندہ و ستا ہست یا زردشت و نیرانش
ہدایت زاہلِ دیں آموز و قولِ فلسفی مشنو — کہ طوطی کاں زہند آید نجوید کس زحرزانش
فروغض در دو سنت جو، اصول آموز و مذہب داں — مجسطی چیست اشکالش، قلیدس کیست برہانش

پھر "حبسیہ" میں کہتا ہے:

فلک کجرو تر است از خط ترسا — مرا دارد مسلسل راہب آسا

چو روح اللہ دریں دیر است چوں شد — چنیں دجال فعل ایں دیر مینا؟
تنم چوں رشتۂ مریم دو تا ہست — دلم چوں سوزنِ عیسیٰ است یکتا
من اینجا پایبندِ رشتہ ماندم — چو عیسیٰ پایبند سوزن آنجا

. . . . . .

مرا اسلامیاں چوں دادند ہندند — شوم برگردم از اسلام؟ حاشا
پس از تحصیل دیں از ہفت مرداں — پس تاویل وحی از ہفت قرا
پس از الحمد والرحمان و الکہف — پس از یاسین وطاسین میم وطاہا
پس از میقات و حج وطوف کعبہ — جمار وسعی و لبیک و مصلا
پس از چندیں چلہ در عہد سی سال — شوم پنجاہ گیرم آشکارا
بگردانم ز بیت اللہ قبلہ — بہ بیت المقدس و محراب اقصا؟
مرا از بعد پنجہ سالہ اسلام — نزیبد چوں صلیبی بند بر پا
شوم ناقوس گویم زیں تحکم — روم زنار بندم زیں تعدا
دگر قیصر سگالد راز زردشت — کنم زندہ رسوم زند اوستا
مگو ایں کفر و ایماں تازہ گرداں — بگو استغفراللہ زیں تمنا

خاقانی، اپنے آثار میں کثیر التعداد دل و دماغ کو روشن کرنے اور طبیعت کو جوش و ترنم میں لانے والے قصائد کے سوا، غزلیں، رباعیاں، اور عربی اشعار بھی رکھتا ہے ـــ لیکن ـــ یہاں اختصار ہی پر اکتفا کی گئی۔

خاقانی کی وفات، ۵۹۵ھ ہجری (۹۹-۱۱۹۸ء) کے قریب ہوئی اور تبریز کے مقام سرخاب کے مشہور قبرستان "مقبرۃ الشعراء" میں دفن ہے۔ خدا اس پر رحمت نازل کرے!

نظامی، جو خاقانی کے بعد گزرے ہیں، اس کی وفات حسرت آیات پر دل کو ہلا دینے والے پر درد مرثیے کے ذریعہ سے جس کی ایک بیت یہ ہے، رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں:-

گماں بردم کہ خاقانی دریغا گوے من باشد
دریغا من شدم اکنوں دریغا گوے خاقانی

ہندوستانی کاشتکاروں کی معاشی حالت

جناب قاضی وضیح الدین احمد صدیقی منعلم بی۔ اے

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہندوستان کے کاشتکاروں کی معاشی حالت روز بروز بد سے بدتر اور نہایت ابتر ہو رہی ہے۔ ہندوستانی کاشتکاروں کی مالی حالت کا صحیح صحیح اندازہ لگانا نہایت مشکل کام ہے کیونکہ برخلاف یورپین ممالک کے یہاں ہندوستان میں معاشی حالت کا ٹھیک اندازہ لگانے کے صحیح ذرائع ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے۔ حکومت اپنے فائدہ کو رعایا کے فائدہ پر ترجیح دیتی ہے اور جہانتک ممکن ہو خود فائدہ حاصل کرنیکی کوشش کرتی ہے اس لئے جو سرکاری رپورٹیں شائع ہوا کرتی ہیں وہ بہت بڑی حد تک حکومت کے موافق ہوتی ہیں اور صحیح حالات کو پبلک سے حتی الامکان چھپایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم کاشتکاروں کی مالی حالت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔

حکومت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ کاشتکاروں کی معاشی حالت بہ نسبت سابق کے بہت بہتر ہے اور روز بروز بہتر سے بہتر ہوتی جا رہی ہے اور اس دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ اجناس کی قیمتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اجناس کی قیمتوں میں اضافہ ہونے سے صاف ظاہر ہے کہ کاشتکار مالدار ہوتے جاتے ہیں۔

حکومت کا یہ دعویٰ ایک بڑی حد تک غلطی پر مبنی ہے کیونکہ اجناس کی قیمتوں میں اضافہ ہونے سے کاشتکاروں کو مطلق فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک دوسرے درمیانی طبقے کو فائدہ حاصل ہوتا ہے جو کاشتکاروں سے بہت ارزاں قیمت پر اجناس خریدتا ہے اور گراں قیمت پر دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔

حکومت کے برخلاف پبلک کا یہ دعویٰ ہے کہ حکومت برطانیہ جب سے ہندوستان پر حکمران ہوئی ہے اس وقت سے کاشتکاروں کی معاشی حالت خراب ہوگئی اور روز بروز اس خرابی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حکومت برطانیہ کے قبل ہندوستان کے کاشتکار بہت مرفہ الحال تھے جس کا ثبوت تاریخ سے بخوبی مل سکتا ہے۔ پبلک اس خرابی کی وجہ حکومت کا طرز عمل بتلاتی ہے اور اس طرز عمل کو نہایت حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔

دونوں جانب کے دلائل در اصل قیاس پر مبنی ہیں۔ دونوں جانب نہایت افراط و تفریط پائی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ حکومت کے طرز عمل کی وجہ سے کاشتکاروں کی معاشی حالت بہت کچھ خراب ہوگئی ہے لیکن اس کا سبب صرف حکومت کا برا طرز عمل ہی نہیں ہے جیسا کہ پبلک کا خیال ہے اگر کافی مواد حاصل کر کے دیکھا جائے

تو اس خرابی کے اسباب کا بھی پتہ چل سکتا ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کاشتکاروں کی معاشی حالت بہ نسبت سابق بہت خراب ہے۔

سب سے پہلے ہم ہندوستان کے کاشتکاروں کی معاشی حالت خراب ہونے کا ثبوت بہم پہنچائینگے گورنمنٹ کے مقرر کردہ کمیشنوں کے بیانات اور رپورٹوں سے بھی کاشتکاروں کی معاشی حالت کی خرابی کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے کمیشنوں کے ان بیانات پر گورنمنٹ کو کافی اعتبار ہے کیونکہ اسی کے مقرر کردہ اشخاص نے لکھا ہے اس لئے ہم ان ہی بیانات کو پیش کرتے ہیں:۔

۱۸۷۵ء میں فسادات دکن کی تحقیق کے لئے حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا تھا جس نے حسب ذیل رائے کا اظہار کیا ہے:۔

"ہم بتا چکے ہیں کہ ان علاقوں میں کاشتکار عام طور پر قرضدار ہیں یہ کچھ قدرتی اسباب کی وجہ سے اور کچھ ہمارے نظم و نسق کے باعث۔ یہ قرضداری گذشتہ چند سال کے عرصے میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ تقریباً ایک اسامی کاشتکار قرضداری کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں اور ان کے قرضوں کا اوسط مالگزاری کی مقدار سے ۸ گنا ہے اور اس قرضہ کا تقریباً دو ثلث حصہ زمین کو رہن رکھکر حاصل کیا گیا ہے"

۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے حسب ذیل الفاظ میں اس بیان کی تائید کی ہے:۔

"ہندوستان کے مختلف علاقوں سے شہادت جمع کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مالکان زمین کے طبقے میں تقریباً ایک ثلث تعداد ایسی ہے جو اسقدر زیادہ قرضدار ہے کہ ان کے لئے قرضداری سے نجات حاصل کرنا ناممکن ہے اور کم از کم اتنی ہی تعداد ان لوگوں کی ہے جو قرضدار تو ہیں لیکن جن کے قرضے ادا ہو سکتے ہیں"۔

۱۹۰۱ء کے قحط کمیشن نے بھی اسی صورت حال کی تائید کی ہے۔ ان تمام بیانات کا لحاظ کرتے ہوئے اور جو شہادت جمع کی گئی ہے اس سے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمارے خیال میں گمانِ غالب یہ ہے کہ بمبئی پریسیڈنسی میں کاشتکاروں کی کم از کم ایک چوتھائی تعداد اپنی زمینیں کھو چکی ہے اور صرف (۱/۱۰) تعداد ایسی ہے جو قرضدار نہیں ہے اور اس کے علاوہ بقیہ تعداد کم و بیش قرض میں مبتلا ہے۔

انریبل مسٹر روجرس رکن مجلس وضع قوانین صوبہ بمبئی نے وزیر ہند کی خدمت میں ایک رپورٹ پیش کی تھی جس میں یہ درج تھا کہ ۱۸۹۰ء سے قبل گیارہ سال کے عرصے میں سرکاری مالگزاری وصول کرنے کی غرض سے تقریباً بیس لاکھ ایکڑ زمین فروخت کی گئی جو آٹھ لاکھ چالیس ہزار سات سو تیرہ اشخاص کے قبضے میں تھی۔ اس کے علاوہ تیس لاکھ روپیوں کی مالیت کی غیر منقولہ جائداد بھی اسی غرض سے فروخت ہوئی اس زمین کا (۶۰) فیصدی حصہ خود حکومت کو خریدنا پڑا کیونکہ ان کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ گویا بالفاظ دیگر

گیارہ سال کی مدت میں اس ضلع کی مجموعی آبادی کا ۱/۸ حصہ بے خانماں ہو گیا۔

پنجاب میں انجمن ہائے قرضہ امداد باہمی کے رجسٹرار صاحب نے ۱۹۲۰ء میں مقامی کاشتکاروں کی قرضداری کی تحقیق کی ہے اور یہ معلوم کیا کہ صوبہ پنجاب کے کاشتکاروں کی مجموعی قرضوں کی مقدار ۳ کروڑ پونڈ یعنی ۴۵ کروڑ روپیہ ہے۔ اسی قسم کے واقعے اور صوبوں کے متعلق بھی معلوم کئے گئے ہیں جن سے یہ نتیجہ یقینی طور پر نکلتا ہے کہ ہندوستان کی زرعی آبادی قرضداری کی مصیبتوں میں بہت زیادہ مبتلا ہے۔

حکومت کے ان کمیشنوں کے بیانات کے پڑھنے سے کیا صاف اور صریح طور پر ظاہر نہیں ہوتا کہ ہندوستان میں کاشتکاروں کی معاشی حالت نہایت خراب ہے اور قرضداری بے انتہا بڑھی ہوئی ہے؟ جب پنجاب جیسے زرخیز اور خوش حال صوبہ کی ایسی بُری کیفیت ہو تو دوسرے صوبوں کی جو پنجاب کی خوشحالی کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتے کس قدر افسوسناک اور ابتر حالت ہو گی؟

اب ہم معاشی حالت کی اس خرابی کے اسباب کی جستجو کریں گے۔

اس خرابی کا سب سے پہلا سبب پیشوں کے توازن کا بگڑ جانا ہے یعنی پیشوں کی تقسیم میں پہلے جو توازن قائم تھا وہ اب باقی نہیں رہا ہے اور اس توازن کے قائم نہ رہنے کا سبب صنعت و حرفت کا زوال ہے یورپی ممالک کی مصنوعات کی درآمد کی وجہ سے ہندوستان کی صنعت و حرفت کو سخت نقصان پہنچا۔ کیونکہ یورپی ممالک کی مصنوعات ارزاں ہونے کی وجہ سے ہندوستانی مصنوعات کی بے قدری ہونے لگی اور اس بیقدری اور طلب کی کمی کی وجہ سے ہندوستانی صناعوں اور کاریگروں کو نقصان برداشت کرنا پڑا اور رفتہ رفتہ یہاں کی صنعت و حرفت کو زوال آگیا اور صناع اور کاریگر صنعت و حرفت کو ترک کر کے زراعت کی جانب متوجہ ہونے لگے یہی وجہ پیشوں میں توازن قائم نہ رہنے کی ہے اور اس توازن کے قائم نہ رہنے کے سبب سے کاشتکار تعداد میں زیادہ ہو گئے اور زمین محدود اس لئے کھیتوں کی وسعت میں بہت کمی واقع ہوئی اور ہر شخص جس قدر بھی زمین کا چھوٹا ٹکڑا ہاتھ لگا قابض ہو گیا۔

ایک اور سبب ہندوستان کے کھیتوں کی وسعت میں کمی کا ہندوستان کا قانون وراثت ہے کیونکہ اس قانون کی رو سے باپ کی وفات کے بعد تمام جائداد (منقولہ و غیر منقولہ) اولاد میں مساوی تقسیم کی جاتی ہے اس کے برخلاف یورپ میں صرف اولاد اکبر مالک گردانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں خاندانی جائداد نسلاً بعد نسلاً برابر چلی آتی ہے بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا ہے اس کے برخلاف ہندوستان میں جائداد بے انتہا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ غائب۔

کھیتوں کے اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جانے کی وجہ سے ان پر کاشت عمیق نہیں کیجا سکتی کیونکہ

مصارف زیادہ لاحق ہونگے اور آمدنی نسبتاً بہت قلیل ہوگی۔ اور پیدائش بر پیمانہ کبیر کے فوائد تو کسی طرح حاصل نہیں کئے جاسکتے۔ البتہ ایسے کھیتوں پر کاشت کرنے سے صرف مصارف پیدائش حاصل ہو سکتے ہیں۔ (مصارف پیدائش میں کاشتکار کی اپنی محنت اور اس کے اہل وعیال کی محنت کا معاوضہ بھی شامل رہتا ہے)

کاشتکاروں کی معاشی حالت کی خرابی کا دوسرا بڑا سبب ہندوستان کا طریقہ مالگذاری ہے مالگذاری وہ محصول ہے جس میں زمین کی پیداوار کا کچھ حصہ حکومت وصول کرتی ہے۔

زمین کی ملکیت کے متعلق ہندوستان میں دو طریقے رائج ہیں ایک وہ جس میں معاشی لگان کے حصہ دار صرف دو حکومت اور زمیندار ہوتے ہیں دوسرا وہ جس میں معاشی لگان کے حصہ دار تین، حکومت، زمیندار اور کاشتکار ہوتے ہیں (معاشی لگان وہ آمدنی ہے جو مصارف کاشت مہیا کرنے کے بعد کاشتکار کو حاصل ہوتی ہے)۔

مالگزاری کے دو محکمے ہیں ایک محکمہ بندوبست یعنی تشخیص مالگزاری دوسرا محکمہ مالگزاری یعنی تحصیل مالگزاری۔ محکمہ بندوبست کا کام یہ ہے کہ مالگزاری کی مقدار بڑھائے یا گھٹائے یعنی مالگزاری مقرر کرے اور محکمہ مالگزاری کا کام یہ ہے کہ مالگزاری وصول کرے۔

مالگزاری کے متعلق حکومت کا دعوے یہ ہے کہ ہم مصارف پیدائش نکالنے کے بعد جو پیداوار باقی رہتی ہے (یعنی معاشی لگان) اس میں سے ایک حصہ وصول کرتے ہیں۔ اس لئے مالگزاری کے وصول کرنے سے کاشتکار کو ہرگز نقصان نہیں ہوتا البتہ فائدہ کسیقدر کم ہوتا ہے۔

پبلک حکومت کے برخلاف یہ دعوی کرتی ہے کہ حکومت کے مالگزاری وصول کرنے کی وجہ سے کاشتکاروں کی مالی حالت خراب ہو رہی ہے کیونکہ مالگزاری کے ادا کرنے سے کاشتکار کو سخت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت جو مالگزاری وصول کرتی ہے وہ دراصل معاشی لگان کا ایک حصہ نہیں ہوتا کیونکہ ہندوستانی کاشتکاروں میں اتنی قابلیت نہیں ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک مصارف پیدائش مہیا کرکے معاشی لگان حاصل کریں بلکہ ان کے حاصل کردہ معاشی لگان میں بہت کچھ مصارف پیدائش شامل رہتے ہیں چنانچہ ہندوستانی کاشتکار معاوضہ تنظیم یعنی خود کی محنت کا معاوضہ اور اپنے اہل وعیال کی محنت کا معاوضہ ہرگز مہیا نہیں کرتا۔ اس لئے جو معاشی لگان اس کو حاصل ہوتا ہے وہ دراصل معاشی لگان نہیں ہوتا اور جب اس معاشی لگان میں سے بھی جس میں بہت کچھ مصارف پیدائش داخل ہیں حکومت اپنا حصہ نکالیگی تو یقیناً کاشتکار کو سخت نقصان ہوگا۔

پبلک کا دعوی بالکل ٹھیک ہے کہ فی الواقعی ہندوستانی کاشتکار خود کی محنت اور اپنے اہل وعیال کی

محنت کا معاوضہ مصارف پیدائش میں شامل نہیں کرتے۔

حکومت اپنے اس دعوے کے ثبوت کے لئے رکارڈو کا نظریہ پیش کرتی ہے اور اس سے مدد لیکر کہتی ہے کہ مالگزاری کے ادا کرنے سے کاشتکار کو ہرگز نقصان نہیں ہوتا۔

حکومت کے دعوے کو رکارڈو کا نظریہ ہرگز تقویت نہیں دے سکتا کیونکہ رکارڈو نے اپنے نظریہ کے ساتھ ساتھ چند مفروضے بھی لگا دیئے تھے اور یہ بتا دیا تھا کہ یہ نظریہ اس صورت میں منطبق اور صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اس کے متعلقہ مفروضے بھی صحیح یا منطبق ہوں لیکن ہندوستان میں رکارڈو کے مفروضے منطبق نہیں ہو سکتے۔ اسلئے یہ نظریہ بھی ہندوستان کے لئے ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔

رکارڈو نے اپنے نظریہ کے ساتھ جو مفروضے پیش کئے تھے وہ حسب ذیل ہیں:-

پہلا مفروضہ یہ ہے کہ "کاشتکاری کا کاروبار نفع بخش ہے"۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں کاشتکاری کا کاروبار ہرگز نفع بخش نہیں ہے۔ کیونکہ بہت سے کھیت ایسے ہیں جن سے صرف مصارف پیدائش حاصل ہو سکتے ہیں اور معاشی لگان ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ اور کثیر التعداد کھیت ایسے ہیں جو اختتام کاشت کی حد پر آ گئے ہیں۔ اس لئے یہ مفروضہ ہندوستان پر ہرگز منطبق نہیں ہو سکتا۔

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ ہر شخص وہی کاروبار اختیار کرتا ہے جس میں وہ سمجھتا ہے کہ اس کو اس کاروبار میں زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہوگا۔ لیکن ہندوستان میں ہرگز یہ صورت نہیں نظر آتی۔ کیونکہ صنعت و حرفت کے زوال اور دوسرے پیشوں کے انقلاب اور ذات پات کے قیود کی وجہ سے صرف پیشہ زراعت ہندوستانیوں کے سامنے موجود ہے اور ہندوستانی اسقدر حوصلہ مند بھی نہیں ہیں کہ کسی اور جگہ وطن ترک کر کے چلے جائیں اور کوئی پیشہ اختیار کریں لہٰذا مجبوراً پیشہ زراعت اختیار کرتے ہیں اگرچہ یہ پیشہ موجودہ حالات کے لحاظ سے مطلق نفع بخش نہیں ہے لیکن پھر بھی اس سے دست بردار نہیں ہوتے کیونکہ ان کو یقین ہے کہ اس پیشہ کے سوا اور کوئی پیشہ ملنا مشکل ہے اور اس پیشہ پر لوگ ٹوٹ پڑ رہے ہیں اگر وہ ترک کر دیں تو زندگی محال ہو جائیگی۔ غرض یہ مفروضہ بھی ہندوستان کے لئے غلط ثابت ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا مفروضہ یہ ہے کہ لگان (مالگذاری) سب سے آخری چیز ہے۔

یہ مفروضہ بھی ہندوستان پر منطبق نہیں ہو سکتا اسلئے کہ زمین کی پیداوار پر سب سے

پہلا حق حکومت کا ہوتا ہے۔ اور یہ قانون ہے کہ "حکومت کے مطالبات سب سے پہلے ادا ہونے چاہئیں" گویا اس طرح یہ مفروضہ بھی ہندوستان کے لئے صحیح نہیں ہے۔

جب مفروضے اسطرح غلط ہو جائیں اور منطبق نہ ہو سکیں تو یقینی نظریہ بھی منطبق نہیں ہو سکتا کیونکہ نظریہ کے لئے متعلقہ مفروضوں کا منطبق ہونا لازمی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ حکومت جو نظریہ اپنے دعوے کی دلیل میں پیش کرتی ہے بالکل غلط ہے اور ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے یہ نظریہ منطبق نہیں ہو سکتا۔ پبلک اور خیر خواہان ملک کا دعویٰ ہے کہ مالگذاری معاشی لگان کا ایک حصہ نہیں ہے بلکہ ٹکس ہے اور ٹکس سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور مشکل ہے۔

لگان (مالگذاری) اور ٹکس میں فرق یہ ہے کہ لگان کے ادا کرنے سے کاشتکار پر مطلق بار نہیں پڑتا اور اس کے برخلاف ٹکس کے ادا کرنے سے بار پڑتا ہے لیکن دریافت واقعات اور حالات سے پتہ چلتا ہے کہ لگان کے ادا کرنے میں ہندوستانی کاشتکار کو بار اٹھانا پڑتا ہے۔ لہذا یہ لگان دراصل ٹکس کی نوعیت رکھتا ہے اور چونکہ ٹکس میں جو سہولتیں موجود ہیں وہ اس ٹکس یعنی لگان میں ہرگز نہیں ہیں اس لحاظ سے لگان ٹکس سے بھی زیادہ سخت اور تکلیف دہ ہے۔

ہندوستان میں مالگذاری وصول کرنے کے لئے دو تاریخیں مقرر کی گئی ہیں اور ان تاریخوں کے اندر رقم مالگذاری داخل کرنا لازمی ہے ایک تاریخ ۱۵ جنوری ہے اور دوسری تاریخ ۱۵ مارچ ہے۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ فصلیں تیار رہتی ہیں۔

کاشتکاروں کو مالگذاری ادا کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ مالگذاری بشکل اجناس ادا نہیں کیجا سکتی۔ اسلئے کاشتکاروں کو فصل تیار ہوتے ہی روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مالگذاری معینہ تاریخ کے اندر داخل کر دیں لیکن اُن کے پاس روپیہ تو موجود نہیں ہوتا البتہ فصلیں تیار رہتی ہیں۔ اسلئے کاشتکار اجناس کو فوراً بازار لیجاتے ہیں تاکہ اُن کو بیچ کر روپیہ حاصل کیا جائے۔ چونکہ مالگذاری داخل کرنیکی تاریخ معین ہے اس لئے تمام کاشتکاروں کو ایک ساتھ روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ تمام کاشتکار ایک ساتھ اپنا غلہ بازار لیجاتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں۔ تمام کاشتکاروں کا غلہ ایک ساتھ بازار آنیکی وجہ سے رسد بہت بڑھ جاتی ہے اور طلب حسب سابق کم رہتی ہے اسلئے قیمت بہت

گھٹ جاتی ہے اور کاشتکاروں کو مجبوراً اپنا غلہ ارزاں قیمت پر فروخت کرنا پڑتا ہے۔ اسطرح کاشتکاروں کو بہت نقصان ہوتا ہے۔ نقصان برداشت کرنے پر بھی وہ اپنا پیشہ جاری رکھتے ہیں کیونکہ ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

اگر کاشتکار اپنا غلہ کچھ دنوں محفوظ رکھکر فروخت کرتے تو یقیناً بہت فائدہ حاصل ہوتا لیکن مالگذاری داخل کرنیکی تاریخ مقرر ہونے کی وجہ سے وہ مجبور ہیں اور ایسا نہیں کر سکتے البتہ ایک دوسرا طبقہ اس سے فائدہ ضرور اٹھاتا ہے یہ سرمایہ داروں کا درمیانی طبقہ ہے جو کاشتکاروں سے ارزاں قیمت پر غلہ خرید کر کچھ دنوں بعد جب رسد گھٹ جاتی ہے گراں قیمت پر فروخت کرتا ہے۔

ایسی حالت میں کاشتکاروں کو مجبوراً مہاجنوں سے روپیہ قرض لیکر اپنا کاروبار جاری رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے کاشتکار بہت مقروض ہوجاتے ہیں اور اُن کا قرضداری سے کبھی پیچھا نہیں چھوٹتا۔ کیونکہ اُن کو ہر سال قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ قرض ادا کرنے کی دیر نہیں کہ پھر قرض لینا لازمی ہوجاتا ہے۔

بعض ماہرین معاشیات کا خیال ہے کہ ہندوستان کے کاشتکاروں کی معاشی حالت کی خرابی کے صرف دو اسباب ہیں۔

(۱) بنیئے اور مہاجن وغیرہ (۲) دوسرے فضول خرچی۔

اگر کافی مواد حاصل کرکے دیکھا جائے تو ان ماہرین کا خیال بھی بڑی حد تک غلط ثابت ہوتا ہے۔ فضول خرچی تو زمانہ قدیم یعنی مغلوں کے زمانہ میں بھی تھی اسوقت کاشتکاروں کی حالت کیوں خراب نہیں ہوئی اور اب کیوں خراب ہوگئی؟ معاشی حالت کی خرابی میں فضول خرچی کو زیادہ دخل نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے اسباب ہیں۔

اسمیں شک نہیں کہ بنیئے اور مہاجنوں سے قرض حاصل کرنے میں بہت سی خرابیاں ہیں لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں کیونکہ کاشتکار کو بعض ناگزیر ضروریات کا پورا کرنا لازمی ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کاشتکار کے بیل مرجائیں تو ایسی صورت میں دوسرے بیل خریدنا کاروبار چلانے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ کاشتکاروں کی مالی حالت تو ظاہر ہے لہذا بیل خریدنے کے لئے روپیہ کا قرض لینا لازمی ہے۔ اسلئے وہ مہاجن یا بنیوں سے روپیہ قرض لیتے ہیں اگرچہ مہاجن وغیرہ غیر ضروری کاموں کے لئے بھی قرض دیتے ہیں اور سود بہت زیادہ

وصول کرتے ہیں لیکن بغیر اس کے کوئی علاج نہیں۔ اور کہیں سے روپیہ نہیں مل سکتا۔ پہلے تو گاؤں میں بنک نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی تو بنک چھوٹی چھوٹی رقموں کا لین دین نہیں کرتے اور پھر کاشتکاروں کی ساکھ اور ضمانت جیسی کچھ ہوتی ہے ظاہر ہے۔ اسلئے بنکوں سے کاشتکاروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ سوائے مہاجن کا دروازہ کھٹکھٹانے کے اور کوئی طریقہ نظر نہیں آتا۔

در اصل غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام قصور حالات کا ہے مہاجنوں کا کوئی قصور نہیں۔

سود کے زیادہ وصول کرنیکی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک گاؤں میں ایک یا دو سے زیادہ مہاجن نہیں ہوتے۔ اور کاشتکار بکثرت ہوتے ہیں اور تمام کاشتکاروں کو ایک ساتھ روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے تمام کاشتکار انہی مہاجنوں کے پاس روپیہ قرض لینے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ روپیہ کی طلب بڑھ جائے اور رسد محدود رہے تو یقیناً سود کی شرح بڑھ جائیگی علاوہ ازیں کاشتکاروں کی ساکھ اور ضمانت نہایت معمولی ہوتی ہے اس لئے بھی سود کی شرح بڑھا دی جاتی ہے۔

جہاں کہیں بھی امداد باہمی کی انجمن قرضہ عمدگی سے کام کر رہی ہیں وہاں مجبوراً مہاجنوں کو قرض کے لین دین کا کاروبار بند کرنا پڑا ہے اور مہاجن بجائے اس کام کے دوسرے کاروبار شروع کر رہے ہیں۔

کچھ تو مذہبی رسم و رواج اور کچھ غیر تعلیم یافتہ ہونیکی وجہ سے کاشتکار پیش بینی نہیں کرتے اور فضول مذہبی بے جا رسومات میں جن سے معیار زندگی ہرگز نہیں بڑھ سکتا کثیر مقداریں روپیہ صرف کرتے ہیں اور ان کاموں میں جن سے معیار زندگی بلند ہوتا ہے روپیہ صرف نہیں کرتے۔

زمانہ قدیم میں کاشتکار اپنے خدمات اور تعلقات کو محسوس کرتا تھا اور زمیندار بھی اپنا برتاؤ کاشتکار کے ساتھ بہت عمدہ رکھتا تھا۔ زمیندار اور کاشتکار کے تعلقات نہایت خوشگوار ہوتے تھے اس لئے کاشتکاروں کو بہت سہولتیں حاصل تھیں۔ زمیندار کاشتکار کو ہر قسم کی مدد دیتا تھا اگرچہ دونوں کے تعلقات خادم و مخدوم کے سے ہوتے تھے لیکن ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے کیوجہ سے دونوں خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن آجکل کاشتکار اور زمیندار کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا صرف معاہدہ کی حد تک تعلق قائم رہتا ہے۔ زمیندار خود کو اس بات کا ذمہ دار نہیں سمجھتا کہ جب کوئی ضرورت پیش آئے کاشتکار کی مدد کرے اور نہ کاشتکار زمیندار سے مدد کی درخواست پیش کر سکتا ہے۔

متذکرۂ بالا اسباب میں جن کی وجہ سے کاشتکاروں کی معاشی حالت خراب ہوگئی اور ہوتی جارہی ہے۔

اب ہم کاشتکاروں کی معاشی حالت کی خرابی کو پیش نظر رکھکر یہ دریافت کریں گے کہ کیا تدابیر ان کی اصلاح کے لئے ہوسکتے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہونے سے وہ اپنی حالت درست کرنے کے قابل ہوجائیں سب سے پہلے ضرورت اس بات کی محسوس ہوتی ہے کہ ان کو اپنی بری حالت سے خبردار کریں کیونکہ جن لوگوں کے حالات درست کرنا مقصود ہو تو یہ ضروری ہے کہ خود ان میں ان کی بری حالت کا احساس پیدا کیا جائے ایسی صورت میں ان کی اصلاح بہت ممکن ہے کیونکہ وہ خود اپنی اصلاح کی کوشش کریں گے جب ہندوستانی کاشتکاروں کو اپنی بری حالت کا احساس ہوگا تو یقیناً ان کی اپنی کوشش سے بہترین نتائج برآمد ہوں گے۔ اس احساس کے پیدا کرنے کا ذریعہ تعلیم ہے۔ اس لئے ہندوستانی کاشتکاروں کو تعلیم دلائی جائے جب وہ تعلیم یافتہ ہوں گے تو ان کو ہر قسم کے معلومات حاصل ہوں گے اور اس طرح وہ متمدن اور ترقی یافتہ ممالک کا مقابلہ اپنے ملک سے کریں گے تو ان کو معلوم ہوجائے گا کہ ان کی معاشی حالت کس قدر خراب ہے۔

کاشتکاروں میں بیجا مذہبی رسومات اور رسم ورواج کی پابندی سختی سے کیجاتی ہے اور ان رسومات کے ادا کرنے میں بہت فضول خرچی سے کام لیا جاتا ہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے یہ فضول خرچی اور رسم ورواج کی بیجا پابندی تعلیم کی وجہ سے رفع ہوسکتی ہے۔

کاشتکاروں کی تعلیم کا معیار بلند نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان کو کاروبار چلانے کے لایق تعلیم درکار ہے ورنہ زیادہ تعلیم سے خواہ مخواہ ان کو نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ بلکہ این ہم رفت وآن ہم رفت کا مضمون ہوجائے گا ایک تو اس کی عمر کا زیادہ حصہ تعلیم میں ضائع جائے گا اور دوسرے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ کاشتکار نہیں رہے گا کیونکہ اس کو ہل جوتنا کھیت میں کام کرنا اور اسی طرح کے کام کسرشان معلوم ہونے لگیں گے اور وہ کاشتکاری کے پیشے کو بہت ممکن ہے کہ نظر حقارت سے دیکھے اور مذموم سمجھے اور کسی سرکاری ملازمت کے حاصل کرنے میں حیران وسرگرداں رہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ع وہ کھوئے گئے اور تعلیم پاکر۔ بیچارہ کاشتکاری سے تو ہاتھ دھو ہی بیٹھتا ہے۔ ملازمت بھی سخت کوشش کے بعد ملتی ہے تو نہایت ادنیٰ درجہ کی کیونکہ رسد نہایت سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور طلب محدود بلکہ گھٹ رہی ہے جدھر دیکھو تخفیف کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے۔

کاشتکاروں کو صرف اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ اپنا کاروبار عمدگی سے چلا سکیں اور ان کی تعلیم کی مدت بہت کم ہونی چاہئے۔ چار یا پانچ سال کی تعلیم بہت کافی ہے پہلے دو سالوں میں

ان کو کاشتکاری کے فن کی تعلیم دی جائے اور کاشتکاری کی تعلیم بھی خاص قسم کی ہونی چاہئے یعنی جس صوبہ میں خاص قسم کی پیداوار ہوتی ہے وہاں کے کاشتکاروں کو اسی پیداوار کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ اس پیداوار کو بہترین طریقہ پر پیدا کر سکیں۔

دوسری تدبیر یہ ہے کہ طریقہ مالگزاری اور بندوبست میں ترمیم کی جائے اور تحصیل مالگزاری میں جو سختیاں ہیں ان کو رفع کیا جائے۔ اور جہاں تک ممکن ہو کاشتکاروں کی سہولت کو مدنظر رکھا جائے۔

حکومت نے مختلف قوانین کاشتکاروں کی سہولت کیلئے رائج کئے ہیں۔ کاشتکاروں کے فائدے کے لئے حکومت نے ہندوستان کے سیول قانون میں کچھ ترمیم کی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ ان کی املاک کو خاص طور پر محفوظ رکھا جائے چنانچہ مجموعہ ضابطہ دیوانی کے ایک خاص دفعہ کی رو سے کاشتکاروں کے بعض املاک قرق ہونے سے مستثنیٰ کر دئے گئے ہیں۔ اسی طرح قانون امداد کاشتکاروں کے تحت کوئی کاشتکار کسی زر کی ڈگری کے لئے گرفتار نہیں کیا جا سکتا اور ہر کاشتکار کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنا قرضہ باقساط ادا کرنے کا مطالبہ کرے۔

قانون ربع بھی کاشتکاروں کے لئے مخصوص طور پر وضع کیا گیا ہے۔ ملک کے بعض حصوں میں اس مسئلہ کی غیر معمولی اہمیت محسوس کرتے ہوئے حکومت نے چند اور قوانین نافذ کئے ہیں جن کی رو سے زمین کو منتقل کرنے یا رہن کرنے کے حق پر مختلف موانعات عائد کئے گئے ہیں چنانچہ پنجاب صوبہ جات متحدہ اور بمبئی میں یہ تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔

سنہ ۱۹۰۱ء کے محکمہ کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ زرعی قرضداری کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ سررشتہ بندوبست کی طرف سے زمین پر کاشتکار کا مالکانہ حق تسلیم کیا گیا ہے جب تک کہ ان حقوق میں رکاوٹیں پیدا نہ کی جائیں کاشتکار کو قرضداری میں مبتلا ہونے سے روکنا ناممکن ہے اسی وجہ سے قانون انتقال اراضی پنجاب کی رو سے انتقال اراضی کے حقوق میں بہت سخت رکاوٹیں پیدا کر دی گئی ہیں کوئی کاشتکار عام ضلع کی اجازت کے بغیر اپنی زمین کسی غیر کاشتکار کے ہاتھ فروخت نہیں کر سکتا۔ دکن کے بعض علاقوں میں بھی اسی قسم کے قوانین نافذ کئے گئے ہیں۔

اگرچہ زراعتی ترقی میں ان تدابیر سے کوئی خاص نتائج برآمد نہیں ہوئے تاہم ان سے اس قدر فائدہ تو یقینی ہے کہ زمین اس سرعت کے ساتھ منتقل نہیں ہونے پاتی اور کاشتکار اپنی اراضی کے بھروسے پر اسی طرح قرض داری میں مبتلا نہیں ہو سکتے پھر بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ معاشی حالت کی اصلاح کی حقیقی تدبیر یعنی قرضے کی فراہمی کا مناسب و معقول انتظام جلد سے جلد کیا جائے۔

ہندوستانی کاشتکاروں کی مالی حالت میں جو اصلاح فوری اور اہم تریں ہے وہ قرضہ کی فراہمی

کا مناسب انتظام ہے تاکہ کاشتکار مویشی، تخم، آلات و اوزار زراعت وغیرہ خرید سکیں اور کھاد استعمال کرکے اور کاشت عمیق کے دوسرے طریق اختیار کرکے زمین کی زرخیزی کو بڑھا سکیں۔ حکومت نے پہلے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اس کی تدبیر کے لئے ۱۸۸۴ء میں قوانین قرضہ جات اصلاح اراضی اور ۱۸۸۴ء میں قانون قرضہ جات کاشتکاران منظور و نافذ کیا جو روپیہ ۱۸۸۳ء کے قانون کے تحت دیا جاتا تھا اس کو اصلاح زمین پر صرف کرنا ضروری تھا مثلاً کوآن کھودنا، موریوں اور نالیوں کی تعمیر و مرمت کروانا وغیرہ برخلاف اس کے ۱۸۸۴ء کے قانون کے تحت جو روپیہ دیا جاتا تھا اس کے لئے لازمی تھا کہ وہ مویشیوں، تخم، آلات زراعت وغیرہ خریدنے میں صرف کیا جائے۔ اگرچہ کاشتکاروں کی ایک معقول تعداد ان قوانین سے اپنی حالت سدھارنے میں مدد لیتی رہی لیکن تاہم جو امداد بحیثیت مجموعی ان قوانین سے حاصل ہوئی وہ تقریباً ناقابل لحاظ ہے۔ ایک تو اس لئے کہ جو رقم دی جاتی ہے وہ مقدار میں بہت قلیل ہوتی ہے دوسرے یہ کہ شرح سود اتنا کم نہیں ہوتا جس سے کاشتکاروں کو قرضہ لینے کی کافی ترغیب ہو اور تیسرے یہ کہ ان قوانین کے تحت قرضہ حاصل کرنے کا جو طریقہ ہے وہ بہت ہی سخت اور تکلیف دہ ہے۔ یہی حال قرضہ ہائے تقاوی کا ہے ان کی بھی مقدار قلیل ہوتی ہے اور ادائی ایک مدت معینہ کے اندر لازمی قرار دی جاتی ہے۔ ان تمام خامیوں کے علاوہ ایک اور عام شکایت یہ ہے کہ قبل اس کے کہ قرضہ کی رقم کاشتکار کے ہاتھ لگے اس کا ایک جزو نامعلوم طریقہ پر مفقود ہو جاتا ہے۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ادنیٰ شرح سود پر قرض دیا جائے اور کاشتکاروں کی ضرورت اور غرض کو اچھی طرح دریافت کر لیا جائے اور ان کی ضرورت کے موافق روپیہ دیا جائے نہ تو روپیہ ضرورت سے زیادہ دیا جائے کہ وہ فضول خرچ کر سکیں نہ کم کہ ضرورت رفع نہ ہو سکے اور ان خامیوں اور دقتوں کو رفع کیا جائے جو قرضہ ہائے تقاوی وغیرہ حاصل کرتے وقت کاشتکاروں کو درپیش ہوتی ہیں۔

کاشتکاروں کے سابقہ قرضہ کا معقول انتظام کیا جائے اور ان کی آئندہ مالی حالت کو درست رکھنے کا کافی خیال رکھا جائے۔

ان تمام انتظامات کے علاوہ ایک اور ضروری بات یہ بھی ہے کہ ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی دی جائے تاکہ زراعت اور صنعت و حرفت کے پیشوں میں توازن قائم ہو جائے اور ملک کے قدرتی وسائل ضائع نہ جائیں کیونکہ ہندوستان میں زراعت کیلئے جس قدر قدرتی وسائل موجود ہیں اسی قدر صنعت و حرفت کے لئے بھی موجود ہیں جہاں ہندوستان زراعت کے لئے موزوں ملک ہے وہاں صنعت و حرفت کیلئے بھی موزوں ہے اور وہی ملک زیادہ خوشحال ہو سکتا ہے جہاں زراعت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت بھی ترقی پذیر ہو۔

غرض جب تمام متذکرہ بالا امور کی طرف کافی توجہ کیجائیگی اور ان امور کا خاطر خواہ انتظام و بندوبست ہو جائیگا اور قوانین متعلقہ اراضی میں جہاں جہاں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہے اگر عمل کیا جائیگا تو پھر کافی توقع ہے کہ ہندوستان کے کاشتکاروں کی معاشی حالت بہت جلد درست ہو جائیگی

سفرنامۂ مصر جدید

مرتبہ

(میر دبیر قاضی مولوی ولی محمد صاحب بی۔ اے سیکرٹری روبکاری تاجدار بھوپال)

از

"مُلّا رموزی"

اِسلامی ہند کے لئے خصوصاً اور ہندوستان کے لئے عموماً مملکت مصر ایک ایسا دلچسپ ملک ہے جسکی مذہبی، سیاسی۔ اور اقتصادی، زندگی ہندوستان کی حیاتِ عامہ سے نہایت قریبی تعلق رکھتی ہے، صرف یہ سوال باقی رہجاتا ہے کہ آیا مصر ہندوستان کو متاثر کرتا ہے یا ہندوستان مصر کو؟ پس اِس لئے بھی مصری حالات کا علم ہمارے لئے ضروری اور مفید ہے، لیکن ہندوستان میں تعلیم کے فقدان اور یہاں کی غیر سیاسی آب وہوا کا جُلا پن ہے کہ ہندوستانی لوگ مصری مسائل سے وہ دلچسپی نہیں لیتے جو اُن پر فرض ولازم ہے، اور ان مسائل سے ہندوستانی دلچسپی لین تو کس طرح جبکہ اُن میں خود "کلرکانہ" تعلیم سے زیادہ کچھ ہے بھی نہیں، اِس لئے وہ اگر ملک مصر کو سمجھتے بھی ہیں تو صرف اس قدر کہ یہ ایک ایسا شہر ہے جس میں ایک نہر بہتی ہے جسے سوئیز کہتے ہیں اور اُس کے بیچ میں سے انگریزی ڈاک کا جہاز ہندوستان آجاتا ہے جس میں ہندوستان کے "گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل" لنڈن سے آیا کرتے ہیں اور بس۔ حالانکہ مصر اور اور حالات مصر سے ہندوستان کے دہنے اور جُلاہون تک کو بخوبی واقف ہونا چاہیئے تھا کیونکہ مصر میں روئی عمدہ اور بکثرت پیدا ہوتی ہے۔

مملکت مصر اور اُس کے حالات ہندوستانیون کے لئے اِس لئے بھی قابل مطالعہ تھے کہ مصر انسانی تہذیب وتمدن، اور تاریخ انسانیت کا وہ نقش اولین ہے جس میں برتر از قیاس عظمت کے حامل انسانون کے علمی، عملی، سیاسی، عرفانی، اور فکری، احوال وسوانح نمایان اور موجود ہیں، لیکن جن ہندوستانیوں کو۔ اندر سبھا امانت، طلسم ہوشربا، اور گل بکاؤلی، ایسی ٹھیٹر انہ یعنی خیالی کتابین حفظ یاد کر لینے کا ذوق ارزانی ہوا ہو اُن کو مصری حالات سے

اُتنی ہی دلچسپی ہو سکتی ہے جتنی دیوبند والوں کو اخبار "پائنیر" سے، البتہ ہندوستانیوں کی ایسی ترچھی ذہنیت والی قوم میں ایک ذرا سیدھی ذہنیت والی جماعت وہ ہے جسے "کالج رسیدہ" عرف تعلیم یافتہ کہتے ہیں، لیکن اوندھے طریق تعلیم کے اثر سے اِس جماعت کے نزدیک۔ بین الاقوامی سیاست، اور تاریخ و معارف کا مطالعہ ٹینس کرکیٹ اور فٹ بال سے کبھی افضل تھا نہ ہے، اِس لئے اس جماعت کو بھی مصری حالات کا اتنا ہی علم ہے کہ مصر ایک ایسے ملک کا نام ہے جہاں سے کیمبرج اور آکسفورڈ جاتے ہوئے گزرتے ہیں اور اس میں جہاز ٹھیرنے کی جگہ کو "پورٹ سعید" کہتے ہیں، ایک جماعت اللہ بخشے اپنے بڑے مولوی صاحب کے مزاج کی ہے جسے مصر کے متعلق صرف اِس قدر علم ہے کہ مصر کوئی شہر تھا جہاں حضور یوسف علیہ السلام اور زلیخا رہتی تھیں، اب اگر ہیں تو چند "گاندھیانہ دماغ" کے ہندوستانی لوگ ہیں جنہیں مصری حالات سے صرف چند دن سے اس لئے دلچسپی ہوگئی ہے کہ وہ سوراج کی تحریک میں مصری لوگوں کی نقالی چاہتے ہیں، یا پھر ہندوستانی اخبارات ہیں جو مصریات کے متعلق کبھی کبھی اتنا بتلا دیتے ہیں کہ

"اللہ عزیز رحمت کرے زغلول پاشا مصری لیڈر تھے نیز
مصری طلبہ سیاسیات ملکی میں جتنا حصہ لیتے ہیں اُتنا حصہ علی گڈھ کے
طلبہ ویسرائے وزٹ میں والنٹیر بنکر بھی نہیں لے سکتے، اور کہ جو مارشل لا
پنجاب میں نافذ ہو چکا ہے وہ مصر میں بھی نافذ ہو سکتا ہے بشرطیکہ
مصر کا وزیر اعظم مصری آزادی کا مطالبہ کرے۔"

یہ تو اُن عام ہندوستانیوں کا تذکرہ تھا جو مصری مسائل و افکار اور احوال و سوانح سے بے خبر رہنا ہی اپنا تعلیم یافتہ پن سمجھے ہوئے ہیں، لیکن اب ذرا اپنے مسلمانانِ ہند پر ایک نظر ڈال لیجئے سو اُن کے ہاں بجز اس کے کچھ نہیں کہ صبح کی نماز کے وقت تک سوتے رہنا اور دس بجے دن کو اُٹھکر انگریزوں کی چائے پینا۔ دفتر جانا۔ شام کو ہاکی اور ٹینس کھیلنا، اور رات کو تھیٹر یا سینما دیکھکر سو جانا اور پھر وہی "گزشتہ سے پیوستہ والی صبح" یہ اُن مسلمانانِ ہند کا نظام اوقات ہے جو چشم بدور تعلیم یافتہ تو کیا البتہ انگریزی یافتہ ہیں اور یہی ہیں وہ جو دنیا جہان کی تمام بیداری، روشن خیالی، ترقی، اور سیاست آگاہی، کو صرف اپنے لئے خاص سمجھے ہوئے ہیں، اب رہے عام مسلمانانِ ہند سو اُن کا علم ممالک اسلامیہ کی ذیل میں صرف اسقدر ہے کہ

"حکومت ترکی وہ جہاں چندہ بھیجا جاتا ہے۔"

"اور ملک مصر وہ جہان یوسف علیہ السّلام بادشاہ ہوئے تھے"۔

حالانکہ مملکت اسلامیہ مصر کی تاریخ اپنی اسلامی روایات، دینی آثار و اثرات، اور سیاسی عروج و فتوحات کے لحاظ سے مسلمانانِ ہند کے لئے "دعائے گنج العرش" سے زیادہ حفظ یاد کر لینے کے قابل تھی، لیکن مسلمانانِ ہند کی موجودہ پستی تاریخ اسلام ہی بھول جانے کا نتیجہ ہے، وہ اگر اپنی قومی تاریخ کو اپنی محافل و مجالس اور اپنے مطالعہ میں باقی رکھتے تو انہیں اپنے اسلاف کے عروج و اقبال کا اندازہ کر کے اپنی موجودہ پستی کے ازالہ کی فکر پیدا ہوتی، لیکن انہیں تاریخ کے صحیح فوائد و اثرات ہی کے سمجھنے کی توفیق نہیں۔ اور یہ سب کچھ اثر ہے علوم اسلامیہ دینیہ سے گریز و غفلت کا جس نے اصل میں علی گڈھی مسلمانوں کی صحبت کے اثر سے تمام مسلمانوں کا بیڑہ غرق کر ڈالا۔ اور وہ وقت دور نہیں۔ جب ہندی مسلمان بھی اپنے قومی شعائر کو خیر باد کہکر مصطفےٰ کمالی اور امان اللہ خانی ہیٹ پوشی اور سوٹ پسندی کو عین اسلامیت سمجھیں گے۔ اللّٰھم احفظنا۔

تاریخ کے بعد سیر و سیاحت یا سفرنامہ خوانی کا رتبہ ہے جو اصل میں تاریخ ہی کا ایک جزو اور حصہ ہے، لیکن ہندوستان میں اول تو سفرنامہ نویسی" دہلوی روزنامچہ نویسی" کے رنگ میں ڈھل چکی ہے یا پھر سفرناموں میں یہ لکھا جاتا ہے کہ

"جب میرا جہاز عدن سے سویز میں داخل ہوا تو پورٹ سعید پر مسٹر قریشی ملے اور انہوں نے لکھنؤ کے آم کھلائے لندن میں مسٹر ہاشمی نے چائے پر بلایا، یہ علی گڈھ میں میرے کلاس فیلو تھے، ہائیڈ پارک میں مسٹر قادری ملے جو عرصہ سے کیمبرج میں فن غلامی کی تعلیم پا رہے ہیں رہے چشتی اور نقشبندی سو وہ شام کو سیسل ہوٹل میں مل جایا کرتے ہیں"۔

اب اگر اس سلسلہ میں روشن خیالی یا قومیت کا بڑا تیر مارا تو سفرنامہ میں اتنا اور لکھدیا کہ

قیام لندن کے زمانے میں مسٹر ریمزے میکڈانلڈ لارڈ برکن ہیڈ اور سر مائیکل اوڈوائر سے میں نے جو ملاقاتیں کیں ان سے اندازہ ہوا کہ یہ سب کے سب ہندوستان کو عمر بھر غلام رکھنا چاہتے ہیں"۔

اور جو یہ سفرنامہ لکھنے والے مسلمان ہوئے تو یہ ضرور لکھیں گے کہ

لندن سے ووکنگ جا کر میں نے خود دیکھا کہ خواجہ کمال الدین تبلیغ اسلام کے نام سے جو چندہ وصول کرتے ہیں اس سے یہاں دو مرغی انڈا خرید کر کھا جاتے ہیں"۔

جس کا خلاصہ یہ نکلا کہ انگلستان میں رہے سہے اسلامی تبلیغ کے سلسلہ کو بھی ختم ہی کر دیا جائے اور احمدیوں کو جھنجی کوڑی بھی نہ دی جائے، یا پھر سفرنامہ کی تیسری ترکیب یہ ہے کہ اس میں لکھدیا کہ۔

"ہر اسٹیشن پر میرے اس قدر مریدوں نے استقبال کیا ہاتھوں کو بوسہ دیا اور نا شستہ پکا کر لائے"

مگر یہ کہیں نہیں لکھیں گے کہ۔ اسقدر روپیہ نذرانے میں وصول ہوا۔

اِن حالات میں ایک سفرنامہ حضرت محترم مولوی قاضی ولی محمد صاحب مدظلہ کا نظر سے گزرا جو اصل حقیقت میں مصر جدید کی ایک محققانہ تاریخ ہے واضح ہو کہ اس اہم علمی سفرنامہ کا مطالعہ جس کامل سکون و فراغت کو چاہتا ہے اُس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملاحظہ کیجئے کہ جب ہم اسے غور سے پڑھنے بیٹھے تو آواز آئی "ذرا زور سے پڑھو تو ہم بھی سنتے جائیں" آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ آواز اُن کی تھی اِس فقرہ پر ہمیں اُن پر کئی قسم کا تاؤ آیا۔ مثلاً

تاؤ نمبر اول اِس خیال سے کہ وہ اِسقدر تاریک خیال کیوں واقع ہوئی ہیں کہ جب ہم کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہونے کے قریب پہنچتے ہیں تو ان سے بولے بغیر کیوں نہیں رہا جاتا۔

تاؤ نمبر دو اِس خیال سے آیا کہ "ذرا زور سے پڑھو ہم بھی سنتے جائیں" کا جو مطالبہ ہم سے کیا گیا اس حساب سے یہ اہم علمی کتاب خاصی طلسم ہوشربا ہو گئی جسے محفل میں چلا چلا کر پڑھنا ہی کمال قابلیت سمجھا جاتا ہے اور محلے والے اُسی کو قابل ترین "منشی جی" سمجھتے ہیں جو ہر کتاب کو ۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا چلا کر پڑھے، اور ہاں یہ بھی سوال فرمایا کہ۔ کتاب پڑھتے وقت یہ سُرخ پنسل لیکر"

"کیوں بیٹھا کرتے ہو؟؟؟

کہیئے کل کلاں کو یہ بھی دریافت کر گزرینگی کہ تم کتابیں ہی کیوں پڑھا کرتے ہو؟؟؟

ہم نے بھی یہ ترکیب اختیار کی کہ فوراً عرض کیا کہ

کچھ نہیں اس کتاب سے اپنے ننھے میاں کے کھیلنے کے لئے عمدہ عمدہ تصویریں چھانٹ رہے ہیں

اِس جواب سے اُن کو جو اطمینان حاصل ہوا اُسے وہی لوگ جان سکتے ہیں۔ جنہیں ایک ایک

ننھے میاں اور ایک ایک "گرلز اسکولی" عطا ہوئی ہیں، اور چونکہ اس جواب سے ہمارا مقصد اُن کو خموش کر دینا تھا سو الحمد للہ کہ وہ اب سکون سے گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئیں، اور ہم نے نہایت آن بان سے سفرنامۂ مصر کا پہلا صفحہ آنکھوں کے سامنے تان لیا اور پڑھتے پڑھتے ابھی اس کی فہرست مضامین تک ہی پہنچے تھے کہ آواز آئی۔

"دس بج گئے دس"

مطلب یہ تھا کہ تم جو علامہ شبلی بنے بیٹھے ہو یہ اس لئے مناسب نہیں کہ علامہ مغفور ایسی فراغت نصیب دوست تمہیں حاصل نہیں۔ لہٰذا اٹھو اور مطالعہ چھوڑ کر دفتر جاؤ اور نوکری بجالاؤ اس آواز پر قریب تھا کہ ہمیں پھر تاؤ آجائے مگر فوراً ہی خیال آیا کہ اگر ہمیں کسی کتاب کو پڑھنا ہی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں روک نہیں سکتی، ورنہ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ ہر مطالعہ کرنے والا نظام حیدر آباد کا علمی وظیفہ خوار ہو کر ہی کامل سکون سے مطالعہ کر سکتا ہے اور جو وظیفہ نہ ہو تو مطالعہ ناممکن۔ لہٰذا ہم فوراً دفتر کے لئے اُٹھے مگر اس طرح کہ سفرنامہ کو آنکھوں اور ہاتھوں سے جُدا نہ کیا اور کھانا طلب کیا، اور شروع کر دیا مگر سفرنامہ کو علیحدہ نہ کیا۔ کھانا کھانے میں مطالعہ جاری رکھنے سے صرف یہ ہوتا ہے کہ بعض نوالے بغیر ترکاری لگائے کھانا پڑتے ہیں سو کھائے مگر سفرنامہ کو جدا نہ کیا۔ پھر نہایت غصہ کے لہجہ میں کہا۔ لاؤ شیروانی، پان کھلاؤ۔ ارے موزے بھی پہناؤ گی یا نہیں؟ دیکھو ننھے میاں گھر سے باہر کھیلنے نہ جانے پائیں کیونکہ آج کل فرسٹ کلاس موٹر ڈرائیور وہی مانا جاتا ہے جو خلاف قانون نہایت تیز موٹر چلائے۔ ایسے احکام صادر کرتے وقت ہم نے لہجہ اس لیئے غضبناک بنا لیا تھا کہ وہ کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ کھاتے وقت مطالعہ جاری رکھنے سے وہ بہت ناراض ہوا کرتی ہیں لہٰذا جب ضروریات سے فارغ ہو گئے تو دفتر جانے کے لئے بھی اس طرح باہر نکلے کہ سفرنامہ کو جدا نہ کیا، تمام راستہ یہی حال رہا کہ سفرنامہ ہاتھوں پر اور آنکھیں سفرنامہ پر اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ تمام راستہ کسی کو سلام بھی نہ کرنا پڑا۔ بلکہ لوگوں نے اُلٹا ہم کو ہی سلام کیا اسپر بھی ہم نے سفرنامہ کو جدا نہ کیا راستہ چلتے چلتے کتاب یا اخبار پڑھنے میں بے شمار فائدے ہیں، مثلاً ایک فائدہ یہ ہے کہ شناسا حضرات اور احباب کے اس تقاضے سے مطالعہ کرنے والا محفوظ رہتا ہے کہ

"اماں ابتو تم عید کے چاند ہو گئے"

"آخر کہاں رہتے ہو؟"

"اچھا تو گھر پر ملنے ہی کا وقت بتلا دو ہم خود آجائیں گے؟"

"اب کہاں جا رہے ہو؟ اور گھر میں تو سب طرح خیریت ہے؟"

دوسرا فائدہ یہ کہ مطالعہ کرنے والا سرِ راہ کسی موٹر کے تصادم پر بازاری ہجوم اور میرے کے سرمہ اور دانتون کے منجن فروخت کرنے والے لیکچرر کے بازاری لیکچر اور مداری کے تماشہ میں نہیں ٹھہرتا۔ صرف موٹر میں بیٹھنے والے لوگ سرِ راہ مطالعہ کرنیوالے کو بیوقوف سمجھتے ہیں مگر یہ نہیں سمجھتے کہ یہ سرِ راہ مطالعہ کرنے والا علمی آدمی ہے مگر ملازمت سے مجبور ہے،

تیسرا فائدہ یہ کہ راستہ میں مطالعہ کرنے سے آدمی منزلِ مقصود تک جانے سے تھکتا نہیں۔ بعض وقت راستہ میں اُسپر غنودگی طاری ہو جاتی ہے، اور اُس کی رفتار خود بخود کم ہوتی چلی جاتی ہے، پس اِن فوائد کے لحاظ سے ضرورت ہے کہ تمام علمی لوگ سڑکوں بازاروں اور گلی کوچوں میں مطالعہ فرمایا کریں، اب ذرا تصور کیجیے اُس پُر لطف وقت کا جب ان فوائد کے لئے ایک سڑک پر مولانا ابوالکلام آزاد کوئی کتاب پڑھتے چلے جا رہے ہوں تو کسی بازار میں گاندھی جی کھڑے اخبار پڑھ رہے ہوں، لیکن چونکہ سرِ راہ مطالعہ کرنا صرف رسم کے خلاف سمجھا گیا ہے اِس لئے بیوقوف لوگ اِسے بیوقوفی سمجھیں گے ورنہ مطالعہ کے شوقین لوگ دل سے یہی چاہتے ہیں۔ اور جو ابھی دیسرائے ہند کسی سڑک پر کھڑے ہوئے اخبار پڑھتے نظر آجائیں تو اُسی وقت سے ہندوستان کے بڑے بڑے وقار الملک اور بڑے بڑے وہم اقبالہ قسم کے لوگ سڑکوں ہی پر مطالعہ کرنا فخر سمجھیں، دور کیوں جائیے ہو اس نقالی میں، ذرا امیر امان اللہ خان ہی کی وہ نقلی کنپلی ملاحظہ فرمالیجیے جو سوٹ اور ہیٹ کے متعلق اُنہوں نے مغربی لوگوں کو دیکھکر حال ہی میں بدلی ہے، ورنہ آپ ہی بتلائیے کہ افغان ایسی اسلام شعار قوم کہیں قومی شلواروں کو مغربی پتلون سے بدل سکتی تھی؟

الحاصل دفتر کے دروازہ تک سفرنامہ کو آنکھوں سے جدا نہ کیا۔ آپ سمجھے ہوں گے کہ واقعی مُلّا رموزی صاحب کوئی ایسے ہی تھرڈ کلاس قسم کے بزرگ ہیں جنہیں گھر میں سکون سے بیٹھکر مطالعہ نصیب نہیں ہوتا! لاحول ولا امان یون کیون نہ سمجھو کہ سفرنامہ ہی اِس قدر دلچسپ تھا کہ اسے شروع کرکے بغیر ختم کیئے چھوڑ دینا اُتنا ہی دشوار تھا جتنا کسی

گم شدہ عزیز کی تلاش" کا اعلان پڑھ کر گمشدہ کا حلیہ اور انعامی رقم کا نہ پڑھنا۔

سفرنامہ کی اغراض تو بے شمار ہیں مثلاً اور کچھ نہیں۔ تو سائمن کمیشن کی خوشامد ہی میں لاہور سے لنڈن چلا جانا۔ یا دردسر کے علاج کے لئے ہندوستان کے "کوفتہ بیختہ جوش دادہ حکیمون" کو چھوڑ کر لندنی ڈاکٹرون سے علاج کے لئے لندن جانا بھی سفر ہوتا ہے یہ بھی سفر ہے کہ پیرس میں ایک ہوٹل کرایہ پر لیکر بس اُس میں ٹھیرے ہوئے ہیں اور ہندوستان آنے کا نام بھی نہیں لیتے۔ یہ بھی سفر ہے کہ امریکہ کی کسی عورت سے ہندوستان میں نکاح کیا اور پھر پیرس کے کسی ہوٹل میں جا بسے، یہ بھی سفر ہے کہ خلافت کمیٹی کے چندہ سے حج کو چلے گئے اور راستہ میں جس شہر میں چاہا ہندوستان کے نمایندے بنکر ٹھیر گئے، یہ بھی سفر کہلاتا ہے کہ رات دن کسی انجمن یا یتیم خانے کے نام سے شہر بہ شہر گھومتے پھرے، یہ بھی سفر ہے کہ کسی قومی لیڈر کی نگرانی کرتے ہوئے کانگریس کے سالانہ اجلاس تک جا پہنچے، لیکن ایسے سفر کرنے والوں کو حق نہیں کہ وہ اپنا سفرنامہ لکھ سکیں، البتہ سفرنامہ وہ شخص لکھ سکتا ہے جو سرکاری خرچ سے سفر کرے اور سفر کے حالات میں اپنی قوم کو یہ بھی بتا دے کہ فلاں ملک میں تجارت اور فوج کشی کے بہت کافی مواقع موجود ہیں ایسے سفر کرنے والوں کا نام عام طور پر مسٹر فلبی یا سر گلبرٹ کلیٹن ہوا کرتا ہے۔ مگر ہمارے خیال میں تمام قسم کے سفرناموں میں یورپی قوموں کے سفرنامے نہایت مکمل اور منفعت بخش ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان سفرناموں کی غرض ایک اور صرف ایک ہوا کرتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں ایشیا کے کسی نہ کسی ملک یا شہر پر قبضہ کرنے کا طریقہ ضرور بتلا دیا جاتا ہے، یا پھر یہ لوگ جس ملک میں سفر کر کے جاتے ہیں وہاں کے عام حالات اور عام لوگون کو عبارت اور تصاویر سے اسقدر ذلیل ثابت کرتے ہیں کہ دنیا جہان میں اُن کی رسوائی ہوتی ہے جیسے ایک "امریکہ زادی" نے۔ مدر انڈیا۔ کے نام سے ہندوستان کا سفرنامہ لکھکر تمام ہندوستانیون کو قلی مزدور ثابت کر کے رکھدیا، یورپ کی قومیں جب ایشیا کے کسی ملک کو فتح کرنا چاہتی ہیں تو پہلے وہ سفرنامہ لکھنے والون ہی کو روانہ کرتی ہیں مثلاً فرض کیجئے کہ اگر جرمن قوم ہندوستان پر حملہ کرنا چاہے تو وہ پہلے ہندوستان کے راستہ سے ایک جماعت روانہ کریگی اور مشہور یہ ہوگا کہ جرمن کی یہ جماعت کوہ ہمالہ کی بلند ترین چوٹی تلاش کرنے حاضر ہوئی ہے اسی طرح اٹلی والے کہیں گے کہ ہم تو ہوائی جہاز پر قطب جنوبی کی تلاش میں نکلے ہیں لیکن کوئی ان سے دریافت کرے کہ کیون صاحب یہ قطب جنوبی اور قطب شمالی کی تلاش میں حضرت

جنرل نوبائیل کی کیا ضرورت ہے؟ امریکہ کو اگر فرانس پر چڑھائی کرنے کی ضرورت ہوگی تو وہ ایک شخص کو ہوائی جہاز پر سوار کر کے بحر اوقیانوس پر سے فرانس بھیجے گا اور اعلان یہ کریگا کہ اس شخص کو ہوائی جہاز پر ایک ہی پرواز میں فرانس تک پہنچنے کا بیحد شوق ہے، اسی طرح اگر برطانیہ ایران پر نہر سویز کی طرح اقتدار رکھکر ہندوستان کو غلام بنائے رکھنے کا طالب ہوگا تو چند لوگوں کو ایران میں رہنے کے لئے بھیجے گا اور بیان یہ کریگا کہ یہ لوگ صرف ایران کے راستہ سے ہندوستان ہوائی ڈاک لیجایا کریں گے، اس لئے خلیج فارس پر ایک ہوائی مرکز بناتے ہیں اور کرتے ہی کیا ہیں؟

لیکن اپنے ہندوستان کے لوگ اول تو مارے اہل وعیال کے سفر ہی نہیں کرتے اور جو سفر کرتے ہیں تو ان تمام مناقانہ اغراض سے قطع نظر کر کے صرف علم وتمدن اور دین وملت کے پرانے کھنڈر دیکھنے جایا کرتے ہیں اور اسی لئے ہندوستانی سیاح ہمیشہ انہی ممالک تک جاتے ہیں اور ایسے ہی ممالک کے سفرنامے لکھتے ہیں جہاں ان کی قومی روایات کے آثار موجود ہوں، اور بشرطیکہ یہ ممالک اتنے قریب ہوں کہ سو سوا سو روپیہ میں آدمی وہاں پہنچ جائے، ورنہ کیا وجہ ہے جو کوئی ہندوستانی صحرائے افریقہ یا کوہ قاف کا سفرنامہ نہیں لکھتا؟ یہ تو صرف انگریز قوم کی بلند پایہ ہمت ہوتی ہے جو ارض سبا کی ڈوبی ہوئی عمارتوں کو بھی آج تلاش کرنے میں مصروف ہے۔ پس مسلمانانِ ہند کو اگر کوئی جذبہ آمادہ سفر وسیاحت کرتا ہے تو وہ صرف قومیت کا روحانی جذبہ اور بس، لہذا یہی جذبہ اگر دوسرے ممالک کے مسلمان بھائیوں کے صحیح اور تاریخی وتمدنی علمی وسیاسی، اور اجتماعی حالات وافکار کو ہم تک پہنچا دے ایسی صورت میں کہ اُسے کوئی سرکاری خرچ اس سفر کے لئے نہ ملے تو وہ یقیناً ہزاروں شکر گزاریوں کا مستحق ہے۔

پس ایسے مسلمان سفرنامہ نگاروں میں حضرت محترم مولوی قاضی ولی محمد صاحب بی، اے۔ ایک امتیازی حیثیت رکھنے والے سیاح ہیں جو باوصف اپنی گوناگون اور ناگوار ذمہ داریوں کے اسلامی ممالک کی سیاحت اور وہاں کے تاریخی حالات کی قلمبندی سے اسی طرح نہیں چوکتے جس طرح ہم مضمون نگاری سے عوام کی نظر میں تو ایسے لوگ صرف "اہل قلم" ہی سمجھے جاتے ہیں لیکن ارباب علم وفضیلت کے نزدیک یہی لوگ ہیں جنکے دماغ وقلم کی کاوشیں اقوام وملل کی تاریخی بنیادیں مضبوط کرتی رہتی ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ لالہ سری رام مؤلف "خمخانۂ جاوید" اسقدر مالدار ہو جائیں کہ بنارس یونیورسٹی کو پانچ لاکھ روپیہ دے مریں اور حضرت سدرشن فسانہ نگاری ہی سے پنجاب یونیورسٹی سے پانچ سو روپیہ نقد انعام لے مریں۔

اور حضرت قاضی صاحب اور آپ کے ضیاء الملک مُلّا رموزی صاحب کو ایک فورڈ موٹر بھی نہ ملے صرف فرق یہ ہے کہ لالہ سری رام جی اور لالہ سدرشن جی نے جو کچھ لکھا وہ اُس ہندو قوم کے لئے جو آج معارف پسندی کے اثر سے دنیا کی سربلند اقوام کے ساتھ دوڑ رہی ہے اور حضرت قاضی ولی محمد صاحب اور حضور مُلّا رموزی صاحب اُس مسلمان قوم کے لئے لکھ رہے ہیں جس کی آل انڈیا ٹورنامنٹ پسندی، یا تھیٹر اور سینما بینی ذلت وخواری کے ایک ایسے تاریک غار میں لے جارہی ہے جسکی ہولناکی سے اُس کا ہر فرد ابھی بے خبر ہے لاحول ولا۔

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ ہنر مند تھے ہم

بہر حال حضرت گرامی قاضی ولی محمد صاحب کی سالہا سال کی جگر کاوی اور بادیہ نوردی اب "مصری سفرنامے" اور "سفرنامۂ اندلس" کی مطبوعہ صورت میں اسوقت ہمارے سامنے ہے حضرت قاضی صاحب نہ فقط مغربی ومشرقی علوم کے ماہر ہیں بلکہ ممدوح پاک باطنی، خلوص، تاریخ دانی، اور مسلم پرستی کا ایک ایسا نمونہ ہیں جو خاکم بدھن اِس سفلہ پرور مسلم قوم میں اگر نہ ہوتے تو اچھا تھا آہ۔ مجھے معلوم ہے اور اچھی طرح معلوم ہے کہ عالی جناب قاضی صاحب نے محض قومی ومذہبی جذبہ کے تحت برسوں سے اپنے شب کے آرام اور اپنی دولت کو اسلامی آثار وروایات کے بقا وتحفظ کی خاطر قربان کر رکھا ہے لیکن مسلمانوں کو اتنی بھی فرصت نہیں کہ وہ قاضی صاحب کے ان جواہر سفرناموں کو ملاحظہ ہی فرمالیں، حضرت قاضی صاحب نے متعدد بار بذات خود سفر فرما کر ۱۹۲۶ء میں دولت شاہانہ اسلامیہ اُندلس کا جو سفرنامہ مرتب فرمایا ہے وہ ادبیات اُردو اور اسلامیات ہند کا ایک ایسا عزیز ومحبوب ذخیرہ ہے جس کی شکر گذاری سے کم از کم راقم الحروف کا قلم عہدہ برآ نہیں ہوسکتا، اور اسی لئے اس جلیل الشان سفرنامۂ اُندلس پر اظہار خیال کو کسی کافی فرصت کے لئے محفوظ رکھا ہے؛

اسوقت قاضی صاحب قبلہ کا وہ نظر نواز ونظر آرا سفرنامۂ مصر ہمارے سامنے ہے جو صفحہ اول سے صفحہ آخر تک فن طباعت وکتابت کاغذ اور مصوری کے جلوہ پرور نمونوں سے مزین ہے، اور حق یہ ہے کہ مطبع نظامی لکھنؤ نے اس سفرنامہ کو حسین وجمیل بنانے میں فن طباعت کا وہ تمام سلیقہ صرف کر دیا ہے جو اپنے علی گڈھ کے مشہور مولانا مولوی باہتمام محمد مقتدی خان شروانی ہی کو حاصل تھا، کتابت کی دیدہ زیبی، کاغذ کی چمک اور صفائی پھر تصاویر کی نفاست کو

اپنی اپنی جگہ پر کچھ اِس خوش اسلوبی سے باقی رکھا ہے کہ آنکھیں اس کتاب کے ہر صفحہ میں ڈوب جانا چاہتی ہیں، یہ سفر حکمت اثر کتاب کے (۲۴۲) صفحات پر ختم ہوتا ہے، تصاویر کی تاریخی اور معنوی اہمیت اور بلند پائیگی کا وہ عالم ہے کہ اگر زبان اُردو میں فن مصوّری صرف بند آنکھوں والے "عمل چغتائی" ہی کے لئے محفوظ و مخصوص نہیں ہوگیا ہے تو مان لیجیے کہ اس کتاب کی تصاویر ہی ایک مستقل نگارخانہ چینی و نقش ارژنگ ہے جو ارباب ذوق سلیم کے لئے سامان صد نظارہ فراہم کرتا ہے۔ اِن جمال افزا اور تاریخی تصاویر کی تعداد ( ) ہے۔ پھر یہ تصاویر وہ نہیں۔ جو محترم مؤلف نے کسی سہ سال ساڑھے پانچ آنہ والی دہلوی دکان سے خرید کر چپکا دی ہوں، بلکہ ان میں سے ہر تصویر مؤلف کتاب کے بذات خود معاینہ کر کے موقع پر کھینچی ہے، اور اسی لئے تمام تصاویر نہایت صحیح اور برمحل ہیں۔ اور حقیقت میں صرف ان تصاویر ہی کو یکجا جمع کر لینے سے ہندوستان ہی میں مصر نظر آجاتا ہے، اور ہم کہیں گے کہ اگر پنجاب میں ڈاکٹر سر اقبال اپنا کوئی لکچر لالٹین کے ذریعہ اچھی طرح سمجھا سکتے ہیں تو حضرت مؤلف سفرنامہ مصر نے مصری تصاویر سے اس علمی و تاریخی سفرنامہ کو اُن سے زیادہ آسانی سے سمجھا دیا ہے اور بات ہے کہ غفرلہٗ اور عفی عنہ قسم کے لوگ میسجک لالٹین کو جائز اور تصاویر کو ناجائز کہدیں۔

ترتیب سفرنامہ میں "عرضِ حال" کے عنوان سے پانچ صفحات میں ضروری اسباب مالیف جمع ہیں اور ان میں انتہائی عجز و انکسار سے وہی کام لیا گیا ہے جس پر مشرق کے نہ فقط سلف صالحین بلکہ جملہ ارباب فضل و کمال فخر کرتے رہے ہیں یہ نہیں لکھا کہ

> "جب میں ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو احباب کا اس قدر ہجوم تھا کہ تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی اچھن صاحب ناشتہ لائے تھے، جمیلا بانو نے امام ضامن باندھا تھا۔ اور فرسٹ کلاس کی ایک سیٹ آنریبل سر ملک عمر حیات خان ٹوانہ نے پہلے ہی محفوظ کرالی تھی، جہاز کا ٹکٹ مولانا شوکت علی لیئے کھڑے تھے، پلیٹ فارم پر گروپ لیا گیا اور میں بلدیہ بمبئی کا ایڈریس سنکر جہاز پر سوار ہوا"

عرض حال۔ کا یہ حصہ مصر کے اون مشائخ اور اکابر افراد کے اسمار گرامی پر ختم ہوتا ہے جن سے اس کتاب کی ترتیب اور واقعات کی تصحیح میں امداد لیگئی ہے، اور مصری اکابر و اعاظم افراد کے یہی وہ جلیل العظمت نام ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی تاریخی عظمت اور واقعی صحت کے بقاء کے لئے محترم مؤلف نے کسقدر کوشش و کاوش سے کام لیا ہے!

اِس کتاب میں مصر قدیم اور مصر جدید کی مکمل تاریخ مع جغرافی احوال کے جمع کر دی گئی ہے اور علم و تمدن، تہذیب و معاشرت، زراعت و تجارت اور اخلاق کے ہر شعبہ پر نہایت درجہ تکمیل کے ساتھ حالات بیان کئے گئے ہیں، ان واقعات کو ذہن نشین کرانے کے لئے مؤلف نے جو طرز تحریر اختیار کیا وہ اس درجہ سہل۔ عام فہم اور لطافت بار ہے کہ ہر حیثیت کا قاری اس سے مستفید ہو سکتا ہے اور مزید آسانی کے لئے محترم مؤلف نے برمحل اشعار سے اسقدر کام لیا ہے کہ تمام اشعار کو ایک جگہ جمع کر لینے سے انجمن حمایت اسلام لاہور کی قومی نظموں کا مجموعہ نہیں تو۔ مسدس حالی۔ ضرور بن سکتا ہے اور اس سے مؤلف کے ادب اُردو سے انتہائی واقفیت یا اصول خطابت کے کمال کا پتہ چلتا ہے؛

آج کل تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں علی گڈھ والوں نے اخبار پائنیر سے یہ بات سن لی ہے کہ

"مورخ کو غیر جانب دار ہونا چاہیئے۔ عام اس سے کہ واقعات اُس کی قوم سے متعلق ہوں یا کسی غیر قوم سے"

اور اسی لئے کسی تنقید و تبصرہ کے وقت اس اصل کار پر بہت زور دیا جاتا ہے لیکن ہم بے حد خوش ہیں کہ اس کتاب میں اس لغو و لایعنی اصل کی دھجیاں اُڑا دی گئی ہیں اور کتاب سرتاسر قومی جذبہ عصبیت میں ڈوبی ہوئی ہے، اور یہ اس لئے کہ یہ ضابطہ تحریر تو صرف اُن کتابوں کے لئے ہے جنکی غایت صرف تحریر واقعات ہو، اور فطری طور پر یہ طریق غیر جانب داری صرف موسیقی کی ایسی تجارتی کتابوں ہی میں برتا جا سکتا ہے جن کا مقصد گوہر جان کلکتے والی، پیارے صاحب اور جانکی بائی الہ آباد کی ٹھمریاں جمع کر دینا ہو۔ لیکن جس اہل قلم کا مقصد ہی قومی تاریخ نگاری ہو اُس سے نہ کہو کہ وہ غیر جانب داری کے اصول پر کاربند رہے، اس سے نہ چاہو کہ وہ غیر متعصب بن جائے ورنہ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ جس شخص کا گھر جلے آپ اُس سے کہتے ہیں کہ تو بھی اس بربادی پر اتنا ہی افسوس کر جتنا کہ عام تماشائیوں کو ہے، اور یہ امر واقع ہے کہ تعصب و غیر جانب داری کی اس غلط فہمی نے مسلمانان ہند کو دشمنوں کے مقابل بے انتہا نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی آج اُن کے بس کی بات نہ رہی، اس لئے بالغ نظر مؤلف سفرنامہ مصر نے تعصب و رواداری کے اس باریک فرق کو محسوس کرتے ہوئے مصر کے ہر اسلامی حادثہ پر اتنے ہی آنسو بہائے ہیں جتنا کہ اس حادثہ کا حق تھا، پھر یہی نہیں کہ مؤلف نے اس کتاب کو۔ مرثیہ مصر بنا دیا

بلکہ جن مواقع پر مصری حالات دل خوش کن ہیں وہاں مؤلف کا قلم بھی بے انتہا مسرور و شادمان نظر آتا ہے مگر ان صحیح اسلامی تاثرات کا مورخانہ کمال یہ ہے کہ اسقدر جذباتی تحریر کی مشتعل رَو کو ہر جگہ آسانی سے قابو میں بھی کر لیا ہے، اور مساوات و رواداری کے صحیح معیار کو سامنے رکھتے ہوئے واقعات نگاری کی دیانت کو نہایت فراخ حوصلگی سے ادا کیا ہے، مثلاً مؤلف نے مصر سے تعلق رکھنے والی یورپی اقوام کی بدسلوکی کے سلسلہ میں جہاں یونانی قوم کو کذاب، فرانسیسی قوم کو مکار۔ اور اطالوی قوم کو غدار لکھا ہے وہاں برنبائے واقعات انگریزی قوم کو غیور۔ اولوالعزم اور معارف پسند لکھنے میں کسی قومی تعصب اور عداوت کو راہ نہیں دی ہے۔

طرز تحریر یا تالیفی دیانت کی اس خوش اسلوبی کے بعد سفرنامۂ مذکور میں ایک اور قابل قدر جوہر بھی ہے۔ اور وہ انداز بیاں ہے، جو انشاء و انشاد کے اس رنگین اصول کے تحت ہے کہ واقعات کو ایسے الفاظ میں بیان کیا جائے کہ واقعات قاری کی نظر سے اُتر کر اُس کے دل میں بیٹھ جائیں، اور اس مقبول اصول کے لئے فن انشاء نے ظرافت کو جگہ دی ہے لہٰذا مؤلف جہاں واقعات نگاری میں دیوبندی متانت اور خشکی سے کام لیتا ہے وہاں وہ ایسے جملے بھی جڑ دیتا ہے جنکی طراوت و لطافت سے خوش طبعی اور تفنن کا وہ جذبہ اُبھر آتا ہے جو کسی خشک کتاب کے مطالعہ کی گرانی کو دور کر دیتا ہے، اور پھر کمال یہ کہ یہ ظرافت اُردو اخبارات کے ظریف کالموں کی سی جسری اور مصنوعی ظرافت نہیں بلکہ اسقدر معنی آفرین اور دلپسند ہے کہ باید و شاید مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ۔

"مدا ذکانین اس قمر طلعت گروہ سے بھری ہوئی ہیں جو گاہک کی اچھی طرح حجامت کرنے میں طاق ہیں"

گو یہ عبارت واقعی معنی میں استعمال ہوئی ہے یعنی حجاموں کی دکانوں کے سلسلہ میں یہ فقرہ لایا گیا ہے لیکن اُردو زبان والے جانتے ہیں کہ حجامت کرنا۔ لوٹنے یا دھوکہ دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"مسز ڈنسٹن کی ملاقات ہوئی اُس کے بعد ان کے شوہر لارڈ کرزن سے یاد اللہ ہوئی"

لفظ حجامت کے بعد لفظ یاد اللہ ہوئی اسقدر معنی آفرین اور ظریف ہے۔

یہ ہے وہ انداز تحریر اور طرز تالیف جس نے اس سفرنامہ کو ہر اردو دان کے لئے مفید و ضروری بنا دیا ہے، اور مصری حالات و مقامات کے اِس دلنواز مجموعے کا مطالعہ ہر اُس ہندوستانی پر فرض ہے جو ایشیائی سیاست و قومیت کا دلدادہ ہے عام اس سے کہ وہ ہندو ہو

یا مسلمان۔

"واقعات نگاری کے سلسلہ میں فاتح ریف غازی محترم محمد بن عبدالکریم اسیر فرانس کہا کرتے ہیں (خدا انہیں فرانس اور اسپین پر لشکر کشی کا پھر موقع عطا فرمائے) کہ سفرنامہ میں بہترین چیز دقت نظر۔ یا تحقیق ہے۔ سو اس کلیہ کو حقیقت میں مؤلف سفرنامۂ مصر نے جس درجہ پورا کیا ہے اُس کا اندازہ سفرنامہ کی اس فہرست مضامین سے کیجئے۔

ملک مصر جغرافی لحاظ سے۔ نہر سویز۔ خدیو اسمٰعیل پاشا۔ بندر سعید۔ بحری سفر مابین عدن و قاہرہ۔ مساجد قاہرہ۔ مضافات قاہرہ۔ اہرام مصر۔ ابوالہول۔ حلوان ممف۔ ومیاط منصورہ۔ مملکۃ الکبریٰ۔ مدینۃ الفیوم۔ ابوصر بعنسہ۔ زقازیق بلبس۔ منہا۔ طنطہ۔ دمن ہور۔ اسکندریہ۔ مضافات اسکندریہ، سیدی جابر۔ الرشید۔ ابوقیر۔ عربی موسیقی۔ رملہ۔ پیکر لطیف۔ خصائل اقوام مغربی۔ حکومت مصر و عہد اسلام۔ شجرۂ خاندان خدیوی۔

مقامات مصوّر۔ کے حالات میں ذیل کی فہرست مضامین ملاحظہ ہو

محمد علی پاشا۔ توفیق پاشا۔ اسمٰعیل پاشا۔ عباس حلمی پاشا۔ سلطان حسین۔ سلطان فواد۔ ملا مفتی عبدہٗ۔ احمد عربی پاشا۔ خواتین مصر۔ صفیہ زغلول پاشا۔ آمنہ بی صدیقی۔ بیگم ہدیٰ شعراویہ خاتون ریاض فانوس۔ اہلیہ یوسف بے غالی۔ بیگم پطرس۔ شامی عورت۔ مصری خاتون۔ متوسط الحال خاتون۔ غربا بدوی کا گھر۔ دہقان کی لڑکی۔ کاشتکاران مصر۔ تھیٹر۔ مصری بزم نشاط۔ رقص۔ دمشق۔ رملہ ہوٹل۔ معاشرت مصر۔ مصری خاندان۔ مساجد مصر۔ مسجد حضرۃ عمر بن عاص۔ جامع ازہر منارہ۔ درس جامع ازہر۔ مسجد قلاون۔ مسجد قائیت بے۔ مسجد حضرت دانیال۔ مقابر سلاطین مملوک، مقبرہ حضرۃ امام شافعی۔ قلعہ وغیرہ۔ قلعہ قائیت بے اسکندریہ۔ قلعہ سلطان صلاح الدین قاہرہ۔ دیار دامصار۔ شارع محمد علی اسکندریہ، قاہرہ۔ اتفنطرہ۔ پل نہر وغیرہ۔ پل دریائے نیل بندنیل۔ بندنیل قلیوب۔ نہر سوئیز۔ از سویز تا بندر سعید۔ نہر سوئیز پر جہاز رانی۔ آثار قدیمہ۔ اہرام مصر۔ زینہ اہرام۔ اہرام مصر۔ ابوالہول۔ شبیہ فرعون موسیٰ از مومیائی۔ تابوت سلطان توت انخ عمون۔ مناظر قدرت۔ بادیہ مصر از ساحل نیل۔ آثار اسلامیہ۔ مقیاس النیل۔ قاہرہ۔ باب العذب قلعہ صلاح الدین۔ مجسمہ محمد علی پاشا۔ دیباچہ اقتدار برطانیہ۔ قتل اسکندریہ۔ بازار۔ شارع محمد علی۔ اسکندریہ۔ بازار قاہرہ۔ عدن۔ چوراہہ عدن۔ حوض شداد۔ ستۂ مصری۔ مصری پنسہارن۔

اس مکمل تحقیق کی کیا حد ہے کہ ان حالات کے لئے مؤلف کبھی صحرائے مصر کی گرمائی ہوئی وسعتوں خوفناک کھنڈرون تاریک قبرستانون، اور مورو راز دیہات اور جنگلوں میں رہ کر داد تحقیق دیتا ہے اور کبھی محلات شاہی، بازار اور تھیٹرون کے اون مظاہرون میں شریک ہوتا ہے جہان علاوہ تاریخی آثار و اثرات کے مصر کے موجودہ باشندون کی تہذیب اخلاق معاشرت۔ اور قومی خصائص کا جیتا جاگتا مطالعہ حاصل ہوتا ہے، اور یہ بھی تحقیق کی حد ہے کہ مؤلف اپنے ذوق کے خلاف مصری میلوں بازاروں ہوٹلوں اور رقص و سرود کی ان محافل میں شریک ہوتا ہے جن کی عمومیت مؤلف کے وقار و متانت کے لئے ہر طرح گراں ہے مگر وہ ایک جلسہ رقص میں محض اس لئے شریک ہے کہ مصری اور ہندی موسیقی کے اصولی فرق کا چشم دید اندازہ مکمل ہو جائے اس جلسۂ رقص و سرود میں شریک ہو جانا تو اس قدر دلچسپ بات نہیں۔ لیکن اس جلسہ میں شریک ہو کر عوام مصر کے جذبۂ آزادی کو یوں معلوم کر لینا کس قدر قابل وقعت تحقیق ہے کہ

"جب مصری طوائف نے مصر کا قومی ترانہ گایا تو میں نے مجمع میں نوجوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور خوانچہ فروشوں تک کو جوش اور فرط جوش سے از خود رفتہ پایا، اور مجمع کے بچوں تک کی زبان پر یہ فقرہ رواں تھا کہ"

"میں مصری آزادی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں"

دیکھئے اس بازاری جلسہ سے کس قدر کارآمد اور معنی آفریں بات تلاش کر لی، اور یہی رتبہ ہوا کرتا ہے کسی بلند نظر محقق کا

پھر اولوالعزم مؤلف نے تحقیق حالات کے سلسلہ میں مصر کا ایک ایک چپہ چھان مارا ہے گویا وہ خود مصر کے باشندے ہیں اسی لئے جس حصۂ ملک پر قلم اوٹھایا ہے اس جامعیت سے جس طرح کوئی دہلوی باشندہ اپنی دیرینہ سکونت کی بنا پر یہ بتا سکے کہ خواجہ حسن نظامی پیر صاحب کیسے بن گئے اور ان کے بھیا احسان کی دکان جامع دہلی کے پاس ہے۔

مصری آثار عتیقہ پر جو کچھ لکھا ہے وہاں حق تاریخ دانی و تاریخ نگاری ادا کر دیا ہے، کوئی کھنڈر کوئی عمارت، اور کوئی تاریخی واقعہ نہیں لکھا جب تک کہ اوس کی مکمل تاریخ نہ لکھدی، مصری فرمانروایان قدیم کے حالات میں ایک ایک بادشاہ کی تاریخ پیدائش سے لیکر تاریخ وفات تک کے جملہ حالات ہر بادشاہ کے ساتھ لکھدئے۔ مصر جدید میں خصوصیت سے دو چار چیزیں خاص تھیں۔ مثلاً خواتین مصر کی بیداری اور خواتین کی جد و جہد کا اثر مصری تاریخ پر، یا طلبہ کا مصری سیاسیات میں دخل و غلبہ، یہ ایسے موضوعات

ہیں جو مصر جدید کے ابواب تاریخ کو آج جگمگا رہے ہیں لہٰذا مؤلف نے ان حالات کی تحقیق میں جامعہ ازہر کی تحقیق کی اس کے اُن دروس علمیہ و دینیہ میں بذات خاص شریک رہے جن کا صحیح طرز تعلیم ان طلبہ کو بیدار کر رہا ہے مصری خواتین کے حالات کے لئے وہ مصر کی نامور اور ذمہ دار خواتین سے بذات خاص حالات معلوم کرنے میں کامیاب رہے، عوام مصر اور خواص مصر کے حالات میں تعلیمی، سیاسی، تجارتی اور فکری اثرات سے لیکر دیہاتی معاشرت اور رسم و رواج تک کا مطالعہ لکھدیا، بین الاقوامی مسائل اور اثرات پر اس قدر تحقیق کی گویا وہ برسوں سے یورپی اقوام اور مصری تعلقات کے مطالعہ میں مصروف تھے اور کمال یہ کہ اُن مغربی کفن چوروں کے حالات اس قدر بے باکی جرأت اور دلیری سے لکھے کہ اگر اپنے پیسہ اخبار والے محبوب عالم صاحب سن لیں تو مارے خوف کے اُسی وقت کچھ ہو جائیں سب سے آخری بات یہ ہے کہ وہ تکمیل تحقیق کے لئے مصر میں اس طرح رہے یا اس قدر رہے کہ انھوں نے خود کو مصری باشندہ بنایا اور اسی لئے مصری خواص و عوام میں گھل مل جانے سے اُنہیں مصریوں کی محاسن کے ساتھ ہی اُن کے معائب اور کمزوریوں کے مطالعہ کا بھی موقع ہاتھ آگیا اور ان کے اخلاق و خواص کا جو تجربہ مؤلف نے ذاتی ذمہ داری پر قلمبند کیا وہی ان کی آخری تحقیق ہے، جس پر وہ ہزاروں ستائشوں کے مستحق ہیں پھر کمال دیانت یہ ہے کہ مصری لوگوں کے محاسن کے ساتھ ان معائب کو آزادی سے لکھ کر مؤلف نے خود کو غیر جانب دار محقق بھی ثابت کر دیا جو باوصف کٹر مسلمان ہونے کے اُنہی کے ضبط نفس کا کام تھا اور اسی لئے یہ سفرنامہ ہر قوم و جماعت کے مطالعہ کے قابل ہو گیا۔

اس قدر حالات کے بعد فاضل مؤلف کی ذمہ داری کی وسعت یا کتاب کا علمی و تاریخی وقار یا اُس کی ادبی بلند پائیگی اور ہماری تنقید کا آزاد اصول چاہتا ہے کہ ہم چلتے چلتے اس معرکۃ الآرا کتاب پر دو چار اعتراضات بھی جڑ دیں اس سے دو چار فائدے ہیں، مثلاً پہلا فائدہ تو یہ کہ اس قدر عظیم القدر علمی کتاب پر اعتراض کرنے سے ہماری قابلیت کا اظہار بھی ہو جائیگا اور ہر شخص سمجھ جائے گا کہ۔ ماشاء اللہ اپنے ملا رموزی صاحب بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ دوسرے اس بات کا بھی اعلان ہو جائے گا اور لوگ باگ آپس میں کہیں گے کہ

"دیکھو ملا رموزی صاحب سوائے گورنمنٹ آف انڈیا اور پولیس آف انڈیا کے کسی سے ڈرتے بھی نہیں اور نہ کسی کی بیجا خوشامد کرتے"

پس ان معقول وجوہ کی بناء پر موقع تھا کہ ہم کتاب پر اعتراضات کرتے لیکن بجز اس کے کچھ

نہیں کہ کاتب کتاب پر قیمت لکھنا بھول گیا اس لئے ہر خریدار کو پہلے مولف سے قیمت دریافت کرنا ضروری ہے لیکن ہم لکھے دیتے ہیں کہ اس کتاب کی قیمت (۵۰) روپیہ ہیں پس اگر خدا اس بلند پایہ کتاب کی خریداری کی توفیق دے تو تمام ہندوستانی کتب خانے، لائبریریاں، ریڈنگ روم، بک ایجنسیاں، ویلر بک اسٹال، ایجنٹ اخبارات، مدارس، کالج، یونیورسٹیاں، دارالعلوم، مساجد، علماء، مشائخ، ادبا، اطبا، ایڈیٹر، لیڈر، حاکمان گورنمنٹ وحاکمان کانگریس، ارکان سائمن کمیشن، ارکان نہرو کمیٹی، صدر اسمبلی دہلی اور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل تک اس کتاب کی خریداری کے وقت کارڈ پر یہ پتہ لکھ دینا چاہئے کہ

"بخدمت شریف میر دبیر حضرت مولوی قاضی ولی محمد صاحب بی اے سکریٹری رو بکاری بھوپال" دام اقبالہ۔

یہاں لفظ "دام اقبالہ"۔ بھوپال سے نہیں، بلکہ قاضی صاحب سے متعلق ہے زیادہ حد فقط

فکر عالیہ

از

مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری

کہاں لیجاؤں امیدوں کی دنیا بزم امکاں سے
کہ قسمت کو شکایت ہے فراوانی حرماں سے

ملا ہے وہ گداز عشق و ذوقِ دردِ جاں کاہی
فضائیں دم بخود ہیں سب مرے جذبات پنہاں سے

مری ہر سانس ہے ڈوبی ہوئی زہرابۂ دل میں
خدارا اے چارہ گر اندیشہائے فکر درماں سے

ترا جلوہ تو بیشک جلوہ بار عام تھا لیکن
شکایت کر رہا ہوں خود میں اپنی چشم حیراں سے

میں صدقے جلوہ آرا ترے ذوق خود نمائی کے
مرتب کر دیا ہستی کو اجزائے پریشاں سے

نہ چھیڑ اے مطرب وارفتہ میرے ساز عشرت کو
کہ دلچسپی نہیں مجھ کو سکون دل کے ساماں سے

میں وہ لذت شناسِ بیکسی ہوں گر مرا بس ہو
بدل لوں صبح عشرت کو میں اپنی شام ہجراں سے

ہر اک ذرہ ہماری وحشت پیمائی کا شاہد ہے
سنو گے داستانیں تم ہر اک خار بیاباں سے

ٹھہر کر دیکھتا جا، بیکسیٔ خانہ ویرانی
ارے او جانے والے سنام کو گورِ غریباں سے

مجھے بربادیٔ ہستی کی کچھ پروا نہیں ثاقب
میں پھر ترتیب دوں گا دل کے اجزائے پریشاں سے

حسن کار

اثر

جناب منشی سدرشن

(مترجمہ جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)

کھٹ، کھٹ، کھٹ! (۱)

کسی نے نیچے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ٹھاکر سنگھ تصویر بنانے میں منہمک تھے۔ انہوں نے آواز نہیں سنی گجری نے آہستہ سے کہا۔ "کوئی آیا ہے"

ٹھاکر سنگھ نے تصویر پر برش پھیرتے پھیرتے مسکرا کر جواب دیا۔ "تو چلو، اڑ کر اپنے گھونسلے میں چھپ جاؤ ورنہ کوئی دیکھ لے گا تو کہے گا جس کی عورت کے کپڑے بھی صاف نہیں۔ وہ تصویر کیا بنا تا ہو گا؟"

گجری نے رنگ کے پیالے میں انگلی ڈبو کر اپنے حسن کار شوہر کی قمیص پر داغ لگا دیا۔ اور شوخی سے بولی "سنگھ جی! پہلے اپنے کپڑے تو دیکھ لو، پھر مجھے کچھ کہنے کی ہمت کرنا"

ٹھاکر سنگھ چونک کر پرے سرک گئے اور بولے۔ "ارے! میرا قمیص خراب کر دیا۔ کیسی پگلی ہے؟ باہر ملنے والے کھڑے ہیں۔ یہ اندر بھاگ کھیلتی ہے"

گجری نے رنگ سے بھری ہوئی انگلی ٹھاکر سنگھ کے منہ کے پاس لے جا کر کہا۔ "سنگھ جی! خبردار! خبردار! تم بولے، اور میں نے تمہارا سارا منہ رنگ دیا"

ٹھاکر سنگھ "میرا ہی منہ رنگنا جانتی ہو۔ یا کچھ اور بھی سیکھا ہے؟ اگر کسی تصویر کا چہرہ رنگ کو تو چار پیسہ نہ کما لو"

گجری۔ "تم پھر بولو"

ٹھاکر سنگھ۔ (دب کر) "بہت اچھا جمعدار صاحب! آپ معاف کریں کیا مجال جو ایک بھی لفظ بول جاؤں۔ واہ وا!

بھئی عورت تو ہمیں ملی ہے۔ عورت بھی ہے۔ جمعدار بھی ہے۔

گجری۔ (مصنوعی غصہ سے) "تم پھر بولنے مانگتا۔ چپ رہو۔ کوئی لوگ آیا ہے"

ٹھاکر سنگھ گجرجی کی اس محبت آمیز سادگی پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ وہ اُسے اٹھا کر کلیجے میں بٹھا لینا چاہتے تھے جہاں اُسے دنیا کی گرم ہوا بھی نہ لگے۔ اتنے میں دروازے پر پھر کھٹکا ہوا۔ گجری نے دبے پاؤں جا کر زینہ کی زنجیر کھول دی، اور بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ٹھاکر سنگھ نے اونچی آواز سے کہا "چلے آئیو! در وزہ کھلا ہے"

اجنبی قیمتی پوشاک پہنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ریاست کا عہدہ دار ہے۔ شکل صورت سے رعب ٹپکتا تھا۔ اُس نے ٹھاکر سنگھ کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا "میں سردار ٹھاکر سنگھ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں"

ٹھاکر سنگھ کی آنکھیں جھک گئیں، خیال آیا میرے کپڑے اتنے صاف نہیں جتنے ہونے چاہئیں۔ انہیں ایسا معلوم ہوا، جیسے مزہ مٹی لگی ہے۔ جیسے بازار میں جاتے جاتے کپڑا پھٹ گیا ہے۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا؟ آہستہ سے بولے "فرمائیے! خادم حاضر ہے"۔ یہ کہکر انھوں نے اجنبی کے بیٹھنے کو کرسی سامنے رکھ دی۔

اجنبی کرسی پر بیٹھ کر بولا "خوب! میں سمجھتا تھا آپ بوڑھے ہونگے۔ مگر میرا قیاس ٹھیک نہ نکلا۔ آپکی عمر تو بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہ ہوگی"

ٹھاکر سنگھ۔ "جی نہیں، میری عمر تیس سال کے لگ بھگ ہے۔"

اجنبی "اس عمر میں بھی ایسی تصویر بنا لینا آپ ہی کا کام ہے۔ میں نے آپ کی کئی تصویریں دیکھی ہیں دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا وہ تصویر نہیں بھی جاگتی چیز ہے۔ کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ ابھی منہ کھول کر بولنے لگیں گی، ابھی چلنے لگیں گی۔ مجھے آپ سے ملنے کی آرزو تھی، آج چلا آیا"

ٹھاکر سنگھ "یہ آپ کی نوازش ہے۔ میں تو حسن کار کہلانے کا بھی مستحق نہیں ہوں۔ یہ بڑا بھاری علم ہے اس کا کندہ کس نے پایا ہے"

اجنبی۔ (مسکرا کر) "آپ کی تصویریں خوب بکتی ہوں گی ایسی اچھی چیز نہ بکے گی تو اور کیا بکیگی؟ مگر (کمرہ دیکھ کر) آپنے مکان اچھا نہیں بنایا۔ یہ آپ جیسے حسن کار کے لائق نہیں۔ جو دیکھے گا یہی کہے گا کہ نام بڑے اور اور درشن تھوڑے"

ٹھاکر سنگھ۔ "دیکھئے کوئی اچھی سی جگہ مل جائے۔ تو بدل لوں گا"

اجنبی "مال پر چلیئے، مال پر، وہاں آپ کا کاروبار اور بھی چمک جائے گا۔ یہاں جو تصویر پچاس کو بکتی ہے وہاں سو میں بکیگی۔ موتی کو مخمل کے ٹکڑے پر رکھ دیا جائے، تو اس کی چمک نہیں بڑھتی، مگر قیمت بڑھ جاتی ہے۔ میرا خیال ہے مال پر چلکر آپ تھوڑے ہی عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے"

ٹھاکر سنگھ۔ "آپ جیسے حضرات کی قدردانی ہو جائے تو ایک مہینے میں سونے کا محل کھڑا کر لوں۔ مگر ابھی

دنیا پیسہ کی قدر کرتی ہے حسن کاری کی نہیں۔ یہاں حسن کاری قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے۔"

اجنبی نے تعجب کی نظر سے نوجوان حسن کار کی طرف دیکھا اور کہا "جب تک کسی شوقین کی نظر نہ چڑھ جائے"۔

ٹھاکر سنگھ نے برش ہاتھ میں لیا اور تصویر کی طرف دیکھ کر بولا۔ "مگر شوقین لوگ دنیا میں کہاں؟ آب حیات کے مثل اس چیز کا بھی نام سنا ہے۔ اُسے دیکھا نہیں ہے"

یہ الفاظ نہیں تھے، حسن کار کے دل کے گھاؤ تھے۔ اجنبی کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ ضرور یہ شخص بے رحم دنیا کا شکار ہے، یقینی اس کا دل دُکھا ہوا ہے، ورنہ اسکے منہ سے یہ الفاظ کبھی نہ نکلتے۔ تھوڑی دیر کے بعد اجنبی نے کہا "میں ریاست سکندھیر کا دیوان ہوں۔ میرا نام ہرجس رائے ہے۔ مہاراج صاحب شوقین آدمی ہیں۔ تصویروں کا تو انھیں خبط ہے۔ انہیں خوش کرنا ہو تو کوئی بڑھیا تصویر ان کے نذر کرو پھر چاہو کرا لو۔ وہ انکار نہ کریں گے۔ دو مہینے کے بعد ان کی سالگرہ ہے۔ میں اس موقع پر انھیں ایک بہت ہی اعلےٰ درجہ کی تصویر نذر کرنا چاہتا ہوں۔ قیمت کی پروا نہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔ مگر تصویر ایسی ہو کہ ایک بار مہاراج پھڑک جائیں، کہیں یہ تصویر تجھے کیسے مل گئی۔ بس! میں مہاراج کے ان چار لفظوں کا بھوکا ہوں"

ٹھاکر سنگھ کے دل میں اُمید کی گدگدی ہونے لگی۔ دیوان صاحب کی طرف دیکھ کر بولے "اپنی عمر میں مجھے پہلی بار ایسے معزز آدمی کے درشن ہوئے ہیں، جس کے پاس حسن کاری دیکھنے والی آنکھیں اور قدر کرنے والا دل ہے"

دیوان صاحب "بس! ایسی چیز بناؤ کہ مہاراج اُچھل پڑیں"

ٹھاکر سنگھ۔ اپنے منہ سے اپنی بڑائی کرنا اچھا نہیں لگتا۔ مگر میں آپ کو ایسی چیز دوں گا کہ آپ خوش ہو جائینگے

دیوان صاحب "آپ کی جو تصویریں اس وقت تک دیکھ چکا ہوں اُن سے بڑھیا ہو گی نا؟"

ٹھاکر سنگھ۔ "اس کی فکر نہ کریں، راگنی کو جب پتھر لگ جائے گا کہ اُس کے سامنے راگ ودیا (علم موسیقی) کے ماہر بیٹھے ہیں اس وقت وہ معمولی چیز بھی نہیں گائے گا"

دیوان صاحب۔ کھڑے ہو گئے اور بولے "تو آپ کب تک مجھے تصویر دے دیں گے"؟

ٹھاکر سنگھ بھی رخصت کرنے کھڑے ہو گئے اور دل میں حساب کر کے بولے "ایک مہینے سے کم مدت میں تو تیار نہ ہو سکے گی"

دیوار پر جلی حرفوں میں لکھا تھا "نصف رقم پیشگی" دیوان صاحب نے یہ شرط آتے ہی پڑھ لی تھی۔ ٹھاکر سنگھ دل میں سوچتے تھے ابھی بٹوا کھولتے ہیں۔ ابھی نوٹ نکالتے ہیں۔ دیکھیں کیا دیتے ہیں۔

امیر آدمی ہیں۔ روپیہ پیسہ کی کمی نہیں، اور کام اعلےٰ درجہ کا چاہتے ہیں۔ پانچ سات سو سے کم کیا دیں گے؟ مگر دیوان صاحب اُٹھے اور پھر آنے کو کہکر نیچے اتر گئے۔ ٹھاکر سنگھ دیکھتے ہی رہ گئے اُٹھی ہوئی کالی گھٹا دیکھ کر کسان کا دل ناچنے لگا تھا۔ اُسے کیسی خوشی ہوئی تھی۔ مگر ہوا کے جھونکوں نے گھٹا کو اڑا دیا۔ پانی کا ایک قطرہ بھی نہ برسا۔

(۴)

گجری اپنے کمرے کے اندر سے سب کچھ دیکھ رہی تھی دیوان صاحب کے جاتے ہی اسنے کمرے سے نکل کر زینہ کا دروازہ بند کر دیا۔ اور جا کر پیار سے اپنے مایوس شوہر کا ہاتھ تھام لیا۔ ٹھاکر سنگھ کی آنکھیں تر ہو گئی تھیں گویا ہاتھ آیا ہوا مال نکل گیا ہو۔ گجری نے ہمدرد آمیز لہجہ میں کہا "تم فضول اپنا جی چھوٹا کرتے ہو اس وقت روپیہ نہیں ملا۔ نہ سہی۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ مجھے تو ذرا بھی دکھ نہیں ہوا۔ الٹی خوشی ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ یہ آدمی ہمارا سچا خیر خواہ ہے۔ میرے دل میں کوئی کہہ رہا ہے کہ اس سے ہمیں فائدہ پہنچے گا۔ اُسے کیا معلوم کہ یہ پورے کنگال ہیں، ان کے پاس پیسے بھی نہیں۔ یہ مکان، یہ اسباب یہ بجلی دیکھ کر کسی کو یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا"

ٹھاکر سنگھ نے گجری کی طرف اس طرح دیکھا جیسا کوئی مجرم منصف کی طرف دیکھتا ہے۔ اور ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا "آج کرو اچوتھ ہے تم نے سہاگ کا برت رکھا ہے۔ اور ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں لوگ خوشیاں منا رہے ہیں اور ہم بیٹھے قسمت کو رو رہے ہیں۔"

گجری "مگر یہ اپنا اپنا نصیبہ ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہے اُسے کون مٹا سکتا ہے۔ باقی رہی کرو اچوتھ کے برت کی بات، اس کی فکر نہ کرو۔ کہیں سے آجائے گا کھا لیں گے۔ نہ آئے گا بھوکے سو رہیں گے"

ٹھاکر سنگھ۔ "اور نوکر کو کیا کھلائینگے؟ وہ تو بیچارہ سمجھتا بھی نہیں کہ ہاتھ تنگ ہے۔ چپ بنا رہوں ہماری بھی کیا شان ہے۔ اپنے کھانے کو روٹی نہیں۔ نوکر سو بنا ہی ہوا ہے"

گجری۔ "اُس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ تم اپنا دل خراب نہ کرو۔ ورنہ بیمار ہو جاؤ گے"

ٹھاکر سنگھ کو بیوی کی ان باتوں سے تسلی ہوئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ دیوان صاحب جاتے ہی گجری انھیں گالیاں دینے لگے گی، تقدیر کو کوسنے لگیگی۔ مگر شوہر کو اداس دیکھ کر وہ اُمید و توکل کی دیوی بن گئی جو کبھی مایوس نہیں ہوتی ٹھاکر سنگھ نے اسے متوکل دیکھ کر کہا "جی چاہتا ہے ان تصویروں کو آگ لگا کر کہیں نکل جاؤں۔ کام کرانے کو سبھی ہیں پیسے دیتے وقت دم نکلتا ہے کبھی کہتے ہیں کل آؤ، کبھی کہتے ہیں برسوں دیں گے"

گجری "یہی تو خرابی ہے۔ ورنہ ہمیں ذرا بھی تکلیف نہ ہو۔ دیکھو گنگو آیا ہے۔ کچھ لاتا ہے۔ یا سب پھرانے کو کہتے ہیں"

ٹھاکر سنگھ "مجھے خوف ہے آج کوئی بھی نہیں دے گا"

گجری ۔ "واہ خدا پر بھروسہ رکھو (تصویر کی طرف اشارہ کرکے) یہ تصویر کس کی ہے؟"

ٹھاکر سنگھ ۔ "ایڈیٹر شوکت ہند کی ہے!"

گجری ۔ کیسا آدمی ہے؟"

ٹھاکر سنگھ ۔ بہت شریف آدمی ہے!"

گجری ۔ "پیسے والا بھی ہے یا ہمارے جیسا ہے؟"

ٹھاکر سنگھ ۔ "آدمی تو خاندانی ہے۔ آگے ہماری قسمت!"

گجری ۔ "تصویر بنا کر لے جاؤ۔ تو پیسے دے دے یا نہیں؟"

ٹھاکر سنگھ "اب میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں، ہاں اُمید ہے دے دیگا"

گجری ۔ "تو اسے ختم کیوں نہیں کرتے؟ کتنے روپیہ مل جائیں گے؟"

ٹھاکر سنگھ ۔ "میں نے تیس مانگے تھے۔ اُس نے بیس سنائے پچیس پر فیصلہ ہو جائے گا"۔ گجری کا چہرہ پر امید کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ بیس کر بولی جلدی ختم کرو، ورنہ جمعدار خفا ہو جائیگا"، اب وہ پھر وہی ہنس مکھ، ہنسی پر وہ اگری تھی جو بھوکی رہکر بھی ہنستی تھی۔

ٹھاکر سنگھ تصویر بنانے لگے۔ کل رات سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ صبح بھوک معلوم ہوئی تھی مگر اس وقت پیاس بھی نہیں تھی۔ انہیں جسم میں ایک نئی تحریک محسوس ہوتی تھی۔ کبھی یہ رنگ گھولتے کبھی وہ۔ اور تصویر بناتے جاتے تھے۔ ان کا ہاتھ آج کیسا تیز چلتا تھا۔ دل کام میں ایسا لگا ہوا تھا جیسے دوستوں میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ اتنی ایک دلی ان میں کبھی نہ تھی۔ یہاں تک کہ پانچ بج گئے۔ اور انھوں نے سر نہ اٹھایا۔ دفتروں کے اہل کاروں کو چھٹی ہو گئی۔ پرندے بھی اپنا بسیرا لینے لگے۔ گائیں اور بھینسیں بھی اپنے گھروں کو آ گئیں۔ مگر ٹھاکر سنگھ کو آرام کہاں؟ وہ ابھی تک اسی لگن سے تصویر بنانے میں لگے تھے آس میں کتنی زندگی ہے کتنی بیداری اور کتنا زور ہے۔ یوں کہنے کو تو ایک کچا دھاگا ہی۔ مگر اسی کچے دھاگے میں وقت آنے پر کیسی قوت آجاتی ہے۔ اتنے میں گنگو آ گیا۔ میاں بیوی کا دل دھڑکنے لگا۔ کچھ لایا ہے۔ یا نہیں؟ ایک میٹھا بول سن کر دونوں کے دل باغ باغ ہو جائینگے۔ اگر وہ خالی لوٹا ہو تو؟ آدمی کتنا محتاج کیسا دوسروں کے بس میں ہے۔ ٹھاکر سنگھ اُس سے پوچھتے بھی ڈرتے تھے۔ گو بیوی عورت ہونے پر بھی ہمت نہیں ہارتی۔ اُس نے گنگو سے کہا "تو نے سارا دن باہر گنوایا۔ بول کچھ کام بھی کیا یا نہیں"، گنگو نے جواب دیا ۔ کہیں سے بھی نہیں ملا"، ٹھاکر سنگھ کے دل پر جیسے کسی نے چھرا بھونک دیا۔ تلملا کر بولے "انجمن کے کارخانہ والوں نے کیا کہا؟" گنگو نے کہا کہ سردار صاحب اُنکے باہر گئے ہیں آئینگے تو بھجوا دینگے"۔

ٹھاکر سنگھ "اور لندن واچ کمپنی والے؟"

گنگو۔ "بولے آج بکری نہیں ہوئی کل آنا"

ٹھاکر سنگھ۔ "اور رائے صاحب ہو تو رام؟"

گنگو۔ "وہ ابھی کراچی سے نہیں آئے"

ٹھاکر سنگھ۔ (غصہ سے) "اور تو اب تک کہاں مر گیا تھا پہلے چلا آتا تو کہیں اور ہی بھیج دیتا اب میں کیا کروں؟"

گنگو نے سہم کر جواب دیا۔ "میاں یعقوب کی طرف گیا تھا۔ انہوں بٹھا لیا کہ ابھی سنی آرڈر آتے ہیں تو لے کر جانا۔ وہیں بیٹھا رہا۔ آخر اٹھ آیا وہ تو اب بھی نہ آنے دیتے تھے کہتے تھے ذرا اور ٹھیر و شاید کوئی دینے والا ہی آجائے"

گجری رونے لگی، شام ہو چلی تھی، سہاگن عورتیں اپنے اپنے تھال میں مٹھائی بادام اور گھی کے چراغ رکھ سہاگن رانی کی کتھا سننے جا رہی تھیں۔ اس وقت ان کے چہرے کیسے بشاش تھے۔ آنکھیں کیسی چمک رہی تھیں آج انھوں نے سہاگ کا برت رکھا تھا۔ آج شوہر کی منگل کامنا کرنے کے لئے جا رہی تھیں۔ مگر گجری کیا کرے؟ اس کی جان پنجرے میں پھنسی ہوئی پرندوں کے مانند پھڑپھڑا رہی تھی مگر اڑنے کی طاقت نہیں تھی اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ اتنے میں اس کی پڑوسن نے ساتھ چھے سے پکار کر کہا۔ "کیوں بہن گجری کتھا سننے چلو گی؟" گجری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جیسے کسی نے پکا ہوا پھوڑا پھوڑ دیا ہو وہ کیسی بدبخت ہے جو سہاگ برت کے دن سہاگ کتھا بھی نہیں سن سکتی مگر پڑوسن پر اپنی بے بسی ظاہر کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ آواز سنبھال کر بولی "بہن جی! میں تو سن آئی"، پڑوسن چلی گئی۔ گجری پھر اداس ہو گئی۔ اسے بے رحم امیروں پر رہ رہ کر غصہ آتا تھا جو غریب مزدوروں سے کام کرا لیتے ہیں۔ پیسے وقت پر نہیں دیتے اس وقت وہ چندریکا دیوی ہو رہی تھی۔ اگر کوئی امیر آدمی اسکے سامنے آجاتا تو اس کا خون پانی ایک کر دیتی وہ سوچتی تھی سب نے انکار کر دیا کسی نے یہ بھی نہ سوچا کہ چلو دے دو۔ تیوہار کا دن ہے۔ اسے بھی ضرورت ہو گی۔ ایسے ہی پانی کے سبب بارش نہیں ہوتی اس لئے تو قحط پڑتے رہتے ہیں۔ آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ گجری اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ مگر اس نے بتی نہیں جلائی۔ یہ باہر کا اندھیرا اس کے دل کے اندھیرے کے سامنے کتنا ہیچ تھا۔ اتنے میں گنگو نے آکر کہا۔ "بی بی جی! کچھ کھانے کو ہے، یا نہیں۔ بڑی بھوک لگی ہے"۔

بات معمولی تھی، لیکن گجری کے بدن میں آگ لگ گئی جیسے سوکھی بارود گرگ سے بھی جل اٹھتی ہے۔ گرج کر بولی۔ "تو آدمی ہے یا گیا۔ بھاؤ دیکھتا نہیں، کہیں سے بھی پیسے نہیں ملے۔ مروت تو ان لوگوں کو چھو بھی نہیں گئی۔ مالک مرے یا جئے۔ ان کی بلا سے۔ انہیں اپنے کام سے کام ہے"

گنگو کھانے کے بدلے گالیاں کھا کر چپ اوپر جا بیٹھا۔ وہ اپنی حماقت پر پشیماں ہو رہا تھا تھوڑی دیر بعد گجری ہمت کر کے اٹھی۔ اور پڑوسن کو بلا کر بولی۔ "بہن ذرا ایک چار آنہ کے پیسے دینا وہ باہر گئے ہیں۔ میرے

پاس دس روپیہ کا نوٹ ہے ابھی لوٹا دونگی،، مگر اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا کہ اگر اس نے بھی نہ دیا تو کیا عزت رہ جائیگی۔ مگر پڑوسن نے چوٹی دے دی۔ گجری کو ایسا معلوم ہوا جیسے یہ چوٹی نہیں، چار سو روپیہ ہے گویا وہ ڈوبتے ڈوبتے بچ گئی ہے۔ چوٹی لے کر بھاگی بھاگی اوپر چڑھ گئی اور گنگو سے بولی "جا۔ جا کر دو آنے کے چاول لے آ ایک آنہ کا دودھ، ایک آنہ کی شکر۔ مگر جلدی آنا۔ تیری عادت ہے جہاں چار آدمی دیکھے وہیں کھڑے ہو گیا" گنگو نے چوٹی لی اور نیچے اتر گیا۔ ادھر گجری نے جلدی جلدی آگ جلائی اور گنگو کا انتظار کرنے لگی۔ مگر آدھا گھنٹہ گذر گیا اور گنگو نہ آیا۔ آخر کہاں چلا گیا؟ اتنی دیر کہاں لگ گئی؟ بنیئے کی دکان تو دور نہیں تین چار منٹ کا رستہ ہے ضرور کہیں کھڑا ہو گیا ہو گا۔ اتنا بھی خیال نہیں کہ آج تیوہار کا دن ہے۔ سردار صاحب آتے ہیں تو کہتی ہوں میں باز آئی ایسے نوکر سے اسے جواب دو۔ ایسے تو اچھے اور برے وقت کا بھی خیال نہیں۔ یہاں آگ لگ رہی ہے وہ وہاں کہیں کھڑا وقت ضائع کر رہا ہو گا۔ مگر آدھا گھنٹہ اور گذر گیا۔ اور گنگو بھی نہ آیا۔ اب گجری کے غصہ نے تفکر اختیار کر لیا سوچنے لگی، کہیں کسی گاڑی تلے نہ آ گیا ہو۔ آنکھیں بند کر کے چلتا ہے سامنے تو دیکھتا نہیں۔ گجری کا دل دھل گیا۔ گویا گنگو سچ مچ گاڑی تلے کچلا گیا ہے۔ اتنے میں گنگو سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور سسک سسک کر رونے لگا گجری نے گھبرا کر پوچھا، کیوں؟ کیا ہوا؟ گنگو نے ہاتھ باندھ کر روتے روتے جواب دیا "چوٹی کہیں گر گئی" گجری نے ٹھنڈی سانس بھری اور مایوسی سے پریشان ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ اُس کے منہ سے ایک بھی لفظ نہ نکلا اندھیری رات میں مسافر کو ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی ملی تھی۔ کتنی محنت، کتنی مصیبت کے بعد، دیکھتے دیکھتے وہ بھی جھاڑیوں میں گم ہو گئی۔ اب مسافر کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ روشنی کہیں بھی نہیں تھی۔

اُدھر ٹھاکر سنگھ تصویر لے کر شوکت ہند کے دفتر میں پہنچے۔ اور ایڈیٹر سے بولے "لیجئے جناب! تصویر تیار ہو گئی"

ایڈیٹر صاحب نے تصویر کو اُچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ اور بے پروائی سے میز کے کونے کی طرف اشارہ کر کے کہا "رکھ دیجئے،، اور یہ قدر تھی اُس چیز کی۔ جسے حسن کار نے بھوکا رہ کر بنایا تھا جس میں اس نے اپنا دل لگایا تھا جس پر اس نے اپنی جان چھڑکی تھی۔ کیا اس کے لئے اس سنگدل اندھے معاملہ والے کے پاس تعریف کے دو لفظ بھی نہ تھے۔ صرف دو لفظوں سے ان کی تسکین ہو جاتی وہ اپنی تھکاوٹ کو بھول جاتا۔ سمجھتے کہ دنیا ابھی قدر والوں سے خالی نہیں ہو گئی۔ روپیہ نہیں دیتے تعریف تو کرتے ہیں۔ اہل کمال کے لئے یہی بہت ہے مگر یہاں وہ بھی نہ تھا۔ ٹھاکر سنگھ کے جی میں آیا کہ تصویر اُٹھا لوں اور کہوں جناب میں تصویر آپ کے ہاتھ نہ بیچوں گا۔ اگر آپ کو میری حسن کاری کی پروا نہیں۔ تو مجھے بھی آپ کے پیسے کی ضرورت نہیں۔ گھر گھر کا اور گھر کی پریشان کن حالت کا خیال آ گیا۔ غیرت نے آن کا گلا گھونٹ دیا۔ تصویر کو ہاتھ میں لیکر بولے "معاف کیجئے آپ نے دیکھ تو لیا"

ایڈیٹر۔ "کل دیکھونگا اس وقت رہنے دیجئے"

ٹھاکر سنگھ۔ "بہت اعلیٰ درجہ کی ہے آپ خوش ہو جائیں گے"

ایڈیٹر۔ "یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں آپ جس چیز کو ہاتھ لگائیں گے وہ خوبصورت بن جائیگی خوبصورتی تو آپکے ہاتھ کا میل ہے"

ٹھاکر سنگھ۔ (شرما کر) "آپ تو مجھے بناتے ہیں"

ایڈیٹر۔ "جی نہیں" میرا سچ مچ یہی خیال ہے"

ٹھاکر سنگھ۔ "اس پر پورے تین دن لگے ہیں"

ایڈیٹر۔ "آپ چاہتے تو ایک دن میں بنا لیتے، بلکہ میرا تو خیال ہے آپ ڈٹ کر بیٹھ جاتے تو تین چار گھنٹوں سے زیادہ کا کام نہ تھا"

ٹھاکر سنگھ "جی نہیں اچھی چیز کافی وقت صرف کئے بغیر عمدہ نہیں بنتی"

ایڈیٹر "ارے! آپ تو شاعری بھی شروع کرنے لگے"

ٹھاکر سنگھ۔ (مسکرا کر) آپ کی نظر عنایت ہو جائے تو شاعری بھی کرنے لگوں گا۔ اب اجازت دیجئے اندھیرا ہو رہا ہے۔"

ایڈیٹر۔ "بہت اچھا! پھر کسی دن آئیے گا۔ ایک اور بھی تصویریں بنوانی ہیں"

ٹھاکر سنگھ۔ "کہئے کل ہی آجاؤں (تکلف سے) اور اس تصویر کے روپئے؟"

ایڈیٹر۔ (ہنس کر) "اتنی جلدی؟"

ٹھاکر سنگھ "بہت ضرورت ہے"

ایڈیٹر۔ "تو دو چار دن میں مل جائیں گے"

ٹھاکر سنگھ "نہ نا صاحب! ایسا ظلم نہ کیجئے گا۔ بڑی آس لے کر آیا ہوں ابھی دلوا دیجئے"

ایڈیٹر۔ (کرسی سے اٹھتے ہوئے) "دو چار دن سے پہلے تو کسی حالت میں نہ دے سکوں گا"

ٹھاکر سنگھ۔ "بڑی ضرورت تھی، پانچ روپیہ ہی دے دیں"

ایڈیٹر۔ (سر ہلا کر) "اس وقت تو پانچ پیسے مانگو وہ بھی نہ ملیں گے"

ٹھاکر سنگھ "آپ نے تو کہا تھا تصویر بنا کر لاؤ۔ روپئے اسی وقت مل جائیں گے"

ایڈیٹر۔ "معلوم ہوتا ہے آپ ہمیں چور سمجھ رہے ہیں جو آپ کی تصویر لے کر بھاگ جائیں گے۔ یہاں چھ چھ مہینے گذر جاتے ہیں کوئی تگ و دو بھی نہیں کرتا"

ٹھاکر سنگھ۔ "ان کے پاس کھانے کو ہوگا۔ تقاضہ کرتے ہوں گے۔ ہم مزدور آدمی ہیں جو کماتے ہیں وہی کھاتے ہیں"

ایڈیٹر۔ "آپ تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے۔ ایک بار کہہ دیا اس وقت نہیں ہیں معاف کرو۔ مگر جناب اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔"

اب ٹھاکر سنگھ بھی تیز ہو گئے۔ بولے۔ "اگر آپ کے پاس روپیہ نہ تھے تو آپنے کام کیوں کرایا؟ ہمیں یوں ٹالیں تو نہ ہوتا۔ مو ایڈیٹر صاحب سناٹے میں آ گئے۔ سوچنے لگے یہ آدمی کتنا کمینہ ہے۔ مگر عزت اور بے عزتی کا ذرا بھی خیال نہیں۔ تھوڑی دیر بعد بولے۔ "اپنی تصویر اٹھا کر لے جائیے مجھے اسکی ضرورت نہیں۔"

ٹھاکر سنگھ۔ (تعجب سے) "مگر آپ نے کھنچوایا ہے۔"

ایڈیٹر۔ "مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ایسی خراب چیز بنالائیں گے؟ اس سے اچھی تصویر تو اسکول کے لڑکے بھی بنا سکتے ہیں۔ اور یہ بھی کسی لڑکے ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ آپ کی نہیں۔ چلیں ہیں ہیں چکہ دیتے لیکن ہم بھی جناب ہاتھ بچا جانتے ہیں، ہاتھ!"

ٹھاکر سنگھ۔ "مگر تصویر تو آپ نے ابھی دیکھی ہی نہیں۔"

ایڈیٹر۔ "آتے ہی دیکھ لیا مجھے ذرا بھی پسند نہیں۔ اخبار میں شائع کر دو تو لوگ کہیں ایڈیٹر پاگل ہو گیا ہے۔"

ٹھاکر سنگھ کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تصویر لیکر چپ چاپ باہر نکل آئے پچھتاتے تھے کہ فضول بات بڑھائی۔ روپے آج نہ ملتے دو دن بعد مل جاتی۔ اب وہ بھی گئے۔ تصویر ان کی ہے۔ دوسرے کوئی اس کے لئے پیسہ بھی نہ دیگا۔ وہ چاہتے تھے ایڈیٹر پاس بلا کر تصویر مانگ لیں۔ تو چپ چاپ دیدیں۔ چوں بھی نہ کریں لیکن وہ دور چلے آئے اور انہیں کسی نے بھی نہ بلایا۔ اب چاروں طرف اندھیرا تھا۔ کیا کریں کیا نہ کریں۔ بہت سوچتے تھے۔ مگر انہیں کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو اس مصیبت کے وقت ان کی امداد کرے۔ انھیں گھر جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ گجری کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

آج کرواچوتھ کا برت ہے۔ عورتیں چاند کو دیکھ کر مٹھائی اور پھل کھائیں گی۔ ہمارے گھر آٹا بھی نہیں بدقسمتی تو دیکھو گھر میں سوائے لکڑیوں کے اور کوئی بھی چیز نہیں بچی۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ٹھاکر سنگھ شہر سے باہر نکل گئے اور پٹریوں میں بیٹھ کر سوچ بچار میں غرق ہو گئے۔ کبھی سوچتے راوی میں ڈوب مریں، ایسی زندگی سے تو موت ہی بھلی۔ کبھی خیال آتا، سادھو ہو جاویں۔ گجری کو اس کا باپ لے جائیگا۔ چار دن یاد کر کے روئیگی پھر بھول جائے گی۔ مگر ان میں اتنا تحمل بھی نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھے۔ اور شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ جیسے کوئی فقیر بھیک مانگنے جا رہا ہو۔ پہلے آہستہ آہستہ چلے پھر تیز ہو گئے۔ امید کے قریب پہنچ کر ہم بے قرار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا صبر شکیب ہوا ہو جاتا ہے۔ اب انہیں ایک دوست کا خیال آگیا تھا۔ شاید وہ دو چار روپے دیدے۔

رات کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا کرواچوتھ کا چاند طلوع ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ ہر مکان پر عورتیں

کھڑی تھیں اور آسمان کی طرف دیکھتی تھیں کہ چاند نکلا ہے یا نہیں۔ جو چھوٹی لڑکیاں بھوک سے بے چین ہو رہی تھیں وہ کہتی تھیں چاند کو بھی آج ہی بیر لینا تھا۔ پہلے تو اتنی دیر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جو سیانی تھیں وہ کہتی تھیں ذرا اور صبر کرو۔ مگر گجری اپنے اندھیرے کمرے میں اوندھے منہ لیٹی تھی۔ وہ چاند کا کیا انتظار کرتی غریب کے پاس ادھر یہ دینے کو کچی لسی بھی نہ تھی۔ نہ برت کھولنے کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ مایوس ہو کر لیٹی تھی اور اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ اتنے میں ٹھاکر سنگھ نے آکر اُسکی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اور پیار سے کہا "اُٹھو! چاند نکل آیا ہے چل کر ادھیر یہ دے لو۔ لسی اور گنڈیریاں نہیں میں ٹھنڈا پانی تو ہے۔ دیوتا لوگ کچھ کھاتے پیتے تو تھوڑے ہی ہیں اعتقاد دیکھتے ہیں اور اُسکی تمہارے پاس کمی نہیں"

گجری چپ چاپ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تصویر کے دام ملے یا نہیں۔ سمجھ گئی نہ ملے ہونگے ملے ہوتے تو ناچتے ہوئے آتے۔ وہ بے دلی کے ساتھ شوہر کے ساتھ اوپر چلی گئی اور نل سے ہاتھ منہ دھو کر بولی "پوتر جل (اچھوتا پانی) کا ایک لوٹا منگوا دو تو ادھیر یہ دے لوں"

ٹھاکر سنگھ۔ "وہ دیکھو چوکی پر دھرا ہے۔ اُٹھا لو"

گجری نے جا کر لوٹے میں لسی دیکھی تو اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس میں جان سی پڑ گئی جیسے کڑی دھوپ میں چلتے ہوئے کسی ادھ موئے مسافر کو راستہ کی ٹھنڈی چھاؤں مل جائے۔ تنک کر بولی "تم نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ پہلے کیوں نہ کہا کہ سب کچھ لے آیا ہوں۔ یہ تو بہت کچھ ہے"

ٹھاکر سنگھ "پہلے چندرما کو ادھیر یہ دے لو پھر باتیں کریں گے"

گجری۔ "کیسے جھوٹے آدمی ہیں کہتے تھے پانی ہی سو ادھیر یہ دے لو"

ٹھاکر سنگھ۔ "مگر اب تو چاول اور گنڈیریاں بھی ہیں"

گجری نے لسی، چاول اور گنڈیریوں سے چندرما کو ادھیر یہ دیا اور ہاتھ باندھ کر شوہر کی درازی عمر کے لئے دعا کی اس وقت اُسے چاند مسکراتا ہوا دکھائی دیا جیسے مبارکباد دے رہا ہو۔ اُسے کہہ لہلہاتی ہوئی فصل گھبراتی تھی اب کہہ لہلہاتی ہوئی گجری کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہوا میں تیر رہی ہے۔ اس کے منہ سے ہنسی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی تھی۔ گجری روکتی تھی مگر ہنسی رکتی نہ تھی وہ اٹھلاتی ہوئی شوہر کے پاس آئی اور پاس بیٹھ کر بولی "کیا کچھ لائے دیکھوں"

ٹھاکر سنگھ نے بنگالی مٹھائی کی ٹوکری سامنے رکھ کر کہا "نمبر ایک" گجری نے مٹھائی دیکھی تو منہ میں پانی بھر آیا۔ مگر شانتی سے بولی "اتنی کیوں لے آئے؟ دو روپئے سے کم کی نہ ہو گی"

ٹھاکر سنگھ "روپیہ کی تو میں ہی کھا جاتا شاید اس سے بھی زیادہ کھا جاؤں۔ کل سے بھوکا ہوں اور کیا ہو دیکھا کیسے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارتا ہوں صرف اجازت ملنے کی دیر ہے"

گجری (مسکرا کر) "اور کیا لائے؟" ٹھاکر سنگھ پھلوں کی ٹوکری سے کاغذ اٹھا کر کہا "نمبر دو" کچھ سیب تھے، کچھ انار

آدھا میرا نگورا اور ایک سرو، گجری کا دل کھل گیا جیسے پودے کو پانی مل جائے۔ بولی "اب معلوم ہوا آج کرواچوتھ کا برت ہے۔"
ٹھاکر سنگھ نے جیب سے ایک بنڈل نکال کر کھولا۔ اس میں ایک ریشمی ساڑی تھی گجری کی آنکھیں چمکنے لگیں ٹھاکر سنگھ نے کہا۔
"بہن تین" گجری نے پنا سر شوہر کے کندھے پر رکھ دیا اور آنکھیں موند لیں۔ خوشی اتنی تھی کہ ہنسے بغیر بھی نہ نکلتی تھی۔ سارے دن کی تھکن دیکھتے دیکھتے دور ہو گئی ٹھاکر سنگھ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "اب بھی خوش ہوئی یا نہیں"
گجری "زبان سے کیا کہوں میرا منہ دیکھ لو" یہ کہہ کر گجری نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اور مسکرانے لگی۔ ٹھاکر سنگھ گجری کا منہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور کہا "اب ہمارا بھی چندرما (چاند) نکلا، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجھے باتیں کر رہا ہے" گجری "(شرارت سے) "کہتا ہے مجھے دیکھو" ٹھاکر سنگھ "نہیں کہتا ہے مجھے ادھیرے دو" یہ کہتے کہتے ٹھاکر سنگھ نے ایک رس گلا اٹھا کر گجری کے منہ میں دیدیا۔ وہ "نانا" کرتی ہی رہی مگر ٹھاکر سنگھ نے ایک نہ سنی۔ کہا "تم نے اپنے چندرما کو ادھیرے دیا ہے یا نہیں۔ ہم اپنے چندرما کو ادھیرے دئے بغیر کیسے کھائیں" گجری بھی ایک رس گلا شوہر کے منہ میں دے دیا۔ میاں بیوی دونو کھانے لگے۔ اتنے میں گنگو نے آکر کہا۔ "میاں یعقوب کا آدمی بیس روپیہ دے گیا ہے" ٹھاکر سنگھ کا چہرہ اور بھی چمکنے لگا۔ گجری نے گنگو سے روپیہ لے لئے۔ اور شوہر کی طرف دیکھ کر کہا "پہلے مل جاتے تو اتنی تکلیف نہ ہوتی"
ٹھاکر سنگھ "اُس حالت میں یہ پھل ایسے میٹھے کبھی نہ لگتے"
یکایک کسی نے نیچے دروازہ کھٹکھٹایا "کون ہے؟ ذرا نیچے آئیے"
گجری نے منہ بنا کر کہا "اس وقت کون آگیا۔ بیٹھے رہو۔ گنگو خبر لے آتا ہے"
ٹھاکر سنگھ۔ (ہنس کر) "گھبراتی کاہے کو ہو۔ میں نیچے جا رہا ہوں دیتی نہیں جا رہا ہوں۔ ابھی آیا۔
گجری "اس وقت ایک منٹ بھی گھنٹے سے کم نہیں"
ٹھاکر سنگھ نیچے گئے اور تھوڑی دیر بعد لوٹے تو چہرہ عجیب چمک تھی۔ گجری نے پوچھا "کون تھا؟"
ٹھاکر سنگھ "کوئی ان ہرچس رائے کا آدمی تھا"
گجری "کون ہرچس رائے؟ وہی تو نہیں جو دو پہر کو آیا تھا؟"
ٹھاکر سنگھ "ہاں ہاں وہی! اُسی نے تصویر کے لئے پیشگی روپیہ بھیجا ہے"
گجری کے دل میں گدگدی ہونے لگی، جلدی سے ٹھاکر سنگھ کے پاس آکر بولی "کتنا روپیہ؟" ٹھاکر سنگھ نے ایک ایک لفظ پر رک رک کر کہا "اڑھائی سو روپیہ" گجری کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ بولی جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟
ٹھاکر سنگھ "جھوٹ بولوں گا تو میرا بیعانہ ضبط نہ ہو جائیگا۔ یہ تمہارا چک رہا"
یہ کہہ کر ٹھاکر سنگھ نے چک گجری کے ہاتھ میں دے دیا۔ گجری چک اور ریشمی ساڑی لیکر جلدی جلدی نیچے اتر گئی۔

(دوشالہ بھارت)

آمد شاہ

از جناب مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب اے۔ آر۔ سی۔ بی۔ (لندن)
بی۔ بی۔ سی آنرز (لندن) فیلو آف دی فزیکل سوسائٹی (لندن)
(صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ)

صدر صاحب نے یہ نظم حضرت اقدس و اعلیٰ کی مراجعت دہلی کے موقع پر فارسی کے اولین اور مشہور شاعر رودکی کے "موے جولیاں" والے قصیدہ پر لکھی تھی۔ جو "مکتبہ" میں شائع کرنے کی غرض سے عنایت کیگئی ہے۔ صدر صاحب کو فارسی قدیم سے خاص شغف ہے۔ جس کا ایک مظہر یہ نظم ہے اپنے علم نواز اور ہر دلعزیز بادشاہ کے متعلق ایک علمی ادارے کے صدر کے یہ مخلصانہ جذبات قابل تحسین ہیں۔
(مجلۂ مکتبہ)

قدم مسیحائے زماں آید ہمے — در تن ہر سودہ جاں آید ہمے
میر عثمان علی شاہ دکن — خرم از ہندوستاں آید ہمے
اے دکن آسودہ زی آباد باش — شاہ بیشیت شادماں آید ہمے
بر اولوالعزمی و عالی ہمتش — مرحبا از آسماں آید ہمے
خلق در وجد است و جشن اندر جہاں — شاہ عثماں کامراں آید ہمے
رود موسیٰ از فروغ شمعہا — جلوہ گر چوں کہکشاں آید ہمے
شاہ شمس و حیدرآباد آسماں — شمس سوئے آسماں آید ہمے
حیدرآباد است باغ عدل و داد — شاہ چوں نوشیرواں آید ہمے

از در و دیوار برخیزد صدا
بازو رود دل دلستاں آید ہمے

عمل

از

جناب نواب ضیاء یار جنگ بہادر۔ سابق رکن عدالت العالیہ

کراست فرصت گلگشت در دیار عمل بیا کہ فاتحہ خوانیم بر مزار عمل

ز چشم سازی دہقان روزگار چہ شود کہ نیست قطرہ آبے بجوئبار عمل

ز دامگاہ نفاق آگہ ہست پنداری کہ رمز سایہ خود می کند شکار عمل

چگونہ پائے بدامن کشد دلم کہ ہنوز نہ رفت موسم گل چیدن بہار عمل

پیچ دست ارلوت در آستین کیں دست کشند بچشم فلک سرمہ غبار عمل

خطر ز فتنہ جاہ است اہل دولت را جز ایں دگر بنود خار رہگذار عمل

ضیا چہ زندہ نمائیم مردہ قومی را

کہ نیست قابل احیاء در دیار عمل

بادۂ دکن

لچھمی نراین صاحب شفیق اورنگ آبادی

(۳)

غزل گوئی کے معنے بالکل معشوق سے باتیں کرنے کے ہیں، صاحب کی غزل گوئی بھی اسی نہج پر ہے ان کے نام صاحب نے احسان شناسی کے طور پر نہایت پر لطف کنایوں کے ساتھ بیان کر دیے ہیں، کبھی پردگی سے کام لیا ہے اور کبھی بے پردگی سے بھی، جن کے حسن تصدق میں غزل گوئی ہوئی ہے، ان کے نام بیربھان، شکر دمیاں، ثابت علیخاں، پھندو میاں وغیرہ ہیں (عمر ۲۰ سنہ)

(بیربھان)

(ب۱) بے وفا بے مہر وہ دل دار ہے — نت نیا حراف اور طرار ہے

(ی۲) یک جگہ الفت نہیں رکھتا ہے وُہ — دل بری کے فن میں کیا ہشیار ہے

(ر۳) ربط رکھتا ہے تمام عالم کے ساتھ — دوست ہے سب سے سبوں کا یار ہے

(ب۴) بھوت ہیں گی شوخیاں گستاخیاں — بات میں انکار ہے اقرار ہے

(ھ۵) ہر کسے لیتا ہے باتوں میں لبھا — کس طرح کا شوخ ہے عیار ہے

(ا۶) اب تو اوروں ساتھ الفت ہے اُسے — کچھ ہمارے سے تو وے بیزار ہے

نام جو چاہے تو ہر اک بیت سے
(ن) حرف لے صاحب تو پھر اظہار ہے

(شکر دمیاں)

(ش۱) شکر حق دل بر ہمارا رام ہے — کچھ تو الفت ساتھ اُس کو کام ہے (ک۲)

(ر۳) ربط رکھتا ہے ہمارے سے بہت — وہ ہماری جان کا آرام ہے (د۴)

(م۵) مہربانی ہے سدا ہم پر اُسے — یہ سخن مشہور خاص و عام ہے (ی۶)

(ا۱) اب سر مصرع سے لے صاحب تو حرف
(ن) نادر اُس پیارے کا اس میں نام ہے

(ثابت علیخاں)

(ث۱) ثانی تر اخدا نے تجھی کو بنا چکا — آئینہ نے بھی شکل کو تیری دکھا چکا (آ۲)

(ب) یار تجھے تو بات مری ہو یا نہ ہو — تیرا تو میں نے آپ کو بندہ کہا چکا (ت)
(ع) عاجز ہوں سخت عشق کی بیتابیوں سے میں — لاچار اب تو جان سے میں ہاتھ اٹھا چکا (ل)
(ی) یارب! کوئی بھی عشق میں بدنام یوں نہ ہو — خوبوں کی گالیاں میں کئی بار کھا چکا (ی)

(ا) ان مصرعوں کے جس نے سر حرف کو لیا
(ن) نام اُس کا صاحب اب تو بلاشبہ پا چکا

(پھندوں میاں)

تو ہے میرا دل ربا پھندو میاں! — تو نے میرا دل لیا پھندو میاں!
تیرے پھاندے میں ہزاروں دل پھنسے — نام ہے تیرا بجا پھندو میاں!
بسکہ شوخی سے ہی تجھ میں کودپھاند — اس سبب گہنار وا پھندو میاں!
انتظاری میں ترے بے تاب ہوں — جلد آ تو جلد آ پھندو میاں!
تو صفا میرے سے رکھ جس طور ہے — تیرے عارض پر صفا پھندو میاں!
حق تعالیٰ نا کرے میرے تئیں — ایک پل تجھ سے جدا پھندو میاں!
میرے دل سے بھولتی ہرگز نہیں — وہ تری پیاری ادا پھندو میاں!
حسن تیرا روز افزوں تر ہے — یہ ہی (ہے) میری مدعا پھندو میاں!
تیری خدمت میں یہی ہے التماس — دوستی مجھ سے نبھا پھندو میاں!

صاحب دل خستہ پر لازم ہے لطف
ہے غلام باوفا پھندو میاں!

(روپ چند)

غنچہ لب، رنگیں ادا ہے روپ چند — سرو قد، نسریں قبا ہے روپ چند
لے گیا دل کو مرے جھپکی بتا — کس طرح کا دل ربا ہے روپ چند
روپ اُس کو چاند سا حق نے دیا — نام اُس کا کیا بجا ہے روپ چند
چاند کم دِستا ہے جوں برسات میں — اس طرح سے کم نما ہے روپ چند

ریختہ فرمائشی صاحب کہا
آشنا کا آشنا ہے روپ چند

تنقیدیں
جدید رسالے

العراقی تقطیع رائل پلے ۱۶ حجم تین جز قیمت سہ سالانہ ۱۲ پتہ نقشبندی منزل لار گورکھپور۔ یہ ایک فرقہ واری ماہوار رسالہ ہے جو گورکھپور کے قصبہ لار سے ابو المعانی علی احمد نقشبندی کی ادارت اور مولانا نیاز فتحپوری کی نگرانی میں ماہ ربیع الاول سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے اجرا کے مقاصد جناب مدیر کے قول کے مطابق عراقیوں میں علمی ادبی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور تواریخی (؟) مذاق از سر نو پیدا کیا جائے۔

پہلے رسالے میں چار مضامین، تین نظمیں ہیں۔ مضامین میں ایک افسانہ بھی ہے "شوہر کا چور"، رسالے کی افتتاحیہ رسم جناب مدیر کی ایک نظم "بیاض از اہر" سے ہوتی ہے۔ قصبہ لار کی تاریخ کے ساتھ ساتھ رسالے کے اجرائی کے مقاصد بھی بیان کر دیے گئے ہیں۔ گویا یہ رسالہ اس برادری میں علمی ترقی کا معاون اور اتحادی روابط کو بڑھانے والا ہوگا۔ یہ خوب آغاز ہے جس کی ابتدا "القریش" سے ہوئی۔ اگر کسی قوم کے مختلف فرقے علم و عمل میں ترقی یافتہ ہو جائیں تو اس کے معنی خود قوم کی ترقی کے ہیں۔ رہنمایان قوم کو اس حقیقت کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ کہ قومیں کبھی اپنے ماضی کی طرف واپس نہیں ہوتیں۔ بلکہ وہ نمونے لے سیکھتی ہیں۔ اس لئے جدید اثرات سے بچنے کی کوشش کے بجائے ان کو قبول کر کے "خذ ما صفا دع ما کدر" کے اصول پر عمل ہو۔

رسالہ کیمیا ماہرار زیر نگرانی سید جالب صاحب ایڈیٹر "ہمدم" لکھنو سے شائع ہوتا ہے چندہ سالانہ معہ محصول ڈاک (للہ) زمانہ قدیم اور بالخصوص قرون وسطیٰ کے لوگ دو چیزوں کے بے حد متلاشی تھے۔ ایک چشمۂ آبحیات۔ اور دوسرے کیمیا کا صحیح نسخہ۔ لیکن باوجود ان کی ان تھک کوششوں کے یہ دونوں چیزیں دستیاب نہ ہو سکیں۔ مگر موجودہ تمدن نے ان دونو چیزوں کو بلا واسطہ حاصل کر لیا ہے۔ اور یہ بتلا دیا ہے کہ انسان کی کوششوں کا نتیجہ ابدی حیات کا پرچشمہ ہے۔ اور کیمیا کا صحیح نسخہ تجارت اور صنعت و حرفت ہے۔ مغربی ممالک کی روز افزوں ترقی کا راز اسی قیمتی نسخہ میں مضمر ہے بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان بھی اب اس نسخہ کو اس طریقے پر حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کا زندہ ثبوت رسالہ "کیمیا" کے مطالعہ سے ملتا ہے۔ اس رسالہ میں صنعت و حرفت اور تجارت سے متعلق مضامین درج ہوتے ہیں ہندوستان کی صنعتی اشیاء پر کافی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ چنانچہ ایڈیٹر صاحب کا مضمون "ہندوستان میں صنعت نمک سازی" اسی قبیل سے ہے اس کے علاوہ "سونے کی کان" کے تحت جو پمپ نسخے درج ہیں ضرور قابل قیمت ہیں

(ان نسخوں کے درج کرنے میں ایڈیٹر صاحب کو کافی احتیاط کی ضرورت ہے۔) علاوہ ازیں اس رسالے میں جو افسانے درج ہیں ان کا موضوع بھی صنعت وحرفت اور تجارت کی تبلیغ سے متعلق ہے"، ہماری رائے ہے کہ اگر ایڈیٹر صاحب کے پیش نظر سائنٹیفک امریکن اور "پاپولر سائنس" جیسے رسالہ بھی ہوں تو پرچہ اور شاندار بن سکتا ہے بہرحال ہم سید جالب صاحب دہلوی کی اس کوشش پر مبارک باد دیتے ہیں۔ کہ انہوں نے ہندوستان میں اس نوعیت کے واحد رسالہ کا اجرا کیا۔ اُردو داں پبلک اس سے بہت کچھ مستفید ہو سکتی ہے۔

مبادی نباتات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۰۳ صفحے مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔ قیمت عصہ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ ٹرونو حیدرآباد دکن

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ نباتات کا ایک ابتدائی رسالہ ہے جس کو مسٹر جگ موہن لال۔ بی۔ ایس سی۔ ایل۔ ٹی نے مختلف انگریزی کتابوں سے مواد لے کر اور جامعہ عثمانیہ کی وضع کردہ اصطلاحات کو کام میں لاکر سلیس اردو میں تالیف کیا ہے۔ یہ رسالہ کئی اعتبار سے قابل قدر ہے۔ ایک تو یہ کہ اُردو زبان میں اپنی نوع کا یہ پہلا رسالہ ہے۔ دیوں تو اس سے قبل بھی دو ایک رسالے اس نوع کے شائع ہو چکے ہیں لیکن اس کا طرز بیان اُن سب سے جدا اور بہتر ہے) دوسرے یہ کہ اس کو نہایت سنجیدگی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ابتدائی ابواب میں بیجوں کی ساخت اور پودوں کے اُگنے سے بحث کی گئی ہے۔ پھر اس کے بعد جڑوں کے اقسام اور ان کے کاموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور پھر پھولوں اور پتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سب سے آخر میں "پودوں کے احساسات" کے عنوان سے ایک باب لکھا گیا ہے جس میں مثالوں کے ذریعہ یہ سمجھایا گیا ہے۔ کہ انسانوں اور جانوروں کی طرح پودوں میں بھی احساس ہوتا ہے مصنف کی اس کوشش پر ہم مبارکباد دیتے ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ آپ کی کوشش سے اس قبیل کی دیگر کتابیں بہت جلد منظر عام پر آجائیں گی۔ آخر پر ہم مشورہ دیتے ہیں کہ آپ جامعہ عثمانیہ کی وضع کردہ اصطلاحات پر قانع نہ ہیں۔ بلکہ اپنی طرف سے بھی کچھ نہ کچھ اضافہ کر کے اُردو زبان کی ساخت میں ہاتھ بٹائیں۔ یہ کتاب نصاب کے لئے بھی موزوں معلوم ہوتی ہے۔

مقنن تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم ۱۰۰ صفحے لکھائی چھپائی عمدہ چندۂ سالانہ عصہ ملنے کا پتہ:۔ منیجر مقنن۔ نام پلی نمبر (۵۰۷) حیدرآباد دکن۔ حیدرآباد دکن کا ایک تازہ قانونی ہفتہ وار رسالہ ہے۔ اس کے مدیر ہیں سید محمد احسن صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی، حسن الدین صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی اور محمد عبدالرحمن صاحب رئیس ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی آمد ترقی بالکل جامعہ عثمانیہ کی پیداوار پر منحصر ہے چنانچہ اندنوں ہر قسم کے مشاغل میں جامعہ کے تعلیم یافتہ نہایت خوش اسلوبی سے حصہ لے رہے ہیں۔ یہ اتفاقی بات ہے کہ اس رسالہ کا پورا ادارہ جامعہ کے فارغ التحصیل نوجوانوں ہی پر مشتمل ہے۔ اس لئے یہ رسالہ صحیح معنوں میں جامعہ عثمانیہ کی پیداوار کا ایک حقیقی نمونہ ہے۔ اس کے پہلے نمبر کو دیکھ کر اس کے شاندار مستقبل کا خاکہ ہماری ذہن میں آجاتا ہے۔ رسالہ کی ترتیب خوبی کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں قانونی مقالات ہیں۔ دوسرا حصہ جو دشیل کیسز اور عدالت العالیہ کے نظائر سے متعلق ہے اور تیسرے حصہ میں عدالتہائے عالیہ ہند کے نظائر درج ہیں۔ ضروری اور اہم قانونی مسائل پر مضامین بھی لکھے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ رسالہ ساری ہندوستان کی قانونی دنیا پر حاوی ہے۔ لہٰذا قانون سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اس کا مطالعہ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کیلئے بینظیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے۔ جو اقسام کے اعصابی و انعدوانی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔ اور متعدد طبی آزمایشوں کے بعد ہم کمال یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے۔ کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا بیقرار اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس۔ وجع مفاصل دمہ۔ دردسر۔ دردسول۔ بچھو کے زہر کے لئے اور زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال

تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر لیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعضاء کو بھاپ دیں اور صاف کریں۔ جو صاحب بغرض امتحان دوا طلب فرمائیں بخوشی تعمیل کی جائے گی۔

نوٹ۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے۔ نسخہ جات نہایت احتیاط کیساتھ تیار کئے جاتے ہیں

المشتہر حسن اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن۔

افتخار الحکماء خواجہ عاذق جنگ مرحوم سابق افسر الاطباء فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت اور بڑی خوشی کے ساتھ محض بیماروں کی شفائی غرض سے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں۔ برص منتشر (یعنی کوڑھ اور سفید داغ) کا علاج نہایت مشکل ہے۔ یہ مرض عموماً بڑھتا ہی جاتا ہے۔ حکیم مولوی محمد عبدالغفار صاحب مدوگار صدر مہتمم دارالادویہ یونانی سرکار عالی و کن دارالتشخیص و انجمن الحباء یونانی حیدرآباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولیٰ رکھتے ہیں صاحب موصوف نے اکثر مرضاء برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور بفضلہ کامیاب ہوئے۔ میں نے بچشم خود مرضاء برص کا معائنہ کیا ہے۔ بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور مجرب دوا کا اثر ہے۔ میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے کٹھن مرض کی بدولت مجرب کی ایجاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہئے کہ وہ اس موقع کو غنیمت سمجھکر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

(شہر محفوظ (افتخار الحکماء عاذق جنگ)

مطبوعات جامعہ ملیہ - دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جہاں مسلمانان ہند کے احیاء بقا کے لئے بہت سے کام اپنے ذمہ لیئے ہیں وہاں اس کا ایک اہم کام اردو زبان میں اعلیٰ لٹریچر بہم پہنچانا بھی ہے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے اس نے اپنے ہاں تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ قایم کیا تھا جو اب اردو اکاڈمی کے نام سے موسوم ہے۔ اردو اکاڈمی مختلف علوم و فنون پر چند نہایت مفید کتابیں شایع کر چکی ہے۔ جن کی فہرست ہم آیندہ صفحات میں درج کرتے ہیں نیز ان کتابوں کی بھی ایک فہرست درج کر رہے ہیں جو مکتبہ جامعہ نے مفید سمجھ کر خود شایع کی ہیں۔ قدر دانان علم سے ہمیں امید ہے کہ ان مطبوعات کی قدر افزائی فرمائیں گے۔

سلسلہ اردو اکاڈمی

تاریخ الامت - مصنفہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ صحیح تاریخی اصول اور تحقیق و تنقید کے ساتھ اردو میں پہلی بار شایع ہو رہا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہر شخص نہایت آسانی سے مسلمانوں کے تاریخی کارناموں سے واقف ہو سکتا ہے۔ جامعہ ملیہ اور صوبۂ متواسط و برار کے محکمۂ تعلیم نے اسے اپنے مدارس کے لئے بھی پسند کیا ہے۔ ابتک چھ حصے شایع ہو چکے ہیں جو حسب ذیل ہے:-

(۱) حصہ اول سیرۃ الرسول ﷺ
(۲) حصہ دوم خلافت راشدہ عہ
(۳) حصہ سوم خلافت بنی امیہ عہ
(۴) حصہ چہارم خلافت عباسیہ جلد اول عہ
(۵) حصہ پنجم " جلد دوم عہ
(۶) حصہ ششم عباسیہ مصر عہ

تاریخ الدولتین - اس کتاب میں خلافت بنی امیہ و بنی عباس کے حالات پر ایک فاضانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ مصر کے مشہور اہل قلم جرجی زیدان کی تصنیف ہے جسے مولانا نیاز فتحپوری نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ قیمت عہ

مبادی معاشیات - یہ علم المعیشت پر ایڈون کینن کی مشہور و معروف تصنیف ہے جس کا ترجمہ پروفیسر ذاکر حسین خان صاحب نے نہایت سلیس اردو میں کیا ہے یہ کتاب فن کے مبتدیوں کے لئے مفید ہے قیمت عہ

تاریخ ہند قدیم - قدیم ہندوستان کی تاریخ کا ایک مختصر لیکن نہایت جامع خاکہ شعبہ تصنیف نے کے، ایم، پانیکر صاحب ایم۔ اے (آکسن) سے انگریزی میں لکھا کر اردو میں ترجمہ کرایا قیمت عہ

تفسیر پارہ عم - مصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاد تفسیر جامعہ۔ سلسلۂ تفسیر "الفرقان فی معارف القرآن" کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ کتاب بھی اسی مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں پارہ عم کی تفسیر خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں امت اسلام کے لئے پیش کی ہے۔ قیمت عہ

عبرت - تفسیر سورۂ یوسف سلسلۂ تفاسیر کی ایک اہم جلد جس میں احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نہایت خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور اس کے عبرت انگیز نتائج کو بہت موثر

طریقہ پر پیش کیا گیا ہے قیمت عہ

برہان سورۂ نور کی مکمل اور مبسوط تفسیر نہایت پرزور اور دلکش طرز تحریر قیمت عہ

قواعد عربی (حصہ اول) کتاب الصرف اردو میں عربی صرف کی مستند کتاب جسے ہندوستان کے مشہور عربی ادیب لغت ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی استاذ عربیات جامعہ نے نہایت تحقیق سے مرتب کیا ہے قیمت ۔ عہ

تاریخ فلسفہ اسلام از ڈاکٹر محمد عبید حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (برلن) ایڈنبرا کے مشہور فلسفی اور مستشرق ٹ ۔ ج ۔ دی بوئر کی گرانقدر تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ ۔ تاریخ فلسفہ اسلام پر اردو میں یہ پہلی قابل قدر کتاب ہے ۔ قیمت عہ

عربوں کا تمدن ڈاکٹر خورف ہیل پروفیسر میونک یونیورسٹی کی مشہور معرکہ تصنیف (RULTUR DER ARABER) کا ترجمہ از ید بیضا بیاری صاحب بی اے (جامعہ) مترجم نے کتاب کی قدر نہایت مفید ضمیمہ لکھکر اور بھی بڑھا دی ہے جو تاریخ اسلام پر اون بھی نہایت محققانہ اور بصیرت افروز مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ قیمت عہ

دیوان غالب

طبع ثانی

مطبوعہ برلن (جرمنی)

ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر و ادیب مرزا غالب کا کلام جو شان رکھتا ہے اور جس قدر و منزلت کا وہ مستحق ہے ہم نے اسی حسن خوبی اور لطافت و نفاست کے ساتھ مرزا کے کلام کا مجموعہ ارباب ذوق کے سامنے پیش کیا ہے ۔

یہ دیوان نہایت اہتمام کے ساتھ جرمنی میں طبع کرایا گیا ہے خوبصورت ملایم جلد، اسپر سنہرے دلفریب نقش نگار طلائی اوراق اور سب سے زیادہ مرزا غالب کی لاثانی عکسی تصویر جرمن ہنرمندی اور کمال کا اعلےٰ نمونہ ہیں ۔

ہمارے اس دیوان کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ چند ماہ کے قلیل عرصہ میں اس کا ایک ایڈیشن ختم ہوگیا اور دوسری بار طبع کرانا پڑا ۔ دیوان مکمل ہے جس میں مرزا مرحوم کا خود نوشتہ مقدمہ غزلیات قصاید اور رباعیات ہیں ۔ جلد مطلا نہایت عمدہ سائز ۴ ۔ ۵ قیمت صرف عہ

دیوان شیدا

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم

کے

فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ

دنیا مسیح الملک کو طبیب، قومی رہنما عالم، ادیب اور حاذق کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن ان کا علم شاید خواص کے علاوہ کسی کو نہو کہ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم فارسی اور اردو کے ایک اعلیٰ پایہ اور کہنہ مشق شاعر بھی تھے ۔ آپکا کلام استادانہ ہے اور رفعت خیالات اور سادگی اظہار کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے ۔ اس دیوان کا ایک ایک لفظ حکیم صاحب مرحوم کی ہمہ گیری نکتہ رسی اور قادر الکلامی کا شاہد ہے

مکتبہ جامعہ نے اس دیوان کو جرمنی میں طبع کرایا ہے ۔ پاکٹ سائز جلد سنہری منقش نہایت خوبصورت اور اق مطلا رنگ سرخ ۔ نیلا ۔ سبز قابل دید چیز ہے ۔ قیمت صرف عہ

مطبوعاتِ مکتبۂ جامعہ

ہمارے نبی بچوں کے لئے خدا کے پیارے ہمارے نبی کی پاک زندگی کی کہانیاں از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے (طبع سوم) ۵ر

ہمارے رسول خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی نے بچوں کے لئے سہل اور موثر ترین زبان میں رسول اللہ علیہ وسلم کے پاک حالات تحریر فرمائے ہیں قیمت ۱ر

سرکار کا دربار از احمد لیاس صاحب بھیجی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر دو رائے لڑکوں کے لئے بیحد مفید کتاب۔ عہ

دنیا کے بسنے والے دنیا کے عجیب و غریب باشندوں کے حالات تقریباً ۵۰ تصاویر از سید بشیر حسین صاحب زیدی۔ ہیڈ ماسٹر مسلم یونیورسٹی اسکول علی گڈھ قیمت ۶/ عہ

ترکوں کی کہانیاں ترک بچوں کی ہمت و جرأت کی سچی کہانیاں جن کے پڑھنے سے بچوں میں قومی جوش پیدا ہوتا ہے قیمت ۵۰ر

ازہار العرب ہمت و شجاعت و سخاوت و مروت اور علم و حکمت کے تبحرین عربی اشعار کا گلدستہ۔ قیمت ۱۰ر

انتخاب مضامین جوہر طلباء جامعہ کے قلمی رسالہ "جوہر" کے منتخب علمی و ادبی اور تاریخی مضامین قیمت عہ

اورنگ زیب عالمگیر مولانا شبلی کی معرکۃ الآرا تصنیف، طباعت، کاغذ نفیس۔ قیمت عہ

مقدمہ شعر و شاعری خواجہ حالی کے دیوان کا مقدمہ اردو شاعری کے محاسن پر لطیف تبصرہ معہ فوٹو خواجہ مرحوم قیمت عہ

صلاح کار عنوان شباب کے خدمات کے شیب و فراز پر گہری نظر۔ اور ازدواجی زندگی کے لئے دلسوز مشیر۔ از چودھری محمد علی صاحب لطیف دلاردو قیمت عہ

جمال الدین افغانی اتحاد اسلام کے داعی اور مشرق کے مصلح اعظم سید جمال الدین افغانی کے حالات زندگی سید صاحب اور ان کے جانشین شیخ محمد عبدہٗ کی تصاویر بھی شامل ہیں قیمت ۱ر

عرض جوہر مجموعہ کلام مولانا محمد علی صاحب قیمت ۱۰ر

انتخاب میر از بان اردو کے زندۂ جاوید شاعر میر تقی میر کے کلام کا ایک خاص نقطۂ نظر سے انتخاب معہ مقدمہ و حالات میر۔ مرتبہ مولوی الرحمن صاحب بی اے۔ علیگ قیمت عہ

دیوان غالب طلبہ کی سہولت اور روزمرہ کے استعمال کے لئے مناسب قیمت ۱۰ر

مسدس حالی طلبہ کے استعمال کے لئے۔ مجلد ہونے کے باوجود قیمت ۱ر

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ اس رسالہ میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے تعلیم کی غایت اور مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی ضروریات پر بڑی مفید بحث کی ہے قیمت ۱ر

خطبۂ صدارت شیخ الہند مرحوم کا تاریخی خطبہ صدارت جو بتقریب افتتاح جامعہ پڑھا تھا قیمت ۱/۶ عہ

خطبۂ صدارت مسیح الملک مرحوم کا عالمانہ خطبہ جو جلسہ اول تقسیم اسناد میں پڑھا گیا۔ قیمت ۵ر

اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے خطبۂ صدارت

کالا دو ترجمہ مسلمانوں کی حیرت انگیز علمی ترقی کا خاکہ قیمت ۵ ر

قومی و اسلامی تعلیم کا نظام مولانا محمد علی کی تعلیمی سکیم قیمت ۵ ر

نامۂ مشیر شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی کا منظوم خط ایک دوست کے نام قیمت ۱ ر

نالۂ مشیر دیوان کا پہلا حصہ قیمت ۴ ر

کلام مشیر دیوان کا دوسرا حصہ قیمت ۴ ر

نینی تال، کشمیر اور یورپ کے پر فضا مقامات کے مین کھی گئی ہیں قیمت ۴ ر

الورد والریحان صحیح بخاری صحیح مسلم کی حدیثوں کا انتخاب مع ترجمہ نظم و نثر قیمت ۱ ر

ملنے کا پتہ ۔ مکتبہ ابراہیمیہ امدادیہ (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

حیدرآباد دکن کی مشہور و معروف دوا

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سرٹیفکیٹ عطا کیے ۔ زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ جرمنی ڈاور سٹیٹ شدہ ہے جو فیل مراض پر آناً فاناً یہ طلسمی اثر دکھاتا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے مثلاً ہیضہ ۔ پلیگ ۔ بخار ۔ سر درد ۔ کھانسی ۔ دمہ ۔ بواسیر ۔ خارش ۔ سانپ بچھو کے زہر اور ہر قسم کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے آزمائے ایک بار ضرور آزمائے ۔ پبلک کو فایدہ پہونچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے ۔ شیشی نمبر (۱) عمدہ نمبر (۲) ۸ ر نمبر (۳) ۴ ر ایک درجن کے خریدار کو خرچہ ۔ وی ۔ پی ۔ معاف ہوگا ۔

پتہ خط و ترسیل کا

زندہ طلسمات حیدرآباد دکن ،،

آپ تمام دنیا دو سے قدم آگے رہنا چاہیں تو

ہفتہ وار رسالہ

انتخاب لاجواب لاہور

(۶) قیمت سالانہ چھ روپے

کا مطالعہ کریں اس کے مستقل خریداروں کو چھ سو صفحوں کی انعامی کتابیں ہفت روزہ حاتی میں انعامی کتابوں کی فہرست اور نمونہ کا رسالہ آپ کے پاس بھیجنے کا طلبگار

(منیجر انتخاب لاجواب لاہور)

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اُردو مرتبہ مولوی مظفر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل۔ جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی، عادل شاہی اور آصف جاہی دور میں اُردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اُردو کا تذکرہ مع نمونہ کلام ضخامت ۲۰۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا بارہ روم قیمت کما

جہانِ اُردو مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرائے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۲۴۵ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ساڈھے

روحِ تنقید مصنفہ مولوی ابو الحسنات سید غلام محی الدین قادری نور ایم اے، فن تنقید کے متعلق اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جسمیں ماضی حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۰۵ سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ مجلد قیمت عہ

تنقیدی مقالات مصنفہ نور صاحب۔ یہ روحِ تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روحِ تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی، فارسی اور اُردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کرکے اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشا پردازوں کے طرزِ تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد ساڈھے

اُردو کے اسالیبِ بیان مصنفہ نور صاحب۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت۔ ابتدا سے لیکر آجتک کے نثر نگاروں کے طرزِ تحریر و انداز بیان کا تذکرہ۔ خاص طرزِ تحریر کے اُردو انشا پردازوں کے اسالیبِ بیان پر تبصرہ ضخامت ۲۰۴ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ساڈھے

سلطان محمود غزنوی کی بزمِ ادب مصنفہ نور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی، ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ر

دنیائے افسانہ مصنفہ مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے، ایل ایل بی، افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ۔ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات یہ اُردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادی فلسفہ مرتبہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی، ڈاکٹر اے یس راپورٹ پی۔ ایچ۔ ڈی کی پراگرس آف فلاسفی کا مفصل اجمالہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ۔ قیمت ۱۴ر

ارباب نثر اُردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اُردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ امیر خسرو صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ مفصل ۲۴۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عال

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب میر سید شمس اللہ قادری ایم آر اے، ایس ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی مستقل تاریخ ضخامت ۴۴۴ صفحے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۲۴ر

جواہر کلیات نظیر منتخبہ جناب مولانا ذہین دسید ممتاز احمد نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے اخلاقی۔ ادبی نصیحت آمیز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۸۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائد امام مترجمہ مولوی محمد عبدالغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور بامحاورہ اردو ترجمہ۔ قیمت ۴ر

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی احمد عبداللہ مسدوسی بی اے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ر

دکنی لغت مولفہ مولوی سید شاہ احمد شعار ہاشمی۔ اردوئے قدیم یعنے دکھنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ر

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحبدل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۴۸ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵ر

خزینۂ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبدالعزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶ر

سیرت خیر البشر سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرتؐ کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱ر

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بد خو شوہر کو ٹھیک کرسکتی ہے۔ قیمت ۲ر

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ۔ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ روبرو محکمہ مالگزاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام محمد عثمان لیتھوگرافر و منیجر مطبع

مجلہ مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم اے۔ ال ال بی

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سکرار آصفیہ

مجلۂ مکتبہ

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سکرار انگلشیہ

(۶۵)

جلد (۲) بابتہ ماہ اسفندار سنہ ۱۳۳۸ف مطابق جنوری سنہ ۱۹۲۹ء (.....) شمارہ (۴)

تصویر۔ نواب سر فریدون ملک آنجہانی۔

فہرست

مضمون		صفحہ
۱۔ شذرات	از مدیر	ب
۲۔ فریدون ملک آنجہانی	" "	د
۳۔ قطبی نور	"جناب عبدالوہاب صاحب عثمانیہ کالج۔	۱
۴۔ کھیل کی تفسیات	" "محمد مظہر حسین صاحب بی اے۔	۱۱
۵۔ خیخوف اور راشد الخیری (ایک تقابلی مطالعہ)	" "عبدالقیوم صاحب باقی بی اے۔	۲۷
۶۔ گنبد خضرا	" "حاجی سید علی شبیر صاحب سررشتہ دولت آصفیہ۔	۳۹
۷۔ عشق (نظم)	" "شیخ عبدالقادر صاحب فانی۔	۴۷
۸۔ ہنگامۂ چشمک (افسانہ)	" "شبیر حسن صاحب قلیس رضوی۔	۴۸
۹۔ بادۂ دکن (بچھمی نارائن صاحب اورنگ آبادی)		۵۶
۱۰۔ امداد باہمی (نظم)	" "صفی اورنگ آبادی	۵۹
۱۱۔ جذبات حبیب (نظم)	" "حبیب رامپوری رکن انجمن ذوق ادب۔	۶۱
۱۲۔ عید کی تمنا (نظم)	" "میر ثامن علی صاحب نسیاں	۶۱
۱۳۔ تنقید (کلیات وطن)	" ع۔ ی	۶۲
۱۴۔ اشتہارات		

شذرات

اعلیحضرت سلطان العلوم ۲۶ رجب کو کلکتہ سے مراجعت فرمائے بلدہ ہوئے۔ اعلیحضرت کا سفر کلکتہ خانگی اور تفریحی تھا۔ وہاں آپ کی خوش گوار مصروفیتوں پر مقامی اور بیرونی اخباروں سے روشنی پڑ چکی ہے۔ اس سفر میں آپ کا ایک درخشاں کارنامہ بنگال کے مفلوک الحال لوگوں کی امداد کے لئے ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ ہے۔ جو گورنر صاحب بنگال کو حسب صوابدید صرف کرنے کے لئے دیا گیا۔ اعلیحضرت کے اس سفر سے ملک اور اہل ملک کے لئے مفید اور مہتم بالشان نتائج برآمد ہونے کی توقع ہے۔

اس سال حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا نواں اجلاس دارالبلد باغ عام (ٹاؤن ہال) میں ۹ اور ۱۰ اسفندار کو منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ جو اکثر و بیشتر ملک کے بہی خواہان تعلیم پر مشتمل تھی۔ مولوی حبیب الرحمان خان شیروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) نے عین وقت پر صدارت قبول فرما کر بڑی آسانی پیدا کر دی۔ نواب فخیار جنگ بہادر کی افتتاحی تقریر مختصر لیکن نہایت سبق آموز اور لائحہ عمل بننے کے قابل تھی۔ آپ نے ذہنی ارتقا اور روحانی اعتلا کے اسباب ایک ساتھ اختیار کرنے اور آزادی اور حریت کا دم بھرنے والوں کو نمود و نمائش سے پاک رہنے کی ضرورت پر زور دیا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے جس قدر قلیل عرصہ میں خطبہ صدارت کو کامیاب بنانے کی سعی کی۔ وہ نواب صاحب کی کہنہ مشقی کی دلیل ہے۔ ابتدائی حصے میں آپ نے جامعہ عثمانیہ کے وہ درخشاں نتائج شمار فرمائے جو ہر جامعہ کے لئے اس قلیل عرصہ میں باعث عزت ہیں۔ کاش! ملک کے ارباب حل و عقد ان نتائج کو ضائع ہونے سے بچا کر عملی طور پر ملک و ملت کے لئے مفید خانے کی کوشش کریں

مولوی سید خورشید علی صاحب معتمد کانفرنس کی روئداد بھی مختصر لیکن ضروری امور پر حاوی تھی۔ اس سے یقیناً اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ کانفرنس کی اہمیت اور اس کا وزن عملاً بڑھتا جا رہا ہے۔ اختلاف پسند طبائع انانیت کو مجموعی اور ملکی مفاد کے پیچھے ڈال کر اسی کے ذریعہ ملکی نظام تعلیم کی تعمیر میں حصہ لیں اور تخریبی قوتوں کو اپنوں کے بجائے غیروں کے مقابلے میں استعمال کریں تو ہم کس قدر جلد ایک مرکز تک پہونچ سکتے ہیں!

کانفرنس کے تینوں اجلاسوں میں چند اہم تحریکات اور مفید تقریریں پیش ہوئیں مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم اولین معتمد کی یادگار میں چندہ فراہم کیا گیا۔ تحریکات میں نواب ناظر یار جنگ بہادر کی تحریک تعلیم نسواں کانفرنس اپنی ضروریات کے مطابق مرتب کرنے کے متعلق جس قدر اہم ہے اس سے ہر شخص واقف ہے یا ہونا چاہئے مگر جی اے سی ای کی تحریک ملک میں اعلیٰ اور ادنیٰ پیشوں کی تعلیم کی جلد سے جلد ترویج کے متعلق تھی

کیونکہ اسی پر ملک کی آئندہ فلاح اور بہبودی کا انحصار ہے تعلیمی کتابوں کی قیمت کے تعین کا سوال بھی جو چوتھی تحریک کی صورت میں پیش ہوا، عاجلانہ توجہ کا محتاج ہے۔ اور حقیقت میں مصنفین اور ناشرین کی سہولت سے زیادہ متعلمین کی سہولت پیش نظر ہونی چاہیئے۔ امید ہے کہ ارباب حل وعقد کی نظر میں اس کی اہمیت نمایاں ہو چکی ہوگی۔

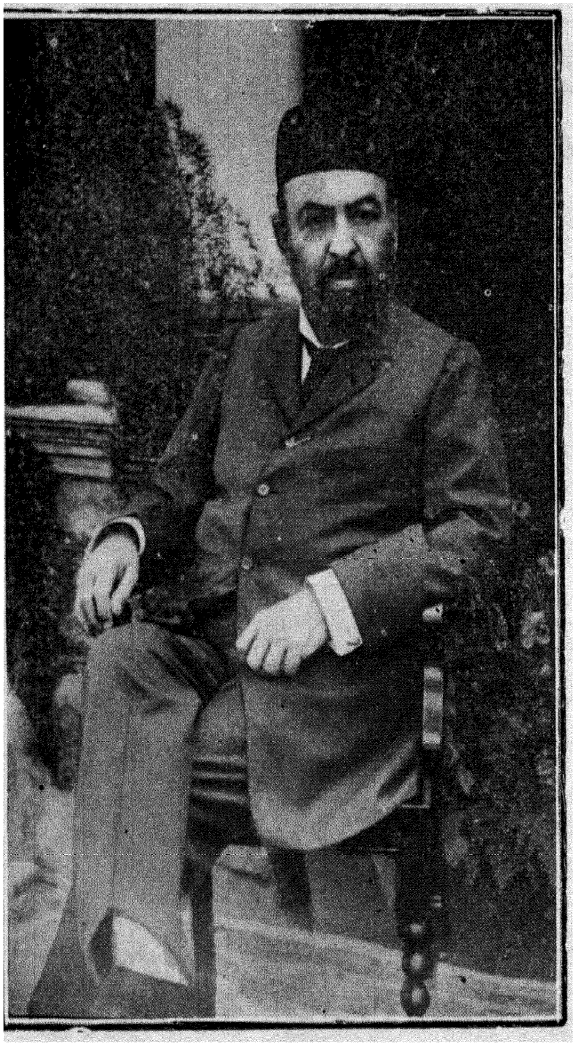
جامعہ عثمانیہ کے ایک قدیم طالب علم مولوی سید محمود عالم صاحب نے نہایت عمدگی سے مشرق و مغرب کے تمدن کا موازنہ کیا۔ اور "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے اصول پر عمل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مولوی یعقوب حسن صاحب نے بھی جو اتفاق سے اس موقع پر بلدہ ہی میں قیام فرما تھے "ہندوستانی کلچر" پر بڑی دلچسپ اور کارآمد تقریر کی۔ یقیناً کسی خاص تہذیب و تمدن کی اشاعت میں زبان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہمارے ملک میں انگریزی تہذیب کے وہی لوگ مقلد ہیں جو انگریزی زبان کے حامی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی تقریر کا مفید موضوع یونیورسٹی کی حقیقی تعلیم اور نظام تعلیم میں مؤثر اشخاص کی ضرورت تھا۔ جو یقیناً بڑی کاوش کا نتیجہ ہے۔ دوران تقریر میں جن مفید پہلوؤں پر ڈاکٹر صاحب نے روشنی ڈالی ہے اس کا شمار بھی یہاں ناممکن ہے۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ کاش ہم اس مسئلہ پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنا شروع کریں۔

اس قسم کی سنجیدہ محفلوں کے کاروبار سے حاضرین کی طبیعت عموماً اکتا جاتی ہے، ایک دو نظمیں خصوصاً جبکہ خوش الحانی کے ساتھ پڑھی جائیں، بہترین وقفہ سمجھی جا سکتی ہیں اس لئے کانفرنس کے نظام میں اس کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا تھا۔

ہمیں امید ہے کہ آئندہ سالوں میں کانفرنس اپنے وجود کو پچھلے سالوں سے زیادہ مفید ملک اور ہر دلعزیز بنانے کی کوشش کرے گی۔

جنوبی ہند کے سفر میں اس اور میسور کے بعد پنجاب کے مایہ ناز شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنی تشریف آوری سے حیدرآباد کو بھی زینت بخشی۔ جامعہ عثمانیہ جو ہند کے ارباب علم کی قدردانی میں امتیاز رکھتی ہے آپ کے خیالات سے ملک کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے مدعو کیا۔ چنانچہ جامعہ کی سرپرستی میں ۱۵، ۱۶، اور ۱۷ جنوری کو آپ کے تین لکچر مابعد الطبیعات پر انگریزی میں ہوئے۔ بہت سے لوگ جو انگریزی سے ناواقف بھی تھے، صرف دیکھنے ہی کی خاطر جمع ہوئے تھے۔ پانچ روز کے مصروف قیام کے بعد آپ راہی وطن ہوئے



نواب سر فریدوں الملک انجہانی

فریدون مُلک آنجہانی

گذشتہ مہینے میں ملک کے ایک علمی ترین عہدہ کو بہ احسن الوجوہ انجام پہونچانے والی ہستی یعنے سر فریدوں جی جمشید جی (نواب فریدون ملک بہادر) کے انتقال کی خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی گئی تھی اس ماہ میں ہم انہیں کی تصویر اور حالات پیش کر رہے ہیں۔

نواب سر فریدون ملک وکن کے ایک پارسی نژاد قابل فرد تھے جن کا وطن جالنہ (ضلع اورنگ آباد تھا) آپ کی ولادت ستمبر ۱۸۴۹ء کو ضلع اورنگ آباد ہی میں ہوئی اور تعلیم جالنہ میں پائی۔ نوعمری ہی میں سرکار عالی کے سررشتہ لمبا میں ملازمت اختیار کی لیکن بعد میں محکمہ مالگزاری میں منتقل ہو کر نمایاں خدمات انجام دیں۔

آپ کی ترقی کا زمانہ نواب محسن الملک مرحوم معتمد مالگزاری و نائم بندوبست کے عہد سے ہوتا ہے جنہوں نے آپ کی قابلیت کا اندازہ کر کے آپ کو ضلع اورنگ آباد کی مہتمی بندوبست کا کام سپرد کیا۔ نواب سر سالار جنگ بہادر مرحوم کی وزارت میں آپنے صوبہ بمبئی کے محکمۂ بندوبست کے اصول پر اورنگ آباد میں کام شروع کیا۔ اور اس کی کامیابی پر اضلاع بیڑ اور پربھنی کے علاقے بھی سپرد کئے گئے۔ اس اصول کے تحت رعایا کی حالت بہتر اور آمدنی میں بھی اضافہ ہو گیا۔

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد موصوف کو نظامت بندوبست کا عہدہ عطا ہوا لیکن اس خدمت پر آپ عرصہ تک نہیں رہنے پائے تھے کہ مدار المہام کے سرکاری پرائیوٹ سکرٹری کے عہدہ پر آپکا انتخاب نواب سر سالار جنگ بہادر نے فرمایا۔ اس خدمت پر آپ نواب سر آسمانجاہ نواب سر وقار الامراء مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر اور نواب سر سالار جنگ (ثالث) کے عہد وزارت میں بھی فائز رہے۔ مہاراجہ بہادر کے عہد وزارت میں معتمد سیاسیات کا عہدہ بھی آپکے سپرد کیا گیا وظیفہ کے قبل آپ صدر المہام سیاسیات ہو گئے تھے۔

وظیفہ پانے کے بعد بھی سر فریدون ملک کا تعلق سرکاری خدمات سے منقطع نہیں ہوا بلکہ باب حکومت کے قیام پر آپ کو رکن اختصاصی کی حیثیت سے قایم رکھا گیا اور سر علی امام بہادر کے یورپ جانے اور پھر خدمت صدارت سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد آپ صدر اعظم کے اہم فرائض سال بھر تک انجام دیتے رہے۔

اس طرح گویا چالیس سال تک مسلسل آپنے ملک اور ملت کے خدمات انجام دیئے۔ اہم ترین منصبداری کے عہدوں پر فائز اور آخر دم تک رکن حکومت رہے۔

نواب فریدون ملک کو مصنف اور مولفین کے زمرہ میں بھی شریک ہونے کا فخر حاصل ہے آپنے کئی مفید کتابیں لکھیں جنمیں سے ایک اورنگ آباد کے کاشتکاروں کی معاشرتی اور معاشی حالت سے متعلق ہے۔ ہندوستان کے مشہور انگریزی اخباروں میں آپکے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے[۱]

آپکے فرزند مسٹر رستم جی ملک کارعالی کے نائم کرور گیری ہیں آپکے انتقال سے ملک ایک مدبر اور تجربہ کار ہستی سے محروم ہو گیا۔

---

[۱] ملاحظہ ہو الانام مطبوعہ عالی پریس (۱۳۴۵ھ) صفحہ ۲۱ و ۲۲۔

قطبی نور

از جناب عبدالوہاب صاحب کلیۂ جامعہ عثمانیہ

مظاہر قدرت کی لاانتہا نیرنگیاں انسان کے دل و دماغ کو ایک غیر محسوس قوت کے ساتھ اپنی طرف جذب کرتی ہیں اور ایک سچا انسان ان بوالعجبیوں اور گوناگونیوں کے مطالعہ میں غرق ہو کر آخر ش پکار اٹھتا ہے ربنا ما خلقت ھذا باطلاً۔ حوادث عالم کا جس قدر گہرا مطالعہ کیجئے اسی قدر ان میں وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ عقل انسان اپنی درماندگی کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے سائنس ان مظاہرات قدرت کو بے نقاب کرتی چلی جاتی ہے چشم بصیرت پر ان کے پس پردہ کارفرما ازلی اور ابدی قوت کا راز منکشف ہوتا چلا جاتا ہے۔ کون ہے جس نے بجلی کی چمک نہ دیکھی ہو اور بادلوں کی گرج نہ سنی ہو؟ مگر ذرا غور تو کیجئے کہ کیا ہر شخص نے غور و تامل سے کام لے کر ان کی اصلیت اور حقیقت کے معلوم کرنے کی کوشش کی؟ ہاں آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس طرح دیگر عام مظاہر فطرت کی اصلیت بھوت اور پریت سے منسوب تھی اسی طرح بجلیوں کی چمک اور بادلوں کی گرج کے علٰحدہ علٰحدہ خدا یا دیوتا مقرر تھے یہی حال قطبی نور کا بھی ہے قطبین کے وہ تمام علاقے اور قطبین سے ہٹ کر یورپ اور امریکہ کے تمام ممالک (مثلاً فرانس، انگلستان اور کینیڈا وغیرہ) جہاں اس نور کی تجلی سے ساری فضا منور ہو جاتی ہے اس نور کو بھی ابتداءً ایک ایسے خدا یا دیو سے منسوب کر دیا گیا تھا جو بہت ہی پر رونق اور سکون بخش ہو چنانچہ یورپ کے قدیم ترین اور شہور شاعر ورجل نے جہاں اس نور کا ذکر کیا ہے تو اس کو ایک دیوتا کی شکل میں پیش کیا ہے۔ غرض اس کے بعد بھی عرصہ دراز تک قطبی نور اوہام پرستوں کے نزدیک ایک بہت بڑے خدا یا دیوتا سے کچھ کم نہ تھا لیکن جس طرح دیگر حقائق کو سائنس نے اوہام پرستی کے پردہ سے نکال کر ان کو اصلی صورت میں جلوہ گر کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح قطبی نور کے متعلق بھی محققین نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔

دیگر مظاہرات فطرت کی طرح قطبی نور بھی ایک مظہر ہے جو کرۂ ارض کے خاص خاص حصوں پر نمودار ہوتا ہے۔ کرۂ ارض کے یہ حصے قطبین سے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر ہم قطعی طور پر یہ نہیں بتلا سکتے کہ قطبین سے کس قدر فاصلے تک یہ نور دکھلائی دیتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف قطبی نور ممالک یورپ میں فرانس میں دکھلائی دیتا ہے تو دوسری طرف ایشیا میں چین میں نظر نہیں آتا۔ محققین نے اس کی باضابطہ حد بندی کی کوشش کی ہے اور نقشے بھی تیار کر لئے ہیں کہ کرۂ ارض کے کن کن ممالک میں یہ نور نظر آتا ہے اور اس کے ظہور کی اوسط سالانہ کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آئے گی۔

قطبی نور کو عموماً نورِ شمالی اور نورِ جنوبی میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نورِ شمالی سے مراد وہ نور ہے جو کرۂ ارض کے شمالی قطب کی سمت میں اور اس کے ملحقہ حصوں میں نظر آئے۔ اسی طرح نورِ جنوبی کے متعلق قیاس کر لیجئے۔

قطبی نور فطرت کے تمام مظاہر میں سب سے خوبصورت ہے۔ اس کی روشنی مختلف الالوان ہوتی ہے اور ہر وقت ایک نئی شان اور نرالی وضع میں نمودار ہوتی ہے۔ اس کی خاص خاص شکلیں یہ ہیں۔

(۱) قوسین۔ قطبی نور جب قوسین کی شکل میں نمودار ہوتا ہے تو عموماً اس کی شکل قطع دائرہ سی ہوتی ہے یا بیضوی۔ بعض اوقات ان کے حدود نہایت بے ڈھنگی شکل کے ہوتے ہیں۔ قوسین کے کنارے افق تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات ایک سرا یا قوسین کے ہر دو سرے افق تک نہیں پہنچتے۔ بیک وقت بہت سی قوسیں بھی نظر آتی ہیں۔ قوس کا وہی حصہ عموماً زیادہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے جو تقریباً اندرونی سمت میں ہو۔ اس حصوں کے پاس آسمان نسبتاً زیادہ تاریک نظر آتا ہے۔

(۲) دھاریاں۔ بعض اوقات یہ بالکل سیدھی ہوتی ہیں اور ان کے کنارے نہایت نمایاں ہوتے ہیں عموماً یہ لہروار پٹیوں کی شکل میں دکھلائی دیتی ہیں۔

(۳) شعاع۔ عموماً ہر قوس یا ہر دھاری کے ساتھ نور کی بہت سی شعاعیں نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جن میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے کم منوّر خطوطِ نور ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ شعاعیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ علیحدہ تمیز کی جا سکتی ہیں۔ نور کی ان شعاعوں کی وضع دھاریوں یا قوسین کے کم و بیش علی القوائم ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ شعاعیں ایک دوسرے کے بالکل متوازی ہوتی ہیں اور ایسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ ایک نقطہ پر مترتب نظر آتی ہیں۔ جو شعاعیں طویل ہوتی ہیں وہ بذات خود قایم ہوتی ہیں یعنی اس وقت دھاریوں یا قوسوں کا وجود ضروری نہیں۔ شعاعِ نور بالعموم قوس کے اوپری کنارے سے نکل کر سمت الراس کی طرف پہنچتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ شعاعِ نور کا اس قسم کا اجتماع بسا اوقات نہایت خوبصورت پنکھے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان شعاعِ نور کا طول تغیر پذیر ہوتا ہے۔ اس میں فوری تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ طویل ہو ہو کر افق تک پہنچ رہی ہیں اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد سمت الراس کی طرف چڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ منظر نہایت دلفریب اور جاذب نظر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اس کو بعض وقت (MERRY DANCER) کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

(۴) پردے۔ قطبی نور بعض اوقات اس شکل میں بھی نظر آتا ہے کہ گویا آسمان سے زمین تک نور کے پردے چھوڑ دئے گئے ہیں۔ قطبی نور کی یہ شکل بہت ہی شاذ ہے اور صرف حدودِ شمالی میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ سب سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ ان نوری پردوں کا اوپری حصہ شعاعوں سے بنا ہوا ہوتا ہے جو

نہایت نمایاں ہوتی ہیں۔ جوں جوں نیچے دیکھتے چلے جائیے نور مسلسل ہوتا ہوا معلوم ہوگا۔ یہ سارا منظر بحیثیت مجموعی ایک ہی چیز ہے اور ایک ایسے پردے کی طرح معلوم ہوتا ہے جو متواتر روشن اقتباریک حصوں میں منقسم ہو۔ ان پردوں میں کرنمایاں طور پر جھلملاتی نظر آتی ہیں اور ان کا آخری کنارہ دھاری دار پردہ (DRAPERY) کی طرح معلوم ہوتا ہے۔

(۵) کارونا:۔ (CORONA) یعنی تاج ناجب مکمل حالت کو پہنچ جاتا ہے تو بہت ہی خوشنما منظر پیش کرتا ہے۔ نام سے خود ظاہر ہے کہ یہ روشنی یا نور کی ایک تاج نما شکل ہے جو ایک تاریک مرکزی حلقہ کو محیط کئے ہوئے ہوتی ہے۔ جوں جوں اس تاریک مرکز سے فاصلہ بڑھتا جاتا ہے، شعاعِ نور کی ساخت زیادہ واضح ہوتی جاتی ہے۔ یہ شعاعیں یا تو بہت گنتی ہوتی ہیں یا ان کے درمیان فصل زیادہ ہوتا ہے۔

(۶) بعض اوقات قطبی نور چند غیر منظم رقبوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جو کبھی کبھی پھیلے ہوئے منور بادلوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اس شکل کو (PATCHES) کہتے ہیں۔

(۷) منفوذ نور:۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کے ایک بہت بڑے حصہ پر نور منتشر ہو گیا ہے بعض جگہ یہ زیادہ اور بعض جگہ کم منور معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی کوئی خاص حد بندی نہیں کی جا سکتی یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ قطبی نور کی یہ مختلف شکلیں کس حد تک ان کے فطری اختلاف کو بتلاتی ہیں اور یہ مقام مشاہدہ کی کہاں تک پابندیں کیونکہ بعض اوقات کئی شکلیں بیک وقت مشاہدہ ہو چکی ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکلیں خاص ہیں اور نظام مشاہدہ کی

آئی سوچازم (ISOCHASM) ادنیٰ عرض البلد میں قطبی نور بہت کم دیکھا گیا ہے۔ نصف کرۂ جنوبی کے اعلیٰ عرض البلد کے علاقوں میں آباد زمین نسبتاً مفقود ہے جس کی وجہ سے اس امر کا مشاہدہ بھی غیر ممکن ہے کہ عرض بلد اور طول بلد کا اختلاف نور شمالی کے تعدد پر کس طرح اثر ڈالتا ہے۔ لیکن تاہم مشہور مشاہد فرٹز (FRITZ) نے چند ایسے منحنیات کھینچے ہیں جن سے نور شمالی کے ظہور کا اختلاف تعدد بلحاظ مقام مشاہدہ بیک نظر واضح ہو جاتا ہے۔ مگر فرٹز کے خطوط یا منحنیات بھی محض نصف کرۂ شمالی تک ہی محدود ہیں۔ فرٹز کے ان منحنی خطوط کو آئی سوچازم (ISOCHASM) کہتے ہیں جو یونانی زبان کا ایک لفظ ہے "جو قطبی نور" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فرٹز نے کثیر شہادات کی مدد سے ان رقبوں کی صحیح حد بندی کی کوشش کی ہے جہاں نور شمالی نظر آتا ہو۔ فرٹز کے تیار کردہ نقشہ کی مدد سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کسی خاص مقام پر نور شمالی کے نظر آنے کی سالانہ اوسط کیا ہے۔ مثلاً ایتھن کے جنوبی علاقہ میں اوسطاً دس سال میں ایک بار قطبی نور نظر آتا ہے لیکن رفتہ رفتہ شمالی خط فرانس میں سالانہ پانچ کی اوسط ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آئرلینڈ کے شمالی حصوں میں رہنے والے اوسطاً ایک سال میں تیس بار اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اگر اسی طرح بڑھتے چلے جائے تو

شٹ لینڈ میں ایک شاہد سالانہ اوسطاً ایک سو بار ان کا مشاہدہ کرتا ہے فرٹز کے مخفیات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آئس لینڈ اور شٹ لینڈ کا درمیانی منحنی نور شمالی کے اعظم تعدد کا منحنی ہے یعنی اس کے بعد شمال کو اور بڑھئے تو تعدد کم ہوتا جائے گا۔ اعظم تعدد کا منحنی غیر منتظم شکل کا ناقص ہے۔ فرٹز کے مخفیات امریکہ میں یورپ کی بہ نسبت زیادہ نیچے کو اترے ہوئے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ قطبی نور کا تعدد کینیڈا اور ممالک متحدہ امریکہ میں زیادہ ہے۔ بہ نسبت اُن ممالک یورپ کے جو اُن ہی عرضِ بلد میں واقع ہیں۔

نور شمالی کے نظر آنے کے لئے سب سے اہم شرط یہ ہے کہ آفتاب افق سے چند درجہ نیچے ہو جائے یہی وجہ ہے کہ بالکل شمال میں واقع ہونے والے ممالک میں عرصہ دراز تک کوئی نور نظر نہیں آتا۔ اسی وجہ سے قطبی نور کے تعدد میں سالانہ تبدیلیاں مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں۔ وسطِ گرما میں تو یہ قطعاً مفقود ہوتے ہیں اِن تبدیلیوں کی وجہ محض سورج کی روشنی ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی مطلع کے ابر آلود ہونے یا نہ ہونے سے بھی قطبی نور کے تعدد پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ راس تھارسڈن (THORDSEN) میں جو شمالی نصف کرہ میں ۶۸° عرض بلد پر واقع ہے متواتر مشاہدات سے معلوم ہوا ہے کہ جب مطلع بالکل صاف ہو تو قطبی نور کی رویت کا اضافی تعدد ایک سو ہوتا ہے لیکن جوں جوں مطلع ابر آلود ہوتا جاتا ہے اس تعدد میں متدبہ کمی ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ جب ساری فضا پر بادل چھا جاتے ہیں تو ان کی تعداد اقل ترین ہوتی ہے۔ اگر آسمان کے بالکل صاف ہونے کی حالت کو صفر سے اور بالکل ابر آلود ہونے کو ۱۰ سے تعبیر کیا جائے تو

بادلوں کی تعداد ۰ ، ۱ - ۳ ، ۴ - ۶ ، ۷ - ۹ ، ۱۰ -

اضافی تعداد ۱۰۰ ، ۸۲ ، ۵۷ ، ۴۶ ، ۸ -

مشاہدات کی یہ فہرست جو راس تھارسڈن پر حاصل کی گئی ہے اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ قطبی نور میں جو سالانہ تبدیلیاں ہوتی ہیں اُن کی ایک وجہ فضا میں بادلوں کا اٹھنا بھی ہے ماہر مشاہدین نے مفصل جدول تیار کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص مہینہ سے لے کر دوسرے اور تیسرے سال پھر اُسی مہینہ تک ان کے دکھائی دینے کی تعداد کا اوسط حاصل کیا جائے تو ایک سال سے دوسرے سال تک کس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ فرق بھی باضابطہ اور منتظم شکل میں پیدا ہوتے ہیں، یعنی ان کے ادوار مقرر ہیں۔ یہ دور دہ سالہ یا بیست سالہ ہوتے ہیں کہ اس زمانہ کے گذر جانے کے بعد وہی کیفیت دوبارہ عود کر آتی ہے۔

ان سالانہ تبدیلیوں کے ساتھ ہی قطبی نور کے تعدد میں روزانہ تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں اکثر جگہوں پر جو مشاہدات حاصل کئے گئے ہیں اُن پر دن کی روشنی کا اثر غالب ہے کیونکہ روشنی کے اثر سے

قطبی نور کی رویت میں انحطاط پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم اُن اسباب کا مشاہدہ کرنا چاہیں جن کی وجہ سے قطبی نور کی رویت اور قیام پذیری رات کے وقت زیادہ ہوتی ہے تو اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ عرضِ بلد کے مقامات پر موسم سرما میں قطبی نور کے تعدد میں روزانہ تبدیلیوں کو بالتفصیل مشاہدہ کرنا چاہیئے۔ اِس قسم کی کوششوں سے جو مشاہدات راس تھارسڈن اور جان مین (JAN MAYEN) پر حاصل ہوئے ہیں اُن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نومبر، دسمبر اور جنوری میں اِس مظہر پر جو اثر پڑتا ہے وہ زیادہ تر دن کی روشنی کی وجہ سے ہے کیونکہ ایسے مہینوں میں جبکہ دن اور رات مساوی ہوتے ہیں۔ جو مشاہدات حاصل کئے گئے اُن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مندرجۂ بالا ہر دو مقامات پر نتائج ایک ہی ہیں۔ ہم بالکلیہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ قطبی نور کے تعدد میں جو روزانہ تبدیلی مشاہدہ ہوتی ہے اُس کی وجہ محض روشنی ہی ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو صبح یعنی قبل زوال اُسی قدر مشاہدات حاصل ہونے چاہئیں جس قدر کہ شام میں یعنی بعد زوال حاصل ہوتے ہیں لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ تمام موسموں میں شام کو نظر آنے والی تعداد صبح میں نظر آنے والی تعداد سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ تجربہ سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے ایک ہی شمار والے عرضِ بلد پر شام کو نظر آنے والے قطبی نور کی تعداد ایک ہی ہوتی ہے۔ مثلاً البجیکا (BELGICA) اور جان مین (JAN MAYEN) پر مشاہدات کی فہرست ایک ہی ہوگی۔ قدرت کا یہ بھی ایک قانون پایا گیا ہے کہ شام میں نظر آنے والی تعداد صبح میں نظر آنے والی تعداد سے ہمیشہ زیادہ ہو۔ محققین کی ایک جماعت نے ۱۹۰۴ء میں یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اِن کا ۵۰ فی صدی نصف شب سے اول ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث قطبی نور سے بحیثیت مجموعی متعلق ہے لیکن اگر قطبی نور کی مختلف اقسام کیلئے علیحدہ علیحدہ مشاہدات حاصل کئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ مختلف شکلیں، روزانہ تبدیلی میں بہت بڑی حد تک ایک دوسرے سے اختلاف رکھتی ہیں۔ قوسوں، دھاریوں یا اگر عمومیت کے رنگ میں دیکھا جائے تو قطبی نور کی زیادہ دیر پا اور منضبط شکلوں کا تعدد رات کے پہلے حصہ میں عام طور پر زیادہ ہوتا ہے۔

قطبی نور پر چاند کی روشنی کا بھی قابلِ لحاظ اثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی رویت کا ایک قمری دور بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی چاند کی روشنی میں کمی اور اضافہ سے قطبی نور کا اختلافِ رویت ایک باضابطہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ قمری روشنی کی وجہ سے قطبی نور کی رویت پر جو اثر پڑتا ہے وہ دراصل خود قطبی نور کی ذاتی چمک اور وقت و مقام کے تابع ہے۔ بعض ماہرینِ فن نے اِس دور

کی مدت ۲۶ دن بتلائی ہے۔

قطبی نور کا تعدد کسی سال زیادہ اور کسی سال کم ہوتا ہے۔ اکثر مقامات پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تعدد کی تبدیلی سورج میں ظاہر ہونے والے داغوں کے بالکل مشابہ ہے۔ ایسے ہبوط جداول مرتب ہو چکے ہیں جن سے ہم عصری معطیات کا پتہ چلتا ہے اور سورج کے داغ اور مشاہدہ شدہ قطبی نور کے تعدد کا ربط معلوم ہوتا ہے۔ ان جداول کی مدد سے ہم پر یہ واضح ہوتا ہے کہ جن سالوں میں سورج کے داغ زیادہ نظر آئے ہیں اُن ہی سال میں قطبی نور بھی زیادہ مرتبہ نظر آیا ہے۔ اور اس کے برعکس بھی درست ہے۔ لیکن اس سے اِن تعدّدوں کے درمیان کوئی رشتہ نہیں پیدا ہوتا کیونکہ اکثر اِن ہر دو مظاہر کے اعظمات اور اقلّات ایک ہی سال میں نہیں واقع ہوتے۔ لیکن اِس کے برخلاف بعض بعض سال ایسے بھی ہیں جن میں قطبی انطباق ہو جاتا ہے۔

قطبی نور کا نصف النہار:۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب کوئی نوری قوس نمودار ہو تو اس کی چوٹی مشاہد کے مقناطیسی نصف النہار میں ہوتی ہے۔ اِس نظریہ کی بنیاد جو کچھ بھی ہو مگر یہ خیال غیر معمولی اہمیت رکھتا اگر در اصل ایسا ہی ہوتا۔ معتدل عرض البلد پر قوسین سمت الراس بہت کم دکھائی دیتی ہیں لیکن وہ عموماً کافی بلندی پر ہوتی ہیں۔ اعلیٰ عرض البلد پر اوسط بلندی کم ہوتی ہے۔ مقناطیسی سوئی کی سمت عرض البلد اور طول البلد کی تبدیلی سے بدلتی جاتی ہے اور اس میں روزانہ تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ پس عام طور پر مشاہد کے مقناطیسی نصف النہار اور وقت و مقام کے لحاظ سے سوئی کی سمت میں فرق ہونا چاہیئے۔ مشاہدات یہ بتلاتے ہیں کہ قطبی نور کے قوس کا راس (AZIMUTH) مقناطیسی نصف النہار سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ دھاریوں کے لئے بھی یہی بات دیکھنے میں آئی ہے۔

قطبی نور کا سمت الراس:۔ قطبی نور کی ایک ایسی وضع بھی ہے جس کا تعلق قریبی طور پر ارضی مقناطیسیت سے پایا جاتا ہے۔ مشاہد کی آنکھ اور تاج نما (CORONA) کے مرکز استراق کو ملانے والا خط عام طور پر میلانی سوئی (DIP NEEDLE) کی سمت سے منطبق ہوتا ہے۔

قطبی نور اور مقناطیسی طوفان:۔ معتدل عرض البلد میں جب قطبی نور دکھلائی دیتا ہے تو اس سے ارضی مقناطیسیت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ یورپ کے ایک کثیر حصہ پر دکھائی دینے والے نور کے ساتھ ساتھ ہمیشہ مقناطیسی طوفان اور ارضی رَو دین بھی ہوتی ہیں۔ سب سے بڑے طوفان اور سب سے بڑے قطبی نور ایک ساتھ مشاہدہ ہو چکے ہیں۔ ۱۸۵۹ء سے لے کر ۱۹۰۵ء

تک اس کی مختلف مثالیں ملتی ہیں کہ جب کبھی قطبی نور نہایت نمایاں طور پر نمودار رہوا ہے تو اس کے ساتھ ہی مقناطیسی طوفانوں کی شدت بھی پائی گئی۔ ان میں تو بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ شمالی اور جنوبی ہر دو نصف کروں پر ایک ساتھ اس قسم کے مظاہر کے پیدا ہونے سے ساری روئے زمین پر مقناطیسی طوفان برپا ہو گئے۔ اعلیٰ عرض بلد پر جہاں "نور" اور مقناطیسی طوفانوں کی کثرت ہے اس میں یکسانیت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ شمالی حصوں میں انگریز اور ڈینی سیاحوں نے یہ دیکھا ہے کہ قطبی نور کے ظاہر ہونے کے باوجود کوئی مقناطیسی ہیجان پیدا نہیں ہوا اور یہ حالت عموماً اس وقت مشاہدہ ہوئی جبکہ نور منفوذ تھا۔ جب قطبی نور میں نمایاں حرکت ہو اور رنگ میں بھی معتدبہ تبدیلی ہوتی رہے تو مقناطیسی طوفان بھی لازمی طور پر مشاہدہ ہوئے ہیں ۱۸۹۲ء میں ایک خاص بات مشاہدہ ہوئی ہے۔ لفٹننٹ ویڈل (VEDEL) کی جماعت نے اسکورسبی سونڈ (SCORESBY SOUND) پر یہ دیکھا کہ ایک نوری پردہ معتدبہ رفتار کے ساتھ جنوب کی طرف سے روانہ ہوا اور اُن کے سروں پر سے ہوتا ہوا شمال کی طرف چلا گیا۔ جوں جوں پردہ قریب ہوتا گیا قطب نما کی سوئی مغرب کی طرف ہٹنے لگی اور جب وہ بالکل سمت الراس پر آگیا تو اہتزاز ہونے لگے۔ بعد ازاں جب شمال کی طرف اُترآیا تو سوئی مشرق کی طرف منصرف ہوگئی۔ پالسن (PAULSEN) کا خیال ہے کہ سوئی کا یہ عمل ٹھیک اُسی طرح ہے جس طرح کہ ایسی حالت میں ہونا چاہئے جب نوری پردہ فضا میں حرکت کرے اُس وقت فضا میں ایسی برقی رَوین گزرتی ہیں جو زمین سے نکلتی ہوئی معلوم ہوں۔ (TASINSAK) میں اس سے کسی قدر مختلف واقعہ دیکھا گیا۔ عموماً پردہ سمت الراس پر پہنچنے کے بعد اُسی طرف واپس ہو جاتا ہے جس طرف سے آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مقناطیسی سوئی مشرق یا مغرب کی طرف منصرف ہوتی ہے بلحاظ اس کے کہ پردہ شمال یا جنوب سے آتا ہوا دکھائی دے۔ جب پردہ واپس ہوتا ہوا دکھلائی دیتا ہے تو اس انصراف میں بھی انحطاط واقع ہوتا ہے۔

قطبی نور کا تعلق مقناطیسیت سے اس طرح پر بھی واضح ہے کہ آئسوچازم (ISOCHASM) میں جو منطقہ شمالی نصف کرہ کے اعظم تعدد کو ظاہر کرتا ہے، اس میں نظر آنے والے قطبی نور عموماً مقناطیسی شمال کی سمت میں ہوتے ہیں۔ اس سے بلند تر عرض بلد پر نور جنوبی سمت میں نظر آتا ہے۔ ان ہر دو حصوں میں اضافی تعدد کا انحصار وقتِ رویت قسم نور،

موسم اور سورج کے داغوں کے دور میں اس سال کے مقام پر ہوتا ہے۔ جان مین (JAN MAYEN) میں ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۳ء تک نظر آنے والے ۷۷ قطبی نوروں میں ۸۸ ایسے تھے جو جنوب میں دکھلائی دیئے۔ ۴۴ شمالی سمت میں اور باقی ۴۵ سمت الراس پر (TASINSAK) میں نظر آنے والے قطبی نوروں کا اوسط فی صد حسب ذیل ہے۔

شمال ۱۰ فی صد، شمال مشرق ۹ فی صد، مشرق ۹ فی صد، جنوب مشرق ۶ فی صد، جنوب ۲۴ فی صد، جنوب مغرب ۹ فی صد، مغرب ۹ فی صد، شمال مغرب ۵ فی صد اور باقیوں میں سے ۱۵ فی صد سمت الراس پر پائے گئے اور ۴ فی صد سارے آسمان پر پھیلے ہوئے تھے۔

قطبی نور کی حرکت کے متعلق بھی معلومات حاصل کئے گئے ہیں (JAN MAYEN) پر نظر آنے والے نوروں میں قوسوں کا ۴۲ فی صد شمال سے جنوب کی طرف حرکت کرتا ہوا پایا گیا اور (THORDSEN) پر ۸۰ فی صد۔ بعض بعض اوقات قوسین کی ظاہری حرکت بہت ہی پیچیدہ ہوتی ہے۔ مثلاً بعض وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک سرا حرکت کر رہا ہے گویا دوسرے سرے کے اطراف گردش ہو رہی ہے کبھی دونوں سرے متضاد سمتوں میں گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے وسط میں سے گزرنے والے انتصابی محور کے گرد گردش ہو رہی ہے۔

بلندی: فن انجینرنگ میں مساحت کا ایک خاص اور مستند طریقہ ہے جس کو تھیوڈولائٹ سروے (THEODOLITE SURVEY) کہتے ہیں۔ اسی کے ذریعہ قطبی نور کے ارتفاع کی پیمایش کی گئی ہے۔ قوسوں کے نچلے سرے کی بلندی بعض بعض دفعہ سطح زمین سے ایک سو میل تک پائی گئی (THORSDEN) اور (BOSSEKOP) پر ان کی بلندی ۳۶ میل سے لے کر ۱۴۱ میل تک پائی گئی۔

چمک: قطبی نور کی چمک جلد جلد بدلتی رہتی ہے بعض اوقات اس کی چمک اس قدر زیادہ پائی گئی ہے کہ چاند کی روشنی معمولی گیسی شعلہ کی طرح معلوم ہوتی تھی جبکہ یہ (گیسی شعلہ) برقی روشنی میں دیکھا جائے لیکن ایسے چمکدار قطبی نور شمالی منطقوں میں بھی شاذ و نادر دکھلائی دیتے ہیں۔ دھاریوں اور شعاعوں کے زیرین حصے عموماً زیادہ چمکدار ہوتے ہیں اور قوسین افق کے قریب زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ قوسوں اور دھاریوں کی صورت میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ ان میں روشنی کی موجیں دوڑتی ہوئی معلوم ہوں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ان موجوں کی روانی کی سمت کوئی نرمنی

یا اختیاری چیز نہیں ہے۔ بعض صورتوں میں تبدیلیٔ مدت قطبی نور کے راس کے گرد ہوتی ہے۔ اور اس صورت کے مشابہ ہوتی ہے جبکہ کسی منور جسم کو تدویری گردش دی جائے (PATCHES) کی صورت میں روشنی کا اُتار چڑھاؤ ایسی کیفیت پیش کرتا ہے گویا سرچ لائیٹ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ڈالی جا رہی ہے۔

رنگ :۔ قطبی نور کا عام اور معمولی رنگ سفید ہے۔ زیادہ چمکدار ہونے کی صورت میں زرد رنگ کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے لیکن مدھم صورت میں چاندی کی طرح سفید ہوتا ہے۔ جب روشنی کی حدت زیادہ ہو اور جلد جلد بدلتی رہے تو سرخی بھی پیدا ہو جاتی ہے خصوصاً زیریں کناروں پر ایسی صورتوں میں بعض بعض اوقات راس کی طرف سبز رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ پس قطبی نور کی ایک چمکدار شعاع کا زیریں حصہ سرخ، بالائی حصہ سبز اور درمیانی حصہ زردی مائل نظر آئے گا بعض اوقات زرد رنگ محض تقابلی طور پر پایا جاتا ہے۔ بنفشی رنگ کبھی کبھی نظر آجاتا ہے عام طور پر نہیں۔

لطیف :۔ قطبی نور کے طیف میں بہت سے خطوط دکھائی دیتے ہیں۔ نہایت چمکدار نور کے لئے طولِ موج کی بھی پیمائش کی گئی ہے۔ مناظری نقطۂ نظر سے ان خطوط میں ایک خط اس قدر ممتاز حیثیت رکھتا ہے کہ اس کو قطبی نور کا خط کہا جاتا ہے۔ یہ خط کرپٹن (KRYPTON) کے نمایاں طیفی خط کے بالکل قریب واقع ہے گو اس پر منطبق نہیں۔ اس خط کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کا وجود یا عدم اس بات کی ضمانت ہے کہ فضا میں نظر آنے والا نور قطبی ہے یا نہیں۔

اصوات :۔ یہ مسئلہ تنازع فیہ ہے کہ آیا قطبی نور کے ساتھ فضا میں کوئی خاص آواز بھی سنائی دیتی ہے یا نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ امر قابل غور ہے کہ اگر کوئی آواز ہو بھی تو اس وقت تک سنائی نہیں دے گی جب تک کہ قطبی نور سطح زمین سے بہت قریب نہ ہو اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی نہ ہو۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ قطب شمال کے قریب ان آوازوں کی سماعت کا امکان ہے۔ کپتان ڈاسن (DAVSON) کا بیان ہے کہ خلیج ہڈسن کے قریب یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض صورتوں میں واضح اور صاف طور پر آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ آواز کوڑے کی شپاشپ کے مشابہ ہوتی ہے یا جہاز کے سب سے اونچے بادباں کی ہوا سے رگڑ ہونے پر جس قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے قطبی نور کے دکھائی دینے کے وقت اسی قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جوں جوں نور کی حدت میں کمی یا زیادتی ہوتی ہے آواز بھی گھٹتی بڑھتی جاتی ہے۔ کپتان ڈاسن کا خیال ہے کہ اگر یہ آوازیں

محض قطبی نور کی وجہ سے تھیں تو پھر اُس کو نہایت قریب ہونا چاہیئے۔

مصنوعی مظہر:۔ برک لینڈ (BIRKLAND) نے ایسی شکلیں مصنوعی طور پر پیدا کی ہیں جو مختلف قسم کے قطبی نوروں سے مشابہ ہیں۔ اُس کے آلے میں ایک خلائی برتن ہے جس کے اندر ایک مقناطیسی کرہ ہوتا ہے۔ یہ کرہ زمین کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ کیفیت اُس خلاء میں سے برقی اخراج کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔

نظریات:۔ فضائی برق میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ جوں جوں زمین سے فاصلہ بڑھتا جاتا ہے برقی قوۃ (ELECTRIC POTENTIAL) کی قیمت بڑھتی جاتی ہے اور مثبت ہوتی ہے۔ ارضی برق کو عموماً منفی خیال کیا جاتا ہے۔ اکثر مشاہدات سے جو شمالی منطقے میں حاصل کئے گئے ہیں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ فضا میں برقی قوت کی قیمت بلندی کے اضافہ سے بڑھنے کی بجائے گھٹتی جاتی ہے اور بعض اوقات گھٹ کر منفی ہو جاتی ہے۔ پالسن اور دیگر محققین قانونِ فطرت کی اس اہم تبدیلی کو محض قطبی نور کے وجود کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

قطبی نور کے متعلق اکثر اختلاف رائے ہے بعض محققین کا خیال ہے کہ قطبی نور بھی ایک خاص قسم کا فضائی اخراج برق (ATMOSPHERICAL ELECTRIC DISC HARGE) ہے۔ برک لینڈ اُن کیتھوڈ (CATHODE) شعاعوں کو اس کی علت غائی بتلاتا ہے جو سورج سے خارج ہوتی رہتی ہیں۔ ناڑڈمین (NARD MAN) کیتھوڈ شعاعوں کی بجائے ہرٹزی امواج (HERTZIAN WAVES) کو اس کا اصلی سبب سمجھتا ہے۔ اس اختلافِ خیال کے علاوہ ارہی نیس (ARRHENIUS) کا بیان کچھ اور ہی ہے اُس کا خیال ہے کہ منفی ذراتِ برق سورج کی فضا سے فضائیں پہنچتے ہیں۔ برک لینڈ اور نارڈمین کے نظریات کی بناء پر ہم یوں تصور کر سکتے ہیں کہ سورج سے نکلنے والا برقی تیج ارضی فضا میں ثانوی کیتھوڈ شعاعیں پیدا کرتا ہے۔ یا یہ کہ ارضی فضا میں اس طرح رَوان (IONS) پیدا ہو جاتے ہیں کہ قدرتی اختلاف قوی کے پیدا ہونے سے اخراج برق میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس روانی حالت (IONIZED CONDITION) کو بہت زیادہ عرصہ تک قایم رہنا چاہیئے ورنہ قطبی نور کے گھنٹوں نظر آنے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ اِن واقعات کی مدد سے کہ اکثر مقامات پر صبح میں قطبی نور کی حدّت اور تعدد میں نمایاں انحطاط ہوتا ہے اور رات میں رویتِ نور کا اوسط بڑھا ہوا ہوتا ہے اُن نظریات کو زیادہ تقویت پہنچتی ہے جو سورج سے نکلنے والے برقی تیج کی وجہ سے فضا میں رَوانوں کے پیدا ہونے کو ممکن اور قطبی نور کو اس کا لازمی نتیجہ بتلاتے ہیں۔

نفسیاتِ کھیل

از

محمد مظہر حسین صاحب بی۔ اے

تخیل[1]، تلازم اور توجہ کی طرح بعض مرتبہ "آزاد" ہوتا ہے اور بعض مرتبہ "مقید" یعنی ہم ان تخیلات کو جن میں صرف اُن واقعات کا احیا ہوتا ہے جو ہمارے پیش نظر مقصد کے لئے مفید ہوتے ہیں "مقید"۔ اور وہ جن میں ہمارا ذہن آزادی کے ساتھ عمل کرتا ہے اور جس میں کوئی متعین مقصد مدنظر نہیں ہوتا "آزاد" کہتے ہیں۔ اگر "مقید تخیل" کو خارج از بحث ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر کے "آزاد تخیل" کی تحلیل کریں تو اس کی کئی صورتیں نظر آئیں گی جن میں "کھیل" بھی داخل ہے۔ "کھیل" کی مروجہ تعریف میں بقول اینجل[2] اس کو ارادی عضلات کی آزاد لذت آفریں اور خود رو فعلیت کہا گیا ہے جس میں تخیلات زیادہ عمل کرتے ہیں۔ عام طور پر حکمائے نفسیات اس کا ذکر نہیں کرتے لیکن باوجود اس بے توجہی اور دانستہ نظر پوشی کے "یہ" صورت جدیدہ کی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکی اور بالآخر منوا ہی لی کہ اس کی بحث اتنی غیر اہم اور سادہ نہیں ہے جتنی کہ زمانہ سلف کی تنگ نظریوں نے اسے بے اعتنائی کی مستحق سمجھ رکھا تھا۔ اس لئے اب ہم اجمالاً اس کے مختلف اہم نظریات کو بیان کریں گے اور دیکھیں گے کہ مسائل ذہن کے لئے کونسا نظریہ فطری اور عسیر الفہم ہے تاکہ اس کی مدد سے اس کی تمام گتھیاں سلجھ سکیں۔

قبل اس کے کہ ہم مختلف مقبول عام نظریات کے نکات مہمہ پر انتقادانہ نظر ڈالیں یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ہیجانات یا محرکات اور جوابات کے غیر مشتبہ انکشافات کو ہماری رہنمائی اور بصداقت تک رسائی کے لئے مع ان کے علائق اور وابستگیوں کے پیش نظر کر دیں تاکہ بحث مابعد زیادہ سلیس اور عام فہم ہو سکے۔ کیوں کہ ہمارے تمام حرکات و سکنات، ہمارے تمام تخیلات و ارادات غرض ہر ذہنی اور بدنی فعلیت کسی نہ کسی مہیج اور جواب کا

---

[1] ملاحظہ ہو وڈورتھ کی کتاب "(STUDY OF MENTAL LIFE) باب ۱۹ صفحہ ۲۸۵

[2] اینجل کی نفسیات (PSYCHOLOGY) باب ۱۶ صفحہ ۳۵۹

مجموعہ ہوتی ہے بعض ماہرین نفسیات کی رائے ہے کہ کھیل کی کوئی مخصوص جبلت نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک خلقی میلان[1] ہوتا ہے ہم ان کے اس بیان پر قناعت نہیں کر سکتے تاہم اس پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے جیسا ہم نے ابتداء ہی میں کہا ہے کہ کھیل "آزاد تخیل" کی ایک صورت ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اس میں "تخیل[2]" اور اختراع کے اجزا بھی پائے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہم بچوں کے افعال کا ناقدانہ مشاہدہ کریں تو یہ عیاں ہو جائیگا کہ بچے یا تو کھیلنے کے لئے ایک نئی سادہ صورت ایجاد کر لیتے ہیں یا اپنے ماحول کے بدلنے کی صورت میں خود کو حالات کے موافق بنا لیتے ہیں[3]۔

یوں تو محقق کو انسانی زندگی کے مختلف مدارج میں اکثر "کھیل" دکھائی دیں گے لیکن فی الحال ہم دانستہ طور پر آسانی مفہوم اور وضاحت مطالب کی خاطر صرف بچوں اور حیوانوں کے کھیلوں کی طرف متوجہ ہوں گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ ان کے مہیجات کی کیا نوعیت ہوتی ہے اور جوابات کس قسم کے صادر ہوتے ہیں یعنی مہیجات سے جو حرکات صادر ہوتے ہیں ان کی غایت کیا ہوتی ہے۔ مہیجات یا محرکات اور جوابات کے متعلق سوالات کرنا تو بے حد آسان ہے لیکن ان کے جوابات حاصل کرنے میں لاانتہا دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے تاہم بچوں کے افعال کے مہیجات کے متعلق نہایت اطمینان کے ساتھ یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ کھلونا ہی اصلی چیز ہوا کرتی ہے[4] جو قوی ترین محرکات کا کام دیتی ہے۔ لیکن یہاں پر یہ اعتراض عائد ہو سکتا ہے کہ "کھلونے" سے کیا مراد ہے اور اس کی کس طرح تشریح کی جائیگی۔ یوں تو مختلف محققین نے مختلف طریقوں سے اس مشکل کو حل کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عامیانہ نقطہ نظر سے بلا پس و پیش آسانی سے یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے بچہ کھیل سکے اس کے لئے کھلونا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تعریف بھی غیر منطقی ہے اور زیادہ تر معمولی اور پیش پا افتادہ باتوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہہ دینے سے ان روزمرہ چیزوں کی تشریح تو ہو جاتی ہے لیکن ان کی کوئی منطقی تعریف نہیں ہوتی۔

اگرچہ یہ نہاں راز آشکارا نہیں معلوم ہوتا تاہم وڈورتھ نے اس کو کسی قدر واضح کرنے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے کہ جب کسی معروض میں حسب ذیل مشترک صفات پائے جاتے ہیں تو وہ مہیج کا کام دیکر "جواب" کا متمنی ہو سکتا ہے[5] اور یہی "کھلونا" ہے۔ وہ مشترک صفات کا منبع اساس اس عام ترین خصوصیت کو قرار دیتا ہے کہ سب سے پہلے اس معروض کا حجم اتنا ہونا چاہیئے کہ بچہ اس کو بلا تکلف متحرک کر سکتا ہو۔ گو اپنے صغائی

---

[1] NATIVE [2] انگریزی میں اس کے مقابل کا لفظ (IMAGINATION) ہے

[3] وڈورتھ کی نفسیات باب ۱۹ صفحہ ۴۸۵ [4] انجل کی نفسیات باب ۱۶ صفحہ ۳۵۹ [5] وڈورتھ کی نفسیات باب ۱۹ صفحہ ۴۸۶

کے لحاظ سے یہ بیان بھی اول الذکر کا نقشِ ثانی ہے لیکن اس کی تشریح میں ایسے لوازمات اور قیود و عائد کیے گئے ہیں کہ اس کے تمام عیوب دور ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ خصوصیات اور اوصاف لاینفک حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہر وہ چیز جو بالغ العمر انسانوں کے کسی چیز کا نمونہ ہو بچوں کے لئے "کھلونا" بن جاتی ہے مثلاً ٹین کے سپاہی ٹین کی موٹر ٹین یا کاغذ کی گڑیا وغیرہ۔ اس قسم کے محرکات جو جوابات بچوں سے حاصل کرتے ہیں وہ ایک حد تک تقلیدی ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض دقیق النظر ماہرین کی رائے ہے کہ کھیل ایک ہیجانی وظیفہ ہے جس کا مصرف ان افعال کو پیدا کرنا ہے جن کی ضرورت بچوں کو آئندہ زندگی میں پڑنے والی ہے لہٰذا کھیل کی ان معنوں میں حیاتیاتی اہمیت رہ جاتی ہے[1]۔ اس پر ہم آگے چلکر مفصل بحث کریں گے۔

(۲) ہر وہ چیز جو شور پیدا کرتی ہے بچوں کے لئے بطور کھلونا کام آسکتی ہے۔ مثلاً سیٹی اور جھنجھنا وغیرہ

(۳) ہر وہ چیز جس سے بچہ کے حرکات کی رفتار میں اضافہ ہوتا ہے کھلونا بن جاتی ہے۔ مثلاً چکر کا جھولا وغیرہ۔

(۴) ہر وہ چیز جو بچوں کے دائرۂ عمل میں وسعت پیدا کردے بچوں کے لئے کھلونے کے کام آسکتی ہے مثلاً گیند وغیرہ۔

(۵) ہر وہ چیز جو بالقوۃ متحرک ہو جائے بچوں کے لئے کھلونا ہو جاتی ہے مثلاً ٹین کی کلدار موٹر وغیرہ

(۶) ہر وہ چیز جو صورت پذیر ہو کھلونا بن جاتی ہے مثلاً مٹی، برف وغیرہ۔ کیونکہ بچوں کی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ وہ نئی چیزیں تعمیر کریں۔ اگرچہ والدین اسے محض کفایت شعاری قرار دیتے ہیں لیکن نفسیاتی حیثیت سے اس میں تعمیریت کا حقیقی میلان ہوتا ہے[2]۔

(۷) ہر وہ چیز جس کو بچہ بہ آسانی کھول یا بند کر سکے کھلونا بن جاتی ہے۔ مثلاً کتاب وغیرہ۔

(۸) اب سب سے آخری صفت یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کشش ثقل کے مخالف کام کرے کھلونے کا کام دیتی ہے مثلاً کنکوا اڑانا وغیرہ۔

یہی وہ خصوصیات ممیزہ ہیں جن کے وجود پر وڈورتھ نے زور دیا ہے اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ بعض صورتوں میں محض ساتھی کا وجود کھلونے کے طور پر کام دیتا ہے۔ گویا اس لحاظ سے ساتھی بھی ایک طرح کا کھلونا ہوتا ہے۔

اس موقع پر اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ حقیقی اور صحیح علم کا ایک ایسا مستحکم نظام جو

---

[1] میکڈوگل کی نفسیات (INTRODUCTION OF SOCIAL PSYCHOLOGY) باب سوم

[2] انجل کی نفسیات صفحہ ۳۶۱۔

تشکیک کے حملوں سے متاثر نہ ہو سکے قائم کرنا بے حد مشکل اور اہم ہے۔ لیکن وڈورتھ نے مہیجات کے متعلق قابل قدر بیان دیکر اعتراض کی بہت کم گنجائش رکھی ہے بنا بریں جب تک اس سے زیادہ تشفی بخش بیان کوئی اور متامل ذہن ہمارے سامنے پیش نہ کرے اس وقت تک وڈورتھ کا یہ بیان ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ یہاں تک تو مہیجات کی بحث تھی اب ہم دیکھیں گے کہ یہ مہیجات اپنے ایک کن یا اشارہ سے کس قسم کے جوابات خلق کر سکتے ہیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم اس ضمن میں کچھ اور کہیں یہاں پر کھیل اور "خود نمائی" کی لزومیت کی غلطی رفع کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا یہ تجربہ ہے کہ کھیل میں اکثر خود نمائی کی جبلت، اگرچہ اور بھی جبلتیں پائی جاتی ہیں لیکن تمام جبلتوں سے زیادہ نمایاں رہتی ہے[1]۔ اسی لئے بعض ماہرین نے نہ صرف اس حقیقت کی تائید ہی کی بلکہ اس امر کا دعویٰ بھی کیا کہ یہی ایک ایسی مشترک جبلت ہے جو کھیل کا لازمی عنصر ہے اور جو تمام کھیلوں میں پائی جاتی ہے۔ اس عقیدہ کی تائید میں وہ کہتے ہیں جب بچہ کسی مہم میں فتحمند ہوتا ہے تو خود کو بہادر تصور کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے اس کے تصرف اور طاقت کا اظہار ہوتا ہے جس سے اسے بیحد خوشی ہوتی ہے اور وہ احترام کا طالب ہوتا ہے یہی اسکی خود نمائی ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ خوشی یا خود نمائی کھیل میں اکثر نمایاں رہتی ہے لیکن یہی وہ اہم چیز نہیں جس پر کھیل کا کلیتہً انحصار ہو کیونکہ بعض مرتبہ عرق ریز کوششوں کے باوجود ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس وقت (اس میں شک نہیں کہ) گو احترام کا طبعی میلان مقصود ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس فقدان سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو کھیل بحیثیت کھیل ضرور موجود ہوتا ہے مثلاً اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض اشخاص ناکامی کے باوجود نہایت اطمینان کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ گو نتیجہ ان کے حق میں ناموافق تھا لیکن کھیل کی فعلیت بیحد پر لطف تھی علاوہ ازیں خود نمائی میں شعور ذات کا دخل ہوتا ہے لہذا اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی شعور حیوانات یا اطفال میں نہیں موجود ہوتا باوجود اس علم کے ڈاکٹر میکڈوگل کہتا ہے کہ حیوانات یا اطفال میں رقابت یعنے اپنے ابنائے جنس اور ہم رتبہ پر فوقیت لے جانے کا خیال پایا جاتا ہے۔ مثلاً مقابلہ کی دوڑ میں بچہ اس بات میں کوشاں نظر آتا ہے کہ وہ ساتھیوں پر سبقت لیجائے تاکہ اور ونکی نظروں میں خود پست ہمت اور کمزور نہ معلوم ہو اب اس کی ماہیت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بلحاظ اصلیت اس میں اور کھیل اور مبارزت میں گہرا تعلق ہے حتیٰ کہ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ رقابت اور مبارزت ہم معنی ہوتے ہیں لیکن میکڈوگل

---

[1] یہ امر آگے واضح ہوگا کہ آیا اور بھی جبلتیں کھیل میں پائی جاتی ہیں یا نہیں لیکن سر دست یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ کھیل کے ساتھ ایک مخصوص جبلت مخلوط ہوتی ہے۔

کہتا ہے کہ اگر رقابت اور مبارزت کو ہم معنی قرار دیا جائے تو رقابت کا فطرتی میلان یہ ہونا چاہئے کہ اپنے مخالف کا خاتمہ ہو جائے۔ بخلاف اس کے جب ایک چھوٹا بچہ اپنے ہم جماعت کو مشہور ہوتے دیکھتا ہے تو اس کا خون جوش کھانے لگتا ہے اور وہ رقیب کہلایا جاتا ہے لیکن اس رقابت کے یہ معنی نہیں کہ اس کا رجحان اپنے حریف کو برباد کرنے کا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جبلّتِ مبارزت اور جبلّتِ رقابت کو ہم معنی قرار نہیں دے سکتے کیوں کہ دونوں کے میلانات اور مہیجات مختلف اور علٰحدہ علٰحدہ ہوتے ہیں۔ مہیجات کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے کہ رقابت کسی ادنیٰ یا اعلیٰ کی ترقی سے رونما نہیں ہوتی بلکہ جب ہمارا ہم رتبہ کسی مہم میں کامیاب ہو جاتا ہے یا ترقی پاتا ہے جس کی وجہ سے ہم ہیچ نظر آتے ہیں تو بس یہی رقابت کا بدیہی مہیج بن جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے مبارزت کا مہیج مختلف تو ضرور ہوتا ہے لیکن یہ اختلاف زیادہ اہم نہیں ہوتا تاہم مبارزت اور رقابت میں اساسی فرق یہ ہے کہ مقدم الذکر کا لازمی عنصر غصّہ ہے جس کی اہمیت کا پتہ ارتقا کے ابتدائی منازل میں چلتا ہے کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ غصّہ اور لڑائی سوانح حیات کا ایک مستقل جزو رہی ہے لیکن موجودہ زمانہ میں تہذیب و تمدن کے مصلحانہ اثر سے یہ جزو ایک حد تک معدوم کر دیا گیا ہے یا بعض صورتوں میں اس کی شکل اس طرح بدل دی گئی ہے کہ قدیم حیوانی خط و خال کا پتہ بھی نہیں چلتا کیونکہ اب گالی گلوچ اور معمولی لڑائی کی جگہ اخباری اشتہار بازی نے لے لی ہے لہٰذا آج کل مروجہ رقابت کو قدیم مبارزت سے ممتاز کرنا بیحد مشکل ہے کیونکہ یہی آج کل قدیم مبارزت کی قائم مقام ہے تاہم اپنے اصلی معنی میں رقابت اخلاقی نقطۂ نظر سے بیحد بلند پایہ چیز ہے اور سمجھی بھی جاتی ہے اس کی ماہیت کے متعلق امریکہ کے مشہور ماہر نفسیات ولیم جیمس[1] کو اختلاف ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ رقابت بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو ہم "تقلید" کہتے ہیں۔ بلاشبہ تقلید اور رقابت میں بیحد قریب کا رشتہ ہے لیکن متجسس دماغ کبھی دونوں کو ہم معنی قرار نہیں دے سکتا۔ کیونکہ بعض مرتبہ تقلید میں رقابت کی جبلّت قطعی نہیں پائی جاتی اور جب ایسی صورت ہوتی ہے تو اس میں رقابت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ بعض مرتبہ رقابت کی ابتدا تقلید سے ہی ہوتی ہے۔

جیمس کے اس خیال کو پیش نظر رکھکر انجل بھی کہتا ہے کہ "رقابت تقریباً وہی ہے جس کو ہم عام طور پر کھیل کہتے ہیں اور جب کھیل کے ہیجان پر بحالت ترقی غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت جلد تقلید کی شکل و شباہت اختیار کر لیتا ہے اور کچھ مدّت بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کو تعبیری کہا جا سکے"[2]

---

[1] ولیم جیمس کی نفسیات (TEXT BOOK PSYCHOLOGY) باب ۱۲ صفحہ ۸۶۔

[2] "اصول نفسیات" باب شانزدہم۔

تو بہ الفاظ دیگر اس کے معنی یہ ہوئے کہ انجیل نے بھی ضمناً جیمس کے نظریہ کو قبول کر لیا ہے اس لئے جو اعتراض جیمس کے نظریہ پر وارد ہوتا ہے وہی انجیل پر بھی صادق آتا ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ہر کھیل میں رقابت کا لازمی طور پر وجود ہو۔ بہرحال ان مشکلات کی بنا پر رقابت اور تقلید کو ہم معنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر میکڈوگل کہتا ہے کہ رقابت میں جو حالت ہوتی ہے اگر اس کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ جو حرکات جبلت مبارزت میں سرزد ہوتے ہیں وہی رقابت میں بھی صورت پذیر ہوتے ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ اول الذکر کا میلان فنا کا ہوتا ہے اور ثانی الذکر کا غیر فنا کا۔

اگرچہ گزشتہ صفحات میں اس کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن وضاحت کی خاطر یہاں پر ایک مثال دیدینا غالباً غیر ضروری نہیں۔ میکڈوگل کہتا ہے کہ مقابلہ کی صورت میں ہمیشہ ایک پارٹی دوسری پر غلبہ حاصل کرنے کی خواہشمند ہوتی ہے۔ اس کے لئے پہلے ایک مدافعانہ پہلو اختیار کرتی ہے اور دوسری مجارحانہ لیکن کچھ دیر بعد ممکن ہے کہ انقلاب کی کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ کایا پلٹ جائے اور وہ جو مغلوب ہو رہی تھی غالب ہو جائے اور غالب مغلوب۔ ایسی صورت میں کشمکش زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے اور بالآخر کسی ایک پارٹی کو شکست ماننی پڑتی ہے۔ اس مثال میں میکڈوگل کہتا ہے کہ غالب و مغلوب کی جو دو صورتیں ہیں وہ جبلت مبارزت کے مظاہرات کے بالکل متوازی ہیں۔ کیونکہ ان میں مدافعانہ اور مجارحانہ دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں لیکن فنا کا میلان مفقود ہوتا ہے۔ پس یہی رقابت ہے۔ اسی لئے بالکل سچ ہے کہ اگر رقابت میں غصہ کا عنصر شامل ہو جائے تو نفس رقابت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بہرکیف رقابت، مبارزت، تقلید اور کھیل میں بلحاظ اصلیت قریب کا رشتہ ہے۔

بہرحال یہ تو ایک ضمنی بحث تھی اور ہم کہہ یہ رہے تھے کہ خودنمائی یا داد خواہی کی جبلت معنی ہوتی ہے شعورِ ذات پر لہٰذا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہی کھیل کی اہم مشترک جبلت ہوتی ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بچہ میں شعورِ ذات بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ہمارا عقیدہ ہی نہیں بلکہ تجربہ بھی ہے کہ بچوں میں اس قسم کا کوئی شعور نہیں ہوتا اس لئے یہ دعویٰ کہ تمام کھیلوں میں جبلت خودنمائی کا وجود ہوتا ہے ایک بے معنی اور مستلزم تناقض مفروضہ نظر آتا ہے۔ بالشبہ اس سے قطعی انکار نہیں کہ بعض حالتوں میں بچوں کی اس سے تشفی نہیں ہوتی کہ دوسروں کی خواہشات کو عملی جامہ پہنائیں بلکہ وہ اپنی قدرت کا اظہار کر کے دوسروں کی داد کے خواہاں ہوتے ہیں لیکن اس قسم کے مستثنیات سے یہ کلیہ قائم کرنا کہ تمام کھیلوں میں خودنمائی کی جبلت پائی جاتی ہے محیر العقل ضرور ہے۔ کیونکہ اکثر شاگردوں میں "خودنمائی" کے بجائے "رازجوئی" "تجسس" اور خوف وغیرہ کی جبلتیں اصلی عمود اور سہارا لیتی ہیں۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کھیلوں کے محرک[1] کی جوابات کسی ایک جبلت کا نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف جبلتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اور خود کھیل کی کوئی مستقل بالذات جبلت نہیں ہوتی بعض متجسس دماغوں کو اس سے اتفاق نہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ اختلاف اور تنوع کے باوجود کھیل کی ایک مستقل اور علٰحدہ مخصوص جبلت ہوتی ہے اس دعوے کے موافقین اور مخالفین دونوں کے استدلالات پر نہایت احتیاط کیساتھ آئندہ بحث کیجائیگی۔ بالفعل ہم ماہیت کھیل کے مختلف نظریات پر غور کریں گے۔

کھیل کے نظریئے

(الف) شلر[2] و اسپنسر[3] کا نظریہ | ماہیت کھیل کے جدید نظریات میں سے سب سے قدیم نظریہ جرمن کی نازیبا ہستی شلر کا ہے۔ حسن اتفاق ہے کہ شلر کی متجسس نگاہوں نے اپنی کاوشوں کی مسافت کو طے کرکے جس نقطہ کو آخری منزل قرار دیا تھا اسی کو اسپنسر نے بھی اپنا گوشہ قناعت سمجھا اسپنسر کہتا ہے کہ اگر ہم حیوانات کے تمام افعال پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ادنیٰ درجہ کے حیوانات کی زندگی اس قسم کی ہوتی ہے کہ اُن سے صرف اپنی ضروریات کو رفع کرنے کے لئے افعال سرزد ہوتے رہتے ہیں اور بعض صورتوں میں وہ بڑی دقتوں کے باوجود اپنی تشنگی کو بجھا نہیں سکتے کیوں کہ ان کی ضروریات ان کے قویٰ سے زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کے برخلاف ارتقاء کے اعلیٰ منازل میں معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض حیوانات میں قویٰ زیادہ نظر آتے ہیں اور ضروریات کم معلوم ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نظام قدرت میں جو چیزیں یا مظاہرات وقوع پذیر ہوتے ہیں ان کے علل و اسباب بھی ضرور ہوتے ہیں چنانچہ اسی بنا پر اگر حیوانات کے اس تفاوت کی وجہ سے ان کی امتیازی خصوصیات کو معلوم کرنے کی کوشش کریں تو اس حقیقت کو بلا پس و پیش ماننا پڑیگا کہ ترقی یافتہ طبقہ میں توانائی ضرورت سے زیادہ اور ادنیٰ طبقہ میں ضرورت سے کم ہوتی ہے اسی مظاہرہ کی بنیاد پر اسپنسر نے اپنا ایک نظریہ قایم کیا ہے جس کی رُو سے وہ کہتا ہے کہ جب فاضل

---

[1] MOTOR

[2] جرمنی کا مشہور شاعر اور ڈرامانویس (J.O.FREEDRICK VON SCHILLER) سنہ ۱۷۵۹ء تا سنہ ۱۸۰۵ء

[3] انگلستان کا مشہور فلسفی (HERBERT SPENCER) سنہ ۱۸۲۰ء تا سنہ ۱۹۰۳ء

توانائی زیادہ عرصہ تک مستعمل نہیں ہوتی تو کھیل کی فعلیت کے ذریعہ اس کا اخراج کیا جاتا ہے۔ اپنے اس بیان کو اس نے چند مثالیں دے کر زیادہ عسیر الفہم بنانے کی کوشش کی ہے چنانچہ وہ پالتو بلی کی مثال دے کر کہتا ہے کہ بلی ایک شکاری جانور ہے اور پالتو ہونے کی وجہ سے اس کی توانائی محفوظ رہتی ہے لیکن یہ فاضل جمع کردہ توانائی کے راستے بالآخر معمولی مہیج سے کھل جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایسی صورت میں وہ بعض مرتبہ درخت کو کھرچتی یا زمین کو نوچتی ہے یا اور اسی قسم کے مختلف حرکات کرتی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے اس قسم کے تمام افعال غیر ارادی ہوتے ہیں اسی طرح اسپنسر نے ایک اور مثال چوہے کی دی ہے جس کی نسبت وہ کہتا ہے کہ جب وہ مقید کر لیا جاتا ہے تو مختلف چیزوں کو نوچنا شروع کرتا ہے۔ حالانکہ اس فعل سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا تاہم وہ زائد یا فاضل عضوی توانائی کو خارج کرنے کا یہی طریقہ سمجھتا ہے یہی حالت اطفال کی بھی ہوتی ہے مثلاً بچی جب گڑیوں سے کھیلتی ہے تو وہ اپنی صلاحیت یا توانائی کا یہی مصرف قرار دیتی ہے کیونکہ جونہی وہ سنجیدہ اور متین افعال میں مشغول ہونے کے قابل ہو جاتی ہے اس میں اس قسم کے اصراف کی فعلیت تجربہ میں نہیں آتی۔ بہر حال مختصراً یہ کہ اسپنسر کے نزدیک کھیل ایک طے بقیہ زائد اور فاضل توانائی کے اخراج کا لیکن اس کے کہنے کے مطابق اس بے ربط سلسلہ میں کسی نہ کسی قسم کی حیثیت کا پایا جانا لازمی ہے۔

اسپنسر کے نظریہ پر تنقید | یہ صحیح ہے کہ ظاہری طور پر یہ نظریہ عیوب سے دور معلوم ہوتا ہے۔ اور کھیل فاضل توانائی کے اخراج کی ایک صورت دکھائی دیتی ہے لیکن اگر باریک بینی سے کام لیا جائے تو دو نقائص کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت تک توانائی قایم رہے گی اسی وقت تک کھیل کی فعلیت بھی جاری رہے گی اور جب جمع خرچ مساوی ہو جائے تو اس فعلیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ حالانکہ ہمارا یہ تجربہ ہے کہ بعض مرتبہ بچہ اس وقت تک کھیل کو جاری اور باقی رکھتا ہے جب تک کہ تکان سے مغلوب نہیں ہو جاتا اس تجربہ کی تشریح اور توضیح اسپنسر کے نظریہ کے بموجب یہ ہوگی کہ ایسی مثال میں فاضل جمع کردہ توانائی خرچ سے بہت کم ہوتی ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے یہ نظریہ مشاہدات کے خلاف پڑتا ہے کیونکہ اس سے مقابل کے اس اعتراض کی کہ بچہ توانائی کے ختم ہو جانے کے بعد تکان تک کیوں کھیلتا ہے؟ تشریح نہیں کی جا سکتی[1] اس نظریہ میں اس نقص کے علاوہ ایک اور اہم نقص یہ ہے کہ اگر ہم کسی نہ کسی طرح قصداً اس نقص کے نظر انداز کرنے پر خود کو دھوکہ بھی دے لیں تو بھی ہم کھیل کے تنوعات کی اس نظریہ سے توجیہ نہیں کر سکتے دوسرے الفاظ میں اگر یہ سوال کیا جائے

---

[1] ملاحظہ ہو اسپنسر کی کتاب (PRICIPLES OF PSYCHOLOGY) حصہ دوم باب نہم صفحہ ۶۹۳۔

کہ مختلف العمر کے انسان کیوں کھیلتے ہیں؟ تو اس نظریہ کی مدد سے ہم اس کا جواب دینے سے قطعی معذور ہیں۔

(ب) مکالگرڈوس[1] کا نظریہ | اسپنسر کے ان تمام نقائص کو پیش نظر رکھتے ہوئے مکالگرڈوس نامی ایک جرمن فلاسفر نے اور ایک نظریہ قایم کیا جس کی بنا پر اس نے اپنے پیشرو کی تمام کمزوریوں کو رفع کرنے کی ممکنہ کوشش کی ہے۔ اس کے نزدیک کھیل "ایک ہیجانی[2] وظیفہ ہے جس کا مصرف یہ ہے کہ ان فعلیتوں کو پیدا کرے جن کی ضرورت آیندہ زندگی میں پڑنے والی ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ بچوں کے تمام افعال آیندہ زندگی کے سنجیدہ افعال کے لئے بطور تیاری سرزد ہوتے رہتے ہیں۔

اس نظریہ پر تنقید | ہوسکتا ہے کہ ان افعال کی اہمیت اس وجہ سے ہو کہ ان کی ضرورت بالغ العمری میں پڑے لیکن ڈاکٹر میکڈوگل جو اس نظریہ کا سب سے زیادہ مخالف ہے اعتراض کرتا ہے کہ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اس نظریہ کو صحیح بھی تسلیم کرلیں اور یہ مان لیں کہ کھیل میں سنجیدہ افعال کی ابتدائی مشق ہوتی ہے تو پھر یہ مشکل آپڑتی ہے کہ اگر یہ فعلیت فی الواقع مشق کے لئے ہے تو ہمیں ان تمام موازنات وعلائم کے مظاہرات بھی لازمی اور ضروری ہیں جو اس وقتی جبلت میں قطعی پائے جاتے ہیں مثلاً غصہ کا فطری میلان یہ ہے کہ وہ حریف کو نقصان پہنچانے کی خواہش کرے اب جب کھیل میں اس کی تیاری کی جاتی ہے تو ضروری ہے کہ اس کے میلان کا بھی وجود ہو کیوں کہ بصورت دیگر اس کے معنی یہ ہوئے کہ مشق نامکمل اور ناقص ہوتی ہے۔

جب اس مشکل کی توجیہ مکالگرڈوس کے نظریہ سے نہیں ہوسکتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کھیل کی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ اس مطالبہ کا جواب انگلستان کا مشہور فلسفی براڈلے[3] یوں دیتا ہے کہ اگر کھیل میں علائم وموانات رونما نہیں ہوتے یعنی فنا کے میلان وتاسف وغیرہ کا مظاہرہ نہیں ہوتا اور حریف مضر حرکات نہیں کرتا تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس "تقلید میں اپنے حرکات کو قابو میں رکھا جاتا ہے تاکہ مہلک حرکات سرزد نہ ہونے پائیں اس میں شک نہیں کہ یہ ہر فرد کی دانستہ کوشش ہوتی ہے تاہم ان کے خلقی مظاہرات کو قطعی طور پر روک نہیں دیا جاتا اس لئے وہ رونما ضرور ہوتے ہیں لیکن نہایت ہی مبہم صورت میں جیسے جب دو بچے آپس میں لڑتے ہیں تو ایک دوسرے پر ضرب لگاتے ہیں لیکن نہایت احتیاط کے ساتھ صرف ایسے مقامات پر جہاں نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔ میکڈوگل کو اس جواب سے تشفی نہیں ہوتی اس لئے وہ کہتا ہے کہ ترقی یافتہ یعنی بالغ العمر

---

[1] ملاحظہ ہو میکڈوگل کی کتاب (INTRODUCTION OF SOCIAL PSYCHOLOGY) باب سوم۔ نیز انجل کی کتاب (PSYCHOLOGY) باب شانزدہم

[2] F.H. BRADLEY ملاحظہ ہو انجل کی کتاب اصول نفسیات مترجمہ پروفیسر ولی الحق صاحب اسلامیہ کالج لاہور صفحہ ۳۸۱

اور عمر رسیدہ انسانوں میں ضبط یا قابو کی صلاحیت بلاشبہ پائی جاسکتی ہے لیکن یہ کس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے۔ کہ اطفال میں بھی ضبط یا قابو کی صلاحیت ہوتی ہے جب کہ ان میں شعور ذات کا فقدان ہوتا ہے اس کے علاوہ ایک اور قباحت یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس لحاظ سے بچوں کے حرکات و سکنات کو متعین ماننا پڑتا ہے حالانکہ ہمیں اس کا بخوبی علم ہے کہ بچوں کے حرکات کا دارومدار صرف وقتی ہیجانات پر ہوتا ہے یعنی وہ شتاب کار ہوتے ہیں۔ بہرکیف اس میں شک نہیں کہ براڈ نے ایک حد تک میکڈوگل کے اعتراض کو معدوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس صورت میں بھی اعتراض اصلی حالیہ باقی رہتا ہے۔

پھر ڈاکٹر میکڈوگل کا دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ بعض کھیلوں کی اس نظریہ کے مطابق توجیہ ہوجاتی ہے لیکن بعض کھیل کی ایسی مخصوص صورتیں بھی تجربہ میں آتی ہیں جن کی نفسیاتی توجیہ اس سے نہیں ہوسکتی۔

قطع نظر اس نقص کے ایک اور نقص یہ ہے کہ اس نظریہ کا اطلاق صرف بچوں یا حیوانوں کے افعال پر ہوتا ہے جس کی وجہ سے کھیل کا دائرہ اس قدر محدود ہوجاتا ہے کہ بالغ العمر انسانوں کے افعال (کھیل) اس میں داخل نہیں کئے جاسکتے اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے افعال کی کس طرح توجیہ کی جائے گی اور ان کو کس چیز کی تیاری کہا جائے گا۔ علاوہ ازیں میکڈوگل کے اعتراضات یہیں نہیں ختم ہوتے بلکہ وہ آخر میں یہ بھی پوچھتا ہے کہ ہم کھیل میں اکثر اپنے ساتھی کو شکست دینا چاہتے ہیں جو کم و بیش ہر کھیل کا لازمی عنصر ہے تو اب اس کی کس طرح توجیہ کی جائے گی۔ اس کے جواب میں کالگروس خاموش نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر شانڈ کا نظریہ | کالگروس کے ان تمام نقائص کو ڈاکٹر شانڈ[1] نے ایک نیا نظریہ قایم کرکے رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کھیل "مسرت"[2] کے ایک مخصوص کردار کا نام ہے اور اپنی تائید میں کہتا ہے کہ اگر ہم قدما کے خیال کے مطابق بازیچہ افعال کو زندگی کے سنجیدہ و متین افعال کی نقل کہیں تو یہ سوال عائد ہوسکتا ہے کہ اس تقلید میں اور سنجیدہ افعال میں امتیاز کیسے قایم کیا جاتا ہے جبکہ دونوں صورتوں میں ایک ہی مقصد کے تحت حرکات سرزد ہوتے ہیں۔ اس کا جواب اسپنسر نے یوں دیا تھا کہ کھیل غیر ضروری اور خود رو حرکات کا مجموعہ ہوتا ہے جن کا کوئی لازمی مقصد نہیں ہوتا بخلاف اس کے سنجیدہ افعال متین اور نصب العین کو لئے ہوئے ہوتے ہیں بعض ماہرین کی اس سے تشفی نہیں ہوتی لہٰذا انہوں نے اس فرق کی گتھی کو اس طرح سلجھانے کی کوشش کی کہ گو کھیل میں مختلف جبلتیں روبکار ہوتی ہیں لیکن ان کی بصورت

---

[1] DOCTOR SHAND

[2] اردو میں JOY کے مماثل کوئی لفظ نہ مل سکا اس لئے ہم نے "مسرت" ہی پر اکتفا کیا ہے۔

موجودہ کوئی عملی اور مفید غایت نہیں ہوتی۔ یعنی بہ الفاظ دیگر ان کا کوئی یعنی مقصد نہیں ہوتا۔ یہ بیان کالگروس کے نظریہ کے بالکل منافی ہے کیونکہ اس کی رو سے کھیل کی فعلیت بیکار نہیں ہوتی بلکہ مستقبل کی تیاری ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بفرض محال اگر اس بیان کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہم ایک طرف تو یہ کہہ رہے ہیں کہ کھیل میں مختلف جبلتوں کی تقلید ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ ان کی اصلی غایت مفقود ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کھیل کی کوئی متعین غایت نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے فقدان کا یہ مطلب نہیں کہ ہر قسم کی غایت مفقود ہوتی ہے۔ بلکہ غایت کسی نہ کسی قسم کا ضرور پائی جاتی ہے لیکن اس کی نوعیت بدل جاتی ہے اور موجودہ فعلیت کی غایت بعینہ وہ نہیں ہوتی جو اصل جبلت کی ہوتی ہے اسی بنا پر اب سوال ہوتا ہے کہ اس اختلاف کی کیا وجہ ہے۔ یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جذبہ کی حالت میں ہم جب اپنے مخالف کے مقابلہ کے قابل نہیں ہوتے تو اس سے بچنے کے لئے بھاگتے ہیں لیکن جب کھیل میں بھی فعلیت صورت پذیر ہوتی ہے تو اس کا مقصد علی حالہ وہی نہیں رہتا اس لئے یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ اب ایسی صورت میں اس کی غایت کس قسم کی ہوتی ہے اس کا جواب عموماً یہ دیا جاتا ہے کہ اور جبلتوں کی طرح کھیل کی بھی ایک خاص جبلت ہوتی ہے اور جس طرح مختلف جبلتوں کے امتزاج میں جو جبلت نمایاں ہوتی ہے اس کی غایت دوسری غایتوں کو مغلوب کر لیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جب کھیل کی جبلت غالب ہوتی ہے تو اس کو کھیل کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے مثلاً پھینے کی ایک آزاد جبلت ہوتی ہے اور اس کے خاص خاص مظاہرات ہوتے ہیں جس کی غایت بھی علٰحدہ ہوتی ہے لیکن جب اس میں خوف کا جز شامل ہو جاتا ہے تو اس امتزاج سے اس مجموعہ کی غایت بھی وہ نہیں رہتی جو انفرادی طور پر خوف یا پھینے کی ہوتی ہے بلکہ کلیتہً تبدیل ہو جاتی ہے اسی طرح جب کسی جبلت میں کھیل کی جبلت شامل ہو جاتی ہے تو اس مجموعہ سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ ان کے انفرادی اور خود مختار غایتوں کا قائمقام ہو جاتا ہے اس مندرجہ بالا بیان کی بنا پر بظاہر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کھیل کی بھی علٰحدہ ایک جبلت ہوتی ہے کیونکہ بصورت دیگر غایات کے اختلاف کی توجیہہ ناممکن نظر آتی ہے۔

ان دشواریوں کو رفع کرنے کے لئے ہمیں یا تو کھیل کی جبلت کو ثابت کرنا پڑے گا (اس پر آگے بحث ہوگی) یا کوئی ایسی اہم خصوصیت دریافت کرنی پڑے گی جس سے اس اختلاف غایات کی تشفی بخش توجیہہ ہو سکے اس گتھی کو سلجھانے کی ڈاکٹر شانڈ نے ایک حد تک کوشش کی وہ کہتا ہے کہ ہر کھیل کی روح رواں مسرت ہے اور مسرت کی ماہیت کے متعلق اس کا خیال ہے کہ بلاشبہ عامیانہ نقطہ نگاہ سے "خوشی" اور "مسرت" کی نوعیت ایک ہی ہے اور ہم عام طور پر شدید خوشی کو مسرت یا مسروریت کہتے ہیں اور اس کے برخلاف شدید درد یا دکھ کو رنج لیکن نفسیاتی نقطہ نگاہ سے ایک مکمل اور منظم ذہنی کیفیت کو مسرت یا رنج کہا جاتا ہے جیسے زنانہ

کے بچھڑے ہوئے دو دوست جب آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو "مسرت" ہوتی ہے یہاں پر ملاقات ایک مرکب فعلیت ہے کیونکہ اس میں ادراک، شعور، تعلقات و زمان اور شناخت و خوشی کے عناصر شامل ہیں اور ہم اس پورے مرتب اور منظم مجموعہ کو مسرت کے نام سے یاد کرتے ہیں جس میں کئی عناصر کے ساتھ خوشی کا بھی ایک عنصر داخل ہوتا ہے یہی صورت رنج کی ہوتی ہے اس لحاظ سے یہ ظاہر ہے کہ خوشی کا عنصر صرف موجود ہی نہیں ہوتا بلکہ اکثر اس کا لازمی جز ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسرت اور خوشی دونوں ہم معنی ہوتے ہیں۔ اس فرق کے علاوہ ایک اور بات الامتیاز یہ ہے کہ خوشی کو ہم کسی نہ کسی حصہ جسم کے ساتھ منسوب کر سکتے ہیں لیکن مسرت یا شادمانی کی حالت کے لئے کوئی حصہ متعین نہیں ہو سکتا جیسے خوشی حواسِ خمسہ میں سے کسی ایک کی فعلیت سے حاصل ہوتی ہے لیکن مسرت "ہم" میں ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور فرق یہ ہے کہ خوشی کی مفرد حالت میں شدت کی وجہ سے ہماری تمام تر توجہ سمٹ کر مجموعی حالت کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر مسرت شدید ہو جائے تو ہماری توجہ نفسِ مسرت کی جانب نہیں جائے گی بلکہ معروض پر زیادہ جمے گی۔ ان تمام امتیازات کے ساتھ ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسرت کی حالت میں معروضات متعین نہیں ہوتے بلکہ اس خصوص میں اس کی صورت بعینہٖ وہی ہوتی ہے جو جذبی حالتوں کی ہوتی ہے یعنی وہ خود اگر معروضات کو تلاش کر لیتی ہے جیسے کہ غصہ کی حالت اشتعال طبعی کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اپنے خلقی رجحان کی بنا پر معروضات کو تلاش کرے یہی صورت "مسرت" کی ہوتی ہے اسمیں بھی اگر معروض موجود ہوتا ہے تو اس کو متعین کر لیا جاتا ہے یا اگر موجود نہیں ہوتا تو اس کا خلقی میلان معروضات کی تخلیق کی طرف راغب ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم شادی منانا چاہتے ہیں تو اس کے فطری رجحان کی بنا پر دوسروں سے ملاقات کرنا شروع کر دیتے ہیں یا تفریح کے لئے جا نکلتے ہیں۔ بہرحال مسرت کی زیادہ سے زیادہ تشریح ہو سکتی ہے نہ کہ اس کی منطقی تعریف کیوں کہ یہ ہمارے امکان سے باہر ہے اگرچہ دورِ جدید کے مشہور فلسفی اسپینوزا[1] کا خیال ہے کہ جب ایک تجربہ کے بعد دوسرا تجربہ امید کے مطابق ہوتا ہے تو ہم مسرور ہوتے ہیں اور یہی مسرت ہے لیکن یہاں اسپینوزا نے "مسرت" کو "امید" تک محدود کر دیا ہے اس لئے ہمارا خیال ہے کہ مندرجہ بالا امتیازات اسپینوزا کے ذہن میں قطعی نہیں تھے لہٰذا اب واحد صورت یہی ہے کہ ہم مسرت کی مختلف صورتوں پر ایک اجمالی نظر ڈالیں تاکہ مسرت محصور کی جا سکے لیکن یاد رہے کہ یہ بھی کوئی تعریف نہ ہوگی بلکہ تشریح۔

تنوعاتِ مسرت" | اس موقع پر اس کا اظہار ضروری ہے کہ جذبات میں ذہن اور جسم متحد العمل ہوتے ہیں لیکن

---

[1] BARUCH SPINOZA سنہ ۱۶۳۲ء تا سنہ ۱۶۷۷ء۔ دورِ جدید کا مشہور وحدت الوجودی فلسفی۔

جب ہم اپنی حرکی ساز و سامان پر سرسری نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی فعلیت میں مکمل عصبی نظام متہیج نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف نظام عصبی کے ایسے راستہ متحرک ہوتے ہیں جو اس فعلیت کیلئے معین اور مقرر ہو چکے ہوتے ہیں اور ان ہی کے ذریعہ احساسی تحریکات خارج ہو کر کامیاب مظاہرات پیدا کرتے ہیں اسی کو ہم عام طور پر "فعلیت" کہتے ہیں اب اگر مسرت کے متعلق بھی یہی کہا جائے کہ وہ بھی اسی کی پیداوار ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر ہمارے عضلات خواہ مخواہ بلا ارادہ متحرک ہو جائیں تو ان کی یہ فعلیت بھی مسرت کا باعث ہوتی ہے لیکن ہمارا یہ عینی مشاہدہ ہے کہ اس قسم کی بیکار حرکات میں مسرت کا فقدان ہوتا ہے لہذا یہ کہنا کہ مسرت اس قسم کے عضوی اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے قطعی غلط ہے مزید برآں اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ جب کسی فعل میں عضوی نظام بقاء کے علاوہ خاص غایت بھی مدنظر ہوتی ہے تو اس میں ضرور ایک کیفی خصوصیت صورت پذیر ہوتی ہے جس کو اگر مسرت کہا جائے تو نامناسب نہیں یہ الفاظ دیگر مسرت نفس فعلیت میں نہیں بلکہ اس کے قبل یا بعد کے خیال میں پائی جاتی ہے مثلاً ڈاکٹر شانڈ کہتا ہے کہ کرکٹ ایک منظم فعلیت ہوتی ہے جس میں امید و بیم اور فکر و اندیشہ کا غلبہ رہتا ہے لیکن کھیل شروع ہونے سے پہلے یا جب کھیل ختم ہو جاتا ہے اور کامیابی حاصل ہو جاتی ہے جو اس فعلیت کی غایت ہوتی ہے تو مسرت ہوتی ہے بعینہٖ یہی صورت دیگر انواع مسرت کی ہوتی ہے یعنی یہ کہ مسرت کی انشراحی کیفیت یا تو فعلیت کے پہلے ہوتی ہے یا فعلیت کے بعد۔

شانڈ کے اس پیش کردہ اصول کے خلاف یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ بعض صورتیں ایسی بھی دکھائی دیتی ہیں جن کے نفس خیال میں مسرت کا فقدان ہوتا ہے جیسے بعض مرتبہ "آرام" میں بجائے مسرت کے کوفت کا پتہ چلتا ہے مثلاً جب ہم کسی روز اپنا وقت بیکاری میں گنوا دیتے ہیں اور پھر شام کے وقت جبکہ سورج اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر آرام کے لئے پابرکاب ہوتا ہے تو ہمیں خیال آتا ہے ع۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ اس صورت میں مطالعہ باطن سے معلوم ہوتا "مسرت" کی بجائے کوفت موجود ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہمیں ناگواری محسوس ہوتی ہے اس کے جواب میں ڈاکٹر شانڈ کہتا ہے کہ جس حالت پر ہم حکم لگا رہے ہیں اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں صرف آرام کا خیال ہی نہیں بلکہ کمزوری کا احساس بھی پایا جاتا ہے لہذا یہی وجہ ہے کہ نفس خیال سے ہمارے اصول کے موافق خوشگواری نہیں بلکہ ناگواری محسوس ہوتی ہے ورنہ اگر نفس خیال پر غور کیا جائے تو وہ ہر حالت میں یقینی خوشگوار ہوتا ہے اسی بنا پر مسرتوں کو "ابتدائی" اور "ثانوی" صورتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور اس اصطفاف کی وجہ یہ ہے کہ بعض وجدان یا جذبہ پر موقوف ہوتے ہیں اور بعض قایم بالذات لہذا اول الذکر کو اصلی اور آخر الذکر کو ثانوی کہا جاتا ہے لیکن ہماری یہ تقسیم کسی اصول پر مبنی نہیں ہے اس لئے اس سے کوئی سائنٹیفک صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ بہر حال مسرت

ذہنی صورتوں میں پائی جاتی ہے اور جب جذبہ یا وجدان کی آمیزش ہوتی ہے تو الم یا ناگواری کا پتہ چلتا ہے۔

ایک مشکل کا ازالہ اب موقع آیا ہے کہ ہم ڈاکٹر شانڈلر کا بیان اختلاف غایات کے متعلق سنیں۔ وہ کہتا ہے کہ مسرت کی ایک علیحدہ غایت ہوا کرتی ہے کیونکہ بصورت دیگر اس کو نظام جذبی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی غایت کے متعلق کہتا ہے کہ مسرت جسم کی وظیفی فعلیت کو پیدا کرتی ہے اور یہی اس کی بالراست غایت ہوتی ہے۔

اب سوال ہوتا ہے کہ یہ غایت کیا ہے اور کن قوانین کے تحت یہ ظہور پذیر ہوتی ہے؟ اس کے جواب سے پہلے یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ خوشی اور مسرت کا رشتہ لازم و ملزوم کا نہیں کیونکہ بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں آمیزش کی وجہ سے خوشی مسرت کی ضامن نہیں ہوتی بلکہ اکثر جسمانی یا ذہنی درد یا دکھ کا لگاؤ مسرت میں پایا جاتا ہے۔ قومی لیڈر کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کو غلامی کی زہر آلود زنجیروں سے آزاد کرے۔ اس نصب العین کی کامیابی کے لئے اکثر وہ طبعی اور جسمانی تکالیف کو برضا و رغبت برداشت کرتا ہے گو یہ تکالیف بظاہر ناقابل برداشت ہوتے ہیں اور دوسرے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس کی اس کو پروا نہیں ہوتی اور "کئے جاؤ کوشش" پر کاربند ہوتا ہے۔ اب یہاں اس مثال میں خوشی کے عنصر کی بجائے رنج و مصیبت کے عناصر موجود ہوتے ہیں لیکن اس حالت سے بھی آسودے "مسرت" ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم خوشی کے وجود کو ہمیشہ قطعی طور پر مسروریت یا مسرت کا منطقی فعل قرار نہیں دے سکتے۔ اس تنبیہ کو پیش نظر رکھکر اگر ہم قوانین مسرت کو معلوم کرنے کی کوشش کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری طور پر تمام "مسرت" کے افعال بلا غایت اور بلا ہیجان نظر آتے ہیں لیکن اگر ان کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ غایت و ہیجان معدوم نہیں ہوتے بلکہ غیر شعوری طور پر نظر انداز کر دئے جاتے ہیں مثلاً ساکت و ساکن آرام کی مسرت کو بھی لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصلی غایت میلان مفقود نہیں ہوتے بلکہ موجود رہتے ہیں جیسے اگر آرام لینے والے کو اس کے میلان کے خلاف دق کیا جائے تو ایسی حالت میں وہ ہماری تمام کوششوں کا مقابلہ کر کے اصلی حالت کو بلا تغیر و تبدل برقرار رکھنے کی طرف مائل نظر آتا ہے لہذا یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مسرت کا سب سے اہم خلقی میلان یہ ہوتا ہے کہ خارجی معروض کو بلا تغیر برقرار رکھے اور اس کے اور ذہنی موضوع (خود) کے تعلق کو تا دیر قایم رکھے یہی مسرت کی بقا کے دو اہم قوانین ہیں۔ اس حقیقت کے واہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسرت جس کو ہم نے زود متغیر اور ساکن سمجھ رکھا تھا بقا کی تمنی اور تعلق کے اختتام کی دشمن ہوتی ہے کیونکہ بصورت دیگر بے چینی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ماتھیو آرنلڈ[1] نے محض اسی بنا پر اپنی قوم کو بہت کچھ برا کہا ہے کہ اس کی قوم کے افراد صرف فطرتی مناظر کو فنا کر کے مصنوعی مناظر کو آراستہ کرتے تھے فطرتی مناظر آرنلڈ

[1] MATHEW ARNOLD

کی "مسرت" کے معروضات میں اس لئے وہ نہیں چاہتا کہ اپنے معروضات میں تغیر واقع ہو بس یہی اس کی غایت ہے۔

ان کے علاوہ ایک اور قسم اقابل لحاظ اساسی میلان یہ ہوتا ہے کہ مسرت کا معروض ہماری توجہ اور فکر کو اپنی طرف اس وقت تک قایم رکھتا ہے جب تک کہ مسرت فی نفسہ فنا نہیں ہو جاتی۔

ہمارے ان بیانات سے اس میں شک نہیں کہ "مسرت" کی غایت اور میلان کا پتہ چل گیا جو ایک اہم مرحلہ تھا لیکن قارئین کو یہ بھلانا نہیں چاہئے کہ معروض ذہنی اور خارجی دونوں طرح کا ہو سکتا ہے لہذا یہ مسئلہ حل طلب رہ جاتا ہے کہ اگر ذہنی معروض ہو تو اس کے میلان اور غایت کے وجود کی کیا صورت ہوگی؟ شانڈ کے خیال کے مطابق اس قسم کی تشکیک نے کئی وہم پرستوں کی بناؤ الی ہے تحقیقات کی بنا پر یہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ معروض کے ذہنی ہونے کی صورت میں ہم اس کو تمثال کی صورت میں باقی رکھتے ہیں اور یہی اس کا میلان بھی ہوتا ہے مثلاً کسی مہم کی کامیابی کی مسرت کو لیجئے یہ ایک ذہنی کیفیت ہے جس کو اگر ہم برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی تمثال قایم کر لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس پر سب کا اتفاق ہے کہ صحیح وقت پر موزوں حالات نہ ہونے کی وجہ سے بعض مرتبہ مسرت کی فعلیت میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے ایک دوسرا جذبہ رونما ہو جاتا ہے جس کو عام طور پر "غصہ" کہا جاتا ہے اسے مسرت کی بقا کے حق میں مضر ہونا چاہئے کیونکہ اس کا فطری خاصہ یہ ہوتا ہے کہ معروض کو تباہ کرے اور ہم نے ابھی کہا ہے کہ مسرت کی اہم خصوصیت بلکہ غایت یہ ہوتی ہے کہ معروض کو غیر متغیر صورت میں باقی رکھے لہذا جب غصہ کا عنصر شامل ہو جاتا ہے تو اس مزاحمت کے معنی یہ ہوں گے کہ تعلقات کو برقرار رکھنے کی خاصیت کا خاتمہ ہو جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ "مسرت" کی کیفیت فنا ہو جائے۔ گو یہ خیال عام طبائع کے بالکل مناسب ہے لیکن ذرا تامل کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مزاحمت سے تعلق فنا نہیں ہوتا بلکہ زیادہ مستحکم اور نمایاں ہوتا ہے یعنی جتنی مزاحمت قوی ہوتی ہے اتنی ہی نمایاں رغبت ہوتی ہے یہاں تک کہ بالآخر مزاحمت کا خاتمہ ہو جاتا ہے تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہماری مسرت کی خواہش کو شعوری بنا لیا جائے۔

غرض یہی وہ اجزائے ترکیبی ہیں جن کی مدد سے غایت مسرت کو محصور کیا جاتا ہے اور یہی وہ اہم خصوصیات ہیں جن کو قوانین مسرت کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

جب یہ ثابت کر دیا گیا کہ مسرت کی غیر شعوری غایت ہوتی ہے تو ضرور ہے کہ کھیل کی بھی کوئی غایت ہو کیونکہ ڈاکٹر شانڈ کے بیان کے بموجب مسرت کے ایک مخصوص کردار کا نام کھیل ہوتا ہے ابتدا میں یہ دقت پیش آتی ہے کہ اگر کھیل میں مختلف جبلی حرکات ظہور پذیر ہوتے ہیں تو اس اجتماع کی غایت کس نوعیت کی ہوگی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ان حرکات کی انفرادی غایات بالکلیہ فقدان ہوتا ہے۔ اسی دقت کو رفع کرنے کیلئے ڈاکٹر شانڈ کہتا ہے کہ ہم عام طور پر

تمام جبلتوں میں ان کے اپنی غایات کے علاوہ مختلف مظاہرات دیکھتے ہیں جو عام طور پر مشترک ہوتے ہیں لیکن جب ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہو جاتے ہیں تو انکی غایات میں بھی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور اس امتزاج میں جو غالب جبلت ہوتی ہے اسی کی غایت دوسروں کی بھی غایت بنجاتی ہے بالکل اسیطرح جب فعلیت ایک نئے نظام جذبی میں جس کو مسرت کہا جاتا ہے داخل ہوتی ہے تو اس کی غایت بھی اس نظام جذبی کی غایت میں ضم ہو جاتی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ کھیل کی غایت بھی ہوتی ہے جو "مسرت" کی ہوتی ہے یہی وہ پریشان کن مسئلہ تھا جس نے اکثر ماہرین کو بھٹکا دیا تھا چنانچہ ہم نے دیکھا کہ اسپنسر نے اس قسم کی فعلیت (کھیل) کو بیکار حرکات کا مجموعہ کہا ہے حالانکہ واقعیہ ہے کہ حرکات فعلی جب مختلف نظامات جذبات میں منسلک ہو جاتے ہیں تو انکی غایات مفقود نہیں ہوتیں بلکہ بدل جاتی ہیں ہاں اس موقع پر مقرض کو ضرور موقع ہے کہ وہ استبدالی کی نوعیت کے متعلق سوال کرے جسکے جواب میں شانڈ کہتا ہے کہ بلاشبہ مظاہرات کی اصلی غایات مفقود ہوتی ہیں لیکن ایک دوسری غایت ان کی قایم مقام بنجاتی ہے جس کی نوعیت وہی ہوتی ہے جو مسرت کے نظام کی غایت کی ہوتی ہے اور یہی وہ اہم غایت ہے جو ہر کھیل میں غیر شعوری طور پر موجود رہتی ہے کیونکہ ہم مسرت کے حصول میں اسقدر محو ہوتے ہیں کہ اس کے شعور کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔

اگرچہ ڈاکٹر شانڈ کی فکر و اجتہاد نے جس حسن خوبی سے اس مرحلہ کو طے کیا وہ قابل تحسین ضرور ہے لیکن معترضین کا ایک اور مطالبہ یہ ہے کہ کھیل میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ اکثر حرکات یا مظاہرات کا اعادہ ہوتا ہے تو اب اس کی کس طرح توجیہ کیجائیگی۔ اسکے جواب میں شانڈ کہتا ہے کہ ہمارے تجربہ کی بنا پر ہم مسرت کے معروض کی دو صورتیں تصور کر سکتے ہیں جیسا کہ گذشتہ صفحات میں کہا جا چکا ہے فرض کیجئے ایک خارجی جوہر سے آزاد ہوتی ہے اور دوسری ذہنی جس کا انحصار خود ہماری ذات پر ہوتا ہے اب ہمارے عقیدہ کے مطابق خارجی معروضات کے متعلق نہایت آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکو بلا اعادہ قائم رکھا جا سکتا ہے لیکن دوسری صنف کے ذہنی معروضات جن کو ہم عموماً کھیل کے زمرہ میں داخل کرتے ہیں بقا میں وقت پیش آتی ہے کیونکہ ان کے تغیر کا بیحد اندیشہ ہوتا ہے اسی لئے ہم مسرت کے رجحان کے موافق بقا کے لئے اکثر حرکات کا اعادہ کرتے رہتے ہیں مثلاً جب کسی شعر سے ہم زیادہ محظوظ ہوتے ہیں تو اسے بار بار پڑھتے ہیں۔

بہرحال ماحصل یہ کہ کھیل کی غایت کے متعلق معترضین نے جن شکوک کا اظہار کیا تھا اسکا اسطرح ازالہ ہو جاتا ہے کہ کھیل میں اسکی غایت صریحاً شعوری طور پر ہمارے پیش نظر نہیں ہوتی لیکن غیر شعوری طور پر تمام صورتوں میں موجود رہتی ہے جس کا عام طور پر مزاحمت سے بچنا چلانا ہے۔

یہاں تک کھیل کی ماہیت کی بحث تھی جسکے متعلق مختلف نظریات بیان کئے گئے جن کے کذب و بطلان پر کافی بحث کرنے کے بعد ہماری نظر نے ڈاکٹر شانڈ کے نظریہ کو اعلیٰ منتخب کیا ہے جسکی موجب اگرچہ آواز بلند نہیں لیکن بقول کسی ظریف کے "چشم و ابرو" کے اشاروں سے یہ تسلیم کرانا پڑتا ہے کہ

کھیل کی بھی ایک مخصوص جبلت ہوتی ہے

لہذا اب ایک عام صدا کا جواب دینا ہے کہ آیا کھیل کی کوئی خاص جبلت ہوتی ہے یا نہیں اس لئے اب ہم باقی ماندہ مضمون کو اسی بحث کے لئے وقف کرتے ہیں۔ (باقی آئندہ)۔

گنبد خضرا

(از جناب حاجی علی شبیر صاحب سررشتہ دار عثمانیہ عدالت العالیہ)

ذیل کا مضمون ہمارے کرم فرما مولوی علی شبیر صاحب کی کتاب "تاریخ مزارات حرمین" کا (جو زیر طبع ہے) ایک پارہ ہے۔ مولوی علی شبیر صاحب اُن افراد سیر میں سے ہیں جنہوں نے ارض حجاز کو چپہ چپہ کی جغرافیائی اور وہاں کے قبور کی ایک ایک اینٹ کی، اپنے عینی مشاہدہ کے ذریعہ تاریخی تطبیق کی ہے" (مجلۂ مکتبہ)

حجرۂ شریف جسمیں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار مبارک اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی قبریں ہیں سب طرف سے بند ہے۔ قبروں تک کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ اس حجرے کی چھت لداؤ کی قبہ نما ہے اس کے اُوپر ایک بلند قبہ ہے جس کا رنگ سبز ہے اسی وجہ سے اس کو گنبد خضرا کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں حجرۂ شریف پر ایک پست چھت تھی جو کھجور کی کڑیوں سے پٹی ہوئی تھی۔ بعد وفات جب آنحضرتؐ اس حجرے میں دفن ہوئے اسوقت بھی یہی چھت قایم رہی ۱۳ھ ہجری میں حضرت ابوبکرؓ یہاں دفن کئے گئے۔ اس کے بعد ۱۷ھ ہجری میں حضرت عمرؓ نے حجرۂ شریف کی دیوار کو جو ٹہنیوں کی تھیں کچی اینٹوں سے بنوا دیا مگر حیثیت وہی رہی۔ ۲۳ھ ہجری میں حضرت عمرؓ اسی حجرے میں دفن کئے گئے لیکن قبروں پر ابھی تک کوئی گنبد نہ بنا۔ اور یہ حالت تقریباً اسی برس تک قایم رہی۔

۹۰ھ ہجری میں جب عمر بن عبدالعزیز[1] نے بزمانۂ ولید بن عبدالملک[2] مسجد نبوی کی توسیع کی تو اس حجرے کو بھی داخل مسجد کرکے تعمیر کرایا۔ حجرۂ شریف کی اصل دیواریں کچی اینٹوں کی رکھیں اور اُن کی اطراف ایک مخمس احاطہ نقشی پتھروں کا تیار کرایا۔ مگر دونوں میں سے کسی میں بھی دروازہ نہ رکھا۔ حجرۂ شریف پر

---

[1] عمر بن عبدالعزیز خاندان بنی امیہ کے آٹھویں خلیفہ تھے۔ زمانۂ ولید بن عبدالملک میں مدینے کے والی تھے مسجد نبوی کی تعمیر انہی کی زیر نگرانی ہوئی تھی جسکی ابتدا ۸۸ھ ہجری میں اور اختتام ۹۱ھ ہجری میں ہوا۔ اس کام پر تین سو رومی و قبطی عیسائی مامور کئے گئے تھے اسی زمانہ میں مزار اقدس کا حجرہ بھی تعمیر کرایا گیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز ڈھائی سال خلیفہ رہے۔ ۱۰۱ھ ہجری میں وفات ہوئی

[2] ولید بن عبدالملک خاندان بنی امیہ کا چھٹا خلیفہ تھا۔ ۸۶ھ ہجری میں تخت نشین ہوا۔ ۹۷ھ ہجری میں وفات پائی۔

معمولی چھت کے علاوہ مسجد کی چھت سے کوئی سوا گز بلندی پر تختوں کا ایک سائبان پختہ اینٹوں کی منڈیر پر پڑا ہوا جو مسجد کی چھت سے علیحدہ اونچا نظر آتا تھا اور اُس پر موم جامہ پڑا رہتا تھا۔ ساتویں صدی کے وسط تک مزار اقدس کی چھت کی یہ حالت رہی۔ اور اُس پر قبہ تعمیر نہ ہوا۔

۶۵۴ھ ہجری کی آتش زدگی میں جب یہ چھت جل گئی تو اس کے بعد ملک منصور علی بن معز و ملک[۵۳] اظاہر رکن الدین سلاطین مصر و حجاز و شمس الدین یوسف بادشاہ یمن نے ۶۵۸ھ ہجری میں حجرۂ شریف تعمیر کرایا۔ اور اس کی چھت بھی اسی وضع کی رکھی جیسی کہ عمر بن عبد العزیز کی بنوائی ہوئی تھی یہ چھت بیس سال تک قایم رہی اس کے بعد ۶۷۸ھ ہجری میں ملک منصور قلاؤن الصالحی سلطان مصر و حجاز نے حجرۂ شریف کی چھت پر ایک خوشنما قبہ تعمیر کرایا۔ یہ سب سے پہلا گنبد ہے جو مزار اقدس پر قایم کیا گیا۔

یہ گنبد نیچے سے مربع اور اوپر سے ہشت پہل تھا۔ اس پر لکڑی کے تختے کیلوں سے جمائے تھے۔ اور اُن کے اوپر سیسے کی چادریں منڈھی تھیں۔

سید جعفر برزنجی[۵۴] اور اُن کی تبع مولوی صبغۃ اللہ صاحب ساکن مدراس[۵۵] مؤلف کتاب السکینہ باخبار

---

[۵۱] کیفیت اس آگ کی یہ ہے کہ یکم رمضان ۶۵۴ھ ہجری کو سر شام ابو بکر بن الدھنا می نے تیل دین روشن کرنے کیلئے مسجد کے ایک کمرے میں گیا اس کے ہاتھ سے جلتی ہوئی بتی چھوٹ کر گر پڑی اس سے کمبل و بورئے میں جو یہاں بچھا ہوا تھا آگ لگ گئی اور اتنی بھڑکی کہ اس کے شعلے مسجد کی چھت تک پہونچ گئے وہ جل اٹھی اب آگ سقف میں پھیل گئی اور منبر خزانۂ قرآن۔ کتابیں غلاف حجرۂ شریف غرض جو کچھ مسجد کی چھت کے نیچے تھا سب جل گیا۔ کوئی لکڑی صحیح و سالم نہ رہی اُس وقت حجرۂ شریف پر تہ بر تہ گیارہ غلاف تھے وہ سب جل گئے اور مسجد میں سوائے ایک گنبد کے جو حرم نے فائدہ رکھنے کیلئے تھا کوئی حصہ محفوظ نہ رہا۔ پتھر کے ستون جلکر کھجور کی ٹہنیوں کیطرح کھڑے رہ گئے۔ مسجد کی چھت جو حجرۂ شریف کی چھت سے اونچی تھی جب وہ جلکر گری تو اس حجرۂ شریف کی چھت بھی ٹوٹ گئی اور دونوں چھتیں قبروں کے اوپر گر پڑیں ایسی اطلاع خلیفہ بغداد معتصم باللہ کو کیگئی اور ۶۵۵ھ کے اوائل میں تعمیر کی ابتدا ہوئی ہنوز تمام ہونے پائی تھی کہ تاتاریوں نے خلافت بغداد کو دنیا سے مٹا دیا آخر ملک منصور نور الدین علی اور ملک اظاہر رکن الدین سلاطین مصر نے کاریگر و سامان مصر سے روانہ کیا اور شمس الدین یوسف نے بھی مدد کی یہاں تک ۶۵۸ھ میں مسجد بنوئی اور حجرۂ مزار اقدس بنکر تیار ہوا۔ ملک[۵۲] منصور نور الدین علی بن معز کی سلطنت ۶۵۵ھ سے ۶۵۷ھ تک ہے۔ ملک[۵۳] اظاہر رکن الدین ۶۵۸ھ سے ۶۷۶ھ تک بادشاہ مصر و حجاز رہا۔ ملک منصور[۵۴] ابو المعانی قلاؤن صالحی خاندان قلاؤنیہ مصر کا پہلا بادشاہ تھا اسکا عہد حکومت ۶۷۸ھ سے ۶۸۹ھ تک ہے۔

[۵۵] سید جعفر برزنجی مدنی کی تاریخ مدینہ مزہۃ الناظرین ..... مدینہ منورہ کی آخری عربی تاریخ ہے جس میں ۱۲۹۶ھ تک کے حالات درج ہیں، اسمیں زیادہ تر مسجد نبوی کی کیفیت بیان کی گئی ہے دوسرے واقعات بہت ہی مجمل و مختصر ہیں سن تالیف اسکا (۱۲۸۶) ہجری ہے مگر اور دس برس تک کے واقعات بھی آخر میں اضافہ کر دیئے گئے ہیں ..... مطبع میں طبع ہوئی ہے برزنجی کا میلاد شریف بھی بہت مشہور ہے۔ مولوی صبغۃ اللہ صاحب مترجم عدالت حنفیہ مدراس نے ۱۳۲۵ھ میں السکینہ باخبار مدینۃ تالیف کی ہے جو ۱۳۲۷ھ میں مقام مدراس طبع ہوئی

مدینہ لکھتے ہیں کہ "قلاؤن صالحی کا بنوایا ہوا قبہ پہلی آتشزدگی میں جل گیا" یہ صحیح نہیں ہے۔ پہلی آتشزدگی ۶۵۴ھ ہجری میں ہوئی تھی جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے۔ اس وقت قبہ تھا ہی نہیں۔ اس آگ کے چوبیس برس بعد سب سے پہلا قبہ ۶۷۸ھ ہجری میں سلطان قلاؤن نے تعمیر کرایا جس کو دونوں مؤرخین مذکورہ بالا تسلیم کرتے ہیں (ملاحظہ ہو نزہۃ الناظرین عربی مطبوعہ مصر صفحہ ۷۶۔ والسکینہ باخبار مدینہ مطبوعہ مدراس صفحہ ۱۱۶)

چند سال بعد بارش کی وجہ سے جب اس قبے کی سیسے کی چادروں میں نقص پیدا ہو گیا تو سلطان قلاؤن کے لڑکے سلطان ناصر حسن نے جس کا زمانہ سلطنت ۶۹۳ھ ہجری سے ۶۹۸ھ ہجری تک ہے اس کی مرمت کرائی۔ اس کے بعد سلطان اشرف شعبان نے جس کا عہد حکومت ۷۶۵ھ ہجری سے ۷۷۸ھ ہجری تک ہے ۷۶۵ھ میں اسکو اور مستحکم کرایا۔ اسی طرح زمانہ سلطان الظاہر جقمق میں جو ۸۴۲ھ ہجری سے ۸۵۷ھ تک ہے مسجد کی تعمیر کے وقت اس قبہ کی بھی درستی کی گئی۔

۸۸۱ھ ہجری میں جب حجرۂ مزار اقدس کی دیواروں میں دراریں پیدا ہو گئیں تو ملک اشرف سلطان قائد بے[1] نے دیواروں کی مرمت کے ساتھ چھت کو بھی بدلوا دیا۔ اور بجائے معمولی چھت کے لداؤ کی چھت کر کے اس کو قبہ نما بنوا دیا۔ یہ چھت تاریخ سمہودی[2] میں قبۂ صغیرہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس پر پیتل کا ایک ہلال بھی نصب ہے۔ حجرے کی سطح سے اس ہلال تک (۲۷) فٹ (۴) انچ بلندی ہے چونکہ اس چھوٹے قبے پر غلاف پڑا رہتا ہے اس وجہ سے یہ نظر نہیں آتا۔ البتہ حجرے کی چھت بیچ میں سے ڈیوڑھی کیطرح کچھ اٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ عام زائرین اس قبہ کی زیارت سے محروم ہیں۔ شعبان ۹۶۱ھ ہجری میں جبکہ سخت

---

[1] عربی مؤرخ اس کا نام قائیتبا یا قایتبائی لکھتے ہیں جو قاید بے کا معرب ہے۔ یہ بادشاہ سلاطین مملوکیہ چرکسیہ مصر میں بڑا نیک و مخیر گزرا ہے۔ اس کو مسجد نبوی کی تعمیر و درستی کا دو مرتبہ شرف حاصل ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ۸۸۱ھ ہجری میں دوسری مرتبہ ۸۸۶ھ ہجری میں دوسری آتشزدگی کے بعد۔ قاید بے ۸۷۲ھ ہجری سے ۹۰۱ھ ہجری تک سلطان مصر و حجاز رہا۔

[2] سمہودی کا پورا نام سید نور الدین علی بن عبداللہ ہے۔ یہ قصبہ سمہود واقع مصر کے رہنے والے تھے اور مدینہ منورہ میں اقامت گزین تھے انکی تاریخ مدینہ وفاء الوفاء باخبار دار المصطفےٰ تالیف ۹۰۰ھ اور اس کا خلاصہ تالیف ۹۱۱ھ جو خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفےٰ کے نام سے مشہور ہے۔ مدینہ منورہ کی مستند ترین تاریخ ہے۔ مجذب القلوب و نزہۃ الناظرین وغیرہ جتنی کتابیں مدینہ منورہ کے حالات میں لکھی گئی ہیں سب کا ماخذ یہی کتابیں ہیں۔ وفاء الوفا ضخیم دو جلدوں میں ہے۔ اور مصر میں طبع ہوئی ہے۔ خلاصۃ الوفاء ایک جلد میں ہے اور مکہ معظمہ میں طبع ہوئی ہے۔ سید سمہودی کی وفات ۹۱۱ھ ہجری میں بمقام مدینہ منورہ ہوئی۔

آندھی کی وجہ سے حجرۂ شریف کی ایک طرف کی جالی گر پڑی تھی تو سید جعفر سبزپوش کو چھت پر چڑھنے اور اُس کی زیارت کرنیکا موقع ملا تھا وہ فرماتے ہیں:۔

"میں نے ادب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حجرہ مربع ہے اس پر غلاف پڑا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ قبہ نظر نہیں آتا۔ جس کا ذکر سمہودی نے کیا ہے۔ لیکن وسط میں غلاف کسیقدر اٹھا ہوا تھا۔ جیسے خیمہ ہوتا ہے۔ اُس سے ظاہر ہوا کہ قبہ کے سبب سے غلاف کے بیچ میں بلندی ہے"

(نزہتہ النّاظرین عربی مطبوعہ مصر۔ صفحہ ۶۹)

سُلطان قاید بے نے حجرۂ مزار اقدس پر چھت کی بجائے قبۂ صغیرہ تعمیر کرا کے اس کے اوپر سلطان قلاؤن صالحی کا بنوایا ہوا بڑا قبہ جو اس وقت صحیح و سالم موجود تھا۔ بدستور قایم رہنے دیا اور اس وقت سے ابتک حجرۂ شریف پر یہ دو قبّے ہیں ایک اندرونی قبہ یا چھت دوسرا بڑا قبہ جو قبۂ خضرا کہلاتا ہے۔

۸۸۶ھ ہجری کی آتشزدگی میں جب قلاؤن صالحی کا بنوایا ہوا بڑا قبہ جل گیا تو سلطان

مزار اقدس کے گرد سب سے پہلے جمال الدین اصفہانی وزیر سلطان نورالدین زنگی شہید آتابک موصل نے ۵۵۵ھ میں صندل کی جالی نصب کی تھی۔ ۶۵۴ھ ہجری کی آتشزدگی میں جب یہ جالی جل گئی تو ۶۶۸ھ ہجری میں ملک الظاہر رکن الدین بیبرس والیٔ مصر نے لکڑی کی ایک جالی بنوائی جس کی بلندی دو قد آدم تھی۔ پھر ۶۹۴ھ ہجری میں ملک العادل زین الدین سلطان مصر نے لکڑی کی ایک جالی استاد کرائی۔ جب ۸۸۶ھ کی آتشزدگی میں یہ جل گئی تو سلطان مصر قاید بے نے ۸۸۸ھ ہجری میں تانبے کی ڈھلی ہوئی جالی تین طرف اور جانب قبلہ پیتل اور چاندی کی جالی نصب کی۔ جو اس وقت موجود ہے۔ جالی کی مفصل تاریخ میں نے اپنی کتاب "مزارات حرمین" میں تحریر کی ہے جو زیر طبع ہے۔

تیرہ رمضان ۸۸۶ھ ہجری کو پہلے پہر منارۂ اذان پر بجلی گرنے سے آگ لگ گئی تھی۔ جس سے مسجد کی چھت میں آگ لگ گئی۔ تمام شہر نے بجھانے کی کوشش کی مگر قابو نہ چلا۔ اور تقریباً نصف مسجد اور بہت سا سامان جل گیا۔ البتہ صرف حجرۂ شریف محفوظ رہا تھا۔ اور قبۂ صغیرہ بچگیا تھا۔ مگر بڑا قبہ نہ بچ سکا۔ اور حجرۂ شریف کے متصل جو ستون تھے وہ جل گئے۔ اور جالی اور اس کے اندر کا سامان بھی جل گیا۔ اس کی اطلاع سُلطان قاید بے کو کی گئی۔ اُس نے بہت سے کاریگر و سامان مصر سے بھجوایا آخر رمضان ۸۸۸ھ ہجری میں تعمیر ختم ہوئی۔

قاید بے نے دوبارہ قبہ عظیم تعمیر کرایا۔ اس آگ میں قبہ صغیرہ یعنی مزار اقدس کی چھت بالکل محفوظ رہی تھی۔ اس وقت اس میں کچھ رد و بدل نہیں کیا گیا۔

چند سال بعد جب اس قبہ میں دراریں پڑ گئیں اور مرمت کا کام چلتا نظر آیا تو اس کے بالائی حصے کو تھوڑا سا توڑ کر قبے کو کسی قدر چھوٹا کر دیا اور محرابوں میں تختے بچھا کر کام شروع کیا تاکہ اوپر سے اگر کچھ گرے تو مزار اقدس پر نہ گرے۔ اس قبہ کی تعمیر میں بڑے ادب سے کام لیا گیا۔ معماروں نجاروں سے چڑھنے اُترنے اور سامان لانے لے جانے کے لئے مسجد نبوی کی شرقی جانب سیڑھیاں لگائی گئیں اور ایسا خاموشی سے کام ہوا کہ نمازیوں کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی کہ یہاں تعمیر ہو رہی ہے۔ سنہ ۸۹۲ ہجری میں قبہ بنکر تیار ہوا۔

(خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفےٰ عربی مطبوعہ مکہ معظمہ صفحہ ۱۴۸۔)

سنہ ۱۲۹۶ ہجری میں سید جعفر برزنجی نے اس قبہ کو اندر سے دیکھا تھا وہ فرماتے ہیں:۔

"قبے کے اندر مختلف قسم کے نقش و نگار ہیں اور نیچے اس کے اطراف میں جلی قلم سے کچھ لکھا ہوا ہے۔ مغربی جانب سے حسب ذیل عبارت لکھی ہوئی دیکھی۔ دوسری جانب میری نظر نہ پہنچ سکی

انشاء ھذہ القبۃ الشریفۃ العالیۃ المعترف بالتقصیر الراجی عفو ربہ القدیر القایتبا:۔"

یعنی اس عالیشان گنبد کا بنوانے والا اپنے گناہوں کا معترف اور خدا کی رحمت کا امیدوار قاید بے ہے۔

(نزہۃ الناظرین مطبوعہ مصر صفحہ ۶۹)

سنہ ۱۲۳۳ ہجری میں سلطان محمود خان[1] سلطان ٹرکی کے زمانہ میں اس قبے میں پھر دراریں پڑ گئیں تو اوپر کے حصے کو منہدم کر کے پھر بنوایا۔ اور اس امر کا لحاظ رکھا کہ انہدام کے وقت کوئی چیز قبہ صغیرہ پر یا حجرے میں یا مسجد میں گرنے نہ پائے۔ اس کام میں حصول برکت کے خیال سے اکثر مدینہ والے اور اُن کے بال بچے شریک ہوئے۔ تعمیر ختم ہونیکے بعد باب عالی سے شہر والوں کے لئے جو اس کام میں شریک تھے نذر کے واسطے رقمیں آئیں اور فی کس ڈھائی ڈھائی سو قرش یعنی کوئی پندرہ پندرہ روپیہ دیئے گئے۔

(نزہۃ الناظرین عربی مطبوعہ مصر صفحہ ۷۷)

---

[1] سلطان محمود خان کا عہد سلطنت ۱۲۲۳ھ سے ۱۲۵۵ھ ہجری تک ہے۔ اس کے زمانے کا سب سے بڑا واقعہ جنگ وہابیہ ہے۔

مشہور و معروف فرنگی سیاح حجاز برکھارٹ[1] ۱۲۳۲ھ ہجری میں مدینے گیا تھا۔ اس نے اس قبہ کے بارے میں وہابیوں[2] کے طرز عمل کے متعلق ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک حجاز وہابیوں کے قبضے سے نکل کر ترکوں کے ہاتھ میں آچکا تھا۔ وہ کہتا ہے:۔

"وہابیوں نے اس قبے کے کلس سے چونک کر اور مزارات کے گنبدوں کی ڈھا دینے والی عادت پر عمل کر کے۔ اس قبے کو بھی منہدم کرنیکی کوشش کی تھی۔ اور کلس و ہلال کو توڑ ڈالا تھا۔ لیکن اس گنبد کی مضبوط ساخت اور سیسے کے پتروں نے جو اس پر جڑے ہوئے تھے اس کام کو مشکل بنا دیا۔ گنبد کی چکنی سطح سے بھی دو کاریگر نیچے گرے۔ اس وجہ سے انہدام کا کام موقوف ہو گیا۔ یہ واقعہ ایک معجزے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ جو آنحضرت نے اپنی یادگار قائم رکھنے کے لئے ظاہر فرمایا۔

(انگریزی سفرنامہ برکھارٹ جلد دوم)

مذکورہ بالا واقعہ محض ایک کہانی ہے جو برکھارٹ نے مدینے میں سنی ورنہ اگر یہ سچا واقعہ ہوتا تو سید جعفر برزنجی

---

[1] برکھارٹ باشندۂ سوئٹزرلینڈ ابراھیم ابن عبداللہ نام رکھکر حجاز گیا تھا۔ یہ عربی سیاحوں کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ اس کی تصانیف میں سفرنامۂ عرب سفرنامۂ شام و سفرنامۂ نوبہ اور بدویوں اور وہابیوں کے حالات بہت مشہور ہیں۔ اسکے سفرنامۂ حجاز کا ترجمہ انگریزی سے میں نے اردو میں کیا ہے۔ جس کی پہلی جلد تاج پریس حیدرآباد میں طبع ہو چکی ہے۔

[2] محمد بن عبدالوہاب نجدی طریقۂ حنبلی کے ایک بڑے عالم تھے۔ وہ تعظیم قبور کو قبر پرستی خیال کرتے تھے۔ اور پختہ قبریں بنانا اور قبے تعمیر کرنا بھی ناجائز سمجھتے تھے۔ ان کے پیرو وہابی کہلاتے ہیں۔ امرائے نجد ان کے معتقد ہو گئے تھے اور جب عام مسلمانوں نے انکی تکفیر کا فتوے دیا۔ اور مکہ معظمہ میں وہابیوں کا داخلہ بند کر دیا۔ اور حج کرنے کو ان کو اجازت نہ رہی تو انہوں نے تلوار سنبھالی اور سعود ابن عبدالعزیز امیر نجد نے حجاز پر حملہ کر کے ۱۲۱۸ھ ہجری میں مکہ اور ۱۲۱۹ھ ہجری میں مدینہ فتح کر لیا۔ بارہ تیرہ برس حجاز وہابیوں کے قبضہ میں رہا۔ اس کے بعد محمد علی پاشاہ والئی مصر نے سلطان ترکی محمود خان سے اجازت حاصل کر کے وہابیوں کے استیصال کیلئے حجاز پر چڑھائی کی اور اسکے لڑکے طوسون پاشاہ و ابراہیم پاشاہ کی کوشش و زور سے اسکی فیاضی و فوج سے ملک حجاز دوبارہ ترکوں کے قبضے میں آگیا۔ اہل نجد نے مکہ و مدینہ پر قبضہ کرنیکے بعد قبروں کے گنبدوں کو توڑ ڈالا تھا۔ مگر گنبد خضرا کیساتھ کسی قسم کی بے ادبی نہیں کی تھی محمد علی پاشاہ نے ۱۲۴۳ھ ہجری میں جنت المعلیٰ و جنت البقیع کے گنبدوں کو دوبارہ تعمیر کرایا۔ ایک سو برس کے بعد اہل نجد نے بسرکردگی سلطان عبدالعزیز ثانی ابن عبدالرحمن آل سعود جو سعود اول کی مناسبت سے ابن سعود کہلاتے ہیں دوبارہ ۱۳۴۳ھ میں شریف حسین پادشاہ کو حجاز سے نکالکر یہاں قبضہ کر لیا۔ اور اس وقت ملک حجاز ان ہی کے زیر نگین ہے۔ اور انہوں نے بھی قبروں کے گنبد منہدم کر دئے ہیں۔

جو وہابیوں کے دشمن ہیں اس کا ضرور ذکر کرتے۔ مگر اس موقعہ پر وہ صرف اس قدر لکھ کر خاموش ہو گئے ہیں

"وہابیوں نے گنبد خضرا کے انہدام کرنے۔ اور اس کے کلس کو سونے کا سمجھ کر لے لینے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ اور وہ اس پر قابو نہ پا سکے۔"

(نزہتہ الناظرین صفحہ ۶۲)

یہ جو وہ بڑا قبہ یا گنبد خضرا سلطان قاید بے کا بنوایا ہوا اسوقت تک قایم ہے اہل نجد کے حالیہ قبضہ جانے کے بعد ہندوستان کے بعض مسلمانوں کو یہ گمان ہوا تھا کہ وہابی شاید گنبد خضرا کے ساتھ بھی اسی طرح کا عمل کریں گے جو انہوں نے دوسرے مزارات کے قبوں کیساتھ کیا ہے۔ اسی بناء پر میں نے ۱۳۴۵ھ ہجری میں بعض سربرآوردہ و اہل علم نجدیوں سے دریافت کیا تھا کہ ہندوستان میں یہ مشہور ہوا ہے کہ آپ لوگ گنبد خضرا پر بھی اسیطرح دست درازی کرنے والے ہیں جیسی کہ آپ کے مورث اعلیٰ امیر سعود بن عبد العزیز نے کی تھی۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہ ایسا سعود نے کیا تھا اور نہ معاذ اللہ ہمارا ارادہ ہے۔ میں نے کہا ایک فرنگی سیاح برکہارٹ نے ایسا ہی لکھا ہے اور بہت سے مسلمانوں کا بھی ایسا ہی خیال ہے۔ انہوں نے کہا کہ عام مسلمان اور عیسائی دونوں ہمارے دشمن ہیں۔

اب میں اپنا سلسلۂ بیان پھر شروع کرتا ہوں:

اس بڑے قبہ میں جانب جنوب ایک کھڑکی ہے۔ جس کے پٹ جالی کے ہیں اس میں سے پانی اندر نہیں جا سکتا لیکن روشنی وہوا پہنچ سکتی ہے۔ یہ کھڑکی کوئی پون گز لمبی اور آدھ گز سے زاید چوڑی ہے ضرورت کے وقت اس میں سے ایک آدمی اندر داخل ہو سکتا ہے اس کھڑکی کے محاذی قبۂ صغیرہ میں بھی ایک دریچہ ہے اس میں بھی جالی کا ایک دروازہ ہے۔ یہ کھڑکی حجرۂ مزار اقدس کی چھت یا گنبد میں ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے سمہودی کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے زمانہ میں ایک سال بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط پڑ رہا تھا۔ اہل مدینہ اکھٹے ہو کر امّ المؤمنین کے پاس گئے اور عرض کیا کہ حجرۂ شریف کا دروازہ کھولدیجئے تاکہ ہم بواسطہ حضرت رحمۃ للعلمین اللہ تعالیٰ سے دعائے باران رحمت کریں۔ حضرت عائشہؓ نے حجرہ کا دروازہ کھولا۔ اور تشنہ کاموں نے دعا کی۔ خدا کی قدرت سے ایسی بارش ہوئی کہ جل تھل ہو گئے اور اس کثرت سے زراعت ہوئی کہ مویشی اناب شناب موٹی ہو گئی اس کے بعد سے مدینہ والوں کا یہ طریقہ ہو گیا کہ جب کبھی قحط کے آثار نمودار ہوتے یا کوئی اور سخت مشکل پیش آتی تو وہ حجرے کی چھت کی کھڑکیاں کھول کر دعا کیا کرتے تھے۔ بہت دنوں تک یہ طریقہ جاری رہا مگر نویں صدی ہجری

---

[۵] سید جعفر برزنجی وہابیوں کا ذکر ایک خاص لہجے میں کرتے ہیں ۱۲۱۹ھ ہجری میں جب وہابیوں نے مدینہ لیا تھا تو سید صاحب موصوف کے والد نے وہابیوں کے ڈر سے بھاگ کر عراق میں پناہ لی تھی۔ اس واقعہ سے بھی سید صاحب کو رنج تھا

یعنی ہمہودی کے زمانہ میں موقوف ہوگیا۔ ان دنوں میں بجائے قبہ کی کھڑکی کے حجرۂ شریف کی جالی کا ایک دروازہ جو جانب قبلہ (جنوب) اور جسے باب التوبہ[1] کہتے ہیں دعائے استسقا کیا کرتے تھے۔ یہ طریقہ بھی چودھویں صدی تک جاری رہا۔ موجودہ عہد میں ایسی کوئی مصیبت نہیں آئی کہ باب التوبہ وا ہوتا اور خدا ایسا موقع بھی نہ لائے

قبۂ خضرا جسکا یہ نام ہمارے زمانہ میں اس کے سبز رنگ کی وجہ سے رکھا گیا ہے ہمیشہ سبز نہیں ہے پہلا گنبد جو ۶۷۸ ہجری میں تعمیر ہوا تھا اس کا رنگ سفید تھا اس وقت اس کو قبۂ بیضا کہا کرتے تھے ۸۸۶ ہجری کی آگ میں جب وہ جل گیا تو دوسرا تعمیر ہوا اسکا رنگ نیلا تھا اور اسکو قبۂ زرقا کہتے تھے ۱۰۱۰ ہجری میں جب شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جذب القلوب تالیف کی تو اس وقت اس کا رنگ سبز تھا۔ پھر نیلا کیا گیا جو غالباً تیرہویں صدی کے وسط تک رہا چنانچہ جعفر برزنجی کہتے ہیں کہ سلطان محمود خان کے زمانہ میں ۱۲۵۳ ہجری میں اسکو سبز رنگا گیا اور اسکے بعد سے اب تک مسلسل اس کا رنگ سبز چلا آرہا ہے۔ ۱۲۸۹ ہجری میں جب مدھم پڑ گیا تو سلطان عبدالعزیز خان[2] کے حکم سے پھر سبز رنگ پھیر گیا۔ مدینہ والوں سے مجھے معلوم ہوا کہ موجودہ رنگ سے پچیس سال قبل ۱۳۲۰ ہجری میں ہوا تھا میں نے ۱۳۴۵ میں دیکھا کہ رنگ بالکل دھیما پڑ گیا ہے اس میں کئی قسم کی تازگی اور شگفتگی باقی نہیں رہی ہے تو تے (طوطے) کے سبز کا رنگ ہے جس میں چمک نہیں اور بجائے روغنی رنگ کے محض آبی رنگ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا سنہری کلس بھی اس قابل ہوگیا ہے کہ اس پر بھی جلا کر دی جائے یہ صرف اس لئے عرض کرتا ہوں کہ دنیا داروں و ظاہر بین اصحاب کی آنکھوں میں بھلا معلوم ہو۔ ورنہ یہ ہلال اور یہ کلس اس قسم کی چمک جھلک اور ملمع کاری سے مبرا ہے اس کی چمک پیتل پنی کی سی چمک نہیں ہے یہ ان تجلیات کا مطلع ہے جن سے زمین و آسمان منور ہو رہے ہیں۔ میں نے سچ کہا ہے اور خوب کہا ہے ؎

نذر چڑھاؤ پیہ ہے شراب طہور کی — مئے نوش لا رہے ہیں خمر دور دور کی
کیا دیکھے کوئی روشنی اب شمع طور کی — جھڑیاں لگی ہوئی ہیں مدینہ کے نور کی

چھٹکی ہلال گنبد خضرا کی چاندنی ؛
پھیکی پڑے نہ کیوں مہ بیضا کی چاندنی[3]

---

[1] یہ دروازہ تخمیناً پانچ فٹ اونچا ڈیڑھ فٹ چوڑا ہے جو جالی کے وسط میں نصب ہے اسکے کواڑ بھی کٹی ہوئی برنجی جالی کے ہیں جنکے ایک پٹ پر چاند کے ڈھلے ہوئے حروف میں بخط طغرے لا الٰہ الا اللہ الملک الحق المبین اور دوسرے پٹ پر محمد الرسول اللہ الصادق الوعد الیقین لکھا ہوا ہے اس دروازے کے قریب ہی طاقچہ نبی یعنی مواجہ شریفہ ہے جہاں زائرین کھڑے ہو کر سلام عرض کرتے ہیں

[2] سلطان عبدالعزیز خان کا عہد حکومت ۱۲۷۷ سے ۱۲۹۳ تک ہے۔

[3] یہ اس فقیر کی نظم مدینے کی چاندنی کا پھلا بند ہے۔

سید سمہودی نے اس قبے کی بلندی تحریر نہیں کی اور جعفر بندنجی بھی ساکت ہیں۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حجرۂ شریف کی چھت یعنی قبۂ صغیرہ سے کوئی دو گز اونچی مسجد نبوی کی چھت ہے اس سے کوئی بارہ گز اونچا یہ قبہ ہے۔ قبۂ صغیرہ کی بلندی سید سمہودی نے کوئی نو گز تحریر کی ہے۔ اس پیمایش اور میرے حساب سے گنبد خضرا کی بلندی زمین سے تیئیس ۲۳ چوبیس ۲۴ گز ہے۔ اس پر چت یا سیسے کے پترے منڈھے ہوئے ہیں جن کی شکنیں اور جوڑ ہر طرف سے بخوبی نظر آتے ہیں۔

گنبد خضرا مدینے کے مختلف محلوں سے اور بعض مقامات پر کئی کئی کوس سے دکھائی دیتا ہے۔ جب حاجیوں کا قافلہ منزل بیر علی[1] پہنچتا ہے جو مدینہ سے دو ڈھائی کوس ہے تو یہ سبز گنبد مشتاقانِ جمالِ احمدی کے زخمِ فرقت ہرے کر دیتا ہے۔ اس کو دیکھ کر شیفتگانِ دیدارِ محمدی کی آتشِ شوق بھڑک اٹھتی ہے۔ یہی وہ موقع ہے جس کی تصویر اس گنہگار نے ان اشعار میں کھینچی ہے۔

۵

قافلے والو! اٹھو وقتِ سحر ہونے لگا ❊ اب ہوائے باغِ یثرب کا اثر ہونے لگا
اب یہ وقت آیا کہ اونٹوں پر ہوا رہنا حرام
حاجیو! اترو کہ روضہ جلوہ گر ہونے لگا

---

[1] بیر کنوئیں کو کہتے ہیں۔ یہاں علی نامی کسی شخص کے کنویں ہیں۔ جن سے زراعت ہوتی ہے۔ دیکھو ص ۱۳۴۵ ہجری میں جب کہ گرمی کا سخت موسم تھا۔ بیر علی کے آس پاس خربوزے تربوزوں کے کھیت میں نے دیکھے تھے۔ حاجی یہاں پڑاؤ کرتے ہیں۔ پانی لینے ہیں اور یہاں کے پہاڑوں پر چڑھ کر گنبد خضرا کی زیارت سے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھاتے ہیں۔

عشق

از جناب شیخ عبدالقادر صاحب فاؔ

ہے کری دل ہنگامۂ سر اک جوشش جنوں اک درد جگر
آنکھوں کی ہوس اور لب کی تمنا یوم جنوں کی شام و سحر
جس کو نہ لگی ہو باس تیری وہ کونسا ہے دنیا میں بشر
تو جس میں نہیں ہے کون وہ سر تو جس میں نہیں ہے کون وہ سر

"ہنگامۂ چشمک"

(تاتار کا ایک واقعہ)

(از جناب شبیر حسن صاحب قیس رضوی متعلم چادر گھاٹ ہائی اسکول)

عزیزہ کے مافوق التعریف سحر پاش حسن کے متعلق جو نان بائی کے متعدد بیانات سے ظاہر ہوا ہے۔ ان سب کو یقین و اثق کر کے نظر تعمق ڈالے تو ہر کوئی اس انصرام پہ پہنچ جائیگا کہ ہمالیہ کی ہیلن کا شہرۂ آفاق حسن اس کے سامنے دھندلا ہے لہٰذا ان تمام بیانات کو پس پردہ ڈالیں کیونکہ ان کو لکھے کئی صدیاں گزر گئیں۔ اور موجودہ نوجوان شاعر منصور الحفیظ کے خط کو جو اپنے ہمعصر شاعر کو عزیزہ کے جادو بھرے حسن کے متعلق تحریر کیا ہے غور سے دیکھیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"اللہ کی تمام مخلوق کشور مخلوق میں اتنی مہ جبیں دوشیزہ پیدا نہیں ہوئی جو اس کے قدموں کی خاک کا بھی مقابلہ کر سکتی"۔

"بلحاظ پوشش وہ سنہری روپہلی پوشاک سے مزین تھی"۔ "اسکا غنچۂ دہن بہار کی طرح کھلکھلاتا"۔ "وہ مجسم شیراز کی چنبیلی تھی"۔ "اور گانے میں بلبل شیراز" "مخلوط شدہ صندل اور مشک کی طرح اس کا پیکر نازنیں معطر تھا"۔

گو آج اس پر اثر خط کو لکھے ہوئے عرصہ ہوا۔ لیکن اب بھی صفحۂ قرطاس کی زینت بنتا ہے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ نقاب پوش عزیزہ موسم گرما میں ایک دوپہر کو سمرقند کی پیچیدہ تاریک گلیوں میں پھر رہی تھی۔ نقاب کے مہین تاروں میں سے اس کا سفید رنگ اس کے انار کے سے یاقوتِ خام کا صنایا پاش حسن چھن چھن کر نکل رہا تھا۔ نوجوان جوش جوانی میں مست محو خرام تھے۔ انہوں نے اس پر ترچھی نظر ڈالی۔ جھلکِ حسن سے بجلی کوند گئی۔ انہوں نے صافہ کو درست کیا۔ مونچھوں کو خوبصورتی سے تاؤ دیا۔ اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ سن رسیدہ لوگوں نے جوانوں پر نگاہِ رشک ڈالتے ہوئے ایک آہِ سرد بھری کیونکہ ان کی جوانی کی امنگیں اور ولولے دب چکے تھے۔

"چھن! چھنن! چھن" کی آواز جو راہ گیروں کو چونکا دیتی تھی۔ عزیزہ کے چاندی کے پازیبوں میں سے نکل رہی تھی۔ جو اس کے عریاں احمری پیروں میں تھے۔ اس کی متناسب

کے ہر قدم پر اس کی ایڑی نیلی سلیپروں پہ سے اُٹھتی۔ اور سلیپر ایک پرند کی آغازِ پرواز کے مانند پھٹ پھٹاتے۔

"چھن! چھن! چھن!" وہ بازار کے جنگلوں کے نیچے سے گزری جنمیں سے سورج کی کرنیں چھن کر تانبے کے ظرف، مٹی کے برتنوں، دمشق کے اسلاح، زیورات، عطر کی بوتلوں، ریشم اور کمخواب پر پڑ رہی تھیں۔

لیکن عزیزہ ان سب سے قطعاً مستغنی تھی وہ ان کو دیکھنے نہیں آئی تھی۔ بلکہ خود کو دکھلانے وہ ایک بُت تھی قابلِ پرستش۔ کیونکہ وہ سولہ سالہ بعبتِ حسن تھی سراپا ناز۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ گذشتہ شب وہ اپنی دادی کے پاس بیٹھی تھی کہ اس نے مکان کے بالائی حصہ پہ سے ایک خوش آیند مسحور کن زمزمۂ محبت سُنا ــــــ جو پُرسکوت فضا کو توڑتا ہوا ارتفاع کی جانب بڑھا۔ یہاں تک کہ انجم بوس ہو گیا۔ یہ گیت تھا درد اور تمنا سے مملو ــــــ کیا یہ گیت اس کے لئے گایا گیا تھا؟ اگر نہیں تو پھر کس کے لئے؟ اور مغنی کون؟ وہ کہاں؟ اور اس سے کس قدر فاصلہ تفاوت؟ ــ

وہ متبسم ہوئی۔ جس پر اُس کی دادی نے غصّہ سے سر ہلاتے ہوئے ڈانٹا اور کہا "اے معجم بجیائی کی پُتلی۔ میری عزت کی قسم یہ نرالا ڈھنگ ہے کہ ..... پر ہنسے۔

"میں چاند کو دیکھ کر ہنسی"۔ عزیزہ نے جواب دیا۔

"ہاں ایک چاند مصطفےٰ یا احمد۔ ایک چاند جس کی بے ڈھنگی الجھی ہوئی ڈاڑھی ہے۔ ہاں ایک چاند جو سراسر کمینہ ہے محبت کا گیت گاتا ہے۔ واہ خوب!" اور بوڑھی نے ایک زور سی طمانچہ مارا۔

(۲)

اُس دوپہر کو جب کہ اُس کی دادی باہر کچھ خریداری میں مشغول تھی۔ عزیزہ چپکے سے باہر نکلی تاکہ سیر کرے۔

وہ ریشم والوں کی دوکان تک پہونچ گئی۔ دو طرفہ درختوں کی قطار کا اختتام ایک سخت پتھر اور سنگِ مرمر کی چٹان کی طرح معلوم ہوتا تھا جہاں تاتار کے خانِ اعظم کا محل تھا۔ خان اعظم یعنی ناصرالدین، نادر خان، قلی خان، منگولیا کا بادشاہ، روس کا شہنشاہِ اعظم، خدا کا دائمی فاتح شیر، اور مذہب کا جان نثار،

ہمیں یہ بتلا دینا چاہیے کہ نو ماہ قبل یہ درخشاں ستارہ مشرقی ممالک پر ایک سیل بے پناہ کی طرح اُمنڈا تھا۔ تاتاری شمشیر کو کوندا تا۔ لڑائی کا نقارہ گرجا تا۔ شاہِ چین کے حصنِ حصین بجلی

کی طرح گرا۔ اور اُس دولعزم فاتح نے اس کو حلقہ بگوش کرلیا۔

دندانہ دار فصیل کے نیچے دو طرفہ سڑک ہے۔ اس لئے عزیزہ حیران تھی کہ کونسا راستہ اختیار کرے کہ بائیں جانب سے ایک نازک اندام خوش رو جوان گزرا جس کے سر پر تیل کا مٹکا تھا۔ اور دائیں جانب سے ایک نوجوان جسکے سر پر میوے کی ٹوکری تھی۔

وہ آپس میں تپاک سے ملے۔

"تجھ پر خدا کا سایہ قایم رہے"۔ تیل والے نے کہا۔

"تجھ پر بھی خدا کی رحمت ہو"۔ میوہ فروش نے کہا۔

وہ اپنی اپنی راہ لینے ہی والے تھے کہ ——— ہوا کے جھونکے سے یا اُس کی نازک گوری ننگی سے نقاب سرکی ——— کیا یہ ہوا کے ذروں کی غلطی تھی۔ یا خود اُسی کے خیال کی۔ اس کی پلکیں تیتری کی طرح پھڑائیں ——— ایک مدہوش کن چمک سے"۔

خدا معلوم اس کی آنکھ دائیں جانب پڑی یا بائیں جانب جھکی۔ اگر وہ خود جانتی ہوتی جو کہ قابل بحث امر ہے لیکن عزیزہ کو کوئی موقع نہ ملا کہ تصفیہ کرتی کیونکہ ———

"اے میری غزالہ میں تیرے قدموں پر ہوں"۔ تیل والے نے کہا۔

"اے مسرت کے چاند میری جبیں ناصیہ فرسائی کی مشتاق ہے"۔ میوہ فروش نے کہا۔

یکے بعد دیگرے آرزو ظاہر کرتا۔ وہ بناز و ادب بلا تعین اپنے سر کا بوجھ سنبھالے یکے بعد دیگرے جھکتے ہوئے قریب سے قریب تر ہو گئے۔ وہ غافل تھے کیونکہ جادو حسن ان پر مستول تھا اور وہ شراب محبت کے متوالے بنے ہوئے تھے۔ وہ ملحق بھی ہو گئے۔ انہیں تن من کا ہوش نہ تھا ——— وہ ٹکرائے ——— بھڑ" سے تیل کا مٹکا گرا اور تیل بہہ گیا۔ "پھٹ" سے میوہ کی ٹوکری گری اور انگور و سنترے خاک آلود ہو گئے۔؟

"تم نے یہ کیا کیا۔ دیکھو تم کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا"۔

"نہیں تم ہی کو ہرجہ دینا پڑیگا۔ تمہیں کیا حق تھا کہ اس کے سامنے جھکو"۔

گالی گلوچ تجاوز کر گئے۔

"دُور ہو دوشیزہ کا اشارہ میری طرف تھا"۔ تیل والے نے کہا۔

"ہشت کیا گلاب کی نوشگفتہ کلی ایک بندر کے حوالے کیجائے۔ اس نے مجھ سے فقط مجھ سے

آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ صرف مجھ سے آنکھ ملی۔ میٹھے میٹھے پن سے اس نے نگاہ محبت مجھ پر ڈالی۔"

"اے جھوٹے کتے۔ کتے کا دل رکھنے والے!"

"اے جھوٹوں کے باپ۔ ڈاڑھی کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے۔" اس طرح گفتگو میں آگ بھڑک اٹھی۔

پھر خنجروں سے بات ہوئی۔ عزیزہ خوف زدہ ہو کر بھاگی۔ اس نے آخری وقت ایک کے جسم سے خون کا دریا ابلتے دیکھا ـــــ ایک پُر درد آواز سنی ـــــ ایک غصہ کی چیخ اس کے کان تک آئی یہاں تک کہ ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ تیل والوں کا گروہ ایک طرف۔ اور میوہ والوں کا دوسری جانب علیحدہ ہوا۔ اور آتش مخالفت بھڑک اٹھی۔ دوکانیں منہدم کر دی گئیں۔ ریشم اور کمبل بیچنے والوں نے بھی اس خانہ جنگی میں حصہ لیا۔ کیونکہ بخاراتِ تلب کے نکالنے اور آہنہ نخلتوں و عداوت کے مرکافات کا غنیمت موقع تھا۔

ایک کمبل والے کی جھونپڑی لیمپ کے گرنے سے جل گئی۔ اور شعلے چاروں طرف دوڑنے لگے۔ یہاں تک کہ محافظان آگ پہونچ گئے۔ دونوں گروہ بازار کے سامنے آئے۔ اور چلانے لگے "مدد کرو! مدد کرو۔ بادشاہ کا مال برباد ہو رہا ہے۔" کمبل فروشوں نے نہایت تضرع سے محافظان آگ سے التجا کی۔

اس احاطہ کے جنوب میں کیزل تاتار کے شہزادہ کا محل تھا۔ اور اس کے شمال میں اس کے بھتیجے اور عدو جانی کیگیز کے شہزادہ کا قصر واقع تھا۔ اس زمانہ میں جبکہ خان اعظم یورشین اوقوحات کرتا پھرتا یا نظام حکومت کے درستی کے لئے دورہ کرتا تو ہر ایک شیرازی شراب سے مست ہو کر خواب غفلت میں ڈوب جاتا۔ اور امور سلطنت بالائے طاق کر کے محفل عشرت منعقد کی جاتی۔"

سمرقند میں جب یہ باہمی فساد برپا تھا۔ وہ حکومت گیری کے لئے یورشین کر رہا تھا۔

دونوں شہزادے بے آزادی میں مخمور اس فتنہ سے بالکل بے خبر تھے۔

"ہمیں مدد دو ـــــ فوراً مدد کرو۔" ریشم والوں نے خضوع و خشوع سے افسران آگ سے التجا کی۔

"ہم ساڑھے پانچسو طومان دینے کے لئے تیار ہیں" کمبل اور ریشم والوں نے کہا۔ محافظان آگ کے شرقی دستے نے بیحد پس و پیش کے بعد منظور کیا۔ لیکن مغربی دستے کے افسر نے اس سے کہا۔

"نہیں یہ رقم بہت کم ہے۔"

"کیا تم ہمیں برباد کروگے اے داغدار ماں کے لڑکے؟"

"چپ رہ اے قصائی" دوسرے نے کہا۔ یہاں تک کہ محافظانِ آگ آپسمیں لڑنے لگے۔ تمام مکانات آگ سے جل کر خاکستر ہوگئے۔ ایک مسجد جل گئی۔ تمام آسمان دھواں دھار بنا ہوا تھا۔ اور قیر کا غازہ تھا۔ شعلے آتشین موت کے فرشتے بنکر آغوش پھیلائے بلند سے بلند تر ہوتے گئے۔ اور جو چیز سامنے آتی فنا کرتے جاتے۔ اب شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ کیونکہ کوئی انکو فروکرنیوالا نہ تھا۔ اور ہر ایک کو نفسا نفسی کی پڑی تھی۔

عزیزہ۔ گلی کے ایک تنگ و تاریک گوشہ میں چھپی ہوئی تمام ماجرا دیکھ رہی تھی جو صرف ایک "حسن کی جھلک" سے وقوع پذیر ہوا تھا۔ وہ خوف زدہ اور لرزہ براندام تھی۔

وہ بہت زیادہ حیران اس لئے تھی کہ اس کے گھر کا راستہ مسدود تھا۔ اور اسے خوف تھا کہ اس کی دادی کیا کہیگی۔ وہ ذرا پیچھے ہٹی "سن" سے ایک پتھر اس کے کان پر سے نکلگیا۔ اور اس کے پیر تلے زمین نکل گئی اس اثنا میں سنگ باری سے لڑائی ہو رہی تھی۔

ایک پتھر نہایت زور سے اڑکر کیزل کے شہزادہ کو لگا جو اپنی نوجوان بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اس کا جبڑا پھٹ گیا۔ اس نے غصہ سے اسلاح لئے اور اپنی فوج کو جمع کرکے لڑائی کے لئے تیار ہوگیا۔ اسے یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ فساد کیگر کے شہزادے کا برپا کیا ہوا ہے۔ وہ سب گلی میں آئے اور کئی کو جانوروں کی طرح قتل کرتے ہوئے شہزادہ کے محل کی جانب چلے لیکن چوکیدار نے پہلے ہی اطلاع دیدی تھی۔ اسطرح دونوں شہزادے آپسمیں لڑنے لگے۔

(۳)

اِس اثنا میں سورج اپنے جلوے دکھاتا ہوا آغوش مغرب میں نہاں ہوچکا تھا۔ اور شام ہو چلی تھی۔ عزیزہ ایک تاریک حصہ میں سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ گو اسکا خوف کم ہوچکا تھا تاہم وہ بھوک سے خستہ حال تھی۔ اور اپنی عیب جُو دادی کے دیدار کی مشتاق۔

یہ عجیب بات تھی کہ باوجود اس جنگ و فساد برپا ہونے کے وہ بالکل بے اعتنا تھی جو ایک عورت کی خصلت ہے کہ آنکھ لڑائی۔ ایک کو اپنے دام میں کھینچا۔ اور دوسرے رقیب سے لڑائی چھڑوائی۔ اسے صرف یہی خیال تھا کہ کیطرح گھر پہنچ جائے۔ لیکن راستہ کی طرف سے مجبور تھی۔ وہ اطمینان سے بیٹھی رہی۔ کیونکہ اس کا حسن پاسبانی کر رہا تھا۔ بگناہی دل کو ڈھارس دے رہی تھی۔ اور جوانی سو رہی تھی۔

تمام کوچہ میں تاریکی مسلط تھی۔ کیونکہ نوشگفتہ فساد نے کسی کو اتنا بھی موقع نہ دیا کہ کوچہ کی قندیلیں روشن کرتا۔ صرف شعلے بعض وقت بلند ہو ہو کر تاریکی کو دور کرتے۔

شعلے اور پھیلنے لگے۔ ایک مسجد جل گئی۔

"اے خدا جانوں کو بچانے والے مولا! مجھے بچا"۔ عزیزہ نے گلوگیر آواز سے گڑگڑا کر دعا کی وہ اب زیادہ ہراساں تھی۔ اس لئے کہ فلک بوس شعلے اُسے مصور کر رہے تھے، وہ دوزانو بیٹھی تھی اور اشک جاری تھے

(۴)

خانِ اعظم، ایک شاندار فاتح کی طرح، فتح و ظفر کا ڈنکہ بجواتا شہر کے ماحول میں پہنچ چکا تھا۔ اور وہیں خیمہ زن ہوا۔ لیکن وہ اس بدامنی سے مطلق بے خبر تھا۔ کیونکہ مسرت میں چور جوانی کی اُمنگوں میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اس کی فوج مالا مال تھی۔ گذشتہ جنگ میں اُسے بیش بہا جواہرات۔ سونا۔ چاندی بے حد ہاتھ آیا تھا۔

اس نے دل میں منصوبہ کیا کہ سمرقند پہنچ کر ایک یادگار قایم کرے۔ تاکہ تمام دنیا میں اس زبردست شاندار فتح کی یادگار باقی رہے۔ جس سے اس کا نام صفحۂ ہستی پر روشن رہے۔

لیکن جب اُس نے اپنے شہر کو دُھوئیں دار شعلوں کی آغوش میں دیکھا اور شور و غوغا سنا تو اس کے قلب کو ایک ٹھیس لگی۔ ایک قلبی صدمہ ہوا۔ اس نے فوراً سردار کو طلب کیا۔ اور پوچھا "یہ کیا ہنگامہ بپا ہے۔ کہیں افغان پھر آ تو نہیں گئے"۔

"نہیں ایلچی کے آنے پہ معلوم ہوگا۔ اسمیں شک ہے۔ ضرور شک ہے"۔ مگر وہ ہنسا "لیکن یہ ضرب المثل کہیں صادق نہ ہو"۔

"کونسی" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "بجھوائے :۔ بلی باہر گئی۔ چوہے آزاد ہوئے۔ خان نے گھوڑے کو ایڑ ماری اور فوج کو شہر کے اندر لانے کا حکم دیکر گھوڑا اُڑایا اور قلب بلدہ میں پہنچ گیا۔ فوج کی وجہ سے تمام سمرقند میں امن ہوا۔ آگ بجھائی گئی اور فسادی گرفتار کر لئے گئے جس میں عزیزہ اس کی دادی اور وہ دونوں جن ان بھی تھے جن کی وجہ سے اس قدر خون ریزی ہوئی تھی

(۵)

بارہ گھنٹے کے بعد دربار منعقد ہوا۔ خانِ اعظم زرنگار تخت پر جلوہ آرا ہوا۔ اس نے طائرانہ فسادیوں کے مجمع پر نظر ڈالی۔ جسمیں عزیزہ بھی تھی۔ اس کے دونوں طرف سپاہی تھے بائیں پہلو والے نے کہا "خدا کی قسم تیری وجہ سے اتنے خون ہوئے تیرے گلے پہ خنجر کی دھار

ہوگی۔"

دائیں بازو اس کی داوی تھی۔ اس نے کہا "نا فرمانبردار بچوں کا مکافات عمل ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔" اس کے آنسو آگئے۔ اور پھر کہنے لگی "آہ! آہ میں کیسے اپنی زندگی بسر کروں گی جب تو آغوش لحد کے تاریک ترین گڈھے میں دائمی نیند لیتی ہوگی۔

لیکن عزیزہ نے کن کی باتوں پر توجہ ملتفت نہ کی وہ گنہگار نہ تھی بلکہ قطعاً معصوم۔ وہ بے قصور تھی۔ اس لئے وہ ساکت اور مستحکم تھی اور موت سے بے خوف۔

نقاب کے سنجاف میں سے اس نے اپنے بادشاہ کو غور سے دیکھا۔ اور اسنے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ خوش رُو جوان ہے۔

خان فیصلہ سنانے کے لئے تیار ہوا۔

اُس نے ڈاکوؤں کو (جو اس فتنہ میں آملے تھے) قتل کا حکم دیا۔ مگر اس کے ذہن میں ایک خیال راسخ ہوا۔ اُس نے سوچا۔

"مرا ہوا چور کس کام کا۔ لیکن ایک زندہ چور.....؟ وہ ہنسا تیمر قند کے مشہور ڈاکو ہو۔ میں تم لوگوں کو محصول وصول کرنے کیلئے معین کرتا ہوں۔ سو اگر تمہیں وقت بے وقت روپیہ کی مدد دیا کریں گے اس طرح سلطنت محفوظ رہیگی۔

اس نے سوداگروں کو ہلکے دُروں کی سزا دی جو بالکل معمولی تھی۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اور پھر حمال و فروُر پیشہ وروں سے کہا "تم نے اپنی بہادری کا ثبوت دیا۔ میں آیندہ سال ہندوستان پر حملہ کرنیوالا ہوں۔ میں تمہیں اے جنگجو رعایا جنگ کی صفِ اوّلین میں رکھونگا اگر مر گئے تو شہید کہلاؤ گے اور زندہ رہے تو غازی۔ دیکھو تمہارے لئے بہشت کے دروازے کھلے ہیں۔" اس نے اسیطرح محافظان آگ کو فوج میں داخل کر لیا۔ اور سوداگروں کو حکم دیا کہ وہ خود فوری آگ بجھانیکا نظام قایم کریں۔

پھر وہ شہزادوں کی طرف رجوع ہوا "میں نے تمہیں وظیفہ دیا تھا تاکہ چین سے زندگی بسر کرو۔ لیکن یہ ایک معجزہ ہے کہ تمہاری جوانی عود کر آئی۔ اور تم اسیطرح بشاش ہو۔"

اس نے کیتل باشی کے شہزادہ سے کہا "مغربی سرحد کی حفاظت تمہارے سپرد کیجاتی ہے۔ تاکہ ترکمانوں کے حملہ کا سدباب کر سکو۔"

اس نے کیگیز کے شہزادہ سے مخاطب ہو کر کہا "شرقی سرحد تمہارے سپرد ہے تاکہ منگول کا تدارک کر سکو۔"

امداد باہمی

از جناب صفی اورنگ آبادی

انجمن امداد باہمی ملکۂ نظم جمعیت صرف خاص مبارک کے سالانہ جلسہ بابتہ ۱۳۳۷ف کے لئے یہ نظم لکھی گئی تھی، حسن اتفاق سے مجلۂ مکتبہ بھی انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ کا آرگن ہے اور یہ نظم اس کے حسب حال (مجلۂ مکتبہ)

جیتے جی بھی ہوتے ہیں انسان پر لاکھوں عذاب
کیا بتاؤں اُن کی گنتی کیا کروں اُن کا حساب

ایک اُن میں قرض وہ بھی قرضِ سودی کی بلا
جس کو یہ لپٹی ہوا پھر اُس کا گھر کا گھر خراب

پہلے تو یہ ہے کہ قرض آسان بھی ملتا نہیں
بے توسط کون ساہوجی کی ہاں ہو باریاب

باریابی بھی ہوئی تو چاپلوسی چاہیئے
ہو مہار احبہ زباں پر اور کبھی عالی جناب

اک غرض مند، ایک بے پروا خدا کی شان ہے
ہے کبھی آدھی تسلی اور کبھی پورا جواب

یہ خوشامد، عاجزی جو ہو کسی معشوق کی
عاشقِ ناکام ہو مقصد میں اپنے کامیاب

بیچ والے کا بھی حقِ سعی ہے ٹھیرا ہوا
یوں کما لیتا ہے حسبِ مقدرت وہ بھی ثواب

چیز پر، تنخواہ پر، جاداد پر قرضہ ملا
وہ بھی جس کی تین میں گنتی نہ تیرہ میں حساب

سو میں ستر ہاتھ آئے تو بڑی دولت ملی
کم ہو کیا اب سر کا سودا اور دل کا پیچ و تاب

ایسے پیاسے کی طرح مقروض کی حالت ہوئی
دوڑے جو پانی سمجھ کر اور وہ نکلے سراب

مطمئن ہونے لیا تھا قرض، وہ اک خواب تھا
فکر ادائی کی گلے ڈالی۔ یہ ہے تعبیرِ خواب

جس کے ہیں مقروض اُس کے آگے منھ کھلتا نہیں
گھر میں رہ جاتی ہے ساری شان و شوکت رعب و داب

ہائے کن کن کو کیا او بار نے خوار و ذلیل
لاکھ کے گھر خاک ہیں افلاس کا خانہ خراب

"نام و فتریں پھٹا ہے پانویں" یہ رنگ ہے
ہاتھ خالی اور فتح خاں "جیب خالی اور نواب

مفلسی میں ہے تمنا عیش کی آرام کی
دیکھتے ہیں جھونپڑوں میں رہ کے ہم محلوں کا خواب

یہ ہماری زندگی کی نیم رُخ تصویر ہے

یہ ہماری داستاں کا ایک ہی چھوٹا سا باب

اِس مصیبت میں ہماری رحم دل سرکار نے
کر دیا ہے ایک ایسے محکمے کا فتح باب

یا ہمی امداد جس کا خاص نصب العین ہے
فائدہ جس سے اٹھا سکتا ہے ہر اک شیخ و شباب

اِس کی سالانہ رپورٹیں بھی ہوا کرتی ہیں طبع
اِس کے اغراض و مقاصد کی بھی ملتی ہے کتاب

اِس میں لکھے ہیں قواعد بھی بڑی تفصیل سے
اِس میں تقریریں بھی ہیں حکام کی با آب و تاب

صدر دفتر وہ ہے لیکن پھر ہر اک دفتر میں بھی
اِس کی ایک اک شاخ کھولی ہے زر وی انتساب

چوں کہ اس دفتر میں بھی یہ کام جاری ہو چکا
ہو چکے ہیں جس سے اکثر قرض لے کر فیض یاب

پہلا سالانہ یہ جلسہ اُس کا ہے سنیئے رپورٹ
ہوگا روشن آپ پر کیا ہے خطا کیا ہے صواب

اب یہ دفتر کا ہے دفتر انجمن کی انجمن
یعنے "ہم خرما" سمجھئے آپ اِس کو "ہم ثواب"

میر مجلس اور نائب میر مجلس معتمد
سب یہاں ہیں بے نظیر و بے عدیل و لاجواب

پھر اراکین و محاسب بھی ہیں اِس کے سب امین
جوڑتے ہیں پیسے پیسے پائی پائی کا حساب

صرف ہمدردی سے اک صاحب ہیں قانونی مشیر
ہوں صلے میں ایسی خدمت کے وہ ماجور و مثاب

میں بتاؤں نام کس کا، میں سناؤں کس کا وصف
میں کروں کس کو مخاطب میں کروں کس سے خطاب

نام سے کیا کام سے مطلب ہے دیکھو کام کو
قطرے کو دریا نہ ذرّے کو بناؤ آفتاب

بعض ناموں کی تو گنجایش نہیں اِس بحر میں
اس لئے یہ شجرہ لکھنے سے کیا ہے اجتناب

گر کروں مدح و ثنا تو جتنے انسان اُتنے منھ
جتنے مُنہ ہیں اُتنی باتیں۔ کیا ہے اِس کا سدباب

کیوں دلیلیں پیش کر کے میں رہوں ناحق ذلیل
کیوں جواب اِن کے ادا کر کے بنوں میں لاجواب

پر کہا یہ کوّا بنائیں حرف کی یہ داستاں
اور کیا کیا کچھ کہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

سب سے بہتر اور افضل تو مری دانست میں
وہ دعا مانگوں کہ جو ہو جائے فوراً مستجاب

یا الٰہی! جس کے سائے میں ہمیں ہے زور و شد
ذوقِ بیداری میسّر اور حاصل لطفِ خواب

کون ہے وہ آصفِ سابع رئیس المسلمین
عدل پرور، علم گستر، رحم دل، گردوں جناب

دوست، اولاد، آل اُس کے شاد اور خرّم رہیں
ہر جگہ ہوں کام بخشش و کامگار و کامیاب

رکھ زمیں پر اُس کو یوں سب میں بڑا مالک کرے
سارے سیاروں میں جیسا آسماں پر آفتاب

جذباتِ حبیب

از جناب حبیب رامپوری رکن انجمن ذوقِ ادب

نہ مرتا میں حسینوں پر نہ رسوا کو کو ہوتا
کسی سے دشمنی ہوتی نہ پھر کوئی عدو ہوتا

بہت اپنی دراندازی سے شرمندہ عدو ہوتا
ہمارا اور اُن کا فیصلہ گر رُو برو ہوتا

نہ ہوتی بیقراری دل کو گر تو رو برو ہوتا
نہ اُٹھتا درد پہلو میں اگر ہمدرد تو ہوتا

مرے چاکِ جگر کو دیکھتا اے بخیہ گر تو بھی
اگر تارِ نگاہِ یار سے اس میں رفو ہوتا

حسینانِ جہاں گل چینیاں کرتے تو کیا کرتے
اگر پھولا پھلا اپنا نہالِ آرزو ہوتا

ہمارے وقتیں ہوتا جو ہوتیں ہم سے دو باتیں
تو پھر مجنوں کی وحشت کا نہ شہرہ چار سو ہوتا

اگر مجھ دل جلے کو قتل کر کے دیکھتا قاتل
سیاہی سے تو سے کی بھی سوا کالا لہو ہوتا

تمنائے شہادت مجھکو اب جینے نہیں دیتی
تری تلوار ہوتی اور قاتل یہ گلو ہوتا

گرا کر مجھکو نظروں سے اُٹھایا اعتبار اپنا
جو میری آبرو کرتا تو تو با آبرو ہوتا

تلاشِ ناقہ نہ تھی مجنوں کی وحشت تھی
اُسے وہ ڈھونڈھ لیتا گر خیالِ جستجو ہوتا

عدو بے آگ کے دن رات کیا کیا رشک سے جلتے
حبیب اپنے اگر قابو میں وہ خورشید رُو ہوتا

عید کی تمنا

از جناب ثامن علی صاحب نیساں

پھر نوید وصال یار آئے
دل بیتاب کو قرار آئے

پھر کھلے اپنا غنچۂ خاطر
باغ ارماں میں پھر بہار آئے

پھر گلے اُن سے ہم ملیں نیساں
عید ایسی ہزار بار آئے

تنقید

کلیاتِ وطن | قیمت (عہ) مکتبۂ ابراہیمیہ (۹۴) صفحے، تقطیع ($\frac{۲۰\times۲}{۱۶}$) لکھائی چھپائی عمدہ۔

حضرت سیّد افتخار علی شاہ وطن رحمتہ اللہ علیہ حیدرآباد دکن میں اپنے وقت کے ایک بسا بزرگ سمجھے جاتے تھے، ان کی تصانیف کے مجملہ علم تصوف کی ایک کتاب (سفر و وطن) بڑی مشہور ہے۔ "بستانِ تصوف" کے نام سے دیوانِ وطن کئی مرتبہ چھپ چکا ہے، اب مولوی غلام معین الدین صاحب یوسفی نے بڑی خوش سلیقگی سے مختلف ایڈیشنوں کو سامنے رکھ کر "کلیاتِ وطن" کو مصنفؒ کی تصویر اور مختصر حالات کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کلیاتِ وطن کے شائع ہونے سے پہلے معلوم ہوا تھا کہ مصنفؒ کے باقیات الصالحات ان کی تصانیف کو یکے بعد دیگرے "مجلس سجادگی و جانشینی" کے سلسلے میں شائع کریں گے، لیکن ان حضرات کو اپنی "سجادگی و جانشینی" کے مخمصوں سے فرصت کہاں؟

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

عقیدت مندانِ خاندانِ افتخاریہ کو مولوی غلام معین الدین صاحب یوسفی کا ممنون ہونا چاہیئے کہ موصوف نے موجودہ مذاقِ مطالعہ کو مدنظر رکھ کر اسے شائع کیا ہے جن نسخوں کو سامنے رکھ کر کلیات مرتب کیا گیا ہے۔ اگر ان کی فہرست بقید سنہ و مطبع دیدی جاتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔ دیباچے میں مصنفؒ کے مختصر حالات وغیرہ ہیں، ان میں ہماری معلومات کی حد تک یہ باتیں قابلِ اضافہ معلوم ہوتی ہیں:۔

مصنفؒ کا غالباً فارسی میں حشمتی تخلص تھا جس کی تائید ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

مدتے شد حشمتی خستہ جگر — در ہوائے وصل تو مستانہ تر
از طفیل شافع جن و بشر — کن بریں حشمتی ز رحمت یک نظر

(سفر و وطن صفحہ ۳ مطبع خیر اورنگ آباد ۱۳۰۶ھ) ان کے ایک مرید سید محمود علی عرف سید عبداللہ لقا تھے، جن کا دیوان گلزار مومنین (مایۂ بقا) کے نام سے گلزار ابراہیم پریس حیدرآباد میں چھپ چکا ہے مصنفؒ کو فارسی میں مولوی احمد علی صاحب عصر سے اور اردو میں جعفر علی صاحب نیک سے تلمذ تھا، جناب نیک کی وفات کے بعد شاید حضرت فیض علیہ الرحمہ سے مصنفؒ نے فیض پایا (تذکرۂ نقشِ قلمی)

حضرت فیض کے فیضانِ سخن کا تو کیا پوچھنا جناب عصر و جناب نیک بھی حضرت فیض کے مشہور شاگردوں میں سے تھے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان حضرات کی نظرِ فیض اثر سے یہ کلام نہیں گزرا۔ اور اگر گزرا ہے تو بہت کم، فن شاعری کی پابندیوں اور زبان و بیاں کی ترکیبوں کی جستہ جستہ

مثالیں ملتی ہیں، دراصل ان بزرگ واروں کو شاعری کی رسوم و قیود سے بہت کم تعلق ہوتا ہے وہ اپنے واردات قلبیہ کو مرتب شکل میں تحریر کی طور پر نہایت صداقت کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں اور یہ لفظی الٹ پلٹ میں پڑنا نہیں جانتے، دکن کے ایک اور صوفی بزرگ حضرت آغا محمد داؤد صاحب ابوالعلائی کا دیوان (دفتر رحمت) جب شائع کیا گیا تو حضرت کے نہایت عقیدت مند مرید مولوی عبدالقیوم صاحب وکیل (مرحوم) اپنی تقریظ میں لکھتے ہیں:۔

شعر گوئی کی حالت یہ تھی کہ کبھی ارادتاً شعر نہیں کہا بلکہ کیفیت غالب ہوئی اور اسی غلبہ میں کچھ کلام موزوں فارسی ہویا اردو، بے اختیار نکل آیا۔ حاضرین میں سے کسی نے اس کو لکھ لیا۔ باعتبار فن شاعری کوئی تعلق نہ تھا، اکثر ایسا ہوا کہ اس کیفیت میں اشعار ناموزوں بھی نکلتے تھے۔

لیکن جو محض فن شاعری کے اعتبار سے اس دیوان کو مطالعہ فرمائیں گے، اُن کی سمجھ میں بعض اشعار قطعاً نہ آئیں گے۔ ..... صفحہ ۱۶ و ۱۷ دیوان صحو ..... کلیات وطن کے یہ اشعار

کی فرشتوں سے میں باتیں کیا ہی کیفیت کے ساتھ
گو رہیں بھی مست رکھی یاد اک مخمور کی

نہ تو کعبہ نہ بت خانہ خوش آیا مجھکو
تو نظر آیا جو میں خود نظر آیا مجھکو

شرارت مجھ سے پروانوں نے سیکھی
دئیے کو داغ بھی میں نے دیا ہوں

گلستان شاعری میں خار کی طرح کھٹکیں گے!

حضرت خواجہ میر درد، مرزا مظہر، شاہ گلشن، شاہ نیاز، شاہ تراب، وغیرہ کی بدولت اردو شاعری میں صوفیانہ اسرار و معارف کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔ اس کے سوا بھی اور شعرا کے کلام میں کبھی کبھار تصوف کی چاشنی ملتی ہے لیکن یہ اُن کا قال ہوتا ہے حال نہیں!

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ مرزا سودا کا یہ شعر

پردہ کو تعین کے دردل سے اٹھادے
کھلتا ہے ابھی دم میں طلسمات جہاں کا

کسی نے حضرت خواجہ میر درد کے سامنے پڑھا، آپ پر رقت طاری ہوگئی، پوچھا کس کا شعر ہے؟ معتقدین نے مرزا سودا کی مزاحمتی کے باعث سودا کا نام لیتے ہوئے پہلے تو گھبرائے بعد کو بتانے پر مجبور ہوئے، حضرت خواجہ میر درد اپنے حلقہ کے ساتھ مرزا سودا کے مکان پر گئے، سودا کو معلوم ہوتے ہی وہ گھر سے باہر خواجہ صاحب کو لینے آئے، خواجہ صاحب نے فرمایا ہاں مرزا صاحب!

پردہ کو تعین کے دردل سے اٹھادے
کھلتا ہے ابھی دم میں طلسمات جہاں کا

تعین کے پردہ کو دردِ دل سے کس طرح اٹھایا جائے؟ مرزا سودا کی سٹی گم ہوگئی، خواجہ صاحب کے قدموں

گر پڑے اور کہنے لگے کہ پہلے کے لوگ اس طرح کہتے آئے، میں نے بھی تقلیداً یہ خیال شعر میں ادا کر دیا ہے میں کیا جانوں کہ تعین کے پردہ کو دردِ دل سے کیسے اٹھا دیں!

خواجہ صاحب نے سودا کو نصیحت کی کہ بغیر سوچے سمجھے ایسی باتیں شعروں میں نہ لکھا کرو۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ؎ تصوف برائے سخن گفتن خوب است۔

کلیاتِ ولمن میں "گل و بلبل" "حسن رہ گزر" "عشق سر را ہے" کے خلاف حقایق و معارف کے نکات بیان ہوئے ہیں

کلام سراپا الہام

میں وہ طلسمِ غیب شہادت ہوں اے ولمن
سنتا ہوں نام پر نہیں ملتا نشاں مرا

آپ کو پاتا ہوں جب آپ میں رہتا نہیں
عالمِ ہستی تماشا ہے عدم آباد کا

سمجھی اگر بہت تو "ہمہ اوست" کہتی ہے
خلقت کے ذہن میں یہی عالم خدا ہے کیا؟

تم شخص ہو، میں عکس ہوں، ہیں ایک یا ہیں دو
منہ دیکھو آئینے میں کہ ما و شما ہے کیا؟

آپ سے ہر دم گزر کر آپ کو پاتا ہوں میں
رات دن مجھ کو ولمن میں بھی سفر ہے دور کا

معنوی ایک نہیں، علاف لفظی ہیں بہت
قال کرتے ہیں مگر حال نہیں دم بھر کا

آپ سے جب میں گذرتا ہوں تجھے پاتا ہوں
دیکھتا ہوں تجھی آنکھوں سے تماشا تیرا

کہیں ہوں سورج، کہیں ذرہ، کہیں ہوں دریا، کہیں قطرہ
وفورِ کثرت سے اپنے مجھکو ہوا ہے ملنا محال میرا

پائیں گے ساکنانِ دو عالم کہاں مجھے
ما و شما نہیں ہیں جہاں ہے ولمن مرا

یہ ہے علمِ تصوف کا خلاصہ
محمدؐ نام ہے شانِ خدا کا

نمود اشیاء مرے قدم سے ظہور اسما ہے میرو سے
ہوں بزمِ عالم میں جلوہ آرا میں شان اپنی اپنی بنا بنا کر

لفظ "انا" کہتے ہیں اربابِ معرفت
معلوم ہو جو غور کریں در اکی طرف

ذکر دنیا ہے نہ فکرِ آخرت ہے اے ولمن
اور ہی عالم کی باتیں کر رہے ہیں یا دہم

حق شناسو! حق مری گوئی سے آگاہ ہے
حق ہے گویا حق ہے شنوا حق ہی بینا نہیں

قالب میں جان، جان ہے جانِ جہاں میں
میں ہوں مکاں میں، ہے یہ مکاں لامکاں میں

آپ میں مجھ میں جو نسبت ہے نظر آتی ہے
آئینہ لے کے ذرا آپ منہ اپنا دیکھو

مقامِ وصل میں سوچو تو اللہ ہے نہ بندہ ہے
فقط ایک نام کی ہے قید قطرہ ہے نہ دریا ہے

مرے جی میں ہے پوچھوں رکھ کے قرآں شیخ کے آگے
زباں مطلق نہیں حق کو تو پھر یہ کون گویا ہے؟

امید ہے کہ کلیاتِ ولمن کی ارادت مندانِ افتخاریہ کے حلقہ میں پوری پوری قدر کی جائے گی۔ (ع، ی)

جدید و تازہ کتب اور رسالے

وہ کتابیں جو حال ہی میں ہندوستان میں شائع یا مکتبہ میں آئی ہوئی ہیں

تجارت عرب۔ ناشر پیسہ اخبار لاہور۔ قیمت ۱ر
خوبصورتی اور تندرستی " " عہ ۱۴ر
درازی عمر کے اسرار۔ " " عہ ۱۴ر
آہنی ارادہ " " ۵ر
عمدہ حافظہ کا راز " " ۲ر ۶ر
مطالعہ نفس " " ۲ر ۶ر
مطالعہ باطن " " ۵ر
امریکہ کے کامیاب لوگ " " عہ ۴ر
آئینۂ اسلام " " عہ ۴ر
محبوب الاخلاق " " ۱۰ر
معلم السیاست۔ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۳ر عفا
تاریخ ہند از ازلا چیت رائے انجہانی ۸ر عفا
پولیٹکل اکانومی۔ از مرزا تھیم ایم اے۔ عہ ۱۴ر

عورت کا دل۔ از اختر ضخامت عہ ۴ر
خواب و خیال۔ از پریم چند " عہ ۹ر
تفسیر آیۃ کریمہ مصنفہ امام ابن تیمیہ (الاول) ۱۵ر
سیر المصنفین جلد دوم۔ از تمنا بی اے۔ " للہ
خیالات اورنگ۔ مترجمہ " ۱۰ر
مخزن ظرافت شائع کردہ مرغوب الحق " ۲ر ۳ر
مضامین چکبست۔ شائع کردہ انڈین پریس الہ آباد " ۱۲ر
نہرو رپورٹ اردو۔ مرتبہ نہرو کمیٹی " عہ ۱۴ر
تتمہ " " " ۱۰ر
پردہ۔ مولفہ عبد الحلیم شرر " عہ ۴ر
خاک پروانہ۔ پریم چند " عہ ۴ر
عروج کابل۔ از سید محمود احمد شاہ چشتی " ۱۰ر
فن شاعری۔ " " " ۲ر ۶ر

بیوی کے فرائض۔ از سید محمود شاہ چشتی قیمت ۱ر
آداب مجلس۔ " " " عہ ۴ر
شب زفاف عروس از غلام احمد " عہ ۴ر
ابن مسعود از عظمت علی " عہ ۹ر
بہترین انشا پرداز۔ مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ " عہ ۱۴ر

مشہور رسالوں کے تازہ سالنامے اور خاص نمبر

سالنامہ نیرنگ خیال لاہور قیمت عہ ۱۴ر
" ہمایون " عہ ۴ر
خاص نمبر عالمگیر " عہ ۴ر
سالگرہ نمبر نگار حیدرآباد " ۱۲ر
رسالہ نگار ۱۹۳۲ء کے جلد کا بقیہ حصہ عہ ۴ر
خاص نمبر رسالہ زبان منگوا لیجئے ۱۹۲۷ء " عہ ۴ر

حسب ذیل ماہانہ و ہفتہ وار رسالے اور اخبار مکتبہ ابراہیمیہ سے ملسکتے ہیں

نیرنگ خیال ۵ر کلدار معاول ۵ر ۱ر عثمانیہ نگار ۸ر کلدار ۹ر ۴ر عثمانیہ مخزن ۶ر کلدار ۷ر عثمانیہ نظام گزیٹ ہفتہ وار ۲ر ۶ر
عالمگیر ۵ر کلدار معاول ۵ر ۱۰ر عثمانیہ۔ معارف ۸ر کلدار ۹ر ۴ر عثمانیہ۔ مجلہ مکتبہ ۶ر عثمانیہ۔ عصمت ہفتہ وار ۲ر عصمت
۵ر کلدار ۵ر ۱۰ر عثمانیہ۔ ہمایون ۸ر کلدار ۹ر ۴ر عثمانیہ تجلی ماہی ۱۲ر عثمانیہ۔ سفینہ ماہی (مدراس) عہ ۱۴ر
زمانہ ۸ر کلدار ۹ر ۴ر عثمانیہ۔ مجلہ عثمانیہ ماہی عہ عصمت کا جوبلی نمبر عال کلدار ۱۴ر عثمانیہ تازیانہ ار کلدار ۱۳ر عثمانیہ
طاقت ۲ر کلدار ۶ر ۲ر عثمانیہ

افتخار الحکما نواب جاذق جنگ مرحوم سابق فرسٹ اسسٹنٹ فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت اور بڑی خوشی کے ساتھ محض بیماروں کی شفا کی غرض سے چند سطور پر قلم کرتا ہوں، برص مستحر یعنے کوڑھ اور سفید داغ کا علاج نہایت مشکل ہے۔ یہ مرض عموماً بڑھتا ہی جاتا ہے۔ حکیم مولوی محمد عبدالقادر صاحب مدگا صدر مخزن الادویہ یونانی سرکار عالی دکن دارالتشفی داخمن اطبار یونانی حیدرآباد دکن خصوصاً علاج برص میں یدطولیٰ رکھتے ہیں صاحب موصوف نے اکثر مریضان برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور یہ فضلہ کامیاب ہوئے ہیں نے بچشم خود مریضان برص کا معائنہ کیا ہے۔ بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہوجاتا ہے۔ حسکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور مجرب دوا کا اثر ہے میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے کٹھن مرض کی دوائے مجرب کی ایجاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہیے کہ وہ اس موقع کو غنیمت سمجھکر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور اس مرض منحوس سے فاضل نہ ہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

شرحدستخط (افتخار الحکما جاذق جنگ)

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پُرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہوچکی ہے۔ جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پُراثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہیے استعمال کے ساتھ ہی اپنا بیرقی اثر دکھاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہوجاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل کوتہ۔ درد سر۔ درد کول بچھو کے زہر کیسے زخم پرانے اور جلدی ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال تھوڑی دوا کو ہلکے دن میں تین چار دفعہ مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر جس طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور صاف کریں۔ جو احباب بغرض امتحان دوا طلب فرمائیں بخوشی تعمیل کی جائیگی۔

نوٹ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ دوا کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے۔ اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر جیمس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگذاری حیدرآباد دکن

اُردو زبان کا قدیم و مستند ماہوار رسالہ صرف

زمانہ

ہے جو ملک کے مشہور ادیب منشی دیانرائن نگم صاحب بی۔ اے کی ادارت میں پچیس سال سے متواتر اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ علمی و ادبی مقالات، تحقیقی تنقیدی مضامین، دلکش و سبق آموز افسانے، بہترین نظمیں اور غزلیں۔ علمی خبریں اور نوٹس، غرض ہر قسم کے بہترین مضامین آپ کو صرف "زمانہ" میں مل سکتے ہیں۔ مشاہیر ملک و اہل قلم کے علاوہ آرٹ کی اعلیٰ تصاویر بھی ہمراہ بلالتزام "زمانہ" میں شائع ہوتی ہیں۔ فروری ۱۹۲۸ء میں "زمانہ" کی پچیس سالہ جوبلی کے موقع پر ایک خاص نمبر "جوبلی نمبر" کے نام سے شائع ہو کر قبولیت عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ اگر آپ نے ابھی تک "زمانہ" ملاحظہ نہیں کیا ہے تو آج ہی اس کے خریدار ہو جائیے۔ قیمت سالانہ صرف پانچ روپیہ ششماہی (سلیے) روپیہ۔ فی پرچہ ۸ر مقرر ہے۔

منیجر رسالہ "زمانہ"، کانپور

قابل قدر و لائق مطالعہ کتابیں

پریم پچیسی۔ اُردو کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند بی۔ اے کے دلکش قصوں کا مجموعہ ہے۔ زبان کی سلاست و لطافت قابل دید ہے قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم ۱۲ر

خاک پروانہ۔ یہ بھی پریم چند صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے اس میں چودہ منتخب جدید افسانے ہیں ہر افسانہ واقعات کی ہو بہو تصویر اور نفسیات انسانی کی بے مثل تمثیل ہے۔ قیمت عہ روپیہ

خیالات عزیز۔ مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔ اے۔ کے دلکش و سبق آموز مضامین کا مجموعہ جو باقاعدہ رجسٹری شدہ ہے۔ اور ہمارے علاوہ کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتا۔ قیمت عہار روپیہ

سیر المصنفین (حصہ اول) اُردو نثر نگاروں کا تذکرہ۔ از مولوی محمد یحییٰ صاحب بی۔ اے۔ قیمت عہار روپیہ۔

سنسکرت علم ادب۔ سنسکرت کے علم ادب کے متعلق بہترین معلومات کا ذخیرہ۔ قیمت ۴ر

گلکدۂ لسان الہند۔ حضرت عزیز لکھنوی کا منتخب دیوان ہر شعر ندرت تخیل و جذبۂ دل کا صحیح نمونہ ہے۔ قیمت عہ روپیہ

اثر ستان۔ خان صاحب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے اُردو کلام کا مجموعہ قابل دید ہے۔ قیمت عہ روپیہ۔

سرمایۂ تسکین۔ حضرت تسکین سورنوی کی منظومات و غزلیات کا مجموعہ۔ قیمت عہ روپیہ

کاس الکرام۔ یعنی شرح رباعیات عمر خیام از میر ولی اللہ صاحب قیمت عہر روپیہ

لسان الغیب۔ اُردو میں دیوان حافظ کی بہترین شرح از میر ولی اللہ صاحب قیمت ہر دو حصے (للہ) روپیہ

منیجر زمانہ بک ایجنسی۔ کانپور

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اردو مولفہ مولوی مصباح الدین احمد صاحب بی اے فاضل جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی دور آصف جاہی دور ان میں اردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اردو کا تذکرہ معہ نمونہ کلام ضخامت ۱۸۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20}{30}$ کاغذ چکنا بارہ دم قیمت عمدہ

جہانِ اردو مرتبہ جناب محمد عارف صاحب جدہ آبادی ہندوستان کے ممتاز اہل قلم و دانشور اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20}{30}$ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عمدہ جلد

روحِ تنقید مصنفہ مولوی ابو السعادات سید غلام محی الدین قادری نور ایم اے۔ فن تنقید کے متعلق اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۵ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20}{30}$ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عمدہ بارہ دم

تنقیدی مقالات مصنفہ نور صاحب۔ یہ روحِ تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روحِ تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی فارسی اور اردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کر کے مہولتکا استعمال دکھلایا ہے اور نیز جنس مشہور اردو دانشوروں کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کیے گئے ہیں ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20}{30}$ کاغذ چکنا لکھائی عمدہ مجلد ساڑھے

اردو کے اسالیب بیان مصنفہ نور صاحب۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت۔ ابتدا سے لیکر آخر تک کے نثر نگاروں کے طرز تحریر پر انداز بیان کا تذکرہ۔ خاص طرز تحریر لے اردو دانشوروں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ساڑھے

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ نور رضا سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی و ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲

دنیا کے افسانے مصنفہ مولوی محمد عبد القادر سروری ایم اے۔ ایل ایل بی۔ افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات پر اردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۱۸۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت

مبادی فلسفہ مولفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی۔ ڈاکٹر اے یس راپورٹ پی۔ ایچ۔ ڈی کی برائمر آف فلاسفی کا مفصل اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت

ارباب نثر اردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے فورٹ ولیم کالج کے اردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر کی تاریخ ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عمدہ جلد

آثار الکرام جلد دوم مصنفہ شمس العلماء خان بہادر حکیم سید شمس الدین صاحب ایم اے ایل ایس ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی مستقانہ تاریخ ضخامت ۴۴۰ صفحے۔ سائز $\frac{20}{30}$ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت

جواہر کلیات نظیر منتخب جناب مولانا ذہین و سید فہام احمد نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے اخلاقی۔ ادبی نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۸۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت

عقائد امام مترجمہ مولوی محمد عبد الغفور عابدی صاحب نقہ اکبر کا عام فہم اردو ترجمہ قیمت

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی محمد عبد اللہ مسدوسی بی اے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت

دکنی لغت مولفہ مولوی سید شاراحمد شعار ہاشمی۔ اردوئے قدیم یعنے دکھنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبد الغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحبدل صوفی عالم کے حیرت انگیز حالات ضخامت ۴۸ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت

خزینہ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبد العزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت

سیرت خیر البشر و سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بد خو شوہر کو ٹھیک کر سکتی ہے۔ قیمت

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین منظوم اخلاقی رسالہ قیمت

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکام اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹیفکٹ عطا کئے۔ زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ سرسام۔ مرگی۔ کھانسی۔ دمہ بواسیر۔ خارش۔ سانپ بچھو کے زہر اور ہر قسم کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمائیے ایک بار ضرور آزمائیے۔ پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے شیشی نمبر (۱) عہ، نمبر (۲) ۸ر نمبر (۳) ۴ر ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی۔ پی۔ معاف ہوگا۔

کا پتہ خط اور تار "زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

انتخاب لاجواب لاہور

امریکہ و یورپ کے بیش بہا علمی تجارتی و خانگی معلومات اور سائنس و نیچر کے دنیا بھر کے عجائبات کا اردو زبان میں بنظیر ہفتہ وار مجموعہ اگر آج تک آپ نے نہ دیکھا ہو تو چھ روپیے بھیجکر سال بھر کے لئے جاری کروالیں۔ سالانہ خریداروں کو علاوہ سال بھر پرچہ بہم پہنچانے کے پانچسو صفحہ کی مختلف کتابیں بھی مفت دیجاتی ہیں۔

خط لکھتے وقت اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ منیجر انتخاب لاجواب لاہور۔

"نیرنگ" کا خاص نمبر

مارچ ۱۹۲۹ء میں نہایت آب و تاب سے نظر نواز ہوگا۔ اس میں نہ تو ادب لطیف کی عریانی ہوگی اور نہ اخلاق سوز تصاویر۔ لیکن باوجود اس کے بیحد دلچسپ، بیحد ہوگا۔ تصاویر ہوں گی مگر تصاویر کی تعداد پوری کرنے کے لئے نہیں۔ نہایت متین اور دلکش مضامین نظم و نثر کا عظیم الشان اجتماع اس نمبر میں ملاحظہ کیجئے گا۔ ہمارے گذشتہ خاص نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی کسی خاص اعانتی سکیم کے ماتحت ہوگا۔ اس وقت صرف اس قدر لکھدینا کافی ہے کہ یہ "خاص نمبر" ہوگا اور بس! قیمت عصمر علاوہ محصول۔

(منیجر نیرنگ)

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھوگرافر منیجر مطبع

مجلۂ مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم۔ اے۔ ال ال بی

مجلۂ مکتبہ

۱- یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲- یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳- بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ خریداری اطلاع دی جائے۔

۴- قیمت سالانہ (للہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ) فی پرچہ ۶

۵- اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (ے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے انکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم مقررہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلہ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر، مضامین اور مجلہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلہ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

بمقام دکن شہر پرکار آصفیہ (۶۵)

مجلۂ مکتبہ

بمقام دکن شہر پرکار انگلشیہ (.....)

جلد (۲) بابتہ ماہ فروردی سنہ ۱۳۳۸ف مطابق فبروری سنہ ۱۹۲۹ء شمارہ (۵)

تصویر: مولانا مفتی سید اعظم علی مرحوم شائق حیدرآبادی

فہرست

	مضمون		صفحہ
۱	شذرات	از مدیر	ب
۲	حدیقۃ العالم	" جناب محمد سراج الدین صاحب طالب	۱
۳	جواب دیا (غزل)	" " سید قادر حسین صاحب قادر	۶
۴	عبرانی خط	مترجمہ " مولوی کامل میر مظہر علی صاحب وکیل	۷
۵	ماضی و حال (نظم)	از " عمر عبدالکریم صاحب گل	۱۵
۶	کھیل کی نفسیات	" " محمد مظہر حسین صاحب بی، اے	۱۷
۷	اشارات اعجام پر ایک تفصیلی نظر	" " ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین	۲۱
۸	تاثرات لطیف (نظم)	" " جوش حیدرآبادی	۳۴
۹	کفارہ (افسانہ)	مترجمہ " غلام رسول صاحب (سنٹی کالج)	۳۵
۱۰	غزل	از " شاہ عبدالعزیز صاحب عزیز	۴۵
۱۱	قہرمانیت	" " محمد حمید اللہ صاحب (بی)، اے	۴۶
۱۲	بادۂ دکن (لچھمی نرائن صاحب اورنگ آبادی)		۵۹
۱۳	انتقیدین	"م م" اور "س"	۶۱

مجلۂ مکتبہ

۱- یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲- یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳- بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴- قیمت سالانہ (للہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ) فی پرچہ ۶

۵- اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (ہ) نصف کے لئے (ے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعاتِ مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُنکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلہ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ اُنکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر، مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلہ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

شذرات

ہندی پرچار سبھا نے جنوبی ہند خصوصاً مدراس میں ہندی زبان کے پھیلانے کے جو منظم پروپگنڈے پچھلے دس سال کے اندر کئے ہیں ان پر ایک نظر بازگشت ڈالنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ کوشش خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو اور اتحاد عمل کیسے نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ ایک مہاتما گاندھی کے اشاروں پر جن کی صدارت میں اس سبھا کا آٹھواں سالانہ جلسہ اندور میں ہوا تھا، مدراس کے ہر بڑے چھوٹے، گاؤں اور شہر میں سبھا کی کوئی نہ کوئی شاخ قائم ہوگئی۔ اس کی نشر و اشاعت کی وسعت کا اندازہ اس امر سے کسی قدر ہو سکتا ہے کہ فی الحال ۵۰ مرکز صرف امتحانات کے مقرر ہیں۔ اس سبھا نے اپنا ذاتی مطبع قائم کر لیا ہے۔ اور چالیس کے قریب کتابیں بھی شائع کیں۔ ہزاروں آدمیوں کو زبان سے روشناس کر دیا۔ ہندی زبان کو جامعہ مدراس کے امتحانات میں داخل کروا دیا غرض وہ کچھ کیا جو ایک زبان کی اشاعت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اور یہ تمام صرف اس کے بہی خواہوں کے صحیح ذوق خدمت اور اچھی تنظیم کا نتیجہ ہے۔ کاش اُردو کی اشاعت کیلئے اس کے آدھے جوش ہی سے کام کرنے والا کوئی ادارہ وجود پذیر ہو جاتا۔

آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کا دسواں اجلاس اوائل ماہ میں اس دفعہ حیدرآباد میں لیڈی سر آسمان جاہ کی صدارت سے منعقد ہوا۔ کانفرنس نے اس اجلاس میں جن تجویزات پر غور کیا اور جن کو کامیاب بنانے کی وہ سعی کرے گی، گذشتہ کی نسبت زیادہ ضروری اور عملاً مفید ہیں۔ ان میں سے تجویزات نمبر (۱) نصاب تعلیم میں امور خانہ داری کا لحاظ (۳) زنانہ طبیہ کالج کا قیام (۴) موجودہ طرز معاشرت کی تبدیلی (۶) خواتین میں اشاعت علم کے مخصوص طریقے اختیار کرنے کے متعلق خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

گذشتہ اجلاس کی طرح اس سال بھی ایک اہم تجویز اور اس کی منظوری اس اجلاس کی روح رواں ہے۔ یہ تحریک مسز حکم (کلکتہ) کی طرف سے پیش ہوئی تھی کہ "اس کانفرنس کی رائے میں پردہ ہر مسلمان اور شریف خاتون کے لئے نہایت ضروری اور باعث عزت ہے"

اس رسالے کے ساتھ جو تصویر شائع ہو رہی ہے، وہ اُردو کے مشہور اور ہر دلعزیز شاعر شیدا (مرحوم حیدرآبادی) کی ہے۔ یہ بلدہ کے ایک قابل احترام خاندان مشائخین کرام سے تھے۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کا چسکا تھا اور نہایت پرگو شاعر تھے چنانچہ ان کا کلام ایک کلیات کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ جو تمام اصناف شاعری پر مشتمل اور نہایت ضخیم ہے۔ ان کا کلام عاشقانہ اور صوفیانہ ہے۔ اور اسکا بیشتر حصہ نعتیہ ہے۔ غزلیں، ٹھمریاں، ترجیع بند غرض تمام نعت پر مشتمل ہیں۔

ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی ہر دلعزیزی ہے۔ یہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا ہوا۔ اور عورتوں اور مردوں دونوں کے ورد زباں ہے۔ اس کی بڑی وجہ اس کا مولود خوانوں کا موضوع بننا ہے۔ اس کو رنج کے باعث کہ موقع پر چنیدہ لوگوں کی ایک جماعت خاص خاص لہجوں سے پڑھتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی کلیات کا ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں ملے گا جو کسی محفل مولود خوانی میں اور ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا جا چکا ہو۔

ان کے حالات باوجود کوشش کے فی الحال اس سے زیادہ دستیاب نہ ہو سکے۔ آئندہ جب کبھی فراہم ہو جائیں گے ان سے قارئین کرام کو روشناس کیا جائے گا۔

حدیقۃ العالم

از جناب محمد سراج الدین صاحب طالب

ہمارے مکرم دوست، مولوی محمد سراج الدین صاحب طالب، نواب میر عالم مرحوم دیوان دکن کی "سوانح عمری" لکھ رہے ہیں، تاریخ "حدیقۃ العالم" میر عالم کے نام سے عام طور پر مشہور و معروف ہے۔ چارلس ریو، ہرمن ایتھے نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی ترتیب فہرست کے وقت، اس کی حقیقت پر کسی قدر توجہ کی تھی، اور اس توجہ کا استدلال مسٹر گرانٹ ڈف (مولف تاریخ مرہٹہ) کے مخطوطات پر مبنی تھا، جن لوگوں کی دست رس ان فہرستوں تک ہوتی وہ تو ایک حد تک اس سے واقف ہو جاتے ورنہ محض منقولات اور صفحات کے حوالے دینے والے حضرات عام غلط فہمی کے آج تک شکار نظر آتے ہیں، مولوی سراج الدین صاحب طالب کے پیش نظر، نواب [illegible] کے مشہور کتب خانے کا ایک خاص نسخہ بھی رہا ہے جس کی وجہ سے ریو، اور ایتھے کی تحقیقات پر بھی روشنی پڑتی ہے!

ایک اور کتاب "دو مجلس" (اردو منظوم) بھی میر عالم کے نام سے موسوم ہے جو محکم کی تصنیف ہے۔

(مجلۂ کتبہ)

یہ غفران مآب نظام علی خاں "آصف جاہ ثانی" کے عہد کی ایک تاریخ ہے اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے یا مقالے میں اول دیباچہ کتاب ہے اور اس کے بعد ایک مقدمہ جس میں سلطان قلی قطب شاہ کا سب بیان کیا گیا ہے اور پھر سات ابواب ہیں جن میں علی التسلسل سات قطب شاہی سلاطین کے احوال مندرج ہیں۔ دوسرے مقالے میں اول ایک مختصر دیباچہ ہے جس میں مقالہ کی تقسیم بتائی گئی ہے اور پھر ایک مقدمہ ہے جس میں اُن حکام و صوبہ داروں کا بیان ہے جو سلاطین قطب شاہیہ اور آصفیہ کے مابین منجانب سلطنت مغلیہ صوبۂ دکن پر امور رہے ہیں۔ اس کے بعد کتاب میں چار باب چار سلاطین آصفیہ کے احوال پر مشتمل ہیں دیباچہ میں اس مقالے کے پانچ باب بتائے گئے ہیں لیکن کتاب میں چار ہی مذکور ہیں۔ پانچواں باب جو مغفرت منزل سکندر جاہ کے عہد پر مشتمل ہے اس میں نہیں ہے اس کتاب کی نسبت مشہور ہے کہ ریاست آصفیہ کے مشہور وزیر میر عالم کی تصنیف ہے اور یہی اس کے مطبوعہ نسخہ کے مقالۂ اول کے دیباچہ سے معلوم بھی ہوتا ہے

چنانچہ:- بنائے علی ہذا در مرأت خاطر فاتر اصنف عباد اللہ القوی ابو القاسم بن رضی الدین الموسوی الملقب بہ میر عالم کہ از معتمدان دولت آصفی نژاد و دستبال این بیاست فیروزی بنیاد است بوہ گردید کہ اگر زمانہ اخبار رنگارنگ چمن دولت سلسلۂ علیہ عالیہ آصفیہ ادام اللہ ایام دولتہم را کہ در صحن بساتین کتب متفرقہ گل گل شگفتہ است برشتہ تحریر گلدستہ بندی لائی آبدار مکارم احوال و معالی آثار این خاندان عالی شان شامخ الارکان را کہ در اصداف السنہ دافواہ منتشر افتادہ است ..... /

اور شاید اسی بنا پر یہ کتاب سب سے پہلے سراج الملک کے عہد وزارت میں انہیں کے ایما پر طبع و شائع ہوئی اور قریباً نصف صدی بعد حسب الحکم نواب فخر الملک بہادر مطبع سیدی میں مکرر طبع ہوئی اس کے بعد برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی جو فہرستیں مدون و شائع ہوئیں ان میں اس کے متعلق سب سے پہلے یہ تحقیق پبلک میں پیش کی گئی کہ حدیقۃ العالم میر عالم کی تصنیف نہیں ہے۔ چارلس ریو برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات میں کہتے ہیں کہ حدیقۃ العالم کے قلمی نسخہ (مخزونہ برٹش میوزیم) کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد ابو تراب ابن سید احمد الرضوی اس کے مصنف ہیں جو اپنی کتاب کے دوسرے مقالے کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ پہلے مقالہ کو جسے میر عالم کے نام سے منسوب کیا گیا ہے ختم کرنے کے بعد میں دوسرے مقالے کو شروع کرتا ہوں ریو نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مطبوعہ نسخہ میں میر عالم جہاں اپنا ذکر کرتے ہیں تو اپنے آپ کو اس قلمی نسخہ میں جہاں میر عالم کا ذکر آیا ہے وہاں ان کے نام کے لئے ضمائر واحد غائب استعمال ہوئے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ اس کا لکھنے والا کوئی اور ہے انڈیا آفس کی فہرست کے مرتب ہرمن ایتھے کی تحقیق بھی یہی ہے اس کے علاوہ اس نے اس کتاب کے متعلق یہ نئی معلومات بھی فراہم کی ہے کہ میر ابو تراب بن سید احمد الرضوی اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں کہ میر اکبر علی خاں سکندر جاہ کے حکم پر وہ (میر ابو تراب بن سید احمد) شاہان قطب شاہی کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوئے اور انہوں نے یہ کتاب لکھی اور اس کا نام قطب نمائے عالم رکھا۔ اس کا سن تصنیف ۱۲۱۲ھ ہے جو ۱۸۰۶ء عیسوی کے مطابق ہوتا ہے یہ کتاب بھی ایک مقدمہ اور سات باب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے جو حدیقۃ العالم کے ابواب کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں چارلس اور ایتھے دونوں کا استدلال ان دو کتابوں پر ہے جو مسٹر گرانٹ ڈف (مؤلف تاریخ مرہٹہ) کے پاس تھیں اور یہی نسخے بعد میں ان کے پاس سے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں منتقل ہوئے اس لحاظ سے حدیقہ کے متعلق سب سے پہلے محقق گرانٹ ڈف ٹھیرتے ہیں تحقیق جس کسی نے پہلے پہل کی ہو بہر حال یہ ضرور ہے کہ حدیقۃ العالم خود میر عالم کی تصنیف نہیں ہے۔ اگرچہ کتاب کے تفصیلی مطالعہ سے بعض مقامات پر اس کے خلاف بھی کچھ شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کا تخلیہ ایسے مقامات

کے مطالعہ سے خود بخود ہو جاتا ہے جن کا خود میر عالم کے قلم سے لکھا جانا کسی طرح باور نہیں آتا۔ مثلاً جہاں میر الملک (علی زماں خاں) سے میر عالم کی لڑکی کی نسبت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کے طرز اظہار سے یہ یقین نہیں ہو سکتا کہ میر عالم نے خود اس طرح لکھا اس موقع پر اس عبارت کو نقل کرنا بیجا نہ ہوگا:۔

"چوں خاتون جنت بنت رسول الثقلین ابو القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحکم الٰہی بوساطت جبرئیل امین بسجد صفدر منسوب شد بر طبق آں نور چشمی ابو القاسم سود اوراق کہ از ذریات رسول اکرم است بآں حیدر ابن صفدر بتقدیر سبحانی بموجب حکم بندگان عالی در حین حیات والد ماجدش نواب غیور جنگ (صفدر یار خاں) مرحوم نامزد گردید ...."

اس سے صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے کہ ان تشبیہات کو میر عالم خود اپنے یا اپنی بیٹی اور داماد کے لئے استعمال نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اگرچہ کہ ذریات و اسباط سے ہونے کے باعث وہ مجاز تھے کہ ان کا استعمال کریں لیکن اس کا اظہار اپنے منھ آپ کرنا شخصیت کی حد تک پہنچتا جس کو عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے قطع نظر ہم اس عبارت کو سید محمد میر ابو تراب کی بھی نہیں سمجھ سکتے اس واسطے کہ مصنف کے اصل نسخے میں اس کا کہیں ذکر بھی نہیں ایسے الحاقات پر علٰحدہ روشنی ڈالی جائے گی۔

حدیقۃ العالم کے پہلے مقالے کے دیباچہ میں جہاں مصنف کا نام بتایا گیا ہے وہاں اہمیت بتانے میں صحت نام کا بہت کم خیال رکھا گیا ہے چنانچہ میر عالم کے باپ کا نام جو رضی الدین لکھا گیا ہے کسی تذکرے یا تاریخ میں ہماری نظر سے نہیں گزرا صاحب تحفۃ العالم (سید عبد اللطیف شوستری) جو میر عالم کے حقیقی چچیرے بھائی تھے اور جنہوں نے اپنی کتاب میں اپنے خاندان کے متعلق تفصیلی معلومات جمع کئے ہیں اور اپنے دادا اور ان کے جملہ بیٹوں کے نام علی الترتیب بتائے ہیں کہیں میر عالم کے باپ کا نام رضی الدین نہیں بتاتے اور اُن کے متعلق تو یہ قیاس نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے چچا کا نام بتانے میں غلطی کی جس تذکرے یا جس تاریخ میں ان کے والد کا ذکر آیا ہے سید رضی کے نام سے آیا ہے۔ یہ فارسی زبان کے فاضل اور اچھے شاعر اور اپنے زمانے کے مجتہدین سے تھے اقدس تخلص کرتے تھے اور مشہور مصنف غلام علی آزاد بلگرامی کے ہمعصر تھے خود آزاد نے ان کو سید رضی نام اور اقدس تخلص سے یاد کیا ہے[1]۔ اگر اس کتاب کو خود میر عالم تصنیف کرتے تو اُن سے اپنے والد کا نام بتانے میں ایسی فروگزاشت نہیں ہوتی مصنف کے اصل نسخہ کے مقالۂ دوم کی ایک نقل نواب یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر کے کتب خانۂ علوم مشرقی میں موجود ہے جو نواب ممدوح کے الطاف و عنایات سے ہمارے دیکھنے میں آئی۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ سید محمد میر ابو تراب نے اس کا

---

[1] مجلۂ مکتبہ بہ سرو آزاد صفحہ ۲۲۳۔

مقالۂ اول حسب الحکم میر عالم لکھا اور اس کو ان کے نام سے منسوب کر دیا چنانچہ اس کی عبارت یہ ہے۔

"مخفی نماند کہ اضعف عباد اللہ القوی سید محمد مدعو بہ میر ابو تراب ابن سید احمد الرضوی عاملہما اللہ باللطف الخفی والجلی حسب الحکم واجب الانقیاد عالیجناب سید مکرم معدن احسان و کرم وزیر اعظم حضرت خلیفۂ دوران اسکندر زمان دام ظلہ رحمۃ علی رؤس العالم میر ابو القاسم المخاطب بنواب میر عالم اعلی اللہ مقامہ چون کتاب حدیقۂ عالم متضمن دو مقالہ مقالۂ اولی در ذکر آثار ملوک قطب شاہیہ نور اللہ مراقدہم و مقالۂ ثانیہ در بیان احوال خیر مآل سلسلۂ عالیہ آصفیہ خلد اللہ دولتہم وغیرہ کہ در فہرست این مقالہ مرقوم تالیف و در نام نامی آں وزارت انتساب منسوب گردانیدہ ....."

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے میر عالم کی فرمائش پر یہ تاریخ لکھی اور اس کو ان کے نام سے موسوم کیا لیکن ایتھے کی یہ تحقیق کہ حدیقۃ العالم سکندر جاہ کی فرمائش پر لکھی گئی ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں تک صحیح ہے قلمی نسخۂ مایہ البحث کے دیباچہ کی عبارت بالا کے علاوہ بعد کی اس عبارت سے بھی۔

"امر عالی آں مدار المہام صاحب اختیار ذو الاقتدار دام دورہ اقتدارہ و اختیارہ بذرۂ بیمقدار منسلک در سلک منتسلان دامن دولت خلوص منزلت مؤلف کتاب موسوم عزصدور یافت کہ مستعد مسرگرم اظہار مافی الضمیر خورشید نظیر بودہ ....."

ظاہر ہے کہ کتاب اس نے میر عالم ہی کی فرمائش پر لکھی۔ اگرچہ کہ اس عبارت میں مدار المہام کا نام واضح نہیں ہے تاہم چوں کہ مصنف نے اسی دیباچہ کے آغاز میں میر عالم کا نام صراحتاً بتا دیا ہے اور اس کے علاوہ بعد میں اسی تصنیف کا سن "یکہزار و دو صد و بست و سیوم از سنین ہجریہ" بتایا ہے اور اس زمانہ میں مدار المہام وہی تھے اس لحاظ سے اس امر کے یقین کرنے کے بغیر کوئی اور صورت نظر نہیں آتی کہ یہ کتاب ان ہی کے عہد وزارت میں تصنیف ہوئی یہ البتہ ممکن ہے کہ اسی کتاب کو مصنف نے سکندر جاہ کے ملاحظہ میں پیش کرنے کے لئے دیباچے میں ضروری تحریف کر لی ہو اگر اس تحریف کو ہم مان لیں تو اس سے مصنف پر تملق طبع کا الزام عائد ہوگا لیکن واقعہ اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ میر عالم بڑے مردم شناس تھے اور وہ آدمی سے اسی قسم کا کام لیتے تھے جس کا وہ اہل نظر آتا۔ سید محمد میر ابو تراب علمی قابلیت رکھنے کے علاوہ ان کو تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے نظر آئے اس لئے ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے ان سے فرمائش کی کہ ایسی ایک تاریخ مرتب کریں جب تاریخ مرتب ہو چکی تو اس کے مصنف نے یہ استدعا کی کہ اس کے صلے میں ان کے ساتھ کوئی معقول سلوک کیا جائے اسی بنا پر اور خود میر عالم کے ایما پر مصنف نے اس کتاب کو بادشاہ وقت سکندر جاہ کے نام سے منسوب کر دیا تاکہ وہ اس کو ان کے ملاحظہ میں گزران کر اس کے صلے میں مصنف

کے نام منصب یا ماہوار کی اجرائی کے لئے معروضہ کرسکیں۔ کتاب کے مقالۂ دوم کے اس نسخہ میں مصنف نے سن تصنیف ۱۲۲۳ھ لکھا ہے اور ایتھے نے ۱۲۲۱ھ بتایا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقالۂ اول ۱۲۲۱ھ میں تکمیل پایا اور اس کو حسب ایماء میر عالم "قطب نمائے عالم" نام رکھکر سکندر جاہ کے ملاحظہ میں پیش کیا اور اس کا صلہ پانے کے بعد دوسرا مقالہ اپنے ہی نام سے لکھا اور اس کو مقالۂ اول کا تکملہ قرار دیا۔ اصول تصنیف کے اعتبار سے اگر نظر ڈالی جائے تو مقالۂ اول اور مقالۂ دوم دونوں الگ الگ تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مقالہ بجائے خود مکمل ہے اور ہر ایک ہر دوسرے سے بے تعلق بھی ہے۔ یہ ممکن تھا کہ مصنف مقالۂ دوم کو ایک الگ کتاب قرار دیتا لیکن ہم اس کی کوئی وجہ قرار نہیں دے سکتے کہ مصنف نے اس کو بھی اسی کتاب کا ایک الگ جز کیوں گردانا۔ اگر مقالہ دوم کو وہ الگ کتاب قرار دیتا تو کوئی حجت ہی نہیں رہتی۔ اس واسطے کہ اس کے مقالۂ دوم ہی کی وجہ سے یہ کچھ دقت درپیش ہے ورنہ مقالۂ اول میں تو علانیہ کوئی بحث ہی نہیں اس صورت میں البتہ قطب نمائے عالم نامی نسخہ سے اس کا تصادم ہوجاتا جو مصنف کے علاوہ کتاب کا نام بھی الگ ہوجانے کی وجہ سے بہت کم قابل توجہ ہوتا۔

حدیقۃ العالم کے پہلے مقالے میں سوائے اس کے کہ اس کا ایک نسخہ ایسا بھی پایا جاتا ہے جس کے دیباچے میں یہ بتایا گیا ہے کہ سکندر جاہ کی فرمایش پر خط تلنگانہ کے شاہان قطب شاہی کی تاریخ میں وہ کتاب لکھی گئی اور اس کا نام قطب نمائے عالم رکھا گیا۔ اور کوئی تبدیل و تحریف پائی نہیں جاتی۔ لیکن اس کے دوسرے مقالے میں البتہ بعض الحاقات نظر آتے ہیں مثلاً متن میں شیر جنگ اور درگاہ قلی خاں سالار جنگ کے احوال۔ ان کا متن کتاب میں شامل ہونا مصنف تالیف میں داخل ہے اگرچیکہ خود مصنف نے بھی ایسے بعض احوال کتاب میں داخل کئے ہیں مثلاً مرہٹوں کا بیان، حیدر علی خاں کا ذکر۔ لیکن ان کا متن کتاب میں داخل ہونا اس وجہ سے بے موقع نہیں معلوم ہوتا کہ تاوقتیکہ ان کے اصلی اور تفصیلی واقعات سے واقفیت نہ ہو تاریخی حالات کھل نہیں سکتے۔ برخلاف ان کے شیر جنگ یا سالار جنگ کے احوال اصل کتاب میں نہ آنے سے تاریخ میں کوئی نقص یا کمزوری واقع نہیں ہوسکتی تھی اور ان کے احوال کو کتاب میں داخل کرنے کی جو توجیہ مصنف کی زبان سے بیان کی گئی ہے یہ ہے:۔

"چون دریں مقالہ ذکر جاذکر نواب حیدر یار خاں بہادر شیر جنگ و نواب درگاہ قلی خاں بہادر سالار جنگ رحمۃ اللہ علیہما نقیباً در مطاوی کلام بزبان قلم آمد لازم شد کہ احوال این ہر دو امیر کبیر عالی شان کہ از اعیان دولت آصفیہ بودند بعرض بیان آید۔"

یہ وجہ اُن بزرگوں کے احوال کو اس موقع پر داخل کرنے کے لئے ذرا بھی موجہ نہیں ہوسکتی اور یہی

معلوم ہوتا ہے کہ یہ علت اور اس کے بعد کے احوال مصنف نے نہیں لکھے بلکہ ان کا الحاق منیر الملک یا سراج الملک کے عہد میں محض ان کی خوشنودی خاطر کے خیال سے ان کے متوسلین میں سے کسی نے کر دیا ہے۔

آخر میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ حدیقۃ العالم کا پہلا مقالہ بعض تبدیلیوں کے ساتھ تاریخ قطب شاہی کی نقل ہے اس واسطے کہ اس میں قطب شاہیوں کے متعلق اس سے کچھ بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتے اور بعض جگہ عبارتیں توارد کی حد تک پہنچ گئی ہیں۔ دوسرے مقالے میں مصنف نے البتہ اپنے عصر کے ذکر میں کچھ اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے لیکن اس کی ترتیب کے وقت توزک آصفیہ[1] کا نسخہ اس کے مصنف کے پیش نظر یقیناً رہا ہے جن واقعات کو صاحب توزک نے تفصیل سے بیان کیا ہے انہوں نے بھی تفصیلاً بیان کیا ہے اور جن واقعات کو انہوں نے اجمالاً بتایا ہے انہوں نے بھی مجمل طور پر کہا ہے البتہ حدیقہ کے آخر میں میسور کی چوتھی جنگ کے حال کو بالکل مختصر کر دیا گیا ہے جسے صاحب توزک نے کسی قدر زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہرحال اس لحاظ سے کہ مصنف نے اپنے زمانے کے واقعات تاریخی لکھے ہیں اس کے عصر کی تاریخ کی حد تک یہ کتاب قابل وقعت متصور ہو سکتی ہے۔

جواب دیا

از جناب سید قادر حسین صاحب قادر حیدرآبادی

دل دیا دل کو پیچ و تاب دیا — جان دی جان کو عذاب دیا
کب سنا اس نے حال دل میرا — کب مجھے اس نے کچھ جواب دیا
سرکشی کا فلک کو نالوں نے — دیکھو جا کر کہاں جواب دیا
دل کے دل ہی میں رہ گئے شکوے — اس نے ایسا مجھے جواب دیا
دے رکھا ہے جواب قسمت نے — آپ نے مجھ کو کیا جواب دیا
اب بھی آؤ کہ بات رہ جائے — زندگی نے مجھے جواب دیا
دردِ دل سن کے ہو رہے خاموش — تم نے مجھ کو نہ کچھ جواب دیا
نہ رکھی اس نے کچھ لگی لپٹی — صاف منہ پر مرے جواب دیا
غیر نے تو برا کہا مجھ کو — آپ نے سن کے کیا جواب دیا
نہ دیا کچھ جواب قادر کو — گر دیا بھی تو لاجواب دیا

---

[1] مجلۂ مکتبہ:۔ شاہ تجلی کی مشہور تاریخ ہے ۱۲۰۸ھ میں تالیف پائی، اس کے صلے میں نواب ارسطو جاہ مدار المہام وقت نے مولف کو پچاس ہزار روپے دلوائے ۱۳۱۰ھ میں مطبع آصفی حیدرآباد میں میر احمد علی خاں موسوی کے حواشی کے ساتھ طبع ہوئی تھی۔

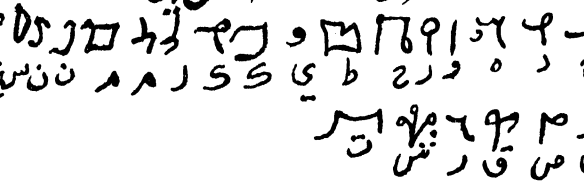
عبرانی خط

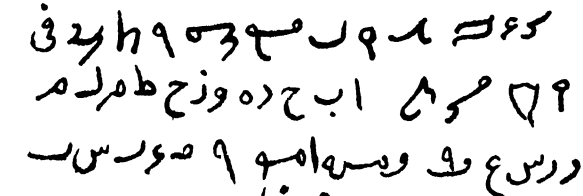
(ترجمہ مقالۂ اول کتاب "الفہرست" ابن الندیم)

(از جناب مولوی کال سید مظہر علی صاحب وکیل)

میں نے بعض قدیم تاریخوں میں دیکھا ہے کہ سب سے پہلے عابر بن شالخ نے عبرانی خط لکھا اور اس کو اپنی قوم میں رواج دیا۔ تب کہیں تمام لوگ یہ خط لکھنے لگے۔ یاقوت نے کہا ہے کہ عبرانی سریانی سے مشتق ہے جب ابراہیمؑ نے نمرود بن کوس بن کنعان سے بھاگ کر شام کے ارادے سے فرات کو عبور کیا تو اسی وقت سے اس کا نام عبرانی ہوا۔ یہود و نصاریٰ کا بالاتفاق یہ خیال ہے کہ عبرانی خط پتھر کی دو تختیوں پر تھا جن کو اللہ جل شانہٗ نے موسیٰؑ کو عطا فرمایا تھا جب موسیٰؑ پہاڑ سے نیچے اترے تو معلوم ہوا کہ آپ کی قوم نے بت پرستی شروع کر دی ہے تو غصہ ہو کر آپ نے دونوں تختیاں توڑ دیں جب آپ اپنے اس فعل پر نادم ہوئے تو اللہ جل شانہٗ نے آپ کو دو تختیاں تیار کر کے ان پر پہلے کا خط لکھنے کا حکم دیا۔ فضلاء یہود میں سے ایک شخص نے بیان کیا کہ وہ عبرانی خط آج کل کے عبرانی خط سے بالکل علٰحدہ تھا کیونکہ اس میں بہت کچھ تغیر و تبدل کیا گیا ہے۔ یہود کے بعض علماء کا بیان ہے کہ جب یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے وزیر تھے تو آپ امور سلطنت اور حساب وغیرہ اسی خط میں لکھتے تھے

عبرانی حروف کے اشکال یہ ہیں





رومی خط

میں نے بعض قدیم تاریخوں میں دیکھا ہے کہ یونانی پہلے زمانہ میں لکھنا نہیں جانتے تھے جب مصر سے دو آدمی آئے جن کے نام (قیمس) اور (اغنور) تھے اور یہ سولہ حرف جانتے تھے تو یونانیوں نے ان سے

یہ حروف سیکھ کر لکھنا شروع کیا پھر انہی دو مصریوں میں سے ایک نے چار حروف کا اضافہ کیا جن کو یونانی بھی لکھنے لگے پھر ایک دوسرے شخص نے جس کا نام (سمونیدس) تھا ان میں اور چار حرف اضافہ کئے جس سے جملہ حروف کی تعداد چوبیس ہوگئی۔ اسحٰق راہب نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ انہی دنوں میں (سقراطیس) نے ستارہ شناسی کی ابتدا کی۔ یعنے ایک رومی سے پوچھا جو اپنی زبان کا بڑا ماہر اور جس کی نسبت یہ مشہور تھا کہ یہ اُس درجہ پر پہنچا ہے جس کو (الیطومولوجیا) کہا جاتا ہے الیطومولوجی رومی زبان کے علم نحو کو کہتے ہیں اس نے کہا کہ مدنیۃ السلام میں عام طور سے رومیوں میں تین خط مستعمل ہیں ایک تولیطون اس کی نظیر عربی میں خط وراقین ہے جس سے قرآن لکھے جاتے ہیں۔

رومی اپنی مذہبی کتابوں کو لیطون ہی میں لکھتے ہیں۔ رومیوں کا مذہب (بیریا)[1] کے نام سے مشہور ہے جس کے معنی مقدس کے ہوتے ہیں اس خط کی مثال یہ ہے۔

(اصل کتاب میں مثال درج نہیں ہے۔)

افوسفیبادون اس خط کی نظیر عربی میں خط ثلث ہے جس میں خط محقق و مسہل مشترک ہے اس خط کی مثال یہ ہے۔

(اصل کتاب میں مثال درج نہیں ہے۔)

سوریطون۔ یہ کتابوں کا مخفف خط ہے اس کی نظیر ہمارے پاس خط مراسلات و فتری ہے جس میں حروف باہم ملائے جاتے ہیں اس خط کی مثال یہ ہے۔

(اصل کتاب میں مثال درج نہیں ہے۔)

سامیا۔ اس خط کی ہمارے پاس کوئی نظیر نہیں کیونکہ اس خط کا ایک حرف بہت سے معانی کا حاوی اور متعدد کلمات کا جامع ہوتا ہے۔ جالینوس[2] نے اپنی کتاب فنیکس میں اس خط کا ذکر کیا ہے فنیکس

---

[1] ۔ بیریا یونانی مذہب اور شرع کو کہتے ہیں۔ گرگیک میں مجموعہ احکام کو بیریا کہا جاتا ہے۔

[2] ۔ جالینوس بقراط سے ۶۶۵ سال بعد ظاہر ہوا۔ رومیس رومی سے اس نے تعلیم حاصل کی اس کی زندگی اکثر سفر میں گذرتی تھی خصوصاً شہر رومیہ کو اکثر جایا آیا کرتا تھا کیونکہ وہاں کا بادشاہ مجذوم تھا اور غالباً اسی کے زیر علاج بھی تھا۔ اکثر بادشاہان اس کی توقیر کیا کرتے تھے اسکندر افرودیسی سے اس کی اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں جالینوس عوام الناس کے مصالح میں بیحد حصہ لیتا تھا۔ یہ اپنے زمانہ میں فن طب میں یکتا تھا۔ اس نے ملوک طوائف کے عہد میں وفات پائی۔ مسیح کا زمانہ جالینوس سے ۵۰ سال پہلے کا ہے۔ ۱۲

کے منے (کتابوں کو ضبط تحریر میں لانا) اس نے کہا ہے کہ میں نے ایک عام جلسہ میں تشریح پر نہایت تفصیل سے تقریر کی تھی چند روز کے بعد ایک دوست سے ملاقات ہوئی انہوں نے کہا کہ آپ نے جلسہ میں جو کچھ کہا تھا وہ سب ایک شخص کو لفظ بلفظ یاد ہے اور انہوں نے میرے الفاظ کا بعینہٖ اعادہ کر دیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو کہاں سے معلوم ہوا انہوں نے کہا میں ایک کاتب سے ملا تھا جو خط سامیا کا ماہر ہے وہ آپ کا کلام ختم ہونے سے پہلے اس کو لکھ لیا کرتا تھا۔ اس خط کو بڑے بڑے کاتب اور بادشاہ سیکھتے ہیں اس کی دقت کی وجہ سے عام لوگوں کو اس کے سیکھنے کی ممانعت ہے ۱۲۴۸ھ میں بعلبک سے ایک طبیب ہمارے پاس آئے تھے انہوں نے کہا کہ میں خط سامیا جانتا ہوں ہم نے اُن کی آزمایش کی واقعی وہ اس خط سے واقف تھے۔ ہم نے دس باتیں کہیں وہ سن کر سب کو ایک لفظ میں لکھ لیے جب ہم نے اعادہ کے لئے کہا تو اسی ایک لفظ سے ہمارے تمام الفاظ ادا کر دئے جعفر برمکی نے کہا ہے کہ رومی بائیں ہاتھ کی طرف سے لکھنا شروع کرتے ہیں اور سیدھے ہاتھ کی طرف ختم کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس امر کے معتقد ہیں کہ بیٹھنے والا ہر حالت میں مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھے جب اس کا منہ مشرق کی طرف ہو تو شمال اُس کی بائیں جانب ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ سیدھا بائیں سے افضل ہے تو گویا بایاں ہاتھ احتراماً ہر چیز سیدھے کو دیتا ہے پس معلوم ہوا کہ لکھنے والا بائیں طرف سے شروع کرے اور سیدھی طرف ختم کرے جعفر ہی کا قول ہے کہ رومیوں کے پاس خط کے قوانین اور رسوم ہیں۔ ان ہی میں سے منجملہ چوبیس حروف کے حروف متعاقبہ ہیں جو غما، ولطا، قبا، سفا، طاؤ جی ہیں۔ رومیوں کے چند حروف ہیں جن کو صوتات کہتے ہیں وہ یہ ہیں۔ الفا، ای، ایطا، یوطا، ہو چھوٹا واؤ۔ بڑا واؤ۔ ان ہی حروف کو اولومیغا کہتے ہیں۔ حروف مونث تین ہیں۔ الفا چھوٹا واؤ۔ بڑا واؤ۔ اور حروف مذکر ای، ایطا، یوطا، ہو ہیں۔ سولہ سات حروف مصوتات کے جو ہیں کے نام سے مشہور ہیں کسی اور یونانی حرف پر اعراب نہیں آتا۔ یونانی زبان عربی زبان کے چھ حروف کے استعمال سے بالکل مستغنی ہے جیسے۔ ما، وال، ضاد، عین، ہا، لام الف۔

خط سنکبروہ ولساکسہ[1]

یہ رومیوں اور فرنگیوں کے مابین ایک قوم ہے جن سے اندلس کا بادشاہ قرابت رکھتا ہے ان کے لکھنے کے حروف بائیں ہیں۔ ان کے خط کا نام اسپیطلیقی ہے یہ لوگ بھی بائیں طرف سے سیدھے طرف لکھتے ہیں لیکن اس کے متعلق ان کا استدلال رومیوں کے استدلال سے علٰحدہ ہے یہ کہتے ہیں کہ بائیں طرف سے اس لئے خط شروع کیا جاتا ہے کہ حرکت قلبی سے لکھنے میں مدد ملے اگر ہم خط کو قلب کی جانب ختم کریں تو اس کی حرکت سے

---

[1] مسعودی نے الونکبروہ اور ساکسہ لکھا ہے ۱۲

مدد نہیں لے سکتی۔ جو خط سیدھی جانب سے شروع کیا جاتا ہے وہ جگر کی طرف سے آغاز ہو کر قلب کی طرف ختم ہوتا ہے۔ اس خط کی مثال یہ ہے۔ (اصل کتاب میں مثال درج نہیں ہے)

چینی خط

چینی خط بالکل نقش کی طرح ہے اس خط کا ماہر کاتب بھی اس کے لکھنے سے تھک جاتا ہے جلد سے جلد لکھنے والا بھی تمام دن میں دو تین ورق سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ اس خط میں اپنے دینی و علمی کتابوں کو پنکھوں پر لکھتے ہیں۔ میں نے بھی چند کتابیں دیکھی ہیں۔ یہ لوگ مشرک و دہریہ ہیں۔ ان کا حال کامل طور سے بعد میں لکھونگا چینیوں کا ایک خط ہے جس کو خط مجموع کہتے ہیں۔ اس خط میں ہر کلمہ کی جو تین یا تین سے زائد حرف سے لکھا جاتا ہے ایک ہی صورت ہوا کرتی ہے اور ہر طویل کلام کے لئے حروف کی ایک خاص شکل ہے جو بہت سے معنی پر حاوی ہوتی ہے۔ اگر چاہیں تو اس خط سے سو ورق کی کتابت کو ایک صفحہ میں لکھ سکتے ہیں۔ محمد بن[1] ذکریا نے کہا ہے کہ ایک شخص چین سے میرے پاس آیا اور قریب ایک سال کے یہاں رہا یہ پانچ مہینہ کے عرصہ میں عربی زبان اور خط سیکھ کر نہایت فصیح اور زود نویس ہو گیا جب اس نے اپنے وطن کو واپس جانا چاہا تو اپنی روانگی سے ایک مہینہ پیشتر مجھ سے کہا کہ اگر جالینوس[2] کی سولہ کتابیں مجھے لکھا دی جائیں تو بہتر ہوگا میں نے کہا کہ وقت بہت تنگ ہے تمہارا قیام کا زمانہ ان کتابوں کے تھوڑے سے حصہ کی نقل کیلئے کافی نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا کہ میرے زمانہ قیام تک اپنے کو

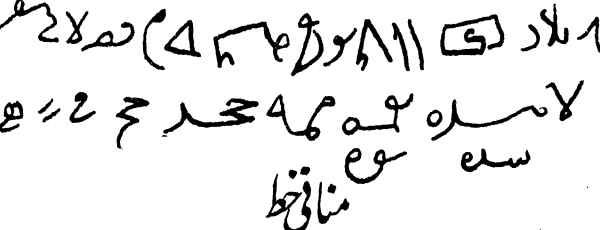
---

[1] ان کی کنیت ابوبکر اور نام محمد ابن ذکریا رازی ہے یہ اہل ری سے ہیں علوم قدیمہ سے خوب واقف تھے اور خصوصاً فن طب میں ان کو خاص دستگاہ حاصل تھی۔ یہ اکثر سفر کیا کرتے تھے۔ بڑے سخی اور رحم دل تھے۔ فقیروں اور مریضوں سے خاص توجہ اور مہربانی کے ساتھ پیش آتے اور بیماروں کی بیمارداری کرتے باوجود ان مصروفیتوں کے پھر بھی وہ کسی نہ کسی کتاب کے مسودہ یا مبیضہ میں مصروف رہتے آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے ان کے بہت سے تصنیفات ہیں صاحب الفہرست نے ان کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ ۱۲

[2] طب کی مشہور سولہ کتابوں کے نام جن کو جالینوس نے تصنیف کیا ہے حسب ذیل ہیں۔

کتاب الفرق، کتاب الصناعۃ، کتاب ای طوتون فی النبض، کتاب ای اخلوتن فی المعاتی شفاء الامراض، کتاب المقالات الخمس فی التشریح، کتاب لاسقس، کتاب المزاج، کتاب القوے الطبیعیۃ، کتاب العلل والاعراض، کتاب تعرف علل الاعضاء والمباطنۃ، کتاب النبض الکبیر، کتاب الحمایات، کتاب البحران، کتاب ایام البحران، کتاب تدبیر الاصحاء، کتاب حیلۃ البرء ۱۲

میرے اس کام کیلئے وقف کر دیجئے اور آپ سے جتنا جلد ہو سکے کہتے جائیے میں آپ کے کہنے سے بھی جلد لکھتا جاؤں گا۔ میں نے اس کام کے لئے اپنے بعض شاگردوں کو بھی آنے کے لئے کہا ہم جتنا جلد ہو سکے کہتے جاتے تھے تاہم وہ لکھنے میں ہم سے آگے رہتا تھا۔ ہم نے تو پہلے جھوٹ بھی سمجھا لیکن مقابلہ کے وقت جو لکھا تھا برابر اس کا مقابلہ کرا دیا میں نے اس سے اس خط کے متعلق دریافت کیا اوس نے کہا کہ ہمارے پاس ایک خط ہے جس کو مجموع کہتے ہیں یہ وہی خط ہے جس کو تم نے دیکھا ہے اگر ہم بڑی سے بڑی عبارت کو تھوڑی سی مدت میں لکھنا چاہیں تو اسی خط سے لکھتے ہیں اور جب چاہتے ہیں پھر اس کو مروج و مبسوط خط میں نقل کر لیتے ہیں اور کہا کہ اس خط کو ذکی اور ہوشیار شخص بھی بیس سال سے کم مدت میں نہیں سیکھ سکتا چینی لوگ بعض چیزوں کو جو چینی تیل کے مشابہ رہتے ہیں مرکب کر کے سیاہی تیار کرتے ہیں۔ میں نے اس سیاہی کو تختیوں کی صورت میں دیکھا ہے جس پر بادشاہ کی تصویر تھی۔ اس کا ایک ٹکڑا باوجود ہمیشہ لکھتے رہنے کے ایک عرصہ کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس خط کی مثال یہ ہے۔



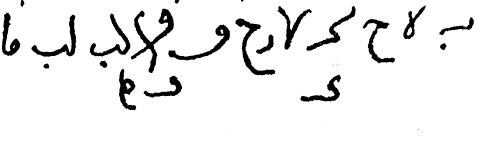
منانی خط

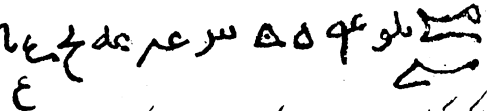
منانی خط کو مانی[1] نے نکالا ہے جس طرح مذہب مجوسیت اور نصرانیت سے مرکب ہے اُسی طرح یہ خط بھی فارسی اور سریانی سے مستخرج ہے اس خط کے حروف عربی حروف سے زیادہ ہیں اسی خط سے اپنی

---

[1] یہ مانی بن فتق بابک بن ابی برزام ہے یا اہل حسکانیہ سے تھا اس کی ماں کا نام میسل تھا بعضوں نے اس کا نام اوتاخیم اور بعضوں نے مریم لکھا ہے۔ یہ اشغانیہ کی اولاد سے تھی بعض کا قول ہے کہ مانی کے والد کا نسبی تعلق ہمدان سے ہے۔ اس کی ماں اس کے حمل کے زمانہ میں عجیب و غریب خواب دیکھا کرتی تھی اکثر بیداری میں بھی یہ دیکھا کرتی تھی کہ کوئی شخص مانی کو جو سمار میں لے گیا ہے بسا اوقات ایک ایک دو دو روز کے بعد مانی کو واپس لایا گیا صغر سنی ہی سے مانی بڑا قریس و تھلسند تھا۔ بارہ سال کی عمر میں اس پر وحی کا نزول ہوا جو فرشتہ وحی لاتا تھا اوس کا نام بطلی زبان میں توم تھا جس کے معنی ساتھی کے ہیں۔ اسی توم نے مانی سے اپنا آبائی مذہب چھوڑنے اور شہوات کے ترک کرنے کی ہدایت کی جب مانی کی عمر ۲۴ سال کی ہوئی تو پھر توم آیا اور اس کو اپنے مذہب کی اشاعت کا حکم دیا۔ بادشاہ غاوس ساوری کے دوسرے سال مانی ظاہر ہوا اور بیان کیا کہ میں ہی وہ فارقلیط ہوں جس کی بشارت عیسیٰ نے دی تھی اس نے مجوسیت اور نصرانیت سے اپنے مذہب کو ترتیب دیا اور دینی کتابوں کی تحریر کیلئے سریانی اور فارسی خطوط کی ترکیب سے ایک خاص خط کی اختراع کی

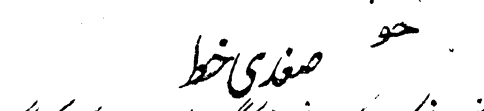
انجلیوں اور مذہبی کتاب کو لکھتے ہیں۔ اہل سمرقند اور اہل ماوراالنہر بھی اپنی مذہبی کتابیں اسی خط میں لکھتے ہیں اسی وجہ سے اس کو خط دین کہتے ہیں۔ مرتونیہ قوم کا ایک خاص خط ہے ایک معتبر شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے اس خط کو دیکھا ہے۔ گو یہ خط مانی کے مشابہ ہے لیکن پھر بھی اس سے علٰحدہ ہے حروف مانی کی مثال یہ ہے۔





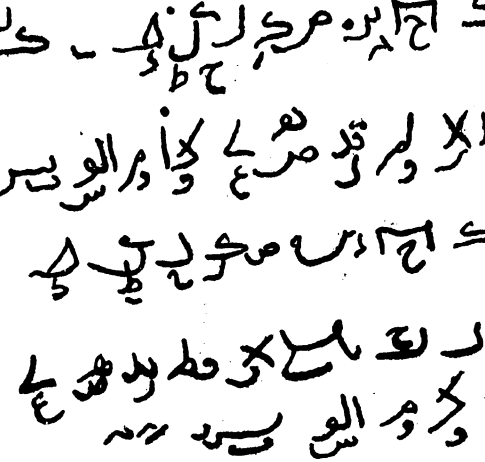
ان کے خط کی ایک اور صورت ہے اس کے حروف پہلے خط کے حروف سے مختلف ہیں اس کو اس طرح لکھتے ہیں





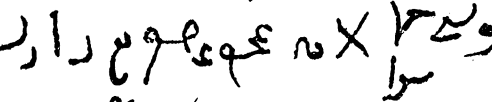
صغدی خط

ایک معتبر شخص نے کہا ہے کہ میں شہر صغد کو گیا تھا یہ ماوراءالنہر کے ایک گوشہ میں واقع ہے اور اس کو صغد ایران الاعلٰی کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ کے ترک اس پر قابض ہیں اس کے قصبہ کا نام فرنکث ہے اور بیان کیا کہ یہاں کے لوگ مشرک اور نصاریٰ ہیں ان کی زبان میں مشرکین کو اجارکف کہتے ہیں ان کے خط کی مثال یہ ہے۔

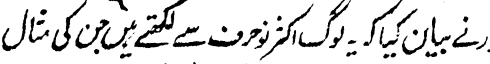


سندی خط

اس قوم کے مختلف زبان اور مختلف مذاہب ہیں ان کے خطوط بھی بہت ہیں ایک شخص نے جس نے ان کے شہروں کی سیاحت کی ہے مجھ سے کہا کہ ان کے خطوط قریب نسخ کے ہیں۔ میں نے بادشاہ کے گھر میں ایک پیتل کا بت دیکھا کہا جاتا ہے کہ یہی بدھ کی شکل ہے یعنے ایک شخص کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اپنے ایک ہاتھ سے تین کا عقد باندھا ہے اور کرسی پر کچھ تحریر لکھی ہوئی ہے جس کی مثال یہ ہے۔



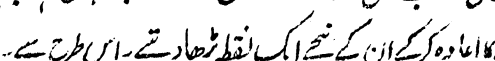
شخص مذکور نے بیان کیا کہ یہ لوگ اکثر نو حرف سے لکھتے ہیں جن کی مثال یہ ہے۔



ان حروف کی۔ ا۔ ب۔ ج۔ د۔ ہ۔ و۔ ز۔ ح۔ ط سے ابتدا ہوتی ہے جب۔ ط تک پہنچتے ہیں تو پہلے کے حروف کا اعادہ کرکے ان کے نیچے ایک نقطہ بڑھا دیتے۔ اس طرح سے۔



اس ایک نقطہ کے اضافہ سے۔ ی۔ ک۔ ل۔ م۔ ن۔ س۔ ع۔ ف۔ ص۔ ہو جاتے ہیں گویا دس دس کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جب۔ ص تک پہنچیں تو پھر انہیں حروف کو پلٹا کر اُن کے نیچے دو دو نقطے دیتے ہیں۔ اس طرح سے۔



ان دو نقطوں کے اضافہ سے۔ ق۔ ر۔ ش۔ ت۔ ث۔ خ۔ ذ۔ ظ۔ ہو جاتے ہیں۔ جب ظ تک پہنچیں تو پھر وہی پہلے کے حروف لکھ کر ان کے نیچے تین نقطے بڑھا دیتے ہیں اس طرح (⁝) تمام حروف مجمہ بنا کر جو چاہتے ہیں لکھتے ہیں۔

سوڈانی خط

سوڈان کے اقوام جیسے نوبہ۔ بجہ[1]۔ زغاوہ۔ مرادہ[2]۔ استان۔ بربر۔ اور سند کے سوا تمام

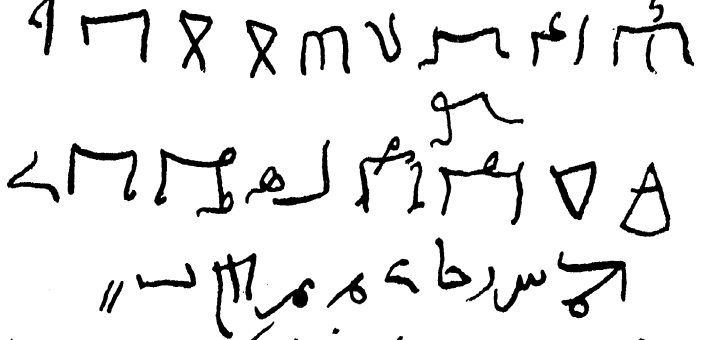
---

[1] اس لفظ کو بیجا۔ بجاوۃ۔ بجاۃ۔ بیجہ لکھا جاتا ہے لیکن ان سب سے مراد ایک ہی ہوتی ہے۔ بجہ سے قدیم زمانہ کے بلیمیز اور موجودہ زمانہ کے ربابدہ مقصود ہیں ۱۲۔

[2] پروفیسر ژابرٹ ایک شہر کو مردۃ اور اسی کو انڈگس میں مرواۃ لکھتا ہے ۱۲۔

حبشی اقوام ہند سے قربت کی وجہ سے ہندی لکھتے ہیں ان کا کوئی خاص مشہور خط نہیں ہے۔ جاحظ[1] نے اپنی کتاب البیان میں جو یہ کہا ہے کہ حبشیوں کے پاس اُن کے مذہب کے موافق اُن ہی کی زبان میں علم خطابت اور بلاغت ہے اس کے متعلق ایک شخص نے اپنا چشم دید واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ جب حبشیوں پر پریشانیاں اور مصائب آتے ہیں تو اُن کا خطیب ایک بلند مقام پر بیٹھتا ہے اور سر جھکا کر دندوں یا نقاروں کی آواز (یعنے گنگنا ہٹ) میں گفتگو کرتا ہے تمام لوگ اس کو سمجھ جاتے ہیں اور بیان کیا کہ لوگ جس قسم کی رائے طلب کرتے ہیں اوسی کے متعلق یہ خطیب مشورہ دیتا ہے اور لوگ اس پر عمل کرتے ہیں واللہ اعلم۔

ایک سیاح نے مجھ سے بیان کیا کہ قوم بجہ کا خاص خط ہے لیکن یہ خط ہم کو نہیں پہنچا۔ ایک اور سیاح نے مجھ سے بیان کیا کہ قوم نوبہ اپنی مذہبی کتابیں سریانی، رومی قبطی خط میں لکھتے ہیں حبشیوں کا ایک خط ہے جس کے حروف حمیری حروف کی طرح ملے ہوئے ہوتے ہیں یہ لوگ بائیں طرف سے لکھتے ہیں اور ہر دو اسموں کے مابین تین نقطے بشکل مثلث دیکر ایک دوسرے میں تفریق کرتے ہیں۔ اس خط کے حروف کی مثال یہ ہے میں نے اس کو مامون کے کتب خانہ سے نقل کیا ہے۔



اس خط میں۔ ت۔ ث۔ ر۔ ز۔ ح۔ خ۔ ع۔ غ۔ ط۔ ظ۔ ایک ہی ہیں۔

---

[1] ۔ ان کی کنیت ابو عثمان ہے یہ بہت مشہور ہیں فن تفسیر وغیرہ میں ان کی تصنیفات ہیں۔ یہ علم کے بڑے شائق تھے ان کی ہمیشہ کتب بینی میں گذرتی تھی۔ ابو حفان ان کے متعلق کہتے ہیں کہ جو کتاب جاحظ کے ہاتھ میں آتی اُس کو ابتدا سے انتہا تک دیکھتے یہ کتابوں کی دکانیں کرایہ سے لیتے اور وہیں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے

ماضی و حال

(از جناب عمر عبد الکریم صاحب گل)

آج ہر فرد بشر مائل شر ہونے لگا کینہ و بغض و حسد دل میں گھر ہونے لگا
یہ نہیں معلوم کیا مد نظر ہونے لگا عیب گنتے تھے جسے اب کیوں ہنر ہونے لگا

بزم عالم کا مرقع ہو گیا بد رنگ آج
دیکھ کر بگڑا ہوا نقشہ پریشاں ہے مزاج

چل رہی ہے کو بکو نا اتفاقی کی ہوا چھا رہی ہے ہر طرف افلاس کی گھٹا
آ رہی ہے آندھیاں دوبار کی صبح و مسا ہو رہا ہے دشمنی کا جا بجا طوفان بپا

آج دریا غضب کیا کیا طلاطم خیز ہے
اور پھر باد مخالف اک ستم انگیز ہے

جل رہا ہے آج سینوں میں عداوت کا چراغ پک رہا ہے گرمی رخصومت سے دماغ
آتش رشک و حسد سے سینکڑوں ہیں دل داغ ہو چلا ویراں سوم جہل سے ایماں کا باغ

دل کا آئینہ مکدر ہے کدورت کے سبب
بغض کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں بے سبب

روز افزوں ہے ترقی پر شر آج کل ہو رہی ہے ہر اک طبیعت آج کل
اڑ رہا ہے ہر طرف رنگ محبت آج کل بڑھ رہی ہے دن بدن جہل و ضلالت آج کل

اٹھ گئی قوی محبت مٹ گیا نام وفا
گھٹ گئی طرز مروت بڑھ گئی رسم جفا

سرد مہری سے زمانہ کی طبیعت ہے اداس دل پہ قابض ہو گئے ہیں حسرت اندوہ و یاس
چھا گئی افسردگی رخصت ہوئی ہر شوق و حواس ناامیدی کے علاوہ کیا رہا ہے اپنے پاس

بیکسی آزردگی کا دیتی ہے پیام
بے بسی بڑھ بڑھ کے اپنا کر رہی ہے اختتام

آج نازل ہو رہا ہے کس لئے ہم پر غضب کیوں زبانیں پھر رہی ہیں مار ہائے زہر شب
سہہ رہے ہیں کس لئے درد و غم و رنج و تعب ہو رہے ہیں دن بدن کیوں ناتوان و جاں بلب

بات تو یہ ہے خطا اس میں نہیں کچھ اور کی
ایک خصوصیت ہوا کرتی ہے ہر اک دور کی

ایک دن وہ تھا کہ ہم میں تھا بہت اتفاق ہم زباں ہم نوا تھے ہم خیال و ہم مذاق
خانگی جھگڑے اٹھا رکھے تھے ہم نے بالائے طاق سب کو ہے معلوم جو کچھ تھا ہمارا المطراق

دل بغلا تھا عیاں چہرے سے تھا ایماں کا نور
ایسے نام آور کہ شہرت تھی ہماری دور دور

ایک دل آپس میں تھے ہم عہد کے پابند تھے پاک باطن پاک نیت تھے سعادت مند تھے
شاد تھے آباد تھے مسرور تھے خورسند تھے لاکھ پر بھاری تھے گو تعداد میں ہم چند تھے

آن بان اپنی رہی ہر حال میں بن بن کے ساتھ
بات کرتے تھے زبان تیغ سے دشمن کے ساتھ

خلق میں مشہور ہم جاں باز تھے ممتاز تھے ایک کے اک مونس و غمخوار تھے دم ساز تھے
متفق تھے اور باہم ہمدم و ہم راز تھے میل جول ایسا کہ ہم آہنگ و ہم آواز تھے

دل مخالف کا دہل جاتا تھا ہم کو دیکھ کر
ظالموں کا دم نکل جاتا تھا ہم کو دیکھ کر

ہو نثار اتنے کہ تھی چاروں طرف دانی نظر باجز ایسے کہ تھی ہر ایک کی ہم کو خبر
ہم سے دنیا میں نہیں چھپا کوئی علم و ہنر شرق سے تا غرب عالم پہ ہمارا تھا اثر

بحر و بر زیر نگیں تھے ہر جگہ تھا انتظام
کیا عرب اور کیا عجم اور کیا عراق و روم و شام

ہم ہر اک بزم و جماعت میں تھے یکتا و جلی عیش میں شادی میں غم میں راحت میں شریک حال تھے
رنج و محنت میں مصیبت میں تھے ہر اک حال میں شریک حال تھے

اپنی ہوتی تھی ہر اک محفل میں قدر و منزلت
کیونکہ خود اپنی تھی اپنے دل میں قدر و منزلت

وہ ہمارا دبدبہ وہ حکومت کیا ہوئی وہ ہمارا رعب اور وہ شان و شوکت کیا ہوئی
وہ فطانت وہ ہمت اور وہ جرأت کیا ہوئی وہ ملیمت وہ حمیت وہ شجاعت کیا ہوئی

وہ زمانہ اور وہ فضلِ الٰہی کیا ہوا
آج کیسی آگئی ہم پر تباہی کیا ہوا

ہیں وہی ہم اور ہزاروں طرح کی بلائیں حملے ٹڈی کے کبھی ہیں اور کبھی ہیں آندھیاں
قہر اولوں کا کبھی ہے اور کبھی طغیانیاں قحط دامن گیر ہے اور سینکڑوں ہیں بیماریاں

زلزلوں سے دل ہلا جاتا ہے جان بیچین ہے

جان اک بیچین کیا سارا جہاں بیچین ہے

ہو گئے اپنے وطن میں بے وطن اہلِ وطن کھا رہے ہیں ٹھوکریں ہم پھول کر اپنا چلن
ہو رہے ہیں مبتلائے آفتِ رنج و محن چین سے رہنے بھی دیتا ہے نہیں کوئی زمن

در بدر بھٹکا رہا ہے آج دورِ روزگار

گردشیں دیتی ہے کیا کیا گردشِ لیل و نہار

آج ہم پیچھا ہے میں چھوڑ کر اپنا مذہب کھو کے اپنا پن ہے ہیں اور کے محتاج آج
ایسے بے خود ہیں کہ قابو میں نہیں اپنا مزاج اس مرض کی کیا دوا اپنے کئے کا کیا علاج

قوم کا چھوٹا بڑا ہر اک پریشاں حال ہے

سچ اگر پوچھو تو یہ سب شامتِ اعمال ہے

آرہا ہے آج کیوں ہر کام میں ہم کو تنزل کیوں تنزل ہو رہا ہے آج ہم سے دور دور
آج کیوں قہرِ مذلت ہے پڑا ہم پر مسلط کس کی غفلت سے خطا کس کی ہے کس کا قصور

شرم دامن گیر ہے کس سے کریں فریاد ہم

ہو رہے ہیں اپنے ہاتھوں آپ ہی برباد ہم

پڑ گئے لہو لعب میں پھنس کر علم و ہنر بے ٹھکانے ہو گئے ہیں پھر رہے ہیں در بدر
فکر کچھ ہے نہ ہمیں کچھ عقبیٰ کا ڈر بے خبر ایسے نہیں ہم کو کسی کی کچھ خبر

تا بلد نا آشنا ہیں نام سے تدبیر کے

جی رہے ہیں ہم بہر دم بہر نفس تقدیر کے

ہم خلف ایسے کہ جھوڑیں ہیں سلف کی ہر جا مستقل اتنے کہ اپنی جا سے اٹھنا ہے محال
پست ہمت ہیں مگر اونچا ہمارا ہے نصب ابتدا کی ہم کو پروا ہے نہ کچھ فکرِ مآل

کس قدر حالت ہماری آج عبرت ناک ہے

سر میں چکر دل پریشان شکل ہیبت ناک ہے

سامنے اہلِ ہنر کے آج آسکتے نہیں سرنگوں ایسے ہیں سر اپنا اٹھا سکتے نہیں
آنکھ اباتِ ترقی سے ملا سکتے نہیں ماجرا اپنی مصیبت کا سنا سکتے نہیں

آج گردن جھک گئی بارِ ندامت کے سبب

آنکھ اٹھ سکتی نہیں اپنی مجالت کے سبب

تا بہ کے یہ بے خودی یہ غفلت تا بہ کے تا بہ کے یہ کاہلی یہ سستی ہمت تا بہ کے
تا بہ کے اے گل یہ بربادی دولت تا بہ کے تا بہ کے یہ فاقہ مستی اور یہ نوبت تا بہ کے

خوابِ غفلت سے اٹھو اب ذرا اپنی خبر

کس خرابی میں پڑے ہو دیکھو آنکھیں کھول کر

مستعد ہو جاؤ تم اب کاہلی کو چھوڑ دو بڑھ کے میدانِ ترقی میں قدم اپنا رکھو
لے نام اللہ کا آگے بڑھو آگے بڑھو ڈھونڈ لو کھوئی ہوئی دولت کو اپنی جستجو

مان لو کہنا ہمارا اب خدا کے واسطے

مصطفےٰ کے واسطے مشکل کشا کے واسطے

وقت اپنا نفس میں کھونے سے حاصل کچھ نہیں بستر آرام پر سونے سے حاصل کچھ نہیں
بیٹھ کر تقدیر کو رونے سے حاصل کچھ نہیں آنسوؤں سے اپنا منہ دھونے سے حاصل کچھ نہیں

کام لینا چاہئے ہمت سے اور تدبیر سے

بات بنتی آئے گی امید ہے تقدیر سے

یا الٰہی اب ہدایت کی ہمیں توفیق دے اور آپس میں محبت کی ہمیں توفیق دے
خلق کی ہمدردی و خدمت کی ہمیں توفیق دے نیک کاموں کی سعادت کی ہمیں توفیق دے

بس دعا یہ آخری ہے خاتمہ بالخیر ہو

آرزو کل کی یہی ہے خاتمہ بالخیر ہو

کھیل کی نفسیات

مسلسل

از جناب محمد مظہر حسین صاحب بی اے عثمانیہ کالج

گذشتہ صفحات میں معترضین نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ کھیل میں "قابو" کا جو جز پایا جاتا ہے اس کی قدیم نظریات کھیل کے بموجب تشفی بخش توجیہ نہیں کی جاسکتی مثلاً جب کھیل میں ایک کتے کا پلا اپنے ساتھی کو دبوچتا ہے تو خود کو قابو میں رکھتا ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو غصہ کا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے "قابو" کے وجود کو تسلیم کئے بغیر کھیل کے مختلف مظاہرات کی تشفی بخش توجیہ نہیں ہوسکتی۔ اسی دقت کو رفع کرنے کے لئے ہم نے ڈاکٹر شانڈ کے نظریہ کو پسندیدہ قرار دیا تھا جس کی بموجب مسرت کے ایک مخصوص کرا کا نام کھیل ہے اور مسرت کا فطری میلان ایسے تغیرات و مظاہرات کو روکتا ہے جن کے وقوع ہونے کی صورت میں نصب العین کے مترازل ہونے کا اندیشہ رہتا ہے لہذا اس بیان کے بموجب معترضین کے شک کو فرض کرنے کی گنجایش ہی باقی نہیں رہتی۔

ڈاکٹر شانڈ کے نظریہ کا اسلوب ہی ایسا ہے کہ قدرتی طور پر حریف کے تمام اعتراضات کے جوابات زیادہ خوبی کے ساتھ دئے جاسکتے ہیں لیکن جب خود نفس نظریہ پر غور و تامل کیا جاتا ہے تو اس میں بھی چند غیر اہم پنہان نقائص دکھائی دیتے ہیں جن کی بنا پر ہم کو مجبوراً چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے سب سے اہم نقص کی تفصیل یہ ہے کہ جس وقت کھیل کے تمام معروضات پر غور کیا جاتا ہے تو اس کی دو مرکب صورتیں دکھائی دیتی ہیں یعنی یہ کہ کھیل کا معروض یا تو جاندار ہوتا ہے یا بے جان اور اس کے علاوہ اس کے ساتھ ساتھ یا تو ہم انفرادی طور پر کھیلتے ہیں یا اجتماعی طور پر ثانی الذکر میں سے اول الذکر کی صورت بالکل سادہ اور بسیط ہے لیکن موخر الذکر صورت کسی قدر تشریح کی طالب ہے کیونکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی جاندار معروض کے ساتھ ہوتے ہیں تو وہ اجتماعی صورت دکھلائی جاسکتی ہے اور غیر جاندار کے ساتھ ہوتے ہیں تو انفرادی لیکن حقیقتہً ہماری مراد اس سے کچھ مختلف ہے کیونکہ انفرادی کا مطلب یہ ہے کہ کھیلنے والا چاہے جاندار سے کھیلے یا غیر جاندار سے کھیل کی عام مسرت کو خود کے لئے مخصوص کرلیتا ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ بعض صورتوں میں معروض جاندار تو ہو لیکن کھیل کی مسرت صرف کھیلنے والے کی ذات تک محدود ہو جیسے ایک خوش طبع شخص جب کسی دوسرے کا مذاق اڑاتا ہے تو اس سے خود اس کی ذات کو بلاشبہ لطف آتا ہے لیکن اس کے معروض

کو اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اجتماعی یا عمرانی کھیلوں میں مسرت سے سب محظوظ ہوتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ شانڈ کے نظریہ سے انفرادی کھیلوں کی کس طرح توجیہ کی جائے گی جبکہ بعض حالتوں میں وہ فی نفسہٖ کھیل تو ضرور ہوتے ہیں لیکن بعض ایسے مخصوص کردار دو بدو کام کرتے رہتے ہیں کہ مسرت کی بقا معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔ شانڈ اس کا جواب اس طرح دیتا ہے کہ ایسی صورتوں میں کھیل موجب مسرت صرف اس وقت ہوتے ہیں جبکہ معروضات ضعیف اور کمزور ہوتے ہیں کیونکہ اگر وہ بھی طاقتور ہوں تو فعلیت کا فوری خاتمہ ہو جاتا ہے اور اگرچہ اس قسم کی فعلیت ابتدائی آفرینش میں مسرت افزا ہوتی ہے لیکن جوں ہی معروض تنگ آ جاتا ہے تو کھیل کے میلان کے باوجود اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ شانڈ کا طریقۂ بیان نہایت سلیس اور عمدہ ہے لیکن متامل اور متجسس ذہن کو اس کے خلاف بھی مثالیں ملتی ہیں مثلاً بچہ جب نادانستہ طور پر جلد توڑ کر کسی کتاب کے اوراق کو پریشان کر دیتا ہے تو اس حرکت سے اس کی کسی طاقت کا مظاہرہ نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ ہیجانی طور پر اپنے معروض کا خاتمہ کر دیتا ہے حالانکہ شانڈ کے مطابق ہونا یہ چاہئے تھا کہ وہ اپنے معروض کو بلا تغیر باقی رکھے کیونکہ بصورت دیگر ایسے افعال کھیل کی فہرست میں داخل نہیں کئے جا سکتے اس کے متعلق شانڈ کہتا ہے کہ ایسی صورت میں چونکہ معروض بے جان ہوتا ہے لہٰذا انتقام یا غصہ کا خوف مفقود ہوتا ہے اسی وجہ سے جب کھیلنے والا خلل کا اندیشہ نہیں پاتا ہے تو اپنی مرضی کے مطابق اس کو کام میں لیتا ہے۔ اس لئے اس لحاظ سے بھی اس کی فعلیت "کھیل" کی ہوتی ہے۔

بہ ایں ہمہ واقعہ یہ ہے کہ شانڈ نہایت خاموشی کے ساتھ اس کا بھی اعتراف کرتا ہے مستثنیات بھی ضرور ہوتے ہیں اور تقریباً تمام انفرادی افعال کو انہی مستثنیات میں داخل کر لیا جا سکتا ہے لیکن اس اعتراف کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ شانڈ کے نظریہ کی اہمیت کا انکار کیا جا سکے کیونکہ اگر اس نظریہ کو ترک کر دیا جائے تو پھر ہم بھول بھلیاں میں پھنس جاتے ہیں جس سے نکلنے کے لئے ہزارہا دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بہرحال یہاں تک معترضین کے اہم مطالبات کے ممکنہ جوابات تھے اور اب دیکھنا یہ ہے کہ کھیل کی کوئی جبلت ہوتی ہے یا نہیں۔ اس پر غور کرنے سے پہلے معلوم کر لینا چاہئے کہ جبلت سے کیا مراد لی جاتی ہے تاکہ آئندہ اس تشریح کے مطابق کھیل کی جبلت کے متعلق فیصلہ کیا جا سکے۔

جبلت کی ماہیت

"نفسیات کی صبح آفرینش سے اس وقت تک جبلت کی ماہیت و اصلیت کے متعلق ماہرین کسی متفق علیہ نتیجہ پر نہیں پہنچے اور ہر زمانہ میں اس لفظ کا اطلاق مختلف فعلیتوں اور مختلف حرکات

پر کیا گیا ہے[1]۔ شروع شروع میں ماہرین حیاتیات نے اسی کو مرکب کردار فرض کر کے خاص طبقہ تک محدود کر دیا تھا اور جبلت اور اضطرار میں یہ فرق قایم کیا تھا کہ مقدم الذکر مرکب اور پیچیدہ ہوتا ہے اور موخر الذکر سادہ اور بسیط۔ علاوہ ازیں جبلت اضطرارات کے خلاف ایک خاص طبقہ میں مشترک ہوتی ہے جیسے مدافعت کے اظہار میں مختلف حیوانات مختلف ہتھیار استعمال کرتے ہیں لیکن جب ایک نوع ایک ہی قسم کے ہتھیار استعمال کرتی ہے تو وہ جبلی کردار قرار پاتے ہیں۔

اس کے بعد جب نفسیات میں ترقی ہوئی تو جبلت کی قدیم نوعیت کی صورت بھی کچھ بدل گئی اور اس کی تعریف اس طرح کی گئی کہ اگرچہ یہ عضویاتی خلیت ہوتی ہے لیکن اس میں ذہن کا بھی عنصر شامل ہوتا ہے لہذا اسی خیال کے تحت انہوں نے جبلت کو جذبہ کا ہم معنی قرار دیا یعنی بہ الفاظ دیگر انہوں نے جذبہ کو اس قدر وسیع کر لیا کہ جبلت بھی اسی زمرہ میں داخل کر دی گئی۔

آغاز نفسیات میں ہمیں عجیب و غریب خیالات نظر آتے ہیں لیکن جب زمانہ نے ترقی کا نیا دور شروع کیا اور علوم کے تمام شعبوں اور جوانب میں اصلاح و تجدید کی نئی روح پھونک دی گئی تو قدیم خیالات میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو گا چنانچہ ہماری نفسیات بھی اس ہمہ گیر انقلاب کے زد سے نہ بچ سکی۔ نئے نئے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے کوپرنیکس کی طرح قدیم رجحانات کی خود مختاری سے بیزاری ظاہر کر کے ان کی جگہ نئے خیالات کی جمہوریت کو قایم کیا اور ہر ایک جمہور پسند نے ہر ایک شاخ کے عنوان پر مستقل کتابیں لکھیں ان پر تنقیدیں ہوئیں اور پھر ان کا ایک معجون مرکب تیار کیا گیا جو آج ہمارے سامنے ہماری جستجو کی تشنگی کو بجھانے کے لئے موجود ہے اور اس پر ہمیں اس وقت تک اکتفا کرنا پڑیگا جب تک کہ کوئی نیا انسٹائن پیدا ہو کر اس قدیم نیوٹن کے معجون کو مہلک نہ ثابت کر دکھائے اور کوئی ایسی دوا نہ تیار کرے جو اس سے زیادہ موثر اور مفید ہو۔ اس ترقی نے جبلت میں نفسی عنصر کے اشتراک کو تو قایم رکھا لیکن کہا کہ یہ جذبہ کا ہم معنی نہیں کیونکہ یہ عادت یا اکتسابی رد اعمال کے خلاف خلقی کردار ہوتا ہے[2]۔ اس میں سوچ بچار یا اکتساب کا قطعی دخل نہیں ہوتا کیونکہ سوچ بچار میں انسان یا حیوان ملت و معلول اور تجربہ پر نیا دکھڑا آتا ہے لیکن جبلت کی نمود تجربہ پر نہیں بلکہ فطری ساخت پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کا تعلق زیادہ خارجی کردار سے ہوتا ہے نہ کہ جذبہ کی طرح ذہنی کیفیات سے۔ اس لحاظ سے اگر جبلت کو جذبہ کا ہم معنی قرار دیا جائے تو اس کی ماہیت کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حیوانی اختلاف کے ساتھ جبلتیں بھی مختلف ہو جاتی ہیں کیونکہ مختلف انواع کی فطری ساخت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے یہ اختلاف کچھ تو آلات حس اور آلات حرکی میں ہوتا ہے اور کچھ اعصاب اور

---

[1] نفسیات جبلت پر معارف کی پرچہ میں ڈیرو ڈی آرمن مسٹر ایم اے نے ایک مضمون لکھا تھا جس سے یہ عبارت منقول ہے۔ ملاحظہ ہو ڈورتھی کی نفسیات باب ششم صفحہ ۱۰۰۔

مراد عصبی میں جو آلات جس کے ذریعہ خود تنبیہ آلات حرکی میں حرکت باعث ہوتے ہیں "مقدمین اضطراری فعل کو جبلی فعل سے کہیں سادہ بتلاتے ہیں لیکن اس بنیاد پر ان میں تفریق ناممکن ہے کیونکہ زیادہ سے زیادہ ڈگری کا فرق قایم جاسکتا ہے نہ کہ قسم کا۔ اضطرارات میں سادہ ترین اضطراری فعل بھی مرکب ہوتا ہے جیسے کھانسی جو ایک مرکب اضطراری فعل ہے بہرحال خلاصہ یہ کہ جبلت ردعمل کے نظری میلان کا نام ہے نہ کہ فوری ردعمل کا۔ اگر کسی محرک کا فوری ردعمل ہو اور معاملہ دیر میں ختم ہو جائے تو وہ اضطراری فعل ہے لیکن جب ایک مہیج کسی ردعمل کا میلان پیدا کرے جو فوری نہ ختم ہو اور مقصد تک جلد نہ پہنچے بلکہ دیر تک استقلال کے ساتھ برسرکار رہے اور ردعمل کا باعث ہوتا جائے تو ہم اس کو جبلت کہیں گے مثلاً مرغی کا انڈے سینا یا چڑیا کا گھونسلا بنانا۔ یہ میلان بذاتہ نہ کسی مفید مقصد کے ردعمل میں آسانی پیدا کرتا ہے اور نہ مضر حرکات سے باز رکھتا ہے بلکہ احساسی ہیجانات سے مل کر ان کے پیدا کرنے میں مدد ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں اس کا بھی خیال رہنا چاہئے کہ ہماری تمام جبلتیں یہ وقت واحد ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ آہستہ آہستہ ظہور میں آتی ہیں بہرحال جبلت کی منظم تعریف میں مختلف ماہرین نے مختلف نقطۂ نگاہ سے بحث کی ہے چنانچہ انسپر اس کو مرکب فعل اضطراری کہتا ہے وہ طبقہ جو مطالعۂ باطن کو اہمیت دیتا ہے اس کو خاص قسم کی عمل کا نتیجہ سمجھتا ہے اور بعض لوگ اس کو اضطراری افعال کا سلسلہ بتلاتے ہیں۔ ان تمام اختلافات کو مدنظر رکھ کر اگر میکڈوگل نے ایک معقول منطقی صورت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ وہ اس کی تعریف کرتا ہے کہ یہ متواریث فطری نفسی طبعی میلان ہوتا ہے صاف میلان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ایک خاص قسم کی اشیاء دیکھے اور ان کی طرف توجہ کرے اور ان کو دیکھ کر ایک خاص جذبی کیفیت محسوس کرے اور ایک خاص طریقہ سے اس کے متعلق عمل کرے یا کم از کم وہ اس قسم کے عمل کی طرف مائل ہو۔"

اس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ میکڈوگل کے نزدیک فطری نفسی طبعی میلان جبلت کا جوہر ہوتا ہے یعنی یہ کہ جبلت خاص نفسی طبعی [illegible] ہوتا ہے جس میں تین اجزا لاینفک ہوتے ہیں وقوفی، مرکزی اور حرکی۔ اور انہی کے مجموعہ کو جبلت اور ان کے مظاہرات کو جبلی کردار کہا جاتا ہے۔

ان تمام بیانات کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کھیل کی کوئی مخصوص جبلت قطعی نہیں ہوتی کیونکہ بصورت دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ کھیل کی صورت میں بھی خاص خاص قسم کے حرکات ان خاص خاص قسم کا معروض ہو لیکن یہ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ کھیل میں مختلف قسم کے حرکات ہوتے ہیں دوڑنا، پھاندنا، ہیجانات، ہر کائنات کی تمام اشیاء کھیل کیجا سکتی ہیں اسلئے اس لحاظ سے بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ کھیل کی کوئی جبلت نہیں ہوتی گذشتہ صفحات میں ہم نے کھیل کی ماہیت اور نوعیت پر مفصل بحث کی ہے اور ماہیت کے متعلق اکثر شاؤ کے نظریہ کو منتخب کیا ہے کہ کھیل کی بوجب کھیل کی ایک جبلت فرض کیجا سکتی ہے لیکن نوعیت کے متعلق ہم اکثر میکڈوگل کے بیان کو پڑھتے ہیں تو کھیل کی جبلت سے انکار کرنا پڑتا ہے جس کا خود شاؤ نے بھی تصفیہ نہیں کیا تھا۔

بہرکیف اس کا آخری فیصلہ ہمارے اختیار سے پرے ہے کیونکہ کوئی ایسا نظریہ قایم کرنا جو تمام اشکوک کے حلول کا ضامن ہو بطلان مقابلہ کے بعد مشکل ہے تاہم کسی جدید انکشاف تک ماہیت و نوعیت کے متعلق شاؤ اور میکڈوگل دونوں کے نظریات قابل قدر اور اعلیٰ ہیں جس کی نعمت جدید شکوریے

اشاراتِ اعجام پر ایک تفصیلی نظر

(۱)

جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین

اُردو رسم خط کی اصلاح کے متعلق ایک عرصہ سے رسالوں میں مضامین شائع ہوتے رہے اور اس میں رسالہ فصیح الملک نے تو کتابت کی ایک حد تک پابندی بھی شروع کر دی تھی لیکن یہ پابندی عالم گیر نہ ہونے پائی، بالآخر انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کی سعی سے حیدرآباد دکن میں ایک مجلس قایم ہوئی۔ اور اس کے ارکان نے اصلاح رسم خط، تبدیل املا پر خیال آرائیاں کرتے ہوئے بالاتفاق "اوقاف" کے لئے حسب ذیل اسماء و علامات مقرر کر دیئے:-

۱۔ فل اسٹاف (وقفہ)	۵۔ ان ورٹڈ کاما ز (واوین)
۲۔ کولن (نیم وقفہ)	۶۔ نوٹ آف ان ٹروگیشن (سوالیہ)
۳۔ سمی کولن (رابطہ)	۷۔ نوٹ آف انٹرجیکشن (ندائیہ)
۴۔ کاما (سکتہ)	۸۔ بریکٹس (قوسین)

(رسالہ اُردو صفحہ ۵۸۲۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء)

اس "بالاتفاق" فیصلے کے باوجود خود مجلس کے قایداعظم نے "نیم وقفہ" کو وقفہ اور "ندائیہ" کو نجائیہ اور "وقفہ" کو ختمہ سے بدلنا شروع کر دیا، ذیل کے مضمون میں جناب متین صاحب نے نہایت توجہ کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس لئے بحث کا اصل مسئلہ قابل توجہ ہے۔

(مجلۂ مکتبہ)

(۱)

تمہید۔ شیخ سعدی کے اس حکیمانہ مقولے سے کہ "سہ چیز پایدار نماند: مال بے تجارت، وعلم بے بحث، وملک بے سیاست" کون انکار کر سکتا ہے۔ بحث مباحثے، مناظرے، مشاعرے، موزانے، محاکمے، تبصرے اور انتقادی مقالے تذکارِ علمیہ کو فروغ دینے کا واحد ذریعہ ہیں: علمی مجلسیں اور ادبی محفلیں انہیں سے اُبھرتی اور سنورتی ہیں اور انہیں سے ترقی، وعروج بھی پاتی ہیں۔

اُردو شعراء کے تذکرے، دراصل اُن کی عجیب وغریب ذہنیتوں کی یادگار ہیں جن کے ذریعہ

ان کی اپنی اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ جب ہم اس زمانہ کا پچاس سال پہلے کی حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو بہت نمایاں تبدیلی پاتے ہیں، کیونکہ اس زمانہ کی حالت یہ تھی کہ تعصب[1] اور ہٹ دھرمی کی گھٹاؤں نے علمی فضا کو تاریک بنا رکھا تھا: لفظی بحث پر ہاتھا پائی کی نوبت آجاتی تھی، فریقین کے دل میں معاندانہ جذبات برسوں تک قائم رہتے تھے: ایک دوسرے کے جابرانہ رُعب کی وجہ کسی کو کسی کے کلام پر نکتہ چینی کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، علمی مجلسیں سرد پڑی ہوئی تھیں۔ علمی طبقہ کے لوگ، اس خیال کے مدِّنظر کہ مصنفین[2] ہمیشہ نشانۂ ملامت بنتے رہتے ہیں، تصنیف و تالیف کے کاموں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، حق گوئی موجب شر سمجھی جاتی تھی اور حق نیوشی باعث ایذا۔ طلبۂ علماء معترضین کے جواب کو "جواب جاہلانہ باشد خموشی" کے خیال کی تائید میں مُہر بلب تھے، یا تو معترضین اور ناقدین نظروں میں کھٹکتے تھے یا تو ان کی موشگافیوں پر کفر و الحاد کے فتوے دیئے جاتے تھے، یا تو ان کی ذاتیات سے بحث کر کے اُن کی شخصیت پر بُرا اثر ڈالنے کی کوشش کیجاتی تھی غرضکہ اُن کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے کوئی تسمہ لگا نہ رکھا جاتا تھا۔

جب سے اُردو زبان کی مربوط تاریخ شروع ہوتی ہے، دلّی اور لکھنؤ ہمیشہ لفظیات کی جنگ میں دست و گریباں رہے: سودا[3]، فاخر مکین، انشاء، مصحفی، ناسخ اور آتش، دبیر و انیس میں محض تنازع لفظی، بناء پر فاسد رہی، اور یہی پر خاش ہجوؤں، مُشاتوں اور مُشاجروں کی شکل میں رونما ہوئی۔ ایک شخص دوسرے کے اعتراض کو، خواہ وہ صداقت ہی پر مبنی کیوں نہ ہو اپنی شخصیت و نفوذ پر بُرا اثر پڑنے کے اندیشہ سے نہیں مانتا تھا۔ لیکن[4] "خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اب مصنفین اور اُن کے ہوا خواہ اپنی معنوی اولاد پر کسی کو تنقید کرتے ہوئے دیکھکر بے دھڑک چراغ پا ہونا چھوڑتے جا رہے ہیں" اور علمی فضاء جہل و نادانی کی بس بھری ہواؤں سے، پاک و صاف ہوتی جا رہی ہے جب سے "روح تنقید" کے فاضل مصنف نے اس گران قدر کتاب کو، ملک میں شائع کر کے اردو دنیا پر احسان عظیم کیا ہے، تنقید کا معیار بلند ہوتا جا رہا ہے: فاضل اہل قلم، تنقید اور اعتراض پر ناک بھوں چڑھانے

---

[1] تفصیل کے لئے "روح تنقید" مصنفہ مولوی سید محی الدین قادری صاحب زورؔ ایم۔ اے صفحہ (۲۹) ملاحظہ ہو۔

[2] کسی عرب کا قول ہے: "مَنْ صَنَّفَ فَقَدِ اسْتَهْدَفَ" جس نے تصنیف کی، نشانہ ملامت بنا۔

[3] "آبحیات" صفحہ ۱۶، ۱۷، ۳۱۷ و ۳۲۵ ملاحظہ ہو۔

[4] "روح تنقید" صفحہ (۲۹)

سے باز آرہے ہیں، اور اب پھر اپنی غلطیوں کا مان لینا دانشمندی میں داخل ہوگیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مقالہ نگار، اس وقت تک طبقہ مصنفین میں جگہ پانے کے مستحق نہ ہوں گے جب تک کہ اُن کے چند مقالوں پر شدت کے ساتھ، غیر جانبدارانہ تنقیدیں نہ لکھی جائیں۔

وہی رائیں اور تبصرے آنکھوں میں جگہ دینے کے قابل ہیں جو معقولیت پر مبنی ہوں، ورنہ وہ ایک دعویٰ ہی دعویٰ ہے جس کا اخبار کسی بار ثبوت کا منت پذیر نہیں، اعتراض، مضامین یا مقالوں کو خامیوں سے پاک کرنے اور اُن کو صحت و معقولیت کا جامہ پہنانے کے لحاظ سے مفید سمجھے گئے ہیں، لیکن وہ اعتراض غیر سنجیدہ ہوتے ہیں جو بلا کسی غور و خوض کے کئے جاتے ہیں اور تحقیقی دائرے میں دلائل و براہین یا کسی معنوی حقیقت کے حامل نہیں ہوتے۔ دنیا میں ہمدرد، مخلص اور آزاد نگار نقادوں کا فقدان ہے؛ اس عصرِ قحط الرجال میں بھی چند شخصیتیں ایسی موجود ہیں، جن کے نوکِ قلم کے تیز تشتر مرہم جراحت ثابت ہوئے ہیں۔

مجلۂ مکتبہ، جلد (۱)، شمارہ (۲)، بابتہ تیر ۱۳۳۳ف فصلی میں، ہمارا ایک مضمون، جو اُردو پنکچویشن یعنے اشارات اعجام کے زیرِ عنوان، شائع ہوا ہے اس کی نسبت، روزنامہ "بمبئی کرانیکل"[1] اور "اخبار رعیت"[2] کے فاضل مُدیرین نے اپنی جن قیمتی رایوں کا اظہار فرمایا ہے اگرچہ وہ ہمارے متزلزل ارادوں کو استحکام بخشنے اور پہلے سے زیادہ اپنے علمی کاوشوں کے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے کافی ہیں۔

تاہم اس موقع پر ہمارا یہ بیان، موجب طوالت نہ سمجھا جائے گا کہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے معتمد "ترقی اردو" جن کے علمی و ادبی کارنامے دنیائے اردو کے آسمان پر روشن ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں اور مولوی سید محی الدین قادری صاحب زورؔ ایم۔اے جو اس وقت انگلستان میں آرین زبانوں کی تحقیقات میں مصروف ہیں باوجود اپنی بے انتہا مصروفیتوں کے ان بزرگواروں نے بھی اس کے متعلق دلچسپی لے کر اپنی رائیں روانہ کرنے کا بذریعہ خطوط وعدہ فرمایا ہے جن کا ہمیں سخت انتظار ہے۔

ایک اور بزرگ، مولوی سید زبید احمد صاحب یم۔اے۔ پروفیسر عربی جامعہ الہ آباد نے بھی، جو اس وقت انگلستان میں مشہور و معروف پروفیسر ڈاکٹر آرنلڈ کے، زیرِ نگرانی تحقیقات علمیہ میں مصروف ہیں اور جن سے غائبانہ تعارف و نیاز مولوی زور صاحب کی بدولت میسر ہوا، اپنی زرین رائے روانہ کرکے "مکتبہ" جلد (۱)، شمارہ (۵)، بابتہ مہر ۱۳۳۳ف کے صفحات کو جو زینت دی ہے وہ جالب توجہ ہے:۔

زور ایم اے حقیقتہً ــــ جیسا کہ پروفیسر صاحب نے لکھا ہے: "آپ اُن چند سعادت مند

---

[1] "بمبئی کرانیکل" بابتہ، ۱۱ جون ۱۹۲۶ء۔ ۱۲

[2] "اخبار رعیت" (حیدرآباد) جلد (۱)، شمارہ (۳۸)، بابتہ ۲۰ شہریور ۱۳۳۳ف ۱۲

صاحب فضل اور ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں، جن کے ابتدائی زمانہ طالب علمی کے کارنامے، اُن کے مستقبل قریب میں اُردو کے مایۂ ناز جیّد عالم ہونے پر بداہتہً دلالت کر رہے ہیں..... "—— قابل وقعت ہستی ہیں۔ انھوں نے خط کے ذریعہ، ہم سے اپنی رائے روانہ کرنے کا وعدہ ہی نہ فرمایا، بلکہ پروفیسر صاحب کی توجہ ہمارے مضمون کی جانب منعطف کرائی اور اُن کے اس وعدہ کی —— جو انھوں نے رائے لکھنے کا قصد ظاہر فرمایا تھا —— خوشخبری بھی دی۔ ایسے زمانے میں، جبکہ سنجیدہ سے سنجیدہ طبیعتیں، علمی و تحقیقی مقالوں کو خشک، اور افسانوی مضامین کو دلچسپیوں کا موجب سمجھتے ہوئے، اس جانب بہت کم توجہ کر رہی ہیں؛ پروفیسر صاحب کا باوجود اپنے انتہائے شغف و انہماک کے، ہمارے ناچیز خیالات کی جانب توجہ فرمانا اور اپنے مخلصانہ مشورہ سے ہم کو استفادہ کا موقع دینا، ہمارے لئے تشکر و امتنان کا ہی موجب نہیں، بلکہ ہم اس کی وجہ سے ایک ایسی شاہراہ پر آگئے ہیں جس سے بھٹکنا ناممکن ہے۔

اس قدر "احوال واقعی" کی گذارش کے بعد، ہم پروفیسر صاحب کی رائے کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں: پروفیسر صاحب نے خاص کر، اُردو پنکچوئیشن کے مصطلحات پر جہاں اپنی رائے میں روشنی ڈالی ہے، مناسب ہوتا، اگر اس کے ساتھ ساتھ، ہمیں یہ بھی بتلا دیتے کہ عہد حاضر کے جدید مصری ادیبوں نے، اپنی زبان میں، پنکچوئیشن کے مجموعی اور تفریدی اسماء و اعلام کا، کن الفاظ میں ترجمہ کیا ہے اور ان کے لئے دیگر سامی و اسلامی السنہ میں کیا اسماء و علامات مقرر ہیں؛ کہاں تک اُن میں اصلاح کی ضرورت ہے، لسانیاتی نقطۂ نظر سے اس کا کوئی جزو تبدیل و ترمیم کے قابل تو نہیں؟

(۲)

ذیل میں ہم، لسانی و انتقادی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے، پروفیسر صاحب کی اُن توجیہات کی نسبت (جن سے ہم کو جزئی اختلاف ہے) تفصیلی بحث کرنا چاہتے ہیں:-

اشارات اعجام کی معنوی ترکیب | ۱- پروفیسر صاحب، "اشارات اعجام" یعنے (PUNCTUATION) پنکچوئیشن کے ترجمہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ "غیر مانوس ترکیب ہونے کے علاوہ معنے کے لحاظ سے بھی صحیح نہیں" یہ بات "فرہنگ اصطلاحات علمیہ"[1] پر نظر غائر ڈالنے سے واضح ہو سکتی ہے کہ فنی اصطلاحیں بالعموم غیر مانوس ہوتی ہیں، لیکن جب اُن کا استعمال شروع کر دیا جائے گا تو رفتہ رفتہ، ان سے غرابت و اجنبیت دور ہو کر روزمرہ میں داخل ہوتی جائیں گی[2] واضعین لغت و ماہرین علم بیان، جب کسی خیال کی ادائی یا کسی لفظ کے ترجمہ کے لئے کوئی لفظ لیتے ہیں تو ان کے پیش نظر یہ بات رہتی ہے کہ لفظ سلیس ہو یا غریب، مگر

---

[1] مرتبہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۲- [2] ضمیمہ فلسفہ جذبات صفحہ ۲۳۶-۱۲

مگر اس میں جامعیت و جزالت کا ہونا ضروری خیال کرتے ہیں یعنی یہ دیکھتے ہیں کہ آیا اس لفظ میں، اس خیال کی ادائی کی قوت یا اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں کچھ علاقہ بھی ہے یا نہیں اور اگر اس میں کچھ معنوی تعلق ہے بھی تو اس میں اصطلاح بننے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے یا نہیں۔

اردو ادبیات کی تاریخ کا، گہری نظر سے مطالعہ کرنے پر اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اب تک جتنے بھی الفاظ اردو زبان میں داخل ہوئے ہیں وہ اکثر فارسی زبان کی وساطت سے داخل ہوئے اور اب بھی اسی خیال کی تحت ہم کو فارسی سے مدد لینے کی ضرورت پڑی:۔

پنکچوئیشن کا ترجمہ اہل ایران[1] نے "اشارات اعجام" کیا ہے اور اس لفظ کو خاص کر اُن ایرانیوں[2] نے، جو اس وقت یورپ میں رہ کر مستشرقین کے دوش بدوش کام کر رہے ہیں، استعمال کیا ہے۔ اس لفظ کی ترکیب معنوی اعتبار سے غلط نہیں معلوم دیتی: "اشارات" کا لفظ رموز، علامات، کنایات کا مترادف ہے؛ یہ لفظ دراصل اسم جمع ہے، اس کا واحد "اشارہ" ہے اور آج کل ہماری تعلیمی اصطلاح میں اس کا استعمال انٹنس (HINTS) اور نوٹس (NOTES) کے عوض بھی ہو رہا ہے۔ بجائے رموز کے اشارات کا لفظ اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ رموز کے معنی لغت میں طعنے تشنہ کے آئے ہیں جو ایک مجاز عرفی کی صورت ہونے کے اعتبار سے معنوی التباس پیدا کر رہا ہے، اور لفظ علامات میں، ہر وہ شخص جو ذوق سلیم رکھتا ہے اس کنہ کو پا سکتا ہے کہ اصطلاحی لفظ بننے کی کس قدر صلاحیت ہے؟ ..... عہد حاضر میں جب کہ علمی طبقہ کی ذہنیات پر غالبیت کا عنصر غالب ہوتا نظر آ رہا ہے اور جس طرح غالب کی تنوع پسند طبیعت نے قدیم تشبیہوں اور قدیم ترکیبوں کو ــــ جن میں کثرت استعمال کی وجہ ابتذال پیدا ہو چلا تھا، ــــ قطعاً ترک کر کے نئی نئی ترکیبیں ایجاد کیں، کیا وہ ایسے الفاظ کو پسند کر سکتی ہیں؟[3]

---

[1] رسالہ "اردو"، جلد سوم، حصہ دہم، بابتہ اپریل ۱۹۲۳ء صفحہ (۲۹۶)

[2] مجلۂ "ایران شہر" شمارہ (۶)، سال (۳)، بابتہ اپریل ۱۹۲۵ء میں آقا سید حسین کاظم زادہ مدیر مجلۂ مذکور کا مضمون "اصلاحاتیکہ بودجہ لازم ندارد"، ملاحظہ ہو ۱۲

[3] مجلۂ مکتبہ:۔ ایک اصولی بحث میں اس فضا سے مرعوب ہونے کی ضرورت تو نہیں معلوم ہوتی، ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب پروفیسر ادبیات انگریزی نے جو مقالہ غالب پر لکھا ہے اگر وہ مضمون نگاہ کے مطالعہ میں آجاتا تو شائد اس خیال کو دلیلی طور پر پیش نہ کیا جاتا کہ خود غالب نے عام ذہنیت پر غالب آنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ تنقید نگاروں کی ذہنیت غالب پر ایسی غالب آگئی کہ عام ذہنیت اُن کے وقار ذہنیت میں آگئی!

لفظ اعجام کی لغوی حقیقت

اعجام کا لفظ نہایت وسیع المعنیٰ ہے، جس کے معنی صرف نقطے لگانے کے لینا، تحقیقی نظر میں محتاج تصحیح ہے۔ نکلسن (NICOLSON) کی تاریخ "ادبیاتِ عرب" (LITERARY HISTORY OF THE ARABS) کے ملاحظہ سے یہ امر واضح ہو سکتا ہے کہ نقطوں کا وجود تقریباً ۸۰ ہجری تک بھی نہ تھا، اُن کا موجد دراصل خلیفہ عبدالملک کے عہد میں، عراق کا عامل حجاج بن یوسف[1] تھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حجاج ابتداء میں ایک معلم تھا اس کو تعلیم دینے میں اوّلین وقت جو پیش آئی وہ نقطوں کا نہ ہونا تھا۔ اسی ضرورت کے احساس نے اُس کو شناخت کے لئے حروف پر نقطے لگانے کے متعلق مجبور کیا۔

اس تاسیس حقیقت پر اعجام کے معنوں کو حروف ہی کے لئے مخصوص کرنا محدود نظری کو کام میں لانا ہے۔ نظر تو ہمیشہ الفاظ کی معنوی وسعت پر رہنی چاہیے۔ الفاظ خیال کے مخزن رکھنے کا بکس ہوتے ہیں جس لفظ میں جتنی وسعت دیکھتے ہیں اُس میں اتنی ہی پہنائی کی چیز رکھ چھوڑتے ہیں۔ اس لئے اگر اعجام کے اصطلاحی معنوں (مثلاً: نقطے لگانا) سے قطع نظر کر کے اس کی لغوی حقیقت پر غور کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس لفظ میں ہنکیوئیشن کے مفہوم کو ادا کرنے کی جو قوت و جزالت موجود ہے وہ کسی دوسرے لفظ میں نہیں پائی جاتی۔

اعجام کے معنے لغت میں گونگے پن کو دور کرنے یا الفاظ دیگر گویائی بخشنے کے ہیں۔ چونکہ اعجامی علامتیں بے اعجام کی عبارت سے ابہام دور کر کے (اُس کو) معنی خیز بنا دیتی ہیں۔ اس لئے یہ لفظ (اعجام بالکسر) یا اُس کے مترادف الفاظ تعجیم یا تنقیط اس معنی میں زیادہ موزوں نظر آتے اور ہنکیوئیشن کا صحیح ترجمہ ہو سکتے ہیں جس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول[2] "اِنَّ الْکَلَامَ یَلْحَنُ کَمَا یَلْحَنُ الْکَلَامُ وَالسِّنَانِیْرُ" میں غیر نحوی کلام کی تشبیہ سگ و گربہ کی چیخوں سے دی گئی ہے۔ اسی طرح اگر بے اعجام کی عبارت کو گونگوں کے الفاظ و اصوات سے تعبیر کی جائے اور اعجام والی عبارت (عبارت مُعْجَمَہ یا مُعَجَّمَہ یا مُنَقَّطَہ) کو کسی گویا شخص کے الفاظ سے مراد لی جائے تو اعجام کی معنوی حقیقت آشکار ہو سکتی ہے۔

صاحب تاج العروس[3] نے "نہایہ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ اَعْجَمْتُ الْکِتَابَ اَیْ نَقَّطْتُہٗ وَفِی النِّہَایَۃِ: اَزَلْتُ عُجْمَتَہٗ اَوِ اسْتَعْجَمْتُہٗ، یعنے میں نے کتاب پر نقطے لگائے اور "نہایہ" میں اس کی معنوی توضیح اس طور پر کی گئی ہے کہ میں نے کتاب کی عُجْمَت یا اس کے استعجام [گونگے پن] کو دور کیا ابن سیدہ کہتا ہے: اعجام میں ہمزہ، سلبی ہے کیونکہ "اَفْعَلْتُ" اگرچہ اس کی اصل اثبات ہے مگر

---

[1] لائبریری ہسٹری آف دی عربس صفحہ (۲۰۱)

[2] (ترجمہ) اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جس کلام میں نحوی ترکیبیں نادرست ہوتی ہیں اس کو کتے اور بلی کی آواز سمجھنی چاہیے ۱۲

[3] تاج العروس فی شرح القاموس، صفحہ (۳۹۰) ملاحظہ ہو ۱۲۔

کبھی کبھی سلب کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں: اَشْکَیْتُ زَیْدًا میں نے زید سے شکایت دور کی اور اسی قبیل کی دوسری نظیریں بھی عرب کے کلام میں موجود ہیں۔

اعجام کے مترادف الفاظ تعجیم اور تنقیط بھی ہیں: تاج العروس، صفحہ ۳۹۱ پر لکھا ہے کہ "تَعْجِیْمُ الْحُرُفِ تَنْقِیْطُہَا لٰکِنْ تَنْقِیْطٌ عُجْمِیَّۃٌ"، یعنی تعجیم کسی حرف کی دراصل اس کی تنقیط ہے تاکہ اس کا ابہام دور ہو جائے۔

لفظ علامات وقف کا جامع نہ ہونا۔

پروفیسر صاحب نے پنکچویشن کے ترجمہ میں "علامات وقف" کا جو لفظ پیش کیا ہے اس کے قبول کرنے میں ہمیں اس وجہ سے تامل ہے کہ وقف کے معنی لغت میں ٹھیرنے کے ہیں اور پنکچویشن کے بعض تفریدی نام ایسے بھی ہیں جو اوقاف کی تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ان ورٹڈ کامازِ (واوین)، ہائی فن (رابطہ)، ایکویشن (متساویہ) اور ڈائس آف اُمیشن (نقاطِ تقدیریہ)..... ..... گویا وقف کا لفظ ان معنوں پر حاوی نہیں۔

اشاراتِ اعجام کے مترادف الفاظ

قرآنی اوقاف، جن کو تجویدی اصطلاح میں "رموز اوقاف" کہتے ہیں، سجاوندی[1] کی تجویز کے بموجب کم و بیش ۱۹ ہیں، لیکن، ان علامات میں کوئی بھی جزو ایسا نہیں، جو اوقاف کی تعریف سے خارج ہوتا ہو۔ جس نام میں اتنی صلاحیت و قوت نہیں کہ وہ منطقی رو سے اپنے اجزاء کی تعریفوں اور مفاہیم پر حاوی ہو، پھر اس [قسم کے نام] کو تجویز کرنے کی کیوں ضرورت ہے؟ کیا "اشاراتِ اعجام"، "رموزِ اعجام"، "رموزِ تعجیم"، "اسرارِ تنقیط"، "مبادیٔ توقیف"، "رموزِ توقیف"، "دراشارات الوقوف"، "در رموز عبارت"، اوقاف و اعجام کے نحوی نام ہونے کے لحاظ سے پنکچویشن (PUNCTUATION) کے مفہوم کو نہیں ادا کر سکتے؟ جو ان کو چھوڑ کر "علامات وقف"، جس میں جزالت و جاذبیت بہت کم ہے، اختیار کیا جائے۔

رموزِ اوقاف" یا علاماتِ وقف" کی تراکیب میں اشتقاقی دقتیں

الفاظ کے ترجمہ کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب نے فرہنگِ اصطلاحاتِ علمیہ کے مقدمہ میں جن سات اصول کو قلمبند کیا ہے اس میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "یہ بھی جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض اصطلاحیں جو صحیح نہیں تھیں اور رائج ہو گئی تھیں یا جن سے اشتقاق و ترکیب کے رو سے آگے لفظ نہیں بن سکتے تھے، انہیں ترک کر دیا ہے اور ان کی بجائے دوسرے الفاظ وضع کر لئے گئے ہیں[2]۔" جب کہ وقف کے معنے پنکچویشن کے مفہوم کے ادا کرنے کی قوت نہیں رکھتے

---

[1] تاریخ القرآن، مصنفہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری صفحہ (۳۷)۔

[2] "فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ"، مرتبہ انجمن ترقی اردو، صفحہ (۴)۔

تو ہم بجائے اس کے مندرجۂ بالا اسماء میں سے کوئی ایک لفظ مثلاً "رموزِ تعجیم"..... وغیرہ کیوں منتخب نہ کریں؟ اس وجہ سے کہ پنکچوئیشن، عبارت میں اُن علامتوں کے لگانے کے عمل کا نام ہے جن کے ذریعہ ابہامات دور ہو کر فہم مطالب میں مدد ملتی ہے اور اعجام یا تعجیم بھی اسی مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔

لسانیاتی نقطۂ نظر سے اس قدر حقیقت کو منکشف کرنے کے بعد ہم یہ عرض کریں گے کہ "علاماتِ وقف" یا "رموزِ اوقاف" کے الفاظ کو اگر کوئی پنکچوئیشن کے بجائے پیش کرنا چاہتے ہوں تو ہماری نظر میں کوئی سلیس سے سلیس نام پنکچوئیشن کے مفہوم کو ادا کر سکتا ہے تو وہ "رموزِ عبارت" یا "رموز العبارت" ہے، یا اگر ایسا لفظ چاہیے جس سے اشتقاق و ترکیب کے رو سے آگے لفظ بن سکتے ہوں تو وہ "رموزِ توقیف" یا "رموز الوقوف" ہیں یا وہ الفاظ، جن کی تصریح ہم نے اوپر کر دی ہے زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔ اگر انہیں الفاظ کو فنی معنوں میں استعمال کرنا چاہیں تو بآسانی اعجامیات، تعجیمیات، تنقیطیات، توقیفیات، وقوفیات، رموزیات، بن سکتے ہیں۔ لیکن ان میں آخر الذکر سے دیگر اشتقاقات کے بنانے کی توقع رکھنا نہالِ بے ثمر کو ثمر دار بنانا ہے۔

پنکچوئیشن کے ترجمہ کی نسبت دیگر تراجم سے اختلاف

اعجام یا تعجیم کی موزونیت کو بہ دلائل ثابت کرنے کے بعد، ہم مولوی عبدالحق صاحب کی اس تجویز پر دو ایک طائرانہ نظر، ڈالنا چاہتے ہیں جس کو انہوں نے قواعد اردو کے جدید ایڈیشن، صفحہ ۲۶۶ پر پنکچوئیشن کے اردو ترجمہ میں "رموزِ اوقاف" یا "وقفے" کے الفاظ کی صورت کو پیش کیا ہے۔ رموزِ اوقاف تو خیر کسی توضیح کا محتاج نہیں لیکن، "وقفے"، کا لفظ ذرا کھٹکتا ہے "وقفہ" شائد اسم جمع ہے "وقفہ" کا، اور "وقفہ" مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق ترجمہ ہے "سی می کولن" کا کیا ہم "سیمی کولن"، پنکچوئیشن کے تمام اجزاء کے مفہوم کو ادا کر سکتا ہے؟..... اگر ہم نے تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا کہ "وقفے"، جمع ہے "وقف"، کی اور وقف نام ہے پنکچوئیشن کے ہر جزو کا، تو کیا ہم جرأت کے ساتھ قواعد اردو کے فاضل مرتب سے یہ امر دریافت کر سکتے ہیں کہ "وقفے"، وقف کی جمع خلاف قاعدہ کس طرح آسکتی ہے؟.....

ہم سے، ایک عربیت پرست بزرگ فرماتے ہیں کہ "رموزِ اوقاف"، ہی پنکچوئیشن کا مترادف سمجھا جائے، مگر ہم اُن کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ "رموزِ اوقاف"، نام ہے اُس مجموعۂ اجزائے اوقاف کا، جو عبارتِ قرآن میں (جن کو رموز القرآن بھی کہتے ہیں) مروج ہیں اگر اردو زبان میں، اُن کو من وعن، نقل کر لیا جاتا ہے تو اس صورت میں، ہم "رموز الاوقاف"، کو پنکچوئیشن کا مترادف یا قائم مقام سمجھتے، لیکن جب یہاں سرے سے ہی اوقافِ قرآنیہ کو نہیں لیا گیا ہے تو پھر اس کے مجموعی نام کو کیوں اختیار کیا جائے۔

(۳)

قاطعہ کی جامعیت اور اس کے ترک وقبول کی نسبت تجویزیں

۲ پروفیسر صاحب کا "قاطعہ" کے ترک کی نسبت، اس توجیہہ کے ساتھ مشورہ دینا کہ "فل سٹاپ کے لئے وقفہ بہتر ہے۔ قاطعہ سے قطع نظر کیجئے" محض شاعرانہ تخیل ہے۔ حالانکہ تجویدی اصطلاح میں[1] "وقفہ" دراصل "سکتہ طویلہ" کا نام ہے جہاں وقف کی حالت میں بغیر سانس توڑنے کے تھوڑے سے ٹھہراؤ کا عمل ہوتا ہے یعنی جتنی دیر سانس لینے میں ہوتی ہے، یہاں اس سے بھی کم ٹھہرتے ہیں "فل سٹاپ" مکمل جملہ کے خاتمہ پر ٹھہرنے کی علامت ہے جس پر "وقف تام" یا "وقفہ کاملہ" کا معناً اطلاق ہوتا ہے جب جملہ تمام ہوتا ہے اور اس کو جملہ مابعد سے لفظاً یا معناً کوئی تعلق نہیں ہوتا تو اس صورت میں ٹھہر کر سانس لینا ضروری ہوتا ہے؛ اس وجہ سے کہ فل سٹاپ کا محل استعمال یہ ہے کہ جب کسی جملہ یا فقرے میں، جو کسی عبارت کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے اور جس میں ایک پوری بات یا ایک پورا خیال ادا ہوتا ہے وہاں یہ علامت لگائی جاتی ہے، جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا یا یہ خیالی عبارت یا پیراگراف سے قطع کر لیا گیا؛ اس اعتبار سے قاطعہ کا لفظ زیادہ موزوں نظر آتا ہے نہ کہ وقفہ کا، مگر چونکہ اہل پنجاب کتب نصاب کے آخر میں حسب عادت مستمرہ، اعجام کی چند علامات کی فہرست جس میں "فل سٹاپ" کا ترجمہ "پورا وقفہ" کیا گیا ہے، دیا کرتے ہیں اور ایک عرصہ سے مستعمل بھی ہے؛ چونکہ مجاز مرسل کی ۲۴ صورتوں میں[2] ایک صورت[3] "تسمیۂ کل باسم جزو" بھی ہے یعنی جزو کہکر اس سے کل مراد لی جاتی ہے اس لحاظ سے مجازاً اس کے معنی وقفہ کے لئے جا سکتے ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب نے "فل سٹاپ" کا ترجمہ "ختمہ" کیا ہے، جس کی ترکیب غیر مانوس اور معنوی اعتبار سے درست نہیں معلوم ہوتی، اور نہ اس لفظ کو علمیت[4] سے کچھ مناسبت ہے؛ اس سے تو "وقفہ" کا لفظ ہی بہتر اور پہلے سے موجود و رائج ہے اور "ترقی اردو" کے اصول موضوعہ[5] کے مطابق درست بھی ہے؛ صرف اسی وجہ سے "قاطعہ" مستحسن الترک ہو سکتا ہے، ورنہ وہ دونو کیفیتیں، جو قطع و وقف سے پیدا ہوتی ہیں اُن کا حامل "وقفہ" ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور پھر مذاقِ سلیم کی آنکھ "قاطعہ" سے قطع نظر نہیں کر سکتی۔

---

[1] خلاصۃ التجوید صفحہ (۳۱)، سراج التنزیل صفحہ (۵۵)

[2] احسن القواعد، مولفہ مولوی نجف علی خاں مراد آبادی صفحہ (۳۳)

[3] حدائق البلاغہ، مصنفہ مولانا شمس الدین فقیر صفحہ (۴۷)

[4] مقدمہ فرہنگ اصطلاحات طبیہ صفحہ (۴) ملاحظہ ہو ۱۲

لفظ مُفرزہ کا ترک اور متوسط کی تجویز | ۳۔ مفرزہ۔ سیمی کولن کے لفظ کا ترک کرنا اُس وقت زیادہ مناسب ہوگا جب کہ اُردو والے اس کی بجائے "نیم وقفہ" کے لفظ کو قبول کرلیں۔ ورنہ مُفرِّزہ یا [اُس کا ہم وزن و مترادف] مُفرِّقہ سہل اللفظ ہیں اور حروف میں بھی نیم وقفہ سے کم۔ مُفرِّزہ، اسم فاعل ہے تفریز کا، جس کے لغوی معنے جدا کرنے والی علامت کے ہیں۔ چونکہ سیمی کولن کی علامت اُن بڑے بڑے جملوں کو، جو بغیر حروف رابطہ کے آپس میں مربوط ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے جدا کردیتی ہے۔ تجوید کی اصطلاح[1] میں "وقفِ مطلق" یا "وقفِ کافی" اسی مفہوم کو ادا کرتے ہیں کہ "بات تو پوری ہوگئی مگر ابھی مطلب تمام نہیں ہوا یعنی قائل کو ابھی کچھ اور کہنا ہے"، لیکن "وقفِ تام" اور "وقفِ کافی" میں یہ فرق ہے کہ اُس کو مابعد کے جملہ سے معناً یا لفظاً کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اِس سے لفظاً تو نہیں مگر، معناً ضرور تعلق ہوتا ہے[2] پنجاب والوں نے اس لفظ کا ترجمہ "تھوڑا وقفہ"[3] کیا ہے، شائد اسی کو ــــ کیونکہ یہاں وقفہ سے کم اور سکتہ سے زیادہ ٹھہراؤ ہوتا ہے، ــــ نیم وقفہ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے مگر اس سے، ایک بزرگوار نے[4] مطلق "وقفہ" مراد لیا ہے جس کی وجہ یہاں لفظی تنازع پیدا ہونے کا احتمال ہے ایسی صورت میں نیم وقفہ کا لفظ ہی بلحاظ عام فہم ہونے کے بہتر ہوگا۔ لیکن، صرف عام فہم ہونا، واضعین کے لئے کافی نہیں۔ سیمی کولن کے ترجمہ کے لئے اگر مُفرِّزہ موزوں نہیں تو اس کا قائم مقام متوسط ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ لفظ، ایسے وقفہ کے لئے تراشا جارہا ہے جو "سکتہ" سے زیادہ اور "قاطعہ" سے کم ہے۔ اس (درمیانی) گومگو حالت کو ادا کرنے کی معنوی قابلیت "مُتوسِّطہ" میں بدرجہ اعلیٰ موجود ہے۔

لفظ مُفسِّرہ کی ترویج کی نسبت مشورہ | ۴۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ "کولن" کے لئے بجائے شارحہ کے مُفسِّرہ بہتر سمجھتا ہوں کہ لفظ شارحہ کے مقابلہ میں شگفتہ ہے۔ حائے حطی اور ہائے ہوز کا اجتماع ثقالت سے خالی نہیں"۔ کولن کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے شارحہ، مُفسِّرہ، تفصیلیہ درست ہوسکتے ہیں لیکن اُن میں کام ایک لفظ، اپنے اپنے موقع پر کام دیتا ہے یعنی شرح کے موقع پر شارحہ کا لفظ شگفتہ نظر آتا ہے تفسیر کے موقع پر مُفسِّرہ کا اور تفصیل کے موقع پر تفصیلیہ کا، لیکن، چونکہ نحو اور فنِ املاء میں بہت قریبی تعلق ہے بلکہ فن املاء، نحو کا جزو لاینفک ہے اس لئے پروفیسر صاحب کی تحریر کے مطابق کہ "ایک ہی فن کی اصطلاحوں میں اشتباہ نہیں ہونا چاہئے"، مُفسِّرہ کا لفظ شائبہ پیدا کریگا۔ شارحہ کے تلفظ میں "حائے حطی" اور "ہائے ہوز" کا اجتماع، ہرگز ثقالت نہیں پیدا کرتا۔ اور نہ پروفیسر صاحب

---

[1] خلاصۃ التجوید، صفحہ (۳۰)

[2] مرقاۃ الادب، مولفہ ظفر اقبال صاحب ایم۔ اے، بی ٹی لکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور صفحہ (ط)

[3] قواعد اردو، جدید ایڈیشن، مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے، صفحہ (۲۶۶)۔ ۱۲

نے ثقالت کی کوئی وجہ بیان کی ہے، حائے حُطی اور ہائے ہوز اُن چھ[1] حروفِ حلقی میں شامل ہیں، جن کے مخرج آخرِ حلق، وسطِ حلق، ابتدائے حلق سے نکلتے ہیں (جن کو تجویدی اصطلاح میں اقصائی، وسطی، ادنائی کہتے ہیں) جیسا کہ قرآن شریف کی اس آیت اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ میں اَعْهَدْ کا لفظ واقع ہوا ہے جو باوجود حروفِ حلقی کے اجتماع کے ثقیل نہیں مانا جاتا۔ یوں تو بیسیوں لفظ ایسے بھی موجود ہیں جن میں حائے حُطی اور ہائے ہوز کا اجتماع ہوا ہے مگر ثقیل نہیں مانے جاتے۔ کیا اس قسم کے الفاظ، لغات و مصطلحات سے، اس خیال کے مطابق خارج کر دینے چاہئیں؟..... مثلاً فاتحہ، سانحہ، لائحہ، اعمالِ صالحہ، کرہٗ مُسطّحہ یا عین و ہاء کے اجتماع سے ــــ جامعہ، قطعۂ اَشعّہ، شہبِ متفرقعۂ (نیازک متفرقعہ)، کرہ مصطنعۂ[2] ..... وغیرہ۔ یہ اعتراض تو مفسّرہ پر ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں حرفِ مُشدّد، جس کو فنی اصطلاح میں مُثقّل بھی کہتے ہیں، ثقالت پیدا کر رہا ہے۔ یہ خیال محتاجِ تصحیح ہے کہ ایک ہی لفظ میں دو قریب المخرج یا متحد المخرج حروف کا اجتماع، ثقالت پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ اگر پروفیسر صاحب کی ثقالت سے تنافر مراد ہے تو، اہلِ بلاغت کے زاویہ نگاہ سے کسی جملہ میں، ایسے حروف کا اجتماع، جن کا متحد المخرج ہونا ثابت ہو، تنافر پیدا کرتا ہے[3]۔ نہ کہ صرف ایک لفظ میں؛ لیکن مفسّرہ کا لفظ "شارحہ" اور "تفصیلیہ" کی نسبت کرتے، بلحاظ جامع ہونے کے اختیار کرنے کے قابل ہے مگر اس اعتراض کی بنا پر نہیں جو شارحہ پر کیا گیا ہے۔

لفظ سکتہ کی مقبولیت۔ ۵۔ "گاما کے لئے سکتہ بہتر ہے" اس لفظ کے بہتر ہونے میں کس کو کلام ہے اور اس کے قبول کرنے میں کس کو تامل؟ اس لئے کہ اس لفظ کو ثقات نے بالاتفاق مان لیا ہے۔ اگرچہ "وقفہ قصیرہ" یا "وقفہ صغیرہ" بھی اسی مفہوم کو ادا کرتے ہیں لیکن ثقات (اُن کو) کیوں مانیں گے؟

لفظ واوین کی شگفتگی۔ ۶۔ "اِن ورٹڈ کامز" کے لئے "واوین" کے لفظ کی تجویز اگرچہ مُمیّزہ، اقتباسیہ، ناقلہ بھی اپنے اپنے موقع پر شگفتہ ہیں، لیکن جامع نہیں] مناسب ہے، کیونکہ اس سے ایک حد تک مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔

استفہامیہ کی موزونیت ۷۔ "گونُری" کے لئے استفہامیہ کا لفظ ہی مناسب ہے جو کسی توضیح مزید سے مستغنی اور ایک

---

[1] خلاصۃ التجوید، مولفہ مولوی قاری محمد منیر علی صاحب عثمانی شیخ التجوید کلیۃ المعلمین حیدرآباد صفحہ (۱۰)

[2] آخر الذکر اصطلاحیں علم ہیئت کی ہیں [فرہنگ اصطلاحات علمیہ، صفحہ ۱۴۱۹] ۱۲۰

[3] تسہیل البلاغہ، مولفہ مولوی مرزا سجاد بیگ صاحب مرحوم صفحہ (۱۷۲) بحر الفصاحت صفحہ (۱۰۲۶)

عرصہ سے مستعمل ہے!

فارقہ کا ترک اور خط فاصل کا استعمال | ۸۔ ڈیش کا لفظ، قبول کرنے میں تامل نہ تھا، مگر ہم کو اس کا مترادف لفظ "خط" [جس کو سابق میں خطِ فاصل بھی کہتے تھے] مل گیا ہے۔ جو ڈیش سے بھی سہل التلفظ اور سہل الاطلاق ہے۔

فجائیہ کی جامعیت | ۹۔ انٹرجکشن کے لئے جذبیہ کا لفظ اس صورت میں زیادہ مناسب ہوتا، جب کہ اردو میں اس سے کوئی جامع لفظ نہ ملتا۔ اگرچہ انجذابیہ کا لفظ، قریب التلفظ ہونے کے اعتبار سے انٹرجکشن کا قائم مقام ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن "فجائیہ" کا لفظ بلحاظ اپنی جاذبیت وجامعیت کے ان دونوں کے مقابل مستحسن الرواج نظر آتا ہے، کیوں کہ جو تفاوت، فعل وانفعال کے معنوں میں ہے وہی جذب وانجذاب کے معنوں میں بھی یعنی جذب کے معنی اثر آفرینی کے ہیں اور انجذاب کے معنی اثر پذیری کے لیکن انٹرجکشن کے معنی حروف ندا یہ ــــ ندا، تعجب، حسرت، افسوس، مسرت، التماس ــــ کے اظہار کی علامت کے ہیں، اور عہد حاضر کے محققین نے ان تمام الفاظ (حروف) کے مفہوم کے لئے فجائیہ کا لفظ [جس سے مراد صرفی اصطلاح میں وہ الفاظ ہیں جو بحالت جوش وجذبہ اچانک طور پر زبان سے نکل جاتے ہیں] تجویز کیا ہے۔ چونکہ انٹرجکشن کی علامت بھی، انہیں الفاظ کے لئے مخصص ہے اس لئے، فجائیہ کا لفظ تجویز کرنا خالی از حکمت نہیں اور نہ تقاضا کو اس کے ماننے میں تامل ہوگا۔ ہماری نظر میں، اگر کوئی لفظ فجائیہ کے بعد، موزوں بھی ہوتا، تو ہم، فوق الذکر توجیہ کی بنا پر انجذابیہ ہی کے لفظ کو پیش کرتے۔

رابطہ کی مناسبت | ۱۰۔ ہائی فن کے لئے رابطہ کے لفظ کو قبول کرنے میں کس کو تامل ہے؟ اگرچہ ایک رگ نے اس کا ترجمہ "زنجیرہ" بھی کیا ہے، لیکن چونکہ ہائی فن کے لغوی معنی مرکب الفاظ کے اجزا کو ملانے والی علامت کے ہیں، اس لئے اسی مناسبت سے اس لفظ کا ترجمہ ٹھیک طور پر رابطہ ہی ہو سکتا ہے نہ کہ زنجیرہ۔

مساویہ کا رواج | ۱۱۔ ایکویشن کے لئے "متساویہ" کے لفظ کی تجویز نہ صرف مناسب بلکہ احسن ہے اس لئے کہ اردو میں کوئی اور لفظ اس کا مترادف نہیں۔

سلہ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اس لفظ کا ترجمہ "خط" ہی کیا ہے (قواعد اردو، جدید ایڈیشن صفحہ ۲۶۶)

سلہ قواعد اردو، جدید ایڈیشن، صفحہ (۱۲۳)

سلہ " " " (۲۶۶) پر انٹرجکشن کا یہی ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲

سلہ اس سے مراد مولوی عبدالحق صاحب ہیں [قواعد اردو، جدید ایڈیشن صفحہ (۲۶۶) ملاحظہ ہو] ۱۲

سلہ دی اسٹوڈنٹس پریکٹیکل ڈکشنری، صفحہ (۳۹۶)۔ ۱۲

لفظ قوسین کا جامع ہونا

۱۲۔ بریکٹ اور پارنتھیسس کے لئے بجائے بیانیہ اور معترضہ کے اردو میں قوسین سے بہتر و جامع کوئی لفظ نہیں ملسکتا۔ کیوں کہ اُن کے لئے جو علامتیں مقرر ہیں وہ تقریباً ایک ہی شکل کی ہیں۔ اہل ایران نے اُس کا ترجمہ "کمانہ" بھی کیا ہے لیکن کمانہ اتنا جامع نہیں جتنا کہ قوسین ہے۔

نقاط تقدیریہ کے ترجمہ کی خوبی

۱۳۔ "ڈاٹس آف اُمیشن" کے لئے نقاط تقدیریہ یا صرف تقدیریہ ہی مناسب ہے اس لئے کہ اس کے ترجمہ میں یہ خوبی ہے کہ نام کے ساتھ ہی اس کے عمل کا پتہ بھی چل جاتا ہے۔

(۴)

اجمامی مصطلحات کی ایک مکمل فہرست

ذیل میں، اجمام کے اجزا و اعضاء کے ہر ہر اسم پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد، ہم ان مصطلحات کو [جو قابلِ رواج یا قابلِ ترک پائے جاتے ہیں] ایک مکمل مگر اجمالی فہرست کی صورت میں، جس میں اُن کے محاذی، مختصر اصطلاحی معنی بھی مندرج ہیں، پیش کئے دیتے ہیں:—

لہ

نمبر شمار	اُردو نام رواج دینے کے قابل	اُردو کے مترادف نام ترک کرنے کے قابل	مختصر اصطلاحی معنی	اردو علامتیں	انگریزی نام اور اُنکے مترادفات	انگریزی علامتیں
۱	قاطعہ (وقفہ کاطعہ)	وقفہ، ختمہ	پورا ٹھہراؤ: عبارت سے کسی مکمل جملے یا فقرے کو قطع کرنے والی۔	۔	فل سٹاپ (پیریڈ)	.
۲	متوسط (وقفہ متوسط)	نیم وقفہ، مقررہ	متوسط ٹھہراؤ: طولانی جملوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی۔	؛	سی می کولن	؛
۳	مفسرہ	تفصیلیہ، شارحہ	پھیلاؤ: اجمال کی تفصیل بتانے والی	:	کولن	:
۴	سکتہ (وقفہ صغیرہ)	قامہ، وقفہ قصیرہ	چھوٹا ٹھہراؤ: پڑھنے میں بے سانس لئے ذرا سا رکاؤ۔	،	کاما	،
۵	واوین	مُمیّزہ، اقتباسیہ، ناطقہ	دو واو: اقتباس یا نقل کی شناخت کرانے والے۔	״ ״	ان ورڈ کاما (کوٹیشن)	״ ״
۶	استفہامیہ	استفساریہ، سوالیہ	پوچھ گچھ: اقرار، انکار، استخبار کی حالتوں کو ظاہر کرنے والی	؟	کوئسچن (نوٹ آف انٹرگیشن)	؟
۷	خط (خطِ فاصل)	فارقہ	فاصل: اصلی اور معترضہ جملوں کا	ـــــ	ڈیش	ـــــ

لہ اس فہرست میں وہی مترادف نام پیش کئے گئے ہیں جو ترجمہ کے اعتبار سے کسی قدر معنوی قربت رکھتے ہیں۔

نمبر شمار	اُردو نام مداخ ہیڈ کے قابل	اُردو کے مترادف نام ترک کرنے کے قابل	مختصر اصطلاحی معنی	علامت	انگریزی نام اور اُنکے مترادفات	علامت
			فرق بتانے والا			
۸	فجائیہ	انجذابیہ، جذبیہ	نشان: جذبہ و جوش کو ظاہر کرنے والی	!	ایکسکلمیشن (ایکسکلمیٹری)	!
۹	رابطہ	زنجیرہ	طلائہ: مرکب الفاظ کے اجزاء کو ملانے والی۔	ـ	ہائی فن	ـ
۱۰	متساویہ (خطوط متساویہ)	متوازیہ، تطبیقیہ	تساوی: مترادف الفاظ کے درمیان تطابق پیدا کرنے والے خطوط۔	=	ایکویشن (ایکویل ٹو)	=
۱۱	قوسین (کمانہ)	تعریفیہ، معترضہ	کمانین: بیانیہ یا معترضہ جملوں یا لفظی توضیحات کا فرق بتانے والیں	( ) یا [ ]	برکیٹ، پارینتھیسس	( ) یا [ ]
۱۲	تقدیریہ (نقاط تقدیریہ)	نقاط انصرافیہ	نقطے: محذوفات یا مقدرات کو ظاہر کرنے والے	.....	ڈاٹس آف ایلیشن	.....

تاثراتِ لطیف

(از جناب جوشؔ حیدرآبادی)

وصل میں وہ لطفاتِ خاص — خاص لہجہ میں تذکراتِ خاص — دلربایانہ جلوہ فرمائی — خاص اوقاتمیں مذاکراتِ خاص
آرزوئے حصولِ یکجائی — اشتیاق، تقربات خاص — بے حجابانہ گفتگو میں بھی، — گاہے گاہے تکلفاتِ خاص
عرق آلود، شرم سے وہ جبیں — وہ ادائے تحیرات خاص — از برائے ثبوتِ صدق وفا — خاص وہ ہے مطالباتِ خاص
عاشقانہ مباحثاتِ لطیف — مخلصانہ تنازعاتِ خاص — یاد ہے ہجر کی پریشانی، — خاص کر وہ تفکراتِ خاص
کر دیا میری پختہ مغزی نے — انکو محوِ تخیلاتِ خاص — یاد ہے انتہائے مستی میں — وہ حصولِ تلذذاتِ خاص
عام لوگوں میں ایک ہیں نکلے!! — سورِ لطف والتفاتِ خاص — قربِ کامل کا انتہائی ذوق — لذت افزا تعلقاتِ خاص
ہم بھی نادر ہیں عشق بازوں میں — خاص میں اپنے کیفیاتِ خاص — اُف! وہ بے باک حملۂ جذبات — وہ کسی کے، مدافعاتِ خاص
خاص دن، خاص وقت، خاص گھڑی — خاص موقع مشاہداتِ خاص — زورِ قدرت نے ان حسینوں کو — کر دیا مظہرِ صفاتِ خاص
دھو دیا دل شرابِ الفت نے — ہو رہے ہیں مکاشفاتِ خلص — اب کہاں زورِ جذبۂ الفت — اب کہاں وہ تقرفاتِ خلص
نام پڑھتا ہوں اک کمی دس کا — بہرِ فتح مقدماتِ خاص — عام لوگوں میں جوشؔ ٹھیک نہیں
رازدارانِ عشق کی باتیں، — ہیں بہر کیف کیفیاتِ خاص — خاص وقتوں کے واقعاتِ خلص

کفارہ

از

فطرت نگار منشی پریم چند۔ بی۔ اے

مترجمہ جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)

(۱)

دفتر میں ذرا دیر سے آنا افسری کی شان ہے۔ جتنا ہی بڑا حاکم ہوتا ہے اتنی ہی دیر میں آتا ہے۔ اور اتنی ہی جلدی جاتا ہے۔ چپراسی کی حاضری چوبیسوں گھنٹے کی۔ وہ چھٹی پر نہیں جا سکتا۔ اپنا عوض دینا پڑتا ہے۔ یہ جب برملی ضلع بورڈ کے ہیڈ کلرک بابو مداری لال گیارہ بجے دفتر آئے تب سمجھو دفتر نیند سے جاگ اٹھا۔ چپراسی نے دو قلم سیکل لی۔ اردلی نے دوڑ کر کرسی کی چمک اٹھادی اور جمعدار نے ڈاک کی کشتی میز پر لاکر رکھ دی۔ مداری لال نے پہلا ہی سرکاری لفافہ کھولا تھا کہ اُن کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ کئی منٹ تک سکتہ کی حالت میں کھڑے رہے گویا حواس باختہ ہیں۔ وہ بڑے صدمے اٹھا چکے تھے پر اتنے بدحواس وہ کبھی نہ ہوئے تھے۔ بات یہ تھی کہ بورڈ کے سکریٹری کی جو جگہ ایک مہینے سے خالی تھی سرکار نے سُدھ چندر کو یہ جگہ دی تھی اور سدھ چندر وہ شخص تھا جس کے نام ہی سے مداری لال کو چڑ تھی۔ وہ سدھ چندر جو اُن کا ہم سبق تھا جسے زک دینے کو انھوں نے کتنی ہی دفعہ جد وجہد کی اور کبھی کامیاب نہ ہوئے تھے۔ وہی سدھ آج اُن کا افسر ہو کر آرہا تھا۔ سدھ کی ادھر کئی سالوں سے کوئی خبر نہ تھی اتنا معلوم تھا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو گیا تھا، مداری لال نے سمجھا تھا وہیں مر گیا ہوگا۔ پر آج وہ سمجھو جی اُٹھا اور سکریٹری ہو کر آرہا تھا۔ مداری لال کو اس کی ماتحتی میں کام کرنا پڑے گا۔ اس بے عزتی سے تو مر جانا کہیں اچھا تھا۔ سُدھ کو اسکول اور کالج کی ساری باتیں یقیناً ہی یاد ہوں گی۔ مداری لال نے اُسے کالج سے نکلوا دینے کے لئے کئی بار نہ جانے کیا کیا چالیں چلیں، بدنام کیا۔ کیا سدھ سب کچھ بھول گیا ہوگا نہیں۔ کبھی نہیں۔ وہ آتے ہی آتے پرانی کسر نکالے گا اور مداری بابو کو اپنے تحفظ جان کی کوئی تدبیر نہ سوجھی تھی۔

مداری اور سُدھ کے ستاروں ہی میں جھگڑا تھا۔ دونوں ایک ہی دن، ایک ہی مدرسے میں داخل ہوئے اور پہلے ہی دن سے دل میں بغض وعناد کی وہ چنگاری پڑ گئی جو آج بیس برس گزرنے پر بھی نہ بجھی تھی۔ سدھ کا قصور یہی تھا کہ وہ مداری لال سے ایک بات میں بڑھا ہوا تھا۔ ڈیل ڈول، رنگ روپ، طور طریق، علم ودانش یہ سارے میدان اُس کے ہاتھ تھے۔ مداری لال نے اس کا یہ قصور کبھی معاف نہیں کیا۔ سدھ بیس برس تک لگاتار اُس کے دل کا کانٹا بنا رہا جب سُدھ ڈگری لے کر اپنے گھر چلا گیا اور مداری فیل ہو کر اس دفتر

میں نوکر ہو گیا۔ تب اس کا دل ٹھنڈا پڑا۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ سُبدھ بصرہ جا رہا ہے، تب تو مداری لال کا چہرہ کھل اُٹھا۔ اُن کے دل سے وہ پرانی پھانس نکل گئی۔ پر ہائے حرماں نصیب! آج وہ پرانا سورمیس اور سورشن کے ساتھ کھل گیا۔ آج اُن کی قسمت سُبدھ کے ہاتھ میں تھی خدا اتنا جبّار ہے! حکم اتنا سخت!

جب ذرا دل ٹھنڈا پڑا، تب مداری نے دفتر کے اہلکاروں کو سرکاری حکم سناتے ہوئے کہا۔ اب آپ لوگ ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر رہئے گا۔ سُبدھ چندر وہ آدمی نہیں ہیں جو غلطیوں کو معاف کر دیں، ایک اہلکار نے پوچھا۔ کیا بہت سخت ہیں؟

مداری لال نے مسکرا کر کہا۔ وہ تو آپ لوگوں کو دو چار دن ہی میں معلوم ہو جائے گا میں اپنے منہ سے کسی کی کیوں شکایت کروں۔ بس تنبیہ کر دیا کہ ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر رہئے گا۔ آدمی قابل ہے پر بڑا ہی غصیلا۔ بُرا فسر وہ غصہ تو اس کی ناک پر رہتا ہے۔ خود ہزاروں ہضم کر جائے اور ڈکار تک نہ لے پر کیا مجال کہ کوئی ماتحت ایک کوڑی بھی ہضم کر لے پائے۔ ایسے آدمی سے ایشور ہی بچائے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ چھٹی لے کر گھر چلا جاؤں۔ دونوں وقت گھر پر حاضری بجانی ہوگی۔ آپ لوگ آج سے سرکار کے نوکر نہیں سکریٹری صاحب کے نوکر ہیں۔ کوئی اُن کے لڑکے کو پڑھائے گا۔ کوئی بازار سے سودا سلف لائے گا۔ اور کوئی انہیں اخبار سنائے گا۔ اور چپراسیوں کے تو شائد دفتر میں درشن ہی نہ ہوں۔ اس طرح سارے دفتر کو سُبدھ چندر کی طرف سے بھڑکا کر مداری لال نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔

(۲)

اس کے ایک ہفتہ بعد سُبدھ چندر گاڑی سے اترے تب اسٹیشن پر دفتر کے سب کارکنوں کو حاضر پایا۔ سب ان کا خیر مقدم کرنے آئے تھے مداری لال کو دیکھتے ہی سُبدھ لپک کر اُن کے گلے سے لپٹ گئے اور بولے۔ تم خوب ملے بھائی! یہاں کیسے آئے؟ اوہ! آج ایک زمانے کے بعد ملاقات ہوئی۔

مداری لال۔ یہاں ضلع بورڈ کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہوں۔ آپ خیریت سے ہیں؟

سُبدھ۔ اجی میری نہ پوچھو۔ بصرہ، فرانس، مصر، اور نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ تم دفتر میں ہو۔ یہ بہت ہی اچھا ہوا۔ میری تو سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کیسے کام چلے گا میں تو بالکل کورا ہوں۔ مگر جہاں جاتا ہوں میرا خوش نصیبا بھی میرے ساتھ جاتا ہے۔

بصرہ میں بھی افسر خوش تھے۔ فرانس میں بھی خوب چین کئے۔ دو سال میں کوئی پچیس ہزار روپے بنا لایا اور سب اُڑا دیا۔ وہاں سے آکر کچھ دنوں کو آبکاری کے دفتر میں سر گشت کرتا رہا۔ یہاں آیا تب تم مل گئے (کلرکوں کو دیکھ کر) یہ لوگ کون ہیں؟

مداری کے دل پر برچھیاں سی چل رہی تھیں۔ مرد و پچیس ہزار روپئے بصرہ سے کما لایا۔ یہاں قلم گھستے

گھستے مر گئے اور پانچ سو بھی جمع نہ کر سکے۔ بولے۔ "یہ لوگ بورڈ کے اہل کار ہیں۔ سلام کرنے آئے ہیں"

سُبدھ نے اُن سب لوگوں سے باری باری سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ آپ لوگوں نے فضول یہ تکلیف کی بہت ممنون ہوں مجھے امید ہے کہ آپ اصحاب کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی مجھے اپنا افسر نہیں اپنا بھائی سمجھئے۔ آپ سب لوگ مل کر اس طرح کام کیجئے کہ بورڈ کی نیک نامی ہو اور میں بھی سرخرو رہوں۔ آپ کے ہیڈ کلرک صاحب تو میرے پرانے دوست اور لنگوٹیا یار ہیں"

ایک من چلے کلرک نے کہا۔ "ہم سب حضور کے تابعدار ہیں۔ حتی المقدور آپ کو ناخوش نہ کریں گے۔ مگر ہیں آدمی ہی ہیں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو حضور اُسے معاف کریں گے۔

سُبدھ نے نرمی سے کہا۔ "یہی میرا عمل ہے ہمیشہ یہی عمل رہا۔ جہاں رہا ماتحتوں سے دوستوں کا سا برتاؤ رہا۔ ہم اور آپ دونوں ہی کسی تیسرے کے غلام ہیں۔ پھر غصہ کیسا اور افسری کیسی۔ ہاں ہمیں نیک نیتی کے ساتھ اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔

جب سُبدھ سے رخصت ہو کر اہلکار لوگ چلے تب آپس میں باتیں ہونے لگیں "آدمی تو اچھا معلوم ہوتا ہے"

"ہیڈ کلرک کے کہنے سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کو کچا ہی کھا جائے گا"

"پہلے سبھی ایسی ہی باتیں کرتے ہیں"

"یہ دکھانے کے دانت ہیں"

(۳)

سُبدھ کو آئے ایک مہینہ گزر گیا۔ بورڈ کے کلرک، اردلی، چپراسی سبھی اس کے برتاؤ سے خوش ہیں۔ وہ اتنا خوش مزاج ہے۔ اتنا خلیق ہے کہ جو اُس سے ایک بار ملتا ہے ہمیشہ کے لئے اُس کا دوست بن جاتا ہے۔ سخت لفظ تو اس کی زبان پر آتا ہی نہیں۔ انکار کو بھی وہ گوارا نہیں کرتا۔ لیکن دشمن کی نظر میں خوبیاں اور بھی غضبناک ہو جاتی ہیں۔ سُبدھ کے یہ سارے اوصاف حمیدہ مداری لال کی آنکھوں میں کھٹکتے رہتے ہیں۔ پہلے اہل کاروں کو بھڑکانا چاہا کامیاب نہیں ہوئے۔ بورڈ کے ممبروں کو بھڑکانا چاہا منہ کی کھائی۔ ٹھیکہ داروں کو ابھارنے کا بیڑا اوٹھایا بے عزت ہونا پڑا۔ وہ چاہتے تھے کہ بُھس میں آگ لگا کر آپ دور سے تماشہ دیکھیں۔ سُبدھ سے یوں ہنس کر ملتے، یوں چکنی چپڑی باتیں کرتے، گویا اس کے سچے دوست ہیں پر گھات میں لگے رہتے۔ سُبدھ میں اور سب گن تھے مردم شناسی نہ تھی۔ وہ مداری لال کو اب بھی اپنا دوست ہی سمجھتے ہیں۔

ایک دن مداری لال سکریٹری کے کمرے میں گئے، تب کرسی خالی دیکھی۔ وہ کسی کام سے باہر چلے

گئے تھے۔ ان کی میز پر پانچ ہزار کے نوٹ پلندوں میں بندھے ہوئے رکھے تھے۔ بورڈ کے مدارس کے لئے کچھ لکڑی کے سامان بنائے گئے تھے۔ اسی کے دام تھے۔ ٹھیکہ دار وصولی کے لئے بلایا گیا تھا آج ہی سکریٹری صاحب نے چیک بھیج کر خزانے سے روپئے منگوائے تھے۔ مداری لال نے برآمدے میں جھانک کر دیکھا، سُدھ کا کہیں پتہ نہیں۔ اُن کی نیت بدل گئی۔ حسد میں لالچ شامل ہو گیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پلندے اُٹھائے۔ پتلون کی دونوں جیبوں میں بھر کر فوراً کمرے سے نکلے اور چپراسی کو پکار کر بولے۔ بابو جی اندر ہیں؟ چپراسی آج ٹھیکہ دار سے کچھ وصول کرنے کی خوشی میں پھولا ہوا تھا۔ سامنے والے تنبولی کی دوکان سے آکر بولا۔ "جی نہیں۔ کچہری میں کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی تو گئے ہیں"

مداری لال نے دفتر میں آکر ایک کلرک سے کہا۔ یہ مسل لے جاکر سکریٹری صاحب کو دکھاؤ۔ کلرک مسل لے کر چلا گیا اور ذرا دیر میں لوٹ کر بولا۔ سکریٹری صاحب کمرے میں نہ تھے۔ مسل میز پر رکھ آیا ہوں۔

مداری لال نے منہ سکوڑ کر کہا۔ "کمرہ چھوڑ کر کہاں چلے جایا کرتے ہیں۔ کسی دن دھوکا اُٹھائیں گے"

کلرک نے کہا۔ "ان کے کمرے میں دفتر والوں کے سوا اور جاتا ہی کون ہے"

مداری لال نے گرج دار آواز میں کہا۔ "تو کیا دفتر والے سب کے سب دیوتا ہیں۔ ایک کس کی نیت بدل جائے کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں نے چھوٹی چھوٹی رقموں پر اچھوں اچھوں کی نیتیں بدلتی دیکھی ہیں۔ اس وقت ہم بھی ایماندار ہیں لیکن موقع پر شاید ہی کوئی چوکے آدمی کی یہی فطرت ہے۔ آپ جاکر اُن کے کمرے کے دونوں دروازے بند کر دیجئے۔

کلرک نے ٹال کر کہا۔ "چپراسی تو دروازے پر بیٹھا ہوا ہے"

مداری لال نے جھنجھلا کر کہا۔ "آپ سے میں جو کہتا ہوں وہ کیجئے۔ کہنے لگے چپراسی بیٹھا ہوا ہے۔ چپراسی کوئی رشی ہے۔ منی ہے۔ چپراسی ہی کچھ اُڑا دے تو آپ اس کا کیا کر لیں گے۔ ضمانت بھی ہے تو تین سو کی۔ یہاں ایک ایک کاغذ لاکھوں کا ہے۔" یہ کہہ کر مداری لال خود اُٹھے اور دفتر کے دروازے دونوں طرف سے بند کر دیئے۔ جب ذرا دل ٹھکانے ہوا تب نوٹوں کے پلندے جیب سے نکال کر ایک الماری میں کاغذوں کے نیچے چھپا کر رکھ دیئے پھر آکر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

سُدھ چندر کوئی گھنٹہ بھر میں لوٹے۔ تب اُن کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دفتر میں آکر مسکراتے ہوئے بولے۔ میرا کمرہ کس نے بند کر دیا ہے بھائی؟ کیا میری بے دخلی ہو گئی؟

مداری لال نے نرمی سے کہا۔ "صاحب گستاخی معاف ہو۔ آپ جب کبھی باہر جائیں۔ چاہے ایک ہی منٹ کے لئے کیوں نہ ہو۔ تب دروازہ ضرور بند کر لیا کریں۔ آپ کی میز پر روپئے پیسے اور سرکاری

کاغذ پتر بکھرے پڑے رہتے ہیں۔ نہ جانے کس وقت کس کی نیت بدل جائے۔ میں نے ابھی سنا کہ آپ کہیں باہر گئے ہیں تو دروازے بند کرا دیئے۔

سُدھ چندر دروازہ کھول کر کمرے میں گئے اور ایک سگار پینے لگے۔ میز پر نوٹ رکھے ہوئے ہیں اس کی خبر ہی نہ تھی یکایک ٹھیکہ دار نے آکر سلام کیا۔ سُدھ کرسی سے اُٹھ بیٹھے اور بولے۔ "تم نے بہت دیر کر دی، تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ دس ہی بجے روپے منگوا لئے تھے۔ رسیدی ٹکٹ لائے ہو نا؟

ٹھیکہ دار "حضور۔ رسید لکھی لایا ہوں"

سُدھ "تو اپنے روپے لے جاؤ تمہارے کام سے میں بہت خوش نہیں ہوں۔ لکڑی تم نے اچھی نہیں لگائی اور کام میں صفائی بھی نہیں ہے اگر ایسا کام کیا کرو گے تو ٹھیکہ داروں کے رجسٹر سے تمہارا نام نکال دیا جائے گا۔

یہ کہہ کر سُدھ نے میز پر نگاہ ڈالی تب نوٹوں کے پلندے نہ تھے۔ سوچا شائد کسی فائل کے نیچے دب گئے ہوں۔ کرسی کے پاس کے سب کاغذ الٹ پلٹ کر ڈالے۔ مگر نوٹوں کا کہیں پتہ نہیں۔

ایں! نوٹ کہاں گئے! ابھی یہیں تو میں نے رکھ دیئے تھے۔ جا کہاں سکتے ہیں۔ پھر فائلوں کو الٹنے پلٹنے لگے۔ دل میں ذرا ذرا دھڑکن اُٹھنے لگی۔ ساری میز کے کاغذ چھان ڈالے۔ پلندوں کا پتہ نہیں۔ تب یہ کرسی پر بیٹھ کر آدھ گھنٹہ میں ہونے والے واقعات پر دل میں تنقید کرنے لگے۔ چپراسی نے نوٹوں کے پلندے لا کر مجھے دیئے خوب یاد ہے۔ بھلا یہ بھی بھولنے کی بات ہے اور اتنی جلد! میں نے نوٹوں کو لے کر یہیں میز پر رکھ دیا گنا تک نہیں۔ پھر وکیل صاحب آ گئے پرانے ملاقاتی ہیں اُن سے باتیں کرتا ہوا ذرا اُس درخت تک چلا گیا۔ انہوں نے پان منگوائے بس اتنی ہی دیر ہوئی۔ جب گیا ہوں تب پلندے رکھے ہوئے تھے۔ خوب اچھی طرح یاد ہے۔ تب یہ نوٹ کہاں غائب ہو گئے۔ میں نے کسی صندوق، دراز یا الماری میں نہیں رکھے۔ پھر گئے تو کہاں! شاید دفتر میں کسی نے حفاظت کے لئے اُٹھا کر رکھ دیئے ہوں۔ یہی بات ہے میں فضول ہی اتنا گھبرا گیا۔ چھی!

فوراً دفتر میں آ کر داری لال سے بولے "آپ نے میری میز پر سے نوٹ تو اٹھا کر نہیں رکھ دیئے؟"

مداری لال نے ذرا چھکے ہو کر کہا۔ "کیا آپ کی میز پر نوٹ رکھے ہوئے تھے؟ مجھے تو خبر نہیں۔ ابھی پنڈت موہن لال ایک فائل لے کر گئے تھے۔ تب آپ کو کمرے میں نہ دیکھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کسی سے باتیں کرنے چلے گئے ہیں تب دروازے بند کرا دیئے۔ کیا کچھ نوٹ نہیں مل رہے ہیں؟"

سُدھ آنکھیں پھیلا کر بولے۔ "ارے صاحب پورے پانچ ہزار کے ہیں ابھی ابھی چک بھنایا ہے۔

مداری لال نے سرپیٹ کر کہا۔ "پورے پانچ ہزار! یا بھگوان! آپ نے میز پر خوب دیکھ لیا؟

"ابھی پندرہ منٹ سے تلاش کر رہا ہوں"

"چپراسی سے پوچھ لیا کہ کون آیا تھا؟"

"آئیے ذرا آپ لوگ بھی تلاش کیجیے میرے تو ہوش اُڑے ہوئے ہیں"

سارا دفتر سکریٹری صاحب کے کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ میز، الماریاں، صندوق سب دیکھے گئے، رجسٹروں کے ورق الٹ الٹ کر دیکھے گئے۔ مگر نوٹوں کا کہیں پتہ نہیں۔ کوئی اُڑا لے گیا اب اس میں کوئی شبہ نہ تھا۔ بُدھ نے ایک لمبی سانس لی اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ذرا سا منہ نکل آیا۔ اس وقت کوئی انہیں دیکھتا تو سمجھتا مہینوں سے بیمار ہیں۔

مداری لال نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "غضب ہو گیا اور کیا آج تک کبھی ایسا اندھیر نہ ہوا تھا۔ مجھے یہاں کام کرتے دس سال ہو گئے کبھی دھیلے کی چیز بھی غائب نہ ہوئی میں نے آپ کو پہلے ہی دن خبردار کر دیا تھا کہ روپئے پیسے کے بارے میں ہمیشہ ہوشیار رہئے گا۔ مگر شدنی تھی کسی کا خیال نہ رہا۔ ضرور باہر سے کوئی آدمی آیا اور نوٹ اُٹھا کر غائب ہو گیا چپراسی کا بھی قصور ہے کہ اُس نے کسی کو کمرے میں جانے ہی کیوں دیا۔ وہ لاکھ قسمیں کھائے کہ باہر سے کوئی نہیں آیا لیکن میں اسے مان نہیں سکتا یہیں سے تو صرف پنڈت سوہن لال ایک فائل لے کر گئے تھے۔ مگر وہ تو ابھی ابھی آئے ہیں۔ سوہن لال نے صفائی دی۔ "میں نے تو اندر قدم ہی نہیں رکھا صاحب۔ اپنے جوان بیٹے کی قسم کھاتا ہوں جو اندر قدم بھی رکھا ہو۔

مداری لال نے پیشانی سکوڑ کر کہا "آپ فضول قسمیں کیوں کھاتے ہیں۔ کوئی آپ سے کچھ کہتا ہے (بُدھ کے کان میں) بینک میں کچھ روپئے ہوں تو نکال کر ٹھیک دار کو دے دیجئے ورنہ بڑی بدنامی ہو گی۔ نقصان تو ہو ہی گیا اب اس کے ساتھ بے عزت کیوں ہو۔

بُدھ نے دردناک آواز میں کہا بینک میں مشکل سے دو چار سو روپے ہوں گے۔ بھائی جان اور روپے ہوتے تو کیا فکر تھی۔ سمجھ لیتا جیسے پچیس ہزار اُڑ گئے ویسے تیس ہزار اُڑ گئے یہاں تو کفن کو بھی کوڑی نہیں۔

اسی رات کو بُدھ چندر نے خودکشی کر لی اتنے روپیوں کا انتظام کرنا اُن کے لئے کٹھن تھا۔ موت کے پردے کے سوا انہیں اپنے رنج، اپنے وقار کو چھپانے کی کوئی آڑ نہ تھی۔

(۴)

دوسرے دن صبح سویرے چپراسی نے مداری لال کے گھر پہنچ کر آواز دی۔ مداری لال کو رات بھر نیند نہ آئی تھی۔ گھبرا کر باہر آئے۔ چپراسی انہیں دیکھتے ہی بولا۔ حضور! بڑا غضب ہو گیا۔ سکریٹری صاحب نے رات کو اپنی گردن پر چھری پھیر لی۔

مداری لال کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں، منہ پھیل گیا اور سارا بدن شل ہو گیا۔ گویا ان کا ہاتھ بجلی کے تار پر پڑ گیا ہے

"چھری پھیر لی؟"

"جی ہاں، آج سویرے معلوم ہوا۔ پولیس والے جمع ہیں آپ کو بلایا ہے"

"لاش ابھی پڑی ہوئی ہے؟"

"جی ہاں" ابھی پوسٹ مارٹم ہونے والا ہے"

"بہت سے لوگ جمع ہیں؟"

"سب بڑے بڑے افسر جمع ہیں۔ حضور لاش کی طرف تاکتے نہیں بنتا! کیسا بھلا مانس ہیرا آدمی تھا سب لوگ رو رہے ہیں چھوٹے چھوٹے دو بچے ہیں، ایک سیانی لڑکی ہے بیاہنے لایک بھوجی کو لوگ کتنا روک رہے ہیں بار بار دوڑ کر لاش کے پاس آجاتی ہیں۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو رومال سے آنکھیں نہ پونچھ رہا ہو۔ ابھی اتنے ہی دن آئے ہوئے، پر سب سے کتنا میل جول ہو گیا تھا۔ روپے کی تو کبھی پرواہ ہی نہیں تھی۔ دل دریا تھا"

مداری لال کے سر میں چکر آنے لگا۔ دروازے کی چوکھٹ پکڑ لی اپنے کو سنبھال نہ لیتے تو شاید گر پڑتے۔ پوچھا۔ "بھوجی بہت رو رہی تھیں"

"کچھ نہ پوچھئے حضور۔ بڑ کی پتیاں جھڑی جاتی ہیں آنکھیں پھول کر گولر ہو گئی ہیں"

"کتنے لڑکے بتلائے تم نے؟"

"حضور دو لڑکے ہیں اور ایک لڑکی"

"ہاں ہاں لڑکوں کو تو دیکھ چکا ہوں، لڑکی سیانی ہو گی؟"

"جی ہاں بیاہنے لایک ہے۔ روتے روتے بچاری کی آنکھیں سوج آئی ہیں"

"نوٹوں کے بارے میں بھی بات چیت ہو رہی ہو گی؟"

"جی ہاں سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ دفتر کے کسی آدمی کا کام ہے۔ دارو غہ جی تو سوہن لال کو گرفتار کرنا چاہتے تھے، پر آپ سے صلاح لیکر کریں گے۔ سکریٹری صاحب تو لکھ گئے ہیں کہ میرا کسی پر شک نہیں ہے۔ نہیں تو اب تک تہلکہ مچ جاتا۔ سارا دفتر پھنس جاتا"

"کیا سکریٹری صاحب کوئی خط لکھ کر چھوڑ گئے ہیں؟"

"ہاں معلوم ہوتا ہے، چھری چلاتے وقت یاد آیا کہ صبح دفتر کے سب لوگ پکڑے جائیں گے بس کلکٹر صاحب کے نام چٹھی لکھ دی"

"چٹھی میں میرے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے؟ تمہیں یہ کیا معلوم ہو گا؟"

"حضور اب میں کیا جانوں، مُدا احباب لوگ کہتے تھے کہ آپ کی بڑی تعریف لکھی ہے"

مداری لال کی سانس اور تیز ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بڑی بڑی بوندیں گر پڑیں۔ آنکھیں پونچھتے ہوئے بولے۔ وہ اور میں ایک ساتھ کے پڑھے تھے نندو۔ آٹھ دس سال ساتھ رہا۔ ساتھ اُٹھتے بیٹھتے، ساتھ کھاتے، ساتھ کھیلتے، بس اسی طرح رہتے تھے جیسے دو سگے بھائی رہتے ہوں۔ خط میں میری کیا تعریف لکھی ہے؟ مگر تمہیں یہ کیا معلوم ہوگا"

آپ تو چل ہی رہے ہیں دیکھ لیجئے گا"

"کفن کا انتظام ہو گیا ہے؟"

"نہیں حضور۔ کہاں کہ ابھی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ مُدا اب جلدی چلئے ایسا نہ ہو کوئی دوسرا آدمی بلانے آتا ہو"

"ہمارے وقت کے سب لوگ آ گئے ہوں گے؟"

"جی ہاں اس محلے والے تو سبھی تھے"

"پولیس نے میرے بارے میں تو ان سے پوچھ پانچھ نہیں کی؟"

"جی نہیں کسی سے بھی نہیں"

مداری لال جب سُدھ چندر کے گھر پہنچے تب انہیں ایسا معلوم ہوا کہ سب لوگ اُن کی طرف شبہ کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ پولیس انسپکٹر نے فوراً انہیں بلا کر کہا۔ آپ بھی اپنا بیان لکھا دیں۔ اور سب کے بیان تو لکھ چکا ہوں۔ مداری لال نے ایسی ہوشیاری سے اپنا بیان لکھایا کہ پولیس کے افسر بھی دنگ رہ گئے۔ انہیں مداری لال پر کچھ شبہ ہوتا تھا۔ پر اس بیان نے اس کا شبہ بھی نکال ڈالا۔ اس وقت سُدھ کے دونوں لڑکے روتے ہوئے مداری لال کے پاس آئے اور کہا چلئے آپ کو اماں بلاتی ہیں دونوں مداری لال سے آشنا تھے۔ مداری لال یہاں تو روز ہی آتے تھے۔ پر گھر میں کبھی نہ گئے تھے سُدھ کی بیوی اُن سے پردہ کرتی تھی۔ یہ بلاوا سُن کر اُن کا دل دھڑک اُٹھا۔ کہیں اس کا مجھ پر شبہ نہ ہو۔ کہیں سُدھ نے میرے بارے میں کوئی شک ظاہر نہ کیا ہو۔ کچھ جھجکتے، کچھ ڈرتے، اندر گئے تب بیوہ کی دردانگیز آہ و بکا سُن کر کلیجہ کانپ اٹھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس عورت کے آنسوؤں کا کوئی دوسرا سوت کھل گیا۔ اور لڑکی تو دوڑ کر اُن کے پیروں سے لپٹ گئی۔ دونوں لڑکوں نے بھی گھیر لیا۔ مداری لال اُن تینوں کی آنکھوں میں اس درجے رنج و غم بھرا ہوا معلوم ہوا کہ وہ اُن کی طرف دیکھ نہ سکے۔ ان کی آتما انہیں لعنت ملامت کرنے لگی۔ جن بچاروں کو ان پر اتنا وشواس، اتنا اعتماد، اتنا اخلاص، اتنی محبت تھی۔ انہیں کی گردن پر انہوں نے چھری پھیری۔ انہیں کے ہاتھوں بھرا پُرا خاندان خاک میں مل گیا! ان یتیموں کا اب کیا حال ہوگا! لڑکی کا بیاہ کرنا ہے۔ کون کرے گا۔ بچوں کے ناز و پرداخت کا بار کون اٹھائے گا! مداری لال کو اس قدر جانکاہ گزرا کہ اُن کے منہ سے تسلی کا ایک لفظ بھی نہ نکلا

انہیں ایسا جان پڑا کہ میرے منہ میں کالک پتی ہوئی ہے۔ میرا قدم کچھ چھوٹا ہو گیا ہے۔ انہوں نے جس وقت نوٹ اڑائے تھے، انہیں گمان بھی نہ تھا کہ اس کا یہ نتیجہ ہوگا۔ وہ صرف سدھ کو زچ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا منشا بالکل یہ ہی نہ تھا۔ دکھیا بیوہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ بھیا جی، ہم لوگوں کو وہ منجھ دھار میں چھوڑ گئے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ دل میں یہ بات ٹھان چکے ہیں تو اپنے پاس جو کچھ تھا وہ سب اُن کے چرنوں پر رکھ دیتی۔ مجھ سے تو وہ یہی کہتے رہے کہ کوئی نہ کوئی تدبیر ہو جائے گی۔ آپ ہی کی معرفت وہ کوئی مہاجن ٹھیک کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے اوپر انہیں اتنا بھروسہ تھا کہ کہہ نہیں سکتی۔

مداری لال کو ایسے معلوم ہوا کہ کوئی اُن کے دل پر نشتر چلا رہا ہے، انہیں اپنے حلق میں کوئی چیز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

رامیشوری نے پھر کہا۔ رات ہوئے تک خوب ہنس رہے تھے۔ روز کی طرح دودھ پیا، بچوں کو پیار کیا۔ تھوڑی دیر ہارمونیم بجایا اور تب کلی کرکے لیٹے۔ کوئی ایسی صورت نہ تھی جس سے تھوڑا سا بھی شبہ ہوتا۔ مجھے متفکر دیکھ کر بولے تم فضول گھبراتی ہو۔ بابو مداری لال سے میری پرانی دوستی ہے۔ آخر وہ کسی دن کام آئے گی میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں اُن کی سب جان پہچان ہے۔ روپیوں کا انتظام آسانی سے ہو جائے گا۔ پھر نہ جانے کب دل میں یہ بات سمائی۔ میں نصیبوں جلی ایسی سوئی کہ رات منکسی تک نہیں۔ کیا جانوں کہ وہ اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔

مداری لال کو ساری دنیا آنکھوں میں پھرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ انہوں نے بہت ضبط کیا مگر آنسوؤں کے بہاؤ کو نہ روک سکے۔

رامیشوری نے آنکھیں پونچھ کر پھر کہا۔ بھیا جی جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا، لیکن آپ اس مردود کا پتہ ضرور لگائیے جس نے ہماری ساری تباہی کر دی ہے۔ یہ دفتر ہی کے کسی آدمی کا کام ہے۔ وہ تو دیوتا تھے، مجھ سے یہی کہتے رہے کہ میرا کسی پر گمان نہیں ہے، یہ کسی دفتر والے ہی کا کام۔ آپ سے صرف اتنا التجا کرتی ہوں کہ اس پاپی کو بچ کر نہ جانے دیجئے گا پولیس والے شاید کچھ رشوت لے کر اسے چھوڑ دیں۔ آپ کو دیکھ کر اُن کا یہ حوصلہ نہ ہوگا اب ہمارے سر پر آپ کے سوا اور کون ہے۔ کس سے اپنا دکھ کہیں، نصیب کی یہ درگت ہونی لکھی تھی۔

مداری لال کے دل میں ایک بار ایسا جوش اٹھا کہ سب کچھ بھی کھول دیں۔ صاف کہہ دیں کہ میں ہی وہ مردود وہ کمینہ، وہ سفلہ ہوں۔ بیوہ کے قدموں پر گر پڑیں اور کہیں وہی چھری اس جان لیوا کی گردن پر پھیر دیں۔ پر زبان نہ کھلی۔ اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے اُن کے سر میں ایسا چکر آیا کہ وہ زمین پر گر پڑے۔

(۵)

تیسرے پہر لاش کا امتحان ختم ہوا۔ ارتھی تالاب کی طرف چلی سارا دفتر، سارے حکام اور ہزاروں آدمی ساتھ تھے۔ واہ سنسکار (لاش پھونکنا) لڑکوں کو کرنا چاہیئے تھا۔ پر لڑکے نابالغ تھے۔ اس لئے بیوہ چلنے کو تیار ہو رہی تھی کہ مداری لال نے جا کر کہا۔ بھوجی یہ سنسکار مجھے کرنے دو۔ تم کریا پر بیٹھ جاؤ گی تو بچوں کو کون سنبھالے گا۔ سُبدھ میرے بھائی تھے۔ زندگی میں اُن کے ساتھ کچھ سلوک نہ کر سکا اب زندگی کے بعد مجھے دوستی کا کچھ حق ادا کرنے دو۔ آخر میرا بھی تو اُن پر کچھ حق تھا۔ رامیشوری نے رو کر کہا۔ آپ کو بھگوان نے بڑا فیاض دل دیا ہے بھیا جی ورنہ مرنے پر کون کس کو پوچھتا ہے۔ دفتر کے اور لوگ جو آدھی آدھی رات تک ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے جھونٹوں بات پوچھنے آئے کہ ذرا تسلی ہوتی۔

مداری لال نے واہ سنسکار کیا۔ تیرہ دن تک کریا پر بیٹھے رہے۔ تیرھویں دن پنڈ دان (دسواں) ہوا۔ برہمنوں نے بھوجن کیا، بھکاریوں کو اناج بانٹا گیا، دوست احباب کی دعوت ہوئی۔ اور یہ سب کچھ مداری لال نے اپنے خرچ سے کیا۔ رامیشوری نے بہت کہا کہ آپ نے جتنا کیا اتنا ہی بہت ہے اب میں آپ کو اور زیر بار کرنا نہیں چاہتی۔ دوستی کا حق اس سے زیادہ اور کوئی کیا ادا کرے گا، مگر مداری لال نے ایک نہ سنی سارے شہر میں اُن کے نیک کام کی شہرت ہو گئی۔ دوست ہو تو ایسا ہو، سولھویں دن بیوہ نے مداری لال سے کہا۔ بھیا جی آپنے ہمارے ساتھ جو بھلائی اور احسان کئے ہیں۔ اُن سے ہم مرتے دم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ آپنے ہماری پیٹھ پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو نہ جانے ہماری کیا گت ہوتی۔ کہیں روکھی بھی چھاؤں تو نہیں تھی۔ اب ہمیں گھر جانے دیجئے۔ وہاں دیہات میں خرچ بھی کم ہوگا اور کچھ کھیتی باڑی کا سلسلہ بھی کروں گی۔ کسی نہ کسی طرح مصیبت کے دن کٹ ہی جائیں گے۔ اسی طرح ہمارے اوپر مہربانی رکھئے گا۔

مداری لال نے پوچھا۔ گھر پر کتنی جائداد ہے؟

رامیشوری۔ زیادہ کیا ہے ایک کچا مکان ہے اور دس بارہ بیگھے کی کاشتکاری ہے۔ پکا مکان بنوانا شروع کیا تھا مگر روپے پورے نہ پڑے۔ ابھی ادھورا پڑا ہوا ہے۔ دس بارہ ہزار خرچ ہو گئے اور ابھی چھت پڑنے کی نوبت نہیں آئی۔

مداری۔ کچھ روپے بنک میں جمع ہیں یا بس کھیتی ہی کا سہارا ہے؟

بیوہ۔ جمع تو ایک پائی بھی نہیں ہے بھیا جی۔ ان کے ہاتھ میں روپے رہنے ہی نہ پاتے تھے۔ بس وہی کھیتی کا سہارا ہے۔

مداری۔ تو ان کھیتوں میں اتنی پیداوار ہو جائے گی کہ لگان بھی ادا ہو جائے اور تم لوگوں کی گزر مسر بھی ہو۔

رامیشوری۔ اور کر ہی کیا سکتے ہیں بھیا جی۔ کسی نہ کسی طرح زندگی کاٹنا ہی ہے۔ بچے نہ ہوتے تو میں زہر کھا لیتی

مداری۔ اور ابھی بیٹی کا بیاہ بھی کرنا ہے؟

بیوہ۔ اس کے بیاہ کی اب کوئی فکر نہیں۔ کسانوں میں ایسے بہت سے مل جائیں گے جو بغیر کچھ لئے دیئے بیاہ کر لیں

مداری لال نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔ اگر میں کچھ صلاح دوں تو اُسے مانیں گی آپ؟

رامیشوری۔ بھیا جی آپ کی صلاح نہ مانوں گی تو کس کی صلاح مانوں گی اور دوسرا ہے ہی کون؟

مداری۔ تو آپ اپنے گھر جانے کے بدلے میرے گھر چلئے۔ جیسے میرے بال بچے رہیں گے ویسے آپ کے بھی رہیں گے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ایشور نے چاہا تو کنیا کا بیاہ بھی کسی اچھے خاندان میں ہو جائے گا۔

بیوہ کی آنکھیں آب دیدہ ہو گئیں۔ بولی۔ مگر بھیا جی سوچئے..... مداری لال نے بات کاٹ کر کہا میں کچھ نہ سوچوں گا اور نہ کوئی عذر سنوں گا۔ کیا دو بھائیوں کے خاندان ایک ساتھ نہیں رہتے۔ بُدھ کو میں اپنا بھائی سمجھتا تھا اور ہمیشہ سمجھوں گا۔

بیوہ کا کوئی عذر نہ سنا گیا۔ اسی دن مداری لال سب کو اپنے ساتھ لے گئے اور آج دس سال سے اُن کی پرورش کر رہے ہیں۔ دونو بچے کالج میں پڑھتے ہیں اور کنواری لڑکی کا ایک معزز خاندان میں بیاہ ہو گیا ہے۔ مداری لال اور اُن کی بیوی دل و جان سے رامیشوری کی سیوا کرتے ہیں اور اُس کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ مداری لال خدمت سے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔ (سرسوتی)

غزل

(از مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب عزیزؔ مصنف "لالسان" وغیرہ)

جانِ ما قربان بطرزِ آفتِ جانِ شما — شورِ قتل کردہ بر آشوبِ فتانِ شما

عاشقاں سوزند از گرمیِ حسنِ لغریب — شعلہا می خیزد از روی درخشانِ شما

نیم جانِ اعجازِ ملاحت بود ایجانانِ ترا — زخمِ دل ستد تازہ از شورِ نمکدانِ شما

بلبلِ بیدل بآہ و نالہ از گرمیِ عشق — شور محشر کرد برپا در گلستانِ شما

رشکِ برگلگونہ می آید گلِ صد برگ را — غرقِ شبنم نخشید چوں روئے درخشانِ شما

جعدِ سنبل میکند حسرت چو بیند کاکلت — کو پریشاں باشد از زلفِ پریشانِ شما

در رہِ وادیِ عشقت رنجہا باید کشید — تا نہد گامے بصد راحت بایوانِ شما

دل نوازی شیوۂ خوبان بود اے جانِ من
زاں سبب باشد عزیزؔ برخستہ قربانِ شما

قہرمانیت

(از جناب محمد حمید اللہ صاحب بی۔ اے)

تعارف | اگلے صفحات میں رالف والڈو ایمرسن کے مضمون (ON HEROISM) کے ترجمے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایمرسن شہر باسٹن واقع میساچوسٹ (امریکہ) میں ۲۵ ویں مئی ۱۸۰۳ء کو پیدا ہوا۔ وہ ابتداءً موحدین کی جماعت میں شریک ہوا مگر جلد الگ بھی ہو گیا۔ پھر فلسفۂ ماورائیت (TRANSCENDENTALISM) کا جس میں المانی (جرمن) فلسفے اور شرقی ادبیات سے متاثر تخیل ہوتا ہے، مرجع و مرکز بن گیا۔ اس کے مضامین میں سے جزا، روحانی قوانین، قہرمانیت (جس کا ترجمہ پیش ہے)، خود اعتمادی اور دوستی عام طور پر ادبیات عالیہ میں شریک کئے جاتے ہیں اور انہیں کے بوتے پر اسے ایک معلم سمجھا جاتا ہے۔ میاتھیو آرنلڈ اسے ایسے لوگوں کا "مددگار و معین" سمجھتا ہے جو "روحانیات میں زندگی بسر کرنی چاہتے ہیں"۔ لاول کا خیال ہے کہ "اس نے ہمیں بیدار کیا ..... وسیع تر خیالات کے سرچشمے کا پتہ دیا، ہماری ذکاوت کو ایک تیز تر محاورے سے جلا اور صیقل دیا ہمیں ایک آئیڈیل اور مطمح کے نظارے دکھائے اور ہماری روح کو برترین اور ابدی جودت سے واقف کیا" اس نے ۲۷ ویں اپریل ۱۸۸۲ء کو (۷۹) سال کی عمر میں وطن کے قریب وفات پائی۔

قدیم انگریزی ڈرامہ نگار خاص کر بومانٹ اور فلیچر ہمیشہ اخلاقِ حسنہ کی اہمیت کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔ گویا ان کے زمانے میں شریفانہ برتاؤ کو وہی امتیاز حاصل تھا جو رنگ کو ہماری امریکی آبادی میں جب کوئی رائڈر گو، پیٹر رویا والیر (یعنی گورے چمڑے کا آدمی داخل ہوتا تو وہ چاہے اجنبی ہی کیوں نہ ہو، ڈیوک یا گورنر بے ساختہ کہہ اٹھتا کہ یہ شریف آدمی ہے ــــ اور اُسے نامتناہی عنایتوں سے ممنون کرتا ہے۔ لیکن باقی سب اس کے نزدیک فضلہ اور کچرا ہیں۔ ان کے ناٹکوں کے کردار اور مکالمے ایک ہیروئی اور قہرمانی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں اور اُس کا باعث اُن خصوصی فوائد کی مسرت کی ہم آہنگی ہے جو کسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں ــــ جیسے بندوق، سفوکلیس، دی میاڈلور، دی ڈبل میاڈج میں محسوس ہو سکتا ہے۔ اُن میں متکلم اتنا پرجوش اور با اخلاق ہو جاتا اور سیرت کی اتنی گہرائی میں پہنچ جاتا ہے کہ اُس کا مکالمہ ناٹک کے پلاٹ میں خفیف ترین حادثے اور واقعے کے اضافہ

ہیروئکا تر کی مرادف قہرمان اور ہیروئزم کا قہرمانیت پسند کیا ہے۔ ہم نے قہرمانیت پسند کیا ہے۔ بعض لوگ شہامت لیتے ہیں۔

پر خود بخود منظوم موزون ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل پر غور کرو۔ رومی جرنیل مارشیس نے یونان کا با تخت تسخیر فتح کر لیا ہے ــــ سوائے ڈیوک آف ایتھنز: سفوکلیس اور اس کی بیوی ڈوری جن کی ناقابلِ تسخیر روحوں کے سب اس کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں۔ آخر الذکر کا حسن مارشیس کے دل میں محبت کی آگ بھڑکا دیتا ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے شوہر کی جان بچا دے، لیکن سفوکلیس اپنی جان کے لئے درخواست اور التجا کرنے آمادہ نہیں ہوتا اگرچہ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ اس کا ایک لفظ بھی اسکی جان بچانے کے لئے کافی ہے۔ آخر دونوں کے قتل کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد:-

والے ری لیس (جلاد): اپنی بیوی کو الوداع کہہ لو۔

سفوکلیس: نہیں، میں اس سے رخصت کی اجازت نہیں چاہونگا، میری ڈوری جن!
وہاں اوپر، آسمان کے ستاروں سے،
میری روح تجھ پر منڈلاتی رہے گی۔ برائے خدا جلدی کر۔

ڈوری جن: ٹھہر سفوکلیس، ــــ اس سے میری آنکھیں باندھ۔
دنیا اتنی متقلب نہ ہونی چاہیئے،
اور نہ جنس لطیف سے مروت اتنی دور ہونی چاہیئے
کہ میں اپنے مجازی خدا کا خون بہتے دیکھوں۔ یوں، بس ٹھیک ہے۔
سورج تلے کسی چیز کو بھی
میں اپنے سفوکلیس کے سامنے نہیں دیکھوں گی۔
خدا حافظ، رومیوں کو بتاؤ کہ یوں مرتے ہیں۔

مارشیس: تجھے معلوم ہے کہ مرنا کیسا ہوتا ہے؟

سفوکلیس: یہ تو، تو ہی نہیں جانتا، مارشیس!
جب ہی تو تو یہ نہیں جانتا کہ جینا کیا ہے؟
مر نا زندگی شروع کرنا ہے!
وہ ایک پرانے، خشک اور ناگوار کام کو ختم کرنا
اور ایک جدید تر و بہتر کام کو شروع کرنا ہے۔
وہ دھوکہ باز معاشوں کو چھوڑنا
اور دلوتاؤں اور نیکوں کی صحبت میں جانا ہے۔
تجھ کو بھی آخر کار
اپنے تمام لجروں[1]، مستروں اور اعزازوں کو خیرباد کہنا۔
اور اپنی ہستی کو آرزو مند ہو گا کہ وہ اس وقت کیا کرے گی۔

والے ری لیس: مگر کیا اس طرح مرنے پر رنج و تکلیف نہیں؟

سفوکلیس: میں کیوں رنج و افسوس کروں جب مجھے وہیں بھیجا جا رہا ہے

---

[1] پھولوں کا ہار۔

جہاں جانے کا میں ہمیشہ سے مشتاق رہا ہوں ؛ میں اب گھٹنے جھکاتا ہوں
مگر پشت تیری طرف کر کے ، یہ وہ آخری عبادت ہے
جو یہ قالب دیوتاؤں کے لئے کر رہا ہے۔

مارشیس : (اے جلاد مجھے) مار مار، والے ری یس۔
ورنہ مارشیس کا دل اُس کے منہ سے نکل پڑے گا۔
یہ ہے اصلی مرد، اصلی عورت! اپنے پیارے کو پیار کر لے
اور اپنی تمام عادتی آزادیوں کے ساتھ زندہ رہ۔
او محبت! تو مجھے دوہری تکلیف دے رہی ہے:
اپنی نیکی سے بھی اور اپنی خوبصورتی سے بھی۔ غدار دل
میرا ہاتھ تجھے اِس سے قبل نعش میں پہنچا دے گا۔
کہ تو ان کے مقدس رشتۂ ازدواج کو کاٹ ڈالے

والے ری یس: میرے بھائی کو کیا چیز ستا رہی ہے؟

سفوکلیس : مارشیس! او مارشیس!
تو نے اب مجھے جیت لینے کا راستہ پا لیا۔

ڈوری جن : او ستارۂ روم! شکر گذاری کو نسے الفاظ ادا کرے
جو اس موقع پر برمحل ہوں؟ .....

مارشیس : والے ری یس! یہ قابل احترام ڈیوک
نصیبے اور موت کو ٹھکرا کر،
قیدی ہونے کے باوجود، مجھے قید کر چکا ہے۔
گو میرے ہی بازوؤں نے اُسے یہاں پکڑ لایا
(مگر) میری روح اس کی باجگزار ہو چکی ہے۔
رومیولس (بانی روم) کی قسم مجھے یقین ہے کہ یہ مجسم روح ہے،
اس کے گوشت نہیں: اور روح قید نہیں کی جا سکتی۔
پھر (اس کو چھوڑ دیں) تو بھی ہم کچھ نہیں کھوئیں گے؛ وہ (تو) آزاد ہے۔
اور مارشیس اب قیدی بن گیا ہے۔

گزشتہ چند سال میں ہمارے مطبعوں نے جتنی بھی نظمیں، ناٹک، وعظ، ناول خطبے شائع کئے ہیں ان میں مجھے ایک بھی ایسا نہیں ملا جو مذکورۂ بالا ہیروئی واقعہ کی سُرخ سے ٹکر لیتا ہو اور اسکی سی عظمت و قربت رکھتا ہو ہمارے پاس بہت سی بالنسریاں اور الغوزے ہیں لیکن (مردانہ) فوجی باجے کی آواز بہت کم سننے میں آتی ہے۔ تاہم ورڈس ورتھ کی لاوڈامیا اور ڈایلون کے گیت و چند سانٹ نظمیں البتہ کسی حد تک ایک شریف نیچل موسیقی پیش کرتی ہیں، اور اسکاٹ بھی بعض وقت اس قسم کی تصویر کھینچ دیتا ہے جیسی کہ الغوزے کے تذکرے میں لارڈ ایوان ہو میل کی ہے۔ طامس کارلائل فطرۃً مردانہ و پر حرارت اخلاق کا مداح تھا اسی وجہ سے اس نے اپنی سیرتی اور تاریخی تصویروں میں داخل کرنے اور اپنے منظور نظروں میں شامل کرنے سے کسی ہیروئی کردار کو نظر انداز نہیں

کیا۔ اس سے پہلے رابرٹ برنس نے ہمیں دو ایک اچھی نظمیں دی ہیں۔ سر لائن مے نے نیز میں لسٹ رین کی لڑائی کا واقعہ پڑھنے کے قابل ہے۔ اور سائمن ڈکلے کی ہسٹری آف سارا سینس (تاریخ عرب) انفرادی جسارتوں کے نادر اثرات کا تحسین و تعریف کے ساتھ تذکرہ کرتی ہے۔ مکرتذکرہ نویس کے متعلق یہ بات بالکل واضح ہے کہ عیسائی اکسفورڈ سے تعلق رکھنے کے باعث وہ اپنا فریضہ خیال کرتا ہے کہ (اسلام کی) مکروہیت کا موزوں طور پر اعتراف کرے۔ خیر۔ اگر ہم قہرمانی یا ہیروئی ادبیات کی تلاش کریں تو ہم بہت جلد پلوٹارک سے دوچار ہوتے ہیں جو اس شعبے کا حکیم اور مورخ ہے۔ یہ پلوٹارک ہی کا احسان ہے کہ ہم براسی ڈاس، ڈائون، اپی منونڈاس، اور قدیم شیپیو سے روشناس ہیں اور میں یہ خیال کرنے پر مجبور ہوں کہ ہم قدیم مصنفوں میں سب سے زیادہ اسی کے قرضدار ہیں۔ اس کی لکھی ہوئی ہر سیرت یا سوانح عمر ہمارے مذہبی اور سیاسی نظریاتیوں کی چوزہ دلی اور کم ہمتی کی ایک تردید اور ایک تغلیط ہے۔ ایک وحشیانہ ہمت اور ایک بیراگ (جو فلسفی نہیں بلکہ عملی ہے) اس کے ہر ہر قصے میں چمکتے نظر آتے ہیں اور یہی وہ بات ہے جس نے اس کتاب کو اتنی بڑی شہرت دلادی ہے۔

ہمیں سیاسیات و معاشیات کی کتابوں سے زیادہ ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جن کی خاصیت تیز اور دست آور ہو۔ زندگی صرف عقلمندوں کے لئے ایک تہوار ہے اور اگر احتیاط کے کونے اور حزم کے آتش دان سے جھانک کر دیکھیں تو وہ ایک خرقہ پوش، بھیانک اور خطرناک چہرہ نظر آتی ہے۔ اگر ہمارے اسلاف یا ہم عصر قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اس کی سزا ہمیں بھی بھگتنی پڑتی ہے۔ ہمارے ماحول کی بیماری اور بدشکلی سے اس بات کا یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ فطری، ذہنی اور اخلاقی قوانین کو ضرور توڑا گیا ہے۔ اور اکثر خلاف ورزی پر خلاف ورزی ہو کر ہی ایسی مرکب تباہی پیدا ہوتی ہے۔ لگجا (LOCKJAW) کی بیماری جس سے انسان کا سر پیچھے جھک کر ایڑھیوں کو آلگتا ہے، سگ گزیدگی جس سے مریض اپنے ہی بیوی بچوں پر بھونکتا ہے، دیوانگی جس سے انسان گھاس کھانے لگتا ہے، اور جنگ، طاعون، ہیضہ، قحط سب جو فطرت کے ایک جوش کا اظہار کرتے ہیں اور جن کی آمد انسانی برائیوں سے ہوتی ہے، انسانی سزایابی ہی سے دور ہو سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایسا کوئی آدمی نہیں پایا جاتا جو گناہ کا کچھ نہ کچھ حصہ دار نہ ہو گیا ہو اسی بنا پر سزا میں بھی اُسے شریک ہونے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

پس ہماری تہذیب کو انسان کے مسلح کرنے سے باز نہیں آنا چاہئے۔ اُسے یہ ہر وقت سن رکھنا چاہئے کہ وہ جنگ کی حالت میں پیدا ہوا ہے اور نہ صرف دولت عامہ بلکہ خود اس کی اپنی بھلائی کا مطالبہ ہے کہ وہ امن کی جھاڑیوں میں رقصاں نہ رہے: (غیر فوجی نہ بنے) بلکہ آگاہ اور دل جمع رہے۔ اور گرج کو نہ تو حقیر سمجھے اور نہ اس سے ڈرے۔ اُسے چاہئے کہ شہرت اور حیات دونوں اپنے ہاتھ میں لے کر اور

جان پر سے کھیل کر، مکمل خوش اخلاقی سے اپنی انتہائی صداقت بیان اور متانت برتاؤ کے ساتھ پھانسی اور ہجوم کا مقابلہ کرے۔

قہرمانیت کی تعریف اس تمام بیرونی برائی کے خلاف انسان اپنے سینے میں ایک جنگجویانہ انداز اختیار کر لیتا ہے اور فرض کر لیتا ہے کہ وہ تن تنہا دشمنوں کی غیر محدود فوج کا مقابلہ کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ روح کے اس فوجی انداز کا نام ہم قہرمانیت (Heroism) رکھتے ہیں۔ اس کی ایک نامکمل ترین صورت ہولت و سلامتی کو ٹھکرا دینا ہے جس کے باعث ایک طرح کی جنگجوئی اور جدال و قتال سے کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ قہرمانیت ایک خود اعتمادی ہے جس میں ممکنہ نقصانات کی تلافی و اصلاح کی غیر معمولی قوت و قابلیت ہوتی ہے اور اسی لئے وہ حزم و احتیاط کی بندشوں کو حقیر سمجھتی ہے۔ ہیرو ایک زبردست توازن کا مالک اور قلب ہوتا ہے۔ اس کے ارادوں کو کوئی ہارج ہلا نہیں سکتا بلکہ وہ اپنی ذاتی موسیقی کی ہم آہنگی کرتے ہوئے خوشی خوشی آگے بڑھتا ہے اس سے اسے کوئی ہولناک خوف یا فنائے عالم کی نشہ آور خوشی کوئی روک نہیں سکتی۔ قہرمانیت کسی قدر غیر فلسفی چیز ہے، اس میں عدم تقدس بھی ہے، وہ اس بات سے ناواقفیت کا اظہار ہے کہ دوسری روحیں بھی اس کی ہم جنس ہیں۔ اس میں فخر ہوتا ہے اور وہ انفرادی طبیعت کی انتہا ہوتی ہے۔ مگر ان سب کے باوجود ہمیں اس کا پورا احترام کرنا چاہیئے۔ کارہائے نمایاں میں کچھ بات ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہم اس کے اسباب و علل اور ذرائع حصول کے پیچھے نہیں پڑتے۔ قہرمانیت محسوس ہوتی وہ کسی سے بخشی نہیں اور اسی وجہ سے ہمیشہ صحت پر ہوتی ہے۔ اور گو یہ صحیح ہے کہ اگر کسی شخص کی نشوونما جداگانہ طور پر ہو، اس کا مسلک و مذہب مختلف ہو اور اس میں ایک عظیم تر ذہنی عملیت ہو تو وہ کسی مخصوص کارنامے میں ترمیم بلکہ تبدیل کر سکتا ہے۔ لیکن ہیرو اپنے کئے ہوئے کارنامے ہی کو بلند ترین کارنامہ خیال کرتا ہے اور وہ کسی فلسفیانہ یا مذہبیانہ تنقید اور ملامت کی پروا نہیں کرتا۔ اور یقین کرتا ہے کہ اس میں ایک ایسی صفت اور قابلیت ہے جس کی وجہ سے خرچ، صحت، زندگی، خوف، دشمنی، ملامت کسی چیز کی اُسے پروا نہیں رہتی، اور وہ جانتا ہے کہ اس کا ارادہ اور عزم تمام حقیقی اور امکانی مخالفتوں سے برتر و بالا ہے۔

قہرمانیت رائے عامہ کے خلاف کام کرتی ہے اور کچھ عرصے تک بہ ظاہر بڑی اور اچھی رائے کے بھی خلاف رہتی ہے۔ قہرمانیت اس مخفی دباؤ کی اطاعت کا نام ہے جو کسی شخص پر اس کے کردار کی طرف سے پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے کسی قہرمانہ کارنامے کی خوبی سوائے اس شخص کے جو اس کو کرتا ہے کسی کو نظر نہیں آتی کیوں کہ ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنا راستہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ دور تک دیکھ سکتا ہے۔ بنا بر ان نیک اور محتاط لوگ (ابتداءً) اس کے کام سے ناراض ہو جاتے ہیں لیکن تھوڑا عرصہ گزرنے کے بعد

وہی لوگ اس ناراض کرنے والی شخصیت کے اور اپنے ذاتی طرزِ عمل میں کوئی اختلاف اور بیگانگی نہیں پاتے۔ بات یہ ہے کہ محتاط لوگ دیکھتے ہیں کہ وہ قہرمانہ طرزِ عمل ایک موجودہ محسوس خوش حالی کے خلاف ہے ـــــ اور ہر قہرمانہ کارنامہ کسی بیرونی خوبی کو ٹھکرانے ہی سے اپنا اندازہ کرتا ہے ـــــ اور اسی وجہ سے وہ مخالفت بھی کرتے ہیں لیکن آخر کار جب اُسے کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو اس وقت محتاط لوگ بھی اُسے آسمان پر چڑھا لیتے ہیں۔

قہرمان کے صفات

خود اعتمادی قہرمانیت کی روح ہے اور یہ روح کی حالتِ جنگ کا نام ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ناروائی اور غلط کاری کو معدوم کر دے اور اس بات کی قابلیت پیدا کرے کہ کارپردازانِ بدی جو کچھ تکلیف پہنچا سکیں اُسے برداشت کر سکے۔ قہرمانیت سچ بات کہتی ہے، وہ منصف، فیاض، مہمان نواز اور اعتدال پسند ہوتی ہے اور دلیل ذرائع سے آمدنی پیدا کرنے اور ٹھکرائے جانے کو ٹھکرانے والی ہوتی ہے۔ اس کا ارادہ پکا، جسارت بے دھڑک اور ہمت غیر مضمحل ہوتی ہے۔ اس کا مزاج معمولی زندگی کو حقیر سمجھتا ہے اور وہ اُن ناروا طور سے احتیاط کرنے والوں کا مضحکہ اُڑاتی ہے جو صحت و ثروت کے عاشق بنے رہتے ہیں۔ جب قہرمانیت اپنے ہی قالب اور جسم پر تقریباً شرمندہ ہو جاتی ہے تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ شکر کے لڈو، چڑیا کے جھولے بناؤ سنگار، تعریف و تحسین، لڑائی جھگڑے، گنجنے کے پتے، فیرنی وغیرہ وغیرہ کے متعلق کیا خیال رکھتی ہوگی حالانکہ یہی چیزیں معاشرے (سوسائٹی) کی فطانت کو ٹھنڈا کرتی رہتی ہیں! مہربان قدرت نے جس کے ہم پروردے ہیں ہمارے لئے کیا کیا مسرت کے سامان مہیا کر دیے ہیں!! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برتری اور کمینگی میں کوئی برزخ اور درمیانی چیز نہیں ہے۔ اگر روح دنیا پر مالک و آقا کی طرح حکومت نہ کرے تو دنیا اس کو فریب دے دیتی ہے۔ ایک کم ظرف آدمی دنیا کی اس عظیم فریب دہی کو سادگی سے قبول کر لیتا ہے، وہ سادہ لوحی اور اعتماد سے کام انجام دیتا رہتا ہے، وہ سرخ پیدا ہوتا ہے مگر زرد مرتا ہے، وہ اپنی سنگار میز کو سنوارتا اور آراستہ کرتا ہے، وہ اپنی صحت کا غیر معمولی بلکہ غیر ضروری طور سے لحاظ رکھتا ہے، وہ محض میٹھی غذا اور تلخ شراب کے حصول کی خاطر پھندے بچھانے سے دریغ نہیں کرتا۔ اُسے کوئی اچھا سا گھوڑا یا رائفل نظر آتا ہے تو بے اختیار دل کھو بیٹھتا ہے اور جیتنے کہ مختصر سی گفتگو اور چھوٹی سی تعریف پر پھول جاتا ہے ـــــ لیکن کم ظرف کی ان سنجیدہ بیہودگیوں پر ایک عظیم روح اور بالا ہستی صرف ہنسنا ہی پسند کر سکتی ہے۔ حقیقت میں ایسی چیزوں کا کچھ لحاظ کرنا عظمت طلبی کے خلاف ہے۔ یہ نوٹ کرنا میرے لئے کتنی سبکی کی بات ہے کہ آپ کے پاس ریشمی یا کتابوں کی کتنی جوڑیاں ہیں اور کس کس رنگ کی ہیں۔ یا یہ کہ کتنی پیصیس ہیں جن میں سے کچھ برت میں ہیں کچھ زاید از ضرورت۔

شہر میں رہنے والے محض خرچ کے خیال سے کسی اجنبی کی میزبانی کرنے اور اُسکو اپنے آتش دان کے

پاس مدعو کرنے میں بے آرامی محسوس کرتے ہیں اسی طرح وہ تنگ دل لوگ یہ بہانہ کرتے ہیں کہ وقت اور غیر معمولی مظاہرات برباد اور تلف ہو جاتے ہیں۔ مگر جو شخصیت عمدہ اخلاق اور اعلیٰ صفات سے متصف ہوتی ہے وہ ایسی بیجا کفایت شعاری کو اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتی اور یقین کرتی ہے کہ "خدا خود میر ساز و سامان ارباب توکل را" ابن حنقل (غالباً ابن حوقل ـــ مترجم) جو ایک عربی جغرافیہ نویس تھا شہر صغد واقع بخارا کی ایک انتہائی مہمان نوازی کا یوں تذکرہ کرتا ہے کہ "جب میں صغد میں تھا تو مجھے ایک بڑی محل نما عمارت نظر آئی۔ اس کے دروازے (پھاٹک) چوپٹ کھلے اور دیواروں میں کھڑکیوں سے جو رُدے گئے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہا گیا کہ عمارت مذکور ایک سو برس سے رات اور دن کبھی بند نہیں کی گئی۔ اجنبی کسی وقت بھی کسی تعداد میں بھی آسکتے ہیں، مالک مکان اُن کی اور اُن کے سواریوں کی مہمانی کرنے سے ہرگز نہیں گھبراتا اور اُس کی اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں کہ مہمان کچھ عرصہ ٹھہریں۔ اس قسم کی اور کوئی چیز مجھے کسی ملک میں بھی نظر نہیں آئی۔" کشادہ دل لوگ خوب جانتے ہیں کہ دکھاوے کی خاطر نہیں بلکہ محض محبت سے اگر کوئی شخص کسی اجنبی کو اپنا کچھ وقت یا رقم یا پناہ دے تو وہ خدا کو اپنا ممنون بناتا ہے ـــ اس سے بڑھ کر اور کیا جزا و بدلہ مل سکتا ہے۔ ان کا وقت جو بظاہر خرچ ہوتا نظر آتا ہے اس کا معاوضہ مل جاتا ہے اور جو تکلیفیں وہ سہتے ہیں اُن کا صلہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگ انسانی محبت کے شعلے کو تیز کرتے ہیں اور بنی نوع انسان میں اخلاق حسنہ کے معیار کو بلند کرتے ہیں۔ میزبانی خدمت کے لئے ہونی چاہئے نہ کہ وہ دکھاوے کے لئے۔ ورنہ وہ میزبان کو اس کے بلند مقام سے نیچے گھسیٹ لیتی ہے۔ بہادر اور حوصلہ مند روح اس بات سے بہت بالا ہوتی ہے کہ اپنا اندازہ اپنے دسترخوان اور فرش کی سج دھج سے کرے۔ وہ جو کچھ میسر ہوتا ہے پیش کرتی ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں کرتی اور اس کی اس جلالت سے سادہ چپاتی اور صاف پانی میں بھی وہ حسن پیدا ہو جاتا ہے جو میر بلد کی شہری ضیافتوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔

ہیرو کی ہر پرہیزگاری اور اعتدال صرف اس خواہش کی وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کی عزت کو بٹہ اور شہرت کو دھبہ نہ لگے۔ پرہیزگاری کو وہ اعتدال پسندی کے باعث چاہتا ہے نفس کشی کی غرض سے اختیار نہیں کرتا۔ وہ اس بات کو اپنے مرتبہ کے مطابق نہیں سمجھتا کہ سنجیدگی اختیار کرے۔ اور ایک تلخ لہجے میں گوشت خواری، شراب نوشی، تمباکو، افیون یا چائے کی عادت اور ریشم و سونے کے استعمال سے اپنی بیزاری ظاہر کرے۔ ایک بڑا آدمی شاید ہی یہ جاننے کی فکر کرتا ہو کہ وہ کیا کھاتا ہے، یا کیسا پہنتا ہے۔ تاہم عیب جوئی اور فیشن پرستی کے بغیر بھی اس کی معیشت طبعی اور شاعرانہ ہوتی ہے۔ جان ایلیٹ نے جس نے

سب سے پہلے امریندیوں (امریکی ہندی یا امریکا کے اصلی باشندوں) میں عیسائیت کی تبلیغ کی ضرورت محسوس کی تھی، پانی پی کر شراب کے متعلق کہا کہ گو شراب ایک نبیل (NOBLE) اور فیاض شے ہے اور ہمیں اس کے لئے عاجزانہ شکر ادا کرنا چاہئے لیکن میں جانتا ہوں کہ پانی اس سے پہلے پیدا کیا گیا۔" اس سے کہیں بہتر شاہ داود (علیہ السلام) کا اعتدال ہے جنہوں نے خدا کی رضا کے لئے اس پانی کو زمین پر انڈیلوا دیا جسے ان کے تین سپاہیوں نے جان جوکھم میں ڈال کر آپ کے لئے حاصل کیا تھا۔

بروٹس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ فلپائی کی لڑائی کے بعد اپنی تلوار پر (خودکشی کے لئے) گرا تو اس نے ایوری پیڈس کی ایک سطر دہرائی کہ "او نیکی! میں عمر بھر تیرے پیچھے لگا رہا لیکن آخر کار معلوم ہوا کہ تو فقط ایک سایہ ہے"۔ مجھے ذرا بھی شک نہیں کہ یہ اس نامور شخص کی محض اہانت ہے۔ ایک قہرمانہ روح اپنا انصاف اور اپنی نبالت (NOBILITY) کبھی فروخت نہیں کرتی۔ وہ کبھی عمدہ کھانے اور گرم اور بہ آرام سونے کے لئے مدعو نہیں کرتی۔ یہ یقین کر لینا ہی حقیقی عظمت ہے کہ نیکی خود وافی ہے اور اپنا آپ صلہ و بدلہ ہے۔ غربت اس کا زیور ہے وہ ثروت و عزت نہیں چاہتی اور بڑی آسانی سے اپنا نقصان برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن قہرمانہ ضعف کی جو چیز سب سے بڑھ کر مجھے بھاتی ہے۔ وہ اس کی خوش مذاقی اور بشاشت ہے۔ یہ صفات اس میں خوب نمایاں رہتے ہیں۔ عظمت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اپنا فرض منصبی ادا کرو اور مصائب کا سنجیدگی سے مقابلہ کر کے انہیں برداشت کر لو ــــ یہ آسان تر ہے۔ لیکن بعض ایسی نادر روحیں بھی ہوتی ہیں جو رائے، کامیابی اور زندگی کی کوئی قیمت ہی مقرر نہیں کرتیں۔ وہ اپنے دشمنوں کو التجاؤں اور درخواستوں سے راضی کرنا یا اپنے افسوس اور معذرت کا اظہار کرنا بالکل نہیں جانتے بلکہ ہمیشہ اپنی عادتی عظمت و خودداری کا نقاب ڈالے رہتے ہیں۔ سیسیرو پر غبن کا الزام لگایا جاتا ہے مگر وہ اپنی برأت ثابت ہونے تک انتظار کرنا بھی ایک بہت بڑی ذلت سمجھتا ہے اور اگرچہ حسابات کی فرد اس کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن وہ اسے ارکان عدالت فوجداری کے سامنے پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ سقراط کا (تبدیلی سزا کی التجا کرنے کی بجائے) دارالبلد میں اپنے اعزاز میں ضیافت چاہنا اور سرطامس مور کا مقتل میں (جلاد سے) دلگی کرنا اسی رو سے تعلق رکھتا ہے۔ بومانٹ اور فلیچر کے "بحری سفر" میں جولیٹا، بہادر کپتان اور اس کے ساتھیوں سے کہتی ہے ــــ

جولیٹا: کیوں غلامو! یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ تمہیں پھانسی دیدیں۔

کپتان: بہت ممکن ہے۔

اور یہ ہمارے بھی اختیار میں ہے کہ پھانسی پر چڑھ کر تجھے حقارت سے دیکھیں۔

یہ جوابات درست اور مکمل ہیں۔ ظرافت حقیقت میں مکمل صحت کا شباب اور تازگی ہے عظیم المرتبت انسانیت کبھی نہیں ہوتا کہ کسی چیز سے سنجیدگی سے مقابلہ کرے۔ وہ ہر چیز کو ایسا ہی بشاش دیکھنا چاہتا ہے۔ جیسے سدا جھجھانے والا گیری پرندہ۔ خواہ کام شہر بسانے کا ہو یا قدیم اور احمقانہ مذہب و اعتقادات کا استیصال کرنا جو ہزاروں برس سے زمین کو پریشان کر رہے ہیں، وہ سادگی سے اس عالم کی تمام تاریخ اور رواجات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور اپنی من مانی بات عمل میں لاتے ہوئے دنیا کے نیلے قوانین کو (جن کا لحاظ نہ رکھنے پر سزا مقرر ہے) "معصومیت" سے ٹھکرا دیتے ہیں اور اگر ہم نسل انسانی کا مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے باہم مل کر کلول کر رہے ہیں۔ اگرچہ دنیا کی نظروں میں وہ عمل و اثر کا ملوکانہ اور سنجیدہ جامہ پہنے نظر آتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جو شخصیت جتنی بڑی ہوگی اتنی ہی زیادہ ظریف، غیر سنجیدہ اور طفلانہ حرکتیں کرنے والی ہوگی۔

عمدہ قصوں سے ہمیں سبق ملتا ہے، ممنوع کتاب کو مدرسے میں بنچ کے نیچے چھپا رکھنے والے لڑکے پر رومان کا اثر اور تسلط ہوتا ہے اور قہرمان یا ہیرو کے حالات پڑھنے سے ہمیں اس سے ایک دلچسپی اور وابستگی پیدا ہو جاتی ہے ــــ سچ پوچھئے تو یہی ہمارے مقصد کی اصل حقیقت ہیں اور یہ بڑی اور قیمتی جائداد کے مانند ہوتی ہیں جن پر ہمارا قبضہ ہوتا ہے۔ اگر ہم یونانی بہادری اور رومی غرور کا مطالعہ کرتے وقت ایک قسم کی وسعت اختیار کر لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ہم یونانی و رومی جذبات سے یگانگی محسوس کرنے لگتے ہیں اور اس رفیع المرتبت مہمان کو (جس کا ہم تذکرہ پڑھ رہے تھے) اپنے حقیر گھروں میں اتارتے ہیں، اس کے بعد میزبان (قاری) کے لئے مناسب ترین امر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو زمان و مکان اور تعداد و تقطیع (سائز) کے وہمی تعلقات سے دھوکہ نہ دیں۔ کیوں آئینائی، رومی، ایشیا اور انگلستان وغیرہ الفاظ کانوں میں گونجیں؟ حالانکہ جہاں دل ہوتا ہے وہیں دیویاں رہتی ہیں اور دیوتا آتے جاتے ہیں؛ اور یہ دیوتا اور دیویاں کسی اور ارض شہرت میں نہیں آتیں۔ میساشوسیٹ، دریائے کنک ٹیکٹ، خلیج باسٹن آپ (امریکی لوگ) معمولی مقامات سمجھتے ہیں اور کان اجنبی اور قدیم بلادیات (ٹوپوگرافی) کے نام پسند کرتے ہیں۔ مگر ہم یہاں ہیں اور ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بہترین چیزیں بھی یہی ہیں۔ صرف یہ دیکھئے کہ آپ یہاں ہیں، ــــ فن اور فطرت، امید اور قسمت، دوست، فرشتے، ذات اعلیٰ کوئی بھی اس کمرے سے جہاں آپ بیٹھے ہیں غائب نہیں۔ بہادر اور مہربان ایپی منڈاس کے متعلق کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ دیوتاؤں کے کوہ ساکن

اولیمپس پر مرے نہ ہی ملک شام کی شاعرانہ دھوپ کی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے اچھا ہے۔ واشنگٹن ٹن کے چلنے پھرنے کے لئے جرسیس کی زمین کافی معزز تھی اور ایسی مرج لندن کی گلیاں ملٹن کے قدموں کے لئے کوئی شخص عظمت حاصل کرتا ہے تو ساتھ ہی اپنے وطن کو لوگوں کے تخیل میں دلپسند اور اس کی آب و ہوا کو ہر دلعزیز منوا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ نفاست پسند روحیں بھی اُسے تسلیم کر لیتی ہیں۔ اصل میں وہی ملک بہترین ہے جو نبیل ترین (NOBLEST) داغوں کا مسکن ہو۔ پریکلیس، ٹرٹوئن، کولمبس، بیارڈ، اسدے کے کارنامے پڑھتے وقت جو تصویریں ذہن میں بھر جاتی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ زندگی کتنی ذلیل ہے۔ نیز یہ کہ ہمیں اپنی استطاعت کے مطابق اپنی زندگی کو ان چیزوں سے آراستہ و پیراستہ رکھنا اور ان اصول پر عمل پیرا رہنا چاہیئے جو فطرت کو ہماری زندگی کے دوران میں بھلے معلوم ہوں۔ ایسی چیزیں شاہی یا قومی طمطراق اور شان و شوکت سے بڑھ کر عظمت رکھتی ہیں۔

ہم نے بہت سے ایسے غیر معمولی نوجوانوں کو دیکھا یا سنا ہے جو بن کھلے مرجھا گئے یا جن کی کارگزاری عملی زندگی میں غیر معمولی نہ تھی: جب ہم اُن کے جذبات و رجحانات دیکھتے ہیں اور انہیں سوسائٹی، کتب، مذہب کے متعلق کچھ کہتا سنتے ہیں تو ہم ان کی برتری کو سراہنے لگتے ہیں! اور جب وہ ہمارے طریقہ حکومت اور سماجی حالت کے پورے ڈھانچے سے حقارت اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تو اُن کا لہجہ ایک شباب بھرے ولولہ کا سا ہوتا ہے جو انقلاب برپا کرنے بھیجا گیا ہے۔ لیکن جب عملی شعبے میں داخل ہونے کا وقت آتا ہے تو یہ تکمیل طلب عوج بن عوق (بجائے COLLOSSUS۔ مترجم) ایک معمولی قد کے انسان میں سکڑ آتے ہیں۔ ان کے اعمال میں جو سحر طرازی تھی وہ دراصل اُن کے تخیلی رجحانات تھے جو ہمیشہ امور واقعی کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ مگر عمل کی سخت زمین تخیل کے آفتابی گھوڑوں سے جوتی نہیں جا سکتی انہیں کوئی نمونہ یا ہم مشرب ساتھی نہ ملنے سے اُن کے دل ہمت ہار دیتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی ابتدائی تمناؤں کے وقت وہ دوسروں کو جو سبق دیتے تھے وہ اب بھی صحیح ہے اور اگر وہ ذرا جرأت اور صداقت سے کام لیں تو اس کی صحت پر انہیں خود بھی یقین حاصل ہو سکتا ہے ورنہ کیوں ایک عورت اپنے آپ کو کسی تاریخی زنانہ شخصیت سے مشابہ سمجھے اور یہ خیال کرے کہ ساقو ہیلو نگلے، دسمائل یا گریجے میں بند رہنے والی ذہین اور تربیت یافتہ راہبہ عورتیں چونکہ تخیل اور پُرجلال عدل کو مطمئن نہیں کر سکتیں اس لئے کوئی بھی مطمئن نہیں کر سکتا — کم از کم وہ نہیں کر سکتی۔ نہیں کیوں؟ اب تک جتنی طبیعتیں وجود میں آئیں ممکن ہے وہ ان میں سرور ترین ہو مگر پھر بھی چونکہ اُسے ایک نئی اور غیر آزمودہ گتھی سلجھانی ہوتی ہے اس لئے اس خاتون کو چاہیئے کہ روح مستقیم کے ساتھ اپنی راہ پر پُرجلال طور سے گامزن رہے، ہر نئے تجربے

کے اشارے اور ارشاد کو قبول کرے، اور یکے بعد دیگرے ان تمام چیزوں کا جائزہ لے جو اس کی آنکھوں سے وکالت کرتی ہیں تاکہ اس طرح وہ اپنی نومولود ہستی کی طاقت اور کشش کا اندازہ کر سکے۔ اگر وہ ایسا کرے تو اس رفتار کی موقتی اور عارضی رکاوٹوں یا سکونوں میں تاریکی یاس کے بعد ایک نئی فجرِ امید کا طلوع ہونا ہے۔ حسین عورت جو مداخلت بیجا کو ایک فیصلہ کن اور مغرور اختیارِ اثرات کے ذریعے مسترد کر دیتی ہے، جو اوروں کو خوش کرنے کا لحاظ نہیں رکھتی اور نہ پروا کرتی ہے اور جو خود پسند اور بلند ہمت ہوتی ہے، وہ دیکھنے والوں کو اپنی نباہت و شرافت سے متاثر کر دیتی ہے، اور اُس کا خاموش دل اس کی ہمت بندھاتا ہے، عزیز من، کبھی ہتیار ڈال کر بادبان نہ اُتارو۔ سربلندی سے بندرگاہ میں آجاؤ یا خدا کے ساتھ سمندروں میں فتحمندی کے پھریرے اُڑاتے اپنے جہاز کے بادبان کھول دو! تمہاری زندگی عبث نہیں کیوں کہ ہر گزرنے والی آنکھ تمہارا معاینہ کر کے مسرور اور اصلاح پذیر ہوتی ہے۔

قہرمانیت کی خصوصیت یہ ہے کہ استقلال کے ساتھ جمے رہیں۔ ہر شخص میں فیاضی کی اتفاقیہ لہریں اُٹھتی اور اس کے دورے ہوتے ہیں۔ مگر کمال تو یہ ہے کہ جب تم نے کسی پارٹ کو اختیار کر لیا تو اسی پر باقی رہو اور یہ کمزوری نہ دکھاؤ کہ دنیا کی رائے کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہیروئی عامی نہیں ہو سکتا اور نہ عامی، ہیروئی۔ اس کے باوجود ہم میں یہ کمزوری ہے کہ لوگوں کی ہمدردی ایسے امور میں حاصل کرنے کے متمنی رہتے ہیں جن کی خصوصیت وخوبی ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمدردی کے پاس اپیل کرنے کی کوشش سے بالا اور سُست رو انصاف کے نزدیک مرافعہ کرنے کی خواہش سے ارفع ہوتے ہیں۔ اگر تم اپنے بھائی کی خدمت اس واسطے کرتے ہو کہ اس کی خدمت تمہارا فریضہ ہے تو یہ دیکھ کر اپنی رائے نہ بدل دو کہ محتاط لوگ تمہاری تعریف نہیں کرتے۔ اپنے عمل سے وابستہ رہو اور اگر تم نے کوئی عجیب اور متجاوز الحد کام کیا ہے اور سلامت روی کی اچاٹ دینے والی یکسانیت کو توڑ دیا ہے تو اپنے آپ کو مبارکباد دو۔ وہ ایک بڑا مشورہ تھا جو ایک نوجوان کو دیا جاتا ہیں نے سنا ہے ——— "ہمیشہ وہی کام کرو جس کے کرنے سے تم گھبراتے ہو" اگر کسی میں سادہ مردانگی ہے تو اسے ہرگز معافی نہیں مانگنی چاہئے۔ بلکہ اپنے گزشتہ کام کو فوشیوں (PHOCION) کے سے سکون سے دیکھنا چاہئے جس نے مان لیا کہ لڑائی کا انجام اچھا رہا مگر اس بات پر کبھی نہیں پچھتایا کہ اس نے اس لڑائی سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

ہماری کوئی کمزوری یا تضحیک ایسی نہیں پائی جاتی جسے اس خیال سے تسلی نہ ہو کہ "وہ میری ساخت اور بناوٹ کا، نیز میرے ہم خلقوں کے ساتھ میرے تعلقات اور فرائض کا جز ہے"۔ کیا فطرت نے میرے ساتھ معاہدہ کیا ہے کہ میرا کبھی نقصان نہ ہو، اور نہ میں کبھی مضحکہ بنوں؟ عظمت

شروع سے آخر تک اوروں کی رائے اور عمدہ خیالات سے بے نیاز رہتی ہے۔ ہم اپنی خیراتوں کا تذکرہ اس لئے نہیں کرتے کہ اُن کی وجہ سے تعریف ہو یا وہ بڑا کارنامہ ہیں بلکہ ہمیں صرف اپنا صحت پر ہونا ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال ایک سرمایہ حماقت سے بڑھ کر وقعت نہیں رکھتا، چنانچہ تمہیں خود اس کا انکشاف اس وقت ہو جاتا ہے جب کوئی اور اپنی خیرات کا تذکرہ کرتا نظر آتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ معمولی حسن خلق (والا) زہد نفس کشی اور غیر معمولی فیاضی کو ایک ایسی پنسیا سمجھتا ہے جو انہیں لوگوں میں پائی جاتی ہے جو آرام اور دافر دولت سے بہرہ ور ہیں اور جن کے متعلق یہ بات بیّن طور سے معلوم ہے کہ انہیں مصیبت زدوں کی عظیم جمعیت سے برادرانہ ہمدردی ہے۔ اور نہ صرف ہمیں ترک مسرات قرض، تنہائی اور غیر ہر دلعزیزی کی سزا کو برداشت کر کے (ہیروئیت کی) روح سے روحدار بننا اور اسی کے مطابق کام کرنا چاہیئے بلکہ عقلمند کو تو یہ سزاوار ہے کہ وہ بہادری سے ان نادرالوجود خطرات کا مقابلہ کرے جو کبھی کبھی انسانوں کو پیش آتے ہیں اور اپنے آپ کو اُکتا دینے والی بیماریوں اور ہتک آمیز حملوں سے مانوس بنائے۔ نیز بے قصور اچانک مار ڈالے جانے کے لئے آمادہ رہے۔

ہیروئی اوقات عموماً پرخطر اوقات ہوتے ہیں مگر وہ دن کبھی روشن نہیں جس میں یہ عنصر کام نہ کرے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی ماحول اور حالت آج کل اس ملک میں تاریخی طور پر گزشتہ تمام زمانوں سے کسی حد تک بہتر ہے اور تہذیب کے لئے زیادہ آزادی میسر و موجود ہے۔ اسی وجہ سے پہلے ہی قدم میں پامالی سے کوئی سخت آویزش نہیں ہوتی تاہم جو ہیروئی ہوگا اُسے ہر وقت اپنی دھار کو آزمانے کا موقع ہاتھ آتا رہے گا۔ انسانی نیکی کے غازیوں اور شہیدوں کو ہمیشہ عناد اور تکلیف ہی سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ تو کل ہی کی بات ہے کہ بہادر لنچ نے اپنا سینہ ایک مجمع کی گولیوں کے سامنے پیش کر دیا اور آزادئ بیان و خیال کی وکالت کرتے ہوئے جان دیدی اور اس وقت حیات کا رشتہ منقطع کیا جب زندہ نہ رہنا ہی بہتر (و شریف تر) تھا۔

میری نظر میں ایسی کوئی راہ نہیں جس پر طمانیت کامل کا دور دورہ ہو اور انسان اپنے دل کے مشورے کے بغیر گامزن رہ سکے۔ اسے میل جول کی کثرت نہ کرنی چاہیئے۔ اسے اپنے نفس سے تخلیہ زیادہ کرنا چاہیئے اور جن راہوں کو وہ پسند کرتا ہے ان پر مضبوطی سے جم جانا چاہیئے۔ اس کا لگاتار چھوٹے سے چھوٹے فرض میں سادے مگر بلند جذبات کا لحاظ رکھنا اس کے کردار کو اس حد تک مضبوط کر دے گا کہ وہ ضرورت پڑے تو سخت ترین ابتری بلکہ پھانسی کے تختے پر بھی قابل تعریف ثبات دکھائے گا۔ لوگوں کو جو کچھ تعدیاں اور مظالم پیش آئے ہیں وہ آئندہ بھی آسکتے ہیں، خصوصاً ایک جمہوریت میں جہاں مذہب کا اثر کم ہو چکا ہے تلخ ہتک

آگ اُگلنے والے اور پر FEATHER (جو امریکائی مجمعوں کی سخت ترین سزا ہے) اور پھانسی کا خیال نوجوان ہیرو کو کتنا آسان اور کتنا دم خوش کن معلوم ہوتا ہے اور جب کبھی کوئی دوسرا اخبار یا ہمسایوں کی کافی تعداد اس کے رجحانات اور آراء کو انقلاب انگیز قرار دینا پسند کرتے ہیں تو دیکھو وہ کس قدر جلد اپنے فرض کے مفہوم کو سمجھتا اور سزاؤں کو ٹھکراتا ہے۔

انتہائی اشتعال طبع دل سے بھی مستقبل کے متعلق پریشانیاں یہ دیکھنے سے دور ہو جائیں گی کہ قدرت نے کس قدر جلد اس کے اور انتہائی بدخواہی کے درمیان ایک حد قائم کر دی ہم (مرنے پر) ایک ایسے کنارہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی دشمن ہمارا پیچھا نہیں کر سکتا ؎

انہیں بکنے دو:

تو اپنی قبر میں آرام سے ہے۔

(تعلیق = یہ ٹینی سن کی DIRGE نامی نظم میں اصل میں یوں ہے (۱) تیری قبر کو گھیرے ہوئے سبزے پر

(۲) انہیں بکنے دو۔ سرجم (۱)

آئندہ کے متعلق ہماری ناواقفیت کی چوتاریکی ہے اس میں اور ایسی گھڑی میں جب ہم بلند تر آوازوں سے کان بند ہوتے ہیں تو کون شخص ہے جو ان لوگوں پر رشک نہ کرے جنہوں نے اپنی مردانہ جد و جہد کا محفوظ انجام دیکھ لیا؟ کون ہے جو ہماری سیاسی کمپنگی کو دیکھتا ہے اور دل ہی دل میں واشنگٹن کو مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہتا کہ وہ عرصے سے کفن میں لپیٹا جا چکا ہے اور ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے! اور یہ کہ وہ قبر میں میٹھی نیند سوتا اور انسانیت کے متعلق ابھی نراس و مایوس نہیں ہوا؟ کون ہے جو بعض اوقات اچھے اور بڑے لوگوں پر رشک نہیں کرتا جو فطرتی دنیا کی ابتری کے مصائب برداشت کرنے اور عجیب سکون کے ساتھ فطرت محدودہ سے اپنے تعلق منقطع ہونے کا انتظار کرنے اب نہیں رہے؟ پھر بھی یہ امر اہمیت رکھتا ہے کہ محبت انسانی نے جو دغابازی سے پہلے فنا ہو جاتی ہے موت کو ناممکن بنا دیا ہے اور وہ اپنے آپ کو لافانی اور مجرد و غیر اطفا پذیر (INEXTINGUISHABLE) ذات کی گہرائیوں کا باشندہ بناتی ہے۔ فقط

(ترجمہ)

بادۂ دکن

(لچھمی نارائن صاحب تخلص اورنگ آبادی)

۵

عالیجاہ بہادر کے تصویر خانہ کے ساتھ، رباعیات و قطعات کا بھی ایک کافی حصہ کلیات میں ہے، جس میں سے مناجات، نعت، منقبت صحابۂ کرام، عقاید، بے ثباتی دنیا، قدر کمال، نیرنگ عشق، استغراق محبت، گریہ وزاری، رضائے دوست، یاد ایام، فہمائش معشوق، شکوۂ معشوق، یار و اغیار، جور و تغافل، صنعت تخلیس، تقدیر و تدبیر کے مضامین رباعیات و قطعات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے (عمر یا نعمی)

مناجات

یارب جو بھلائی ہو مری سو تو دے — دل پر مرے جو ننگ ہے اُس کو کھو دے
ظاہر تمہارے ہاتھ سو میں نے کھویا — باطن ہے ترے ہاتھ تو اُس کو تو دے

نعت

نکلا احمد سین جب کہ میم احمد — وو ذات مقدس تو ہوی عین احد
چالیس برس بعد نبوت جو ہوئی — یہ رمز ہے یعنی کہ ہوے محو عدد

منقبت صحابۂ کرام

جیسے فرقان میں ہیں نقطے چار — یوں رسول خدا کے چار ہیں یار
چار ہیں گے کتاب ربانی — اور مقرب فرشتہ بھی ہیں چار

عقائد

کس کے نزدیک مال کی عزت — کس کے نزدیک آل کی عزت
میرے نزدیک اُس کی ہے عزت — جس کے نزدیک آل کی عزت

مسکین و غلام اہل مصطفےٰ تو ہے — دل خستہ نیم جاں ہوں یا مصطفےٰ تو ہے
نشاید کہ دلوں میں در کسے ہے تغافل — بکس ہم نہ جواں ہوں یا مصطفےٰ تو ہے

گھستے ہیں ترے در پہ جبیں اہل نیاز — الطاف ترا ہر دو جہاں میں ہے سمانا

تیرا ہوں غلام تو ہے صاحب میرا — یا بندہ نواز ہے بندے کو نواز

بے ثباتی دنیا

الٰہی! اب ہم سے جنگ تجھ کو کب تک؟ — گلشن میں ترے یہ ننگ ہو کب تک؟
تیری ہے غرض کہ ہم چمن جاویں — بالفرض کہ ہم ہوا سے گئے تو کب تک؟

اے شمع! بھلا یہ گرانی کب تک — پروانے کے ساتھ تن تنانی کب تک؟
وے تو جل مرے ترے پہ خاک ہوا — بارے تیری یہ زندگانی کب تک؟

قدر کمال

کوئی مشتاق مال کے ہیں گے — کوئی عاشق جمال کے ہیں گے
میرے نزدیک وہی ہیں کامل — جو کہ طالب کمال کے ہیں گے

نیرنگ عشق

پیا کل رات میرے گھر کو آیا — میں سویا تھا مجھے اُس نے جگایا
کہا جاگو پیارے کہاں تک سوئے گا تو؟ — ارے اب جاگ جو جاگا سو پایا"

ہم دو ہیں کہ مے پیں بہ مستی نکریں — بت خانہ میں جاویں بت پرستی نکریں
زلفوں سے بتوں کی گوش ہیں سا رہتا — لیکن یہ غلط راز دستی نہ کریں

یہ جو اک تنیج گانہ باطن و ظاہری — مانع دید ہیں ان سے ہوا تو جیسی

چشمۂ حیواں ابلتا ہی رہے گا بیچ دشتِ تباں کے ہی آپ چلو گھڑی

صبح عدم کو آیا تھا میں کیا فراغ سے نے کام تھا یاغ سے نے سیر باغ سے
خانۂ خراب عشق نے آکر جگا دیا میرا ہی گھر جلا دیا میرے چراغ سے

استغراقِ محبت

ہر شخص سے کیفیت کو تیرے پوچھا جو کوئی آیا ادھر میں اُس سے پوچھا
جس نے کہ ذرہ حرف کہا تیرا مجھے اک بار میں پوچھ پوچھ پوچھ پوچھ پوچھا
واعظ کیا تو پھر ہی بھٹکا بھٹکا دیکھا نہیں اُس زلف کا لٹکا لٹکا
کیا حور بہشت کی کرے ہے تعریف یہ دل ہے ہمارا جدھر کو اٹکا اٹکا
صاحب اِس چمن میں یہ ہمارا میں کیا تھا کل اک سرو کو دیکھا ہوش میں آیا سر خجل
میں اُس کے تئیں کو یار کے قامت کا کر خیال دوڑا، گلے لگا میں گرایا نو پر پھل

گریہ وزاری

میں یار کا خط ہاتھ میں لیکر رویا ایسا رویا کہ خط گیا سب دھویا
جب مجھ سے پڑھا گیا نہیں وہ نامہ پھر میں رویا کہ ہائے کہوں میں رویا
صاحب کا تو ان دنوں عجب ہے لکھا میں حال کو اُس کے تاکہ جا کر دیکھا
اک خط جو لکھا سامنے میرے تجھ کو آنسو سے بھگا کے آہ سے پھر سکھا
مخمور میں کل صبح کو موتے ہوتے سرخ آنکھیں اُٹھا نیند سے سوتے سوتے
زاہد نے مجھے دیکھ کہا آنکھیں لال کیا پیے ہیں میں؟ ہنس کہا "روتے روتے"

رضائے دوست

تو تم کو ہے مطلوب تو لیجے پیارے سر تم کو ہے مطلوب تو لیجے پیارے
اک جی تو بساط میں ہمارا ہی ہم پاس گر تم کو ہے مطلوب تو لیجے پیارے
جس گھر میں بسمل تڑپنے سے رہا نزع کی حالت میں انتہا کہا
تو نہا قاتل سے مت مانگو مرا یہ ہے بس جو در پہ اُس کے خون بہا

یادِ ایام

اے دل! جب کہ عشق میں تو آیا میرے کہنے کو پھر نہ خاطر لایا
اب ہے گرفتار بلا میں ہمدم دیکھا آخر سزا کو اپنی پایا

سامع میں فتور ہے تھوڑا باصرہ میں قصور ہے تھوڑا
لذتِ راگ و رنگ سے چھوٹے بارے اُس سے سرور ہے تھوڑا

فہمائشِ معشوق

اے یار ہمیں سخت کہیگا کب تک ہم ہیں سہتے کوئی سہیگا کب تک؟
دو دن کی یہ زندگی خوشی سے کاٹیں پیارے! ہنس ہنس خفا ہوگا کب تک؟

وصلِ معشوق

اُس شوخ سے شب میکدہ میں دھوم رہی تھی آنکھوں میں سبھوں کی تو نشہ جھوم رہی تھی
شیشہ کے گلے پڑتی تھی خم سے نکل کر پیالے کا صراحی بھی تو منھ چوم رہی تھی

یار و گلزار

گلشن میں دم صبح عجب دھوم رہی تھی بلبل بھی رگ گل سے لٹک جھوم رہی تھی
میں کوشکِ یار کو اپنے تو سنا یا شبستاں کا قمری بھی قدم چوم رہی تھی

جور و تغافل

تغافل سے ترے ہم تو مرے رے کوئی کیا الفت تجھ سے کرے رے
پھپولا ہو رہا ہے دل ہمارا دکھایا اس کے تئیں تو نے ارے رے
دلِ صاحب عبث اے دل آزار! لب کو شکوہ سے نہیں کرتا
جب تلک پھوٹتا نہیں شیشہ تب تلک تو صدا نہیں کرتا

صنعتِ تجنیس

اُس غنچہ دہن سا کہ جہاں میں گل ہے کیا سوجھے اُسے جس کی نہ میں گل ہے
پروانے کی پریشانی کچھ گل نہ ہوئی افسوس! چراغِ انجمن میں گل ہے
مرض ہے مرا اے پیا۔ لا دوا تری چشم کا ہے پیالا دوا
حکیم اب تری دیکھی تشخیص میں نے جو کچھ تو دیا میں پیا۔ لا دوا
پیا جا مت سا میرے تئیں کو پی آجا۔ مت سا میرے تئیں کو
پیا پے کیوں مجھے دیتا ہی پیالے پیا جا۔ مت سا میرے تئیں کو

تقدیر و تدبیر

اک ذرہ اختیار ترے ہاتھ میں نہیں آیا یہ فہم از تری ذات میں نہیں
تدبیر کیتیں ہے تقدیر نقش ہے گر عیب تیرے ہاتھ کے ہاتھ میں نہیں

تنقیدیں

شہنشاہِ دوجہاں اس کتاب کو لال دین صاحب عابد۔ ایم۔ اے۔ نے تالیف کیا ہے اس میں پیغمبر اسلام کی پیدائش سے وفات تک کے حالات درج ہیں یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں عرب کا جغرافیائی حال اور خاندان ہاشم کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام کی پیدائش آپ کی پرورش۔ تجارت اور نکاح وغیرہ کے احوال ہیں۔ تیسرے باب میں رسول اللہ صلعم کی نبوت۔ اسلام کا آغاز۔ مسلمانوں پر کفار قریش کے مظالم اور حبش کی ہجرت کا ذکر ہے۔ چوتھے باب میں آنحضرت صلعم کی مدینہ کی جانب ہجرت۔ مسجد نبوی کی تعمیر اور اصحاب صفہ کا حال ہے۔ پانچواں باب آنحضرت صلعم کے غزوات پر مشتمل ہے۔ چھٹا باب عرب میں قیام امن۔ تمام عربوں کا مسلمان ہونا اور اسلامی سلطنت کی بنیاد کے متعلق ہے۔ ساتویں باب میں آنحضرت صلعم کے حج کا تذکرہ ہے آٹھویں باب میں آنحضرت صلعم کی وفات کا بیان ہے۔ نواں باب خانہ نبوت کے احوال پر مشتمل ہے۔ دسویں باب میں آپ کے شمائل درج ہیں۔ اس طرح اسلام اور پیغمبر اسلام کے تمام سوانح نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں۔ گو (۳۰۳) صفحوں کی ضخامت میں ان تمام مضامین کا سمانا متعذر ہے لیکن مولف نے ایجاز و اختصار سے کام لے کر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ صحیح اور ضروری واقعات نہایت دلچسپ پیرایہ میں درج کئے ہیں۔ لیکن جو خاص اور اہم واقعات ہیں بلحاظ ضرورت ان کی کسی قدر تفصیل بھی کر دی ہے غرضکہ اسلام اور پیغمبر اسلام جنکے ضروری واقعات و حالات سے ہر مسلمان کو کم از کم واقف رہنا چاہیئے وہ تمام باحسن الوجوہ اس کتاب میں موجود ہیں کتابت و طباعت بھی اچھی ہے۔ عابد صاحب کی یہ اسلامی خدمت قابل مبارک باد ہے۔ حقیقتاً اس زمانہ میں اس امر کی بیحد ضرورت ہے کہ عام مسلمانوں کے معلومات کے لئے اسی طرح چھوٹی چھوٹی کتابیں اسلام کے مختلف شعبوں پر عام فہم اردو میں تالیف کی جائیں۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ منشی طالب علی صاحب پائنیر پرنٹنگ پریس پروپرائٹر اخبار تعلیم انارکلی لاہور۔

(۲) **رسالہ ارشاد** یہ ماہانہ رسالہ محرم ۱۳۴۷ھ سے پیرزادہ سید شاہ یوسف الدین صاحب قادری کے زیر ادارت حیدرآباد سے شائع ہو رہا ہے سائز رائل حجم (۴۸) صفحہ قیمت سالانہ مع محصول ڈاک (ے) ہے۔ یہ بالکل مذہبی اصلاحی رسالہ ہے ہر رسالہ کے (۲۰) صفحات تفسیر حدیث فقہ کے لئے مخصوص کر دئے گئے ہیں بقیہ صفحات پر علمی اصلاحی، تاریخی مضامین درج رہتے ہیں۔ چونکہ اکثر مسلمان قرآن کے معنی و مطلب سے واقف نہیں ہوتے اس لئے اس رسالہ نے اون سورتوں کی سلیس تفسیر شروع کی ہے جو عموماً نمازمیں پڑھے

جاتے ہیں اور جن کے معنی سے واقف رہنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ اسی سلسلہ میں مسلمانوں کو حدیث و فقہ کے معلومات بہم پہنچانے کا بھی انتظام کیا ہے جو زمانہ موجودہ میں مسلمانوں کے لئے بیحد ضروری ہے جو مضامین ابتک اس میں شائع ہوئے ہیں وہ فاضل اور مشہور مضمون نگاروں کے قلمی ہیں اور حالات حاضرہ کے اعتبار سے مسلمانوں کے اضافہ معلومات کے لئے بیحد مفید ہیں حقیقت میں ملک کو ایک ایسے مذہبی رسالہ کی بڑی ضرورت تھی ہمیں قوی امید ہے کہ مسلمان ضرور اس مفید رسالہ کی قدر کریں گے اور اس ہونہار پودے کے بارآور کرنے میں ممکنہ سعی سے دریغ نہ کریں گے۔ (م۔م)

رپورٹ اجلاس نہم آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس منعقدہ ملکپور (برار) فروری ۱۹۲۵ء۔ مرتبہ جناب نفیس دلہن صاحبہ آنریری سکریٹری۔ صفحات ۱۱۲

۱۹۲۵ء کے ابتدائی ماہ میں اس کانفرنس کا اجلاس ملکپور کے چھوٹے سے شہر میں منعقد ہوا تھا لیکن مکمل اجلاس جس خوش اسلوبی کے ساتھ انجام کو پہنچا، وہ اس چھوٹے شہر کی سنجیدہ خیال والی بیبیوں کی مساعی کا ترجمان ہے۔

کانفرنس کے اس اجلاس میں کل (۱۱) تحریکات پیش اور منظور ہوئیں۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ مسلم خواتین میں حصول علم کی خواہش پیدا ہو رہی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مذہبی احساس کی بھی ان میں کمی نہیں چنانچہ دوسری تحریک میں حکومت سے اس امر کی خواہش کی گئی ہے کہ جس طرح مدارس میں ہندی کو داخل نصاب کیا گیا ہے اسی طرح مسلم زنانہ مدرسوں میں دینیات کو لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ یہ احساس اپنی تمام وسعت نظر کے ساتھ ہماری آئندہ آزاد خواتین کا مشعل ہدایت بن سکتا ہے اور اس کا صحیح استعمال ہی میدان ترقی میں ان کو افراط و تفریط کے راستوں سے بچا بچا کر لے جا سکتا ہے۔

جب ہم اپنی زندگی کے اس تاریک پہلو پر دردمندانہ نگاہ ڈالتے ہیں جو ہماری زندگی کا بہترین نصف اور بیحد کی حد تک ہماری دلی کے اندر پوشیدہ ہے تو ہمارے دلکو ان کی عمومی پستی اپنے قنوطی اثر سے بھرنے لگتی ہے۔ سید احمد کی وسیع نظر انہ جد و جہد سے مسلمان مردوں کو تو آشنا بنا دیا کیا اچھا ہوتا اگر سید مرحوم کی توجہ ہمارے گھر کے ان محفوظ خزانوں کی طرف بھی منعطف ہو گئی ہوتی! ہم ان کو اس روشن عہد میں یقیناً زیادہ مفید اور اپنے کاموں میں مددگار پاتے۔

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں — فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

تاہم ہم کسی فوق فطری ہستی کی پیدائش اور رہنمائی کے منتظر بھی نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ فضل تہذیب میں ہماری جگہ سر نشیب سے بھی نیچے ہو جائیگی اس لئے آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس ہو یا کوئی اور اصلاحی انجمن خواتین ہم کو اس کی مدد کی طرف نہایت سنجیدگی سے متوجہ ہونا چاہئے۔

انجمن کے اس اجلاس کا سب سے بڑا شاندار کارنامہ غالباً وہ ہے جو خواتین ملکپور کی اس متعدی کو ظاہر کرتا ہے جس سے انہوں نے کھامگاؤں کی اسکول خانمیں کانیا آباد کی کو خواستہ امداد اور فراخدلانہ اور عاقبت اندیشانہ نظر ڈالی جس سے تشنہ علم اپنی پیاس بجھانے کے قابل ہو سکی۔ امید ہے کہ یہ مثال فوجوان ملکپور سال اپنے آپ کو پیش کریگی کارکنان کانفرنس خصوصاً جناب سکریٹری صاحبہ اپنی ان قومی مساعی کے صلہ میں ہماری دعوت علی حمدردی اور دلی قومی حد تک شکریہ کی مستحق ہیں

ہر پڑھنے لکھنے والی لڑکی اور تمام مسلمانوں کو اپنی بہنوں کی ان ہی خواہیدہ بیکسوں کا بارہا سے واقف ہونے کی خاطر کانفرنس سے متعلق رہنا اور اسکے روشن پیام کو ہر گھر تک پہنچانے کا مقدس

جدید و تازہ کتب اور رسالے

وہ کتابیں جو حال ہی میں ہندوستان میں شائع یا مکتبہ میں آئی ہوئی ہیں

تجارت عرب۔ ناشر سید اخبار لاہور قیمت ۱۰ر — عورت کا دل۔ از اختر قیمت ۴ر — بیوی کے فرائض۔ از سید ظہور احمد شاہجہانپوری قیمت ۱۰ر

خوبصورتی اور تندرستی " " " ۴ر — خواب و خیال۔ از پریم چند " ۴ر — آداب مجلس۔ " " " ۴ر

درازی عمر کے اسرار " " " ۴ر — تفسیر آیۃ کریمہ بمصنفہ امام ابن تیمیہ " ۱۵ر — شب ناچیز عروس از غلام احمد " ۴ر

آہنی ارادہ " " " ۵ر — سیر المصنفین جلد دوم از شہابی ۔ ایلچہ " ۴ر — ابن مسعود از عظمت علی " ۹ر

عمدہ حافظہ کا راز " " " ۶ر — خیالات اورنگ۔ مترجمہ " ۱۰ر — بہترین انشا پرداز۔ مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ " ۴ر

مطالعہ نفس " " " ۲ر — مخزن ظرافت شائع کردہ مرغوب اسمعیلی لاہور " ۳ر

مطالعہ باطن " " " ۵ر — مضامین چکبست۔ " انڈین پریس الہ آباد " ۴ر

امریکہ کے کامیاب لوگ " " " ۴ر — نہرو رپورٹ اردو۔ مرتبہ نہرو کمیٹی " ۴ر

آئینہ اسلام " " " ۴ر — تتمہ " " " " ۱۰ر — ہمایون " ۴ر

محبوب الاخلاق " " " ۱۰ر — پردہ۔ مولفہ عبد الحلیم شرر " ۴ر — خاص نمبر عالمگیر " ۴ر

معلم السیاست مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ " عطایا — خاک پروانہ۔ از پریم چند " ۴ر — سالگرہ نمبر نگاش حیدرآباد " ۱۲ر

تاریخ ہند از لاجپت رائے آنجہانی " عطایا — عروج کابل۔ از سید ظہور احمد شاہجہانپوری " ۱۰ر — رسالہ نگار ۱۹۲۳ء کے جلد کا انتخاب " ۴ر

پولیٹکل اکانومی از امر ناتھ ایم۔ اے " ۴ر — فن شاعری " " " ۶ر — خاص نمبر رسالہ زبان منگروال بابتہ ۱۹۲۶ء " ۴ر

مشہور رسالوں کے تازہ سالنامے اور خاص نمبر

سالنامہ نیرنگ خیال لاہور قیمت ۴ر

ہمایون " ۴ر

خاص نمبر عالمگیر " ۴ر

سالگرہ نمبر نگاش حیدرآباد " ۱۲ر

رسالہ نگار ۱۹۲۳ء کے جلد کا انتخاب " ۴ر

خاص نمبر رسالہ زبان منگروال بابتہ ۱۹۲۶ء " ۴ر

حسب ذیل ماہانہ و ہفتہ وار رسالے اور اخبار مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتے ہیں

نیرنگ خیال ۵ر کلدار معاول ۱۰ر عثمانیہ نگار ۸ر کلدار ۹ر ۴ر عثمانیہ۔ مخزن ۶ کلدار ۷ر عثمانیہ۔ نظام گزٹ ہفتہ وار ۲ر ۶ر

عالمگیر ۵ر کلدار معاول ۱۰ر عثمانیہ معارف ۸ر کلدار ۹ر ۴ر عثمانیہ۔ مجلہ مکتبہ ۶ عثمانیہ۔ عیسیٰ ہفتہ وار ۲ر عصمت ۵ر کلدار ۱۰ر عثمانیہ

الجمعیۃ ۱ر کلدار ۲ر ۱ر عثمانیہ۔ ہمایون ۸ر کلدار ۹ر ۴ر عثمانیہ۔ تجلی سہ ماہی ۱۲ر عثمانیہ۔ سفینہ سہ ماہی (مدراس) ۴ر عثمانیہ۔ زمانہ ۸ر کلدار ۹ر

۴ر عثمانیہ۔ مجلہ عثمانیہ سہ ماہی ۸ر عصمت کا جوبلی نمبر عطایا کلدار ۴ر عثمانیہ۔ تازیانہ ۱ر کلدار ۱ر ۳ر عثمانیہ طاقت ۲ر کلدار ۲ر ۶ر عثمانیہ۔

مطبوعات مکتبہ جامعہ ملیہ

ہمارے نبی بچوں کے لئے خدا کے پیارے نبی کی پاک زندگی کی کہانیاں از پروفیسر نواب علی صاحب ایم اے (طبع سوم) ۵ر

ہمارے رسول خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی نے بچوں کے لئے سہل اور موثر ترین زبان میں رسول اللہ علیہ وسلم کے پاک حالات تحریر فرمائے ہیں قیمت ۱ر

سرکار کا دربار از احمد الیاس صاحب حسبی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ذرا بڑے لڑکوں کے لئے بہت مفید کتاب۔ ۴ عہ

دنیا کے بسنے والے دنیا کے عجیب و غریب باشندوں کے حالات تقریباً ۵۰ تصاویر از سید شیر حسین صاحب زیدی۔ ہیڈ ماسٹر مسلم یونیورسٹی اسکول علیگڈھ قیمت ۶ر

ترکوں کی کہانیاں ترک بچوں کی ہمت و جرأت کی سچی کہانیاں جن کے پڑھنے سے بچوں میں قومی جوش پیدا ہوتا ہے قیمت ۵ر

ازہار العرب ہمت و شجاعت و سخاوت و مروت اور علم و حکمت کے بہترین عربی اشعار کا گلدستہ۔ قیمت ۱۰ر

انتخاب مضامین جوہر طلبا رجامعہ کے قلمی رسالہ "جوہر" کے منتخب علمی و ادبی اور تاریخی مضامین۔ قیمت ۴ عہ

اورنگ زیب عالمگیر مولانا شبلی کی موکدۃ الآثار تصنیف، طباعت، کتابت نفیس۔ قیمت ۴ عہ

مقدمہ شعر و شاعری خواجہ حالی کے دیوان کا مقدمہ اردو شاعری کے اصناف پر لطیف تبصرہ

خطبہ صدارت شیخ الہند مرحوم کا تاریخی خطبہ صدارت جو بتقریب افتتاح جامعہ پڑھا تھا ۴ عہ

خطبہ صدارت مسیح الملک مرحوم کا عالمانہ خطبہ جو جلسہ اول تقسیم اسناد میں پڑھا گیا قیمت ۵ عہ

اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب کے خطبہ صدارت کا اردو ترجمہ مسلمانوں کی حیرت انگیز علمی ترقی کا خاکہ۔ قیمت ۵ر

قومی و اسلامی تعلیم کا نظام از مولانا محمد علی کی تعلیمی اسکیم۔ قیمت ۵ر

نامہ مشیر شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی کا منظوم خط ایک دوست کے نام قیمت ۱ر

نالہ مشیر دیوان کا پہلا حصہ۔ قیمت ۴ عہ

کلام مشیر دیوان کا دوسرا حصہ بیشتر نظمیں نینی تال، کشمیر اور یورپ کے پر فضا مقامات میں لکھی گئی ہیں قیمت ۴ عہ

الورد والریحان صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیثوں کا انتخاب معہ ترجمہ نظم و نثر ۱ر قیمت

ملنے کا پتا

رسالہ میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے تعلیم کی غایت اور مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی ضرورت پر بحث مفید بحث کی ہے۔ قیمت ۱۰ر

مقدمہ اردو شاعری کے اصناف پر لطیف تبصرہ معہ فوٹو خواجہ مرحوم۔ قیمت ۱۴ر

صلاح کار عنفوان شباب کے جذبات کے نشیب و فراز پر گہری نظر۔ اور ازدواجی زندگی کے لیے دلسوز مشیر۔ از چودھری محمد علی صاحب تعلقہ دار ردولی۔ قیمت ۴ عہ

جمال الدین افغانی اتحاد اسلام کے داعی اور مشرق کے مصلح اعظم سید جمال الدین افغانی کے حالات زندگی سید صاحب اور ان کے جانشین شیخ محمد عبدہٗ کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت

عرض جوہر مجموعہ کلام محمد علی صاحب قیمت

انتخاب میر زبان اردو کے زندہ جاوید شاعر میر تقی میر کے کلام کا ایک خاص نقطۂ نظر سے انتخاب معہ مقدمہ حالات میر۔ مرتبہ مولوی نور الرحمن صاحب بی۔ اے (علیگ) قیمت ۴ عہ

دیوان غالب اطلبہ کی سہولت اور روزمرہ کے استعمال کے لئے مناسب۔ قیمت ۱۰ر

مسدس حالی اطلبہ کے استعمال کے لئے مجلد ہونے کے باوجود قیمت ۱۰ر

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ میں

مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) اسٹین روڈ آباد کن

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سیکڑوں سرٹیفکٹ عطا کئے زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھاتا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ متلی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر۔ خارش۔ سانپ بچھو کے زہر اور ہر قسم کے درد کیلئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمائیے ایک بار ضرور آزمائیے۔ پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔

شیشی نمبر (۱) عہ نمبر (۲) ۸ر نمبر (۳) ۴ر ایک درجن کے خریدار کو خرچہ۔ وی۔ پی۔ معاف ہوگا۔

پتہ خط اور تار کا

"زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

انتخاب لاجواب لاہور

امریکہ و یورپ کے بیش بہا علمی تجارتی و خانگی معلومات اور سائنس و نیچر کے دنیا بھر کے عجائبات کا اردو زبان میں بےنظیر ہفتہ وار مجموعہ اگر آج تک آپ نے نہ دیکھا ہو تو چھ روپیے بھیجکر سال بھر کے لئے جاری کروالیں سالانہ خریداروں کو علاوہ سال بھر بےپہ بہم پہنچانے کے پانچسو صفحہ کی مختلف کتابیں بھی مفت دی جاتی ہیں:-

خط لکھتے وقت اخبار کا حوالہ ضرور دیں:- منیجر انتخاب لاجواب لاہور

"نیرنگ کا خاص نمبر"

مارچ ۱۹۲۹ء میں نہایت آب و تاب سے نظر نواز ہوگا۔ اس میں نہ تو ادب لطیف کی عریانی ہوگی اور نہ اخلاق سوز تصاویر لیکن باوجود اس کے بیحد دلچسپ سنجیدہ ہوگا۔ تصاویر کی تعداد پوری کرنے کے لئے نہیں۔ نہایت متین اور دلکش مضامین نظم و نثر کا عظیم الشان اجتماع اس نمبر میں ملاحظہ کیجئے گا، ہمارے گذشتہ خاص نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی کسی خاص اور انوکھی جدت کا حامل ہوگا،

اس وقت صرف اس قدر لکھدینا کافی ہے کہ یہ "خاص نمبر" ہوگا اور بس، قیمت عصار علاوہ محصول

(منیجر نیرنگ رامپور)

رسالہ انکشاف

کا عید نمبر ملک کے بہترین دماغوں کے تازہ افکار اپنے دامن میں لیکر ۸ر مارچ ۱۹۲۹ء تک شائع ہوگا۔ اگر آپ عید کی سچی مسرتیں حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی ۸ر کے ٹکٹ منیجر انکشاف لکھنو کے پاس روانہ فرمادیں یا عطائے سالانہ چندہ ارسال فرماکر اسے مفت ہی حاصل فرمائیں۔ انکشاف کا یہ نمبر اتنا دلکش اور موثر ہوگا کہ آپ کو عرصہ تک اس کی یاد رہے گی

(منیجر انکشاف لکھنو)

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اردو مولفہ مولوی مظہر الدین ہاشمی صاحب فضلی فاضل جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی دور تصوف جاہی دور ان میں اردو نظم و نثر کی حالت و شعرائے اردو کا تذکرہ معہ نمونہ کلام ضخامت ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۲/۱۶ کاغذ چکنا روم قیمت ۱۲ر

چمنستانِ اردو مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے متعدد اردو اخبارات و رسائل کے نامور شعرائے کرام کے منتخب کلام کا بہترین انتخاب جو اردو کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۲/۱۶ کاغذ چکنا کھلائی چھپائی عمدہ قیمت صرف ۱۲ر

روحِ تنقید مصنفہ مولوی ابو السنات سید غلام محی الدین تاجوری زور ایم اے فن تنقید کے متعلق اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں مغربی خیال کے علماء یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۲/۱۶ کاغذ چکنا کھلائی چھپائی عمدہ و موقیت عہ

تنقیدی مقالات مصنفہ زور صاحب یہ روحِ تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روحِ تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی فارسی اور اردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کر کے ان کے محاسن و کمالات اور خوبیوں کو نمایاں کیا ہے اور تنقید و انشاء پردازی کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنے کے علاوہ خاص خاص اصول بیان کیے گئے ہیں ضخامت ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۲/۱۶ کاغذ چکنا کھلائی و غیر مجلد ماہ ہے

اردو کے اسالیب بیان مصنفہ زور صاحب نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت ابتدا سے لیکر اب تک نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان کا تذکرہ خاص طرز تحریر کے اردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا کھلائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ساں

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ زور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی و ادبی کارناموں کی ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے کاغذ چکنا کھلائی چھپائی عمدہ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ر

دنیا کے افسانے مصنفہ مولوی محمد عبد القادر سروری ایم اے ایل ایل بی افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات یہ اردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا کھلائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادی فلسفہ مولفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی ڈاکٹر اے یس راپورٹ پی۔ ایچ۔ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا ملخص و مجاورہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا کھلائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۲ر

ارباب نثر اردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر کا تاریخی تحقیقی مطالعہ ضخامت ۲۰۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا کھلائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس الاتقیاء جناب مفتی فیاض علی صاحب مدیر شمس الاخبار ایڈیٹر ہندوستان کے سلاطین عظام کے علمی و ادبی کارناموں کی مفصل تاریخ ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز ۲۰×۳۲/۱۶ کاغذ چکنا کھلائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

جواہر کلیات نظیر مرتبہ جناب مولانا ذہین و سید مشتاق احمد نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے انتخابی۔ ادبی نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلچسپ نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۰۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا کھلائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

عقائد اسلام مترجمہ مولوی محمد عبد الغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اردو میں محاورہ دار اردو ترجمہ قیمت ۱۲ر

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی محمد عبد الحق صاحب مدرس بی اے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا کھلائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ر

دکنی لغت مولفہ مولوی سید شمار احمد شمار ہاشمی۔ اردو سے قدیم یعنی دکنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ر

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبد الغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحب دل صوفی عالم کے حالات ضخامت ۴۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵ر

تزئینِ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبد العزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۲ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن تیسلت ۲ر

سیرت خیر البشر و سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین مذکور رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱ر

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین مذکور رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بد خو شوہر کو شیشہ کر سکتی ہے۔ قیمت ۲ر

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین مذکور اخلاقی رسالہ قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ۔ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ روبرو محکمہ مالگذاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

افتخار الحکما نواب جاذق جنگ مرحوم سابق فرسٹ اطبا فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت اور بڑی خوشی کے ساتھ محض بیماروں کی شفا کی غرض سے چند سطور یہ قلم کرتا ہوں برص (یعنی کوڑ) و سفید داغ) کا علاج نہایت مشکل ہے۔ یہ مرض عموماً بڑھتا ہی جاتا ہے۔ حکیم مولوی محمد عبدالمعاد صاحب مدیر کارصدر مخزن الادویہ یونانی سرکار عالی دکن وارالتشخیص و انجمن اطبار یونانی حیدرآباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولیٰ رکھتے ہیں صاحب موصوف نے اکثر مریضان برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور بفضلہ کامیاب ہوئے میں نے چشم خود مریضان برص کا معاینہ کیا ہے۔ بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور مجرب دواکا اثر ہے میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے کٹھن مرض کی دوائے مجرب کی ایجاد پر مبارک باد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہئے کہ وہ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور اس مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وما علینا الا البلاغ

شرحدستخط (افتخار الحکما جاذق جنگ)

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پُرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے۔ ہر اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پُراثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل دمہ۔ درد سر۔ درد کمر۔ بچھو کے زہر کیلئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا ہتھیلی میں لیکر دو تین چار وقت مقام معاوف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان دوا طلب فرمادیں بہ خوشی تعمیل کی جائے گی۔

نوٹ۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے اور نسخجات نہایت احتیاط کیساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر۔ جیمس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھو گرافر منیجر مطبع

مجلۂ مکتبہ

انجمن امداد باہمی بکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم اے، ال ال بی

مجلۂ مکتبہ

۱۔ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲۔ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳۔ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴۔ قیمت سالانہ (للہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہاں) فی پرچہ ۶

۵۔ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (نہ) اور چوتھائی کے لئے (عہ) ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں بہ سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے انکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلہ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلہ مکتبہ" "مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن" ہونی چاہیئے۔

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ (۶۵)

مجلۂ مکتبہ

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار انگلیشیہ (۰۰۰۰)

جلد (۲) سنہ ۱۳۳۸ف شمارہ (۶)

بابتہ ماہ اردی بہشت تا ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء

تصاویر

(۱) مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم و امیر علیہ عثمانیہ (۲) راجہ مرلی دھر فتح نواز دنت بہادر یکنٹھ باش

فہرست

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات		۲
شبلی اور جدید شاعری	از جناب احمد عبداللہ صاحب المسدوسی بی اے	۵
نتیجۂ آزادی (نظم)	" " سید علی شبیر صاحب شبیر	۲۴
بادۂ دکن (شفیق)	" " عریانی صاحب	۲۵
زنجیر غلامی (افسانہ)	" " ابوالکارم فیض محمد صاحب یقینی بی اے	۳۲
مائدۃ الاسلام (نظم)	" " ابوالسخا محمد سعید صاحب باشمل سالار	۴۳
رباعی	" " ابوالاعظم امجد حیدرآبادی	۴۴
ایثار حیات	" " نبی الحسن صاحب شمیم	۴۵
دیوان غالب قلمی سنہ ۱۲۳۷ھ	مترجمہ " سید محمد صاحب ایم اے	۵۳
باقیات فانی (غزل)	از " احمد نواز جنگ بہادر فانی مرحوم	۵۸
پرده (نظم)	" " میرزا علی رضا صاحب شیرازی	۵۹
تنقید تبصرہ غالب و قوم پرست طالبعلم	" " س ب م	۶۰
فہرس مضامین جلد دوم		۶۳
اشتہارات		۶۵

شذرات

اس نمبر پر مجلۂ مکتبہ کی دوسری جلد ختم ہو رہی ہے۔ خدائے تعالیٰ کا صدق دل سے شکر گذار ہونا چاہئے کہ مجلۂ مکتبہ کو ناگون رکاوٹوں اور برس کے بارہ مہینوں کی مخالف ہواؤں کے باوجود افتاں و خیزاں اپنی زندگی کا ایک سال پورا کرنے کو ہے۔ اس قلیل یا طویل عرصہ مدت میں اس نے علم و ادب کی کیا خدمت انجام دی اور کس قسم کا لٹریچر پیش کیا اس کا جواب ہمارے پاس کچھ زیادہ نہیں۔ مضامین جلد اول کی فہرست مطبوعہ جلد دوم نمبر (۱) اور مضامین جلد دوم کی فہرست پر جو اس نمبر کے آخر میں شریک ہے ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس کی خدمت گذاری کا کچھ پتہ چلتا ہوا اندازہ بہ آسانی کیا جا سکتا ہے حیدرآباد میں خالص علمی مسائل اور ادبیات کی بے لوث خدمت کی جو کس مپرسی ہے اور کتابت و طباعت کی جو رکاوٹیں رونما ہیں اور جن کی اصلاح شاید کئی برس میں ہو ان کے پیش نظر کارپردازان مجلۂ مکتبہ کچھ بہت زیادہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تاہم ہم مایوس نہیں ہیں۔ ع رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔ یہی موانعات ہمارے ارادوں کو مستقل بناتے، ہمارے جوش بڑھاتے اور ہمت باندھتے نظر آتے ہیں۔ ہم نے جس طرح ابتدا میں بلند بانگ دعاوی پیش کرنے سے احتراز کیا تھا اب بھی خاموشی کے ساتھ مکتبہ خدمت گذاری کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جو لائحہ عمل ہمارے سامنے ہے اور جن اصولوں پر ہم مکتبہ کے ذریعہ اہل حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں اور کارناموں کو اجاگر کرنے اور مفید مضامین زبان و ادب پر محققانہ مقالات سے اردو لٹریچر میں اضافہ کرنے کے آرزومند ہیں ان کا دلفریب طریقہ پر اظہار اتنا اچھا نہیں جتنا کہ عملی ثبوت ہو سکتا ہے۔

۲۹ ماہ حال کو جامعہ عثمانیہ کا چوتھا سالانہ جلسہ عطائے اسناد منعقد ہوا اور ان طلبا سے ان کو ڈگریاں دی گئیں جو جامعہ میں تحصیل علمی سے فارغ ہو کر میدان عمل میں قدم رکھنے والے ہیں۔ اگرچہ تقریب ایک رسمی جلسہ ہو گئی ہے لیکن اپنے مقصد کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ اس دفعہ نواب سر اکبر حیدری بہادر ایم اے، ایل ایل ڈی نے خطبہ دیا جو نہایت پر مغز اور مفید نصائح اور مشوروں پر مشتمل تھا ہم اس خطبہ کو مجلۂ مکتبہ میں شایع کرتے لیکن ملک کے تقریباً تمام وقیع اخبار و جرائد میں یہ شایع ہو گیا ہے۔ فاضل خطیب نے

جو نصائح اس خطبہ میں کی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ نہ صرف نوجوان طیلسانیں ہی بلکہ پرانے تعلیم یافتہ اور تمام ہندوستانی جامعات کے بوڑھے گرایجویٹ بھی اس سے مستفید ہوں اور جو حقیقی حسلی اسپرٹ پیدا کرنے کا مشورہ اس خطبہ میں دیا گیا ہے اس کو عملی جامہ پہنائیں۔

اس جلسہ کی ایک اہم خصوصیت نواب معود جنگ بہادر (سید راس مسعود) بی اے بیرسٹرایٹ لا کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری کی عطا ہے۔ موصوف کے عہد نظامت تعلیمات حیدرآباد میں ادبی و علمی تعلیم میں جو ترقی ہوئی اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ جامعہ عثمانیہ کے تحت تین انٹرمیڈیٹ کالج خواتین کے لئے ایک درجہ اول کا زنانہ کالج اور کلیۃ المعلمین آپ کی تعلیمی خدمات کے نمایاں ثبوت ہیں اگرچہ آپ کی بیشتر توجہ علمی اور ادبی تعلیم کی طرف رہی اور صنعت و حرفت کے مدارس آپ کی توجہ سے محروم رہے لیکن یہ بڑی حد تک وقت کا اقتضا تھا ورنہ آپ صنعت و حرفت کی تعلیم کو بھی بڑا فروغ دیتے۔ جامعہ عثمانیہ کے اصول تعلیم کے نہ صرف اول سے قائل اور ہمدرد تھے بلکہ اس کے زبردست مبلغ بھی۔ آپ کا وہ خطبہ جو جامعہ خواتین پونہ میں دیا گیا تھا اس کا بین ثبوت ہے آپ کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری جامعہ عثمانیہ نے آپ کی واقعی علمی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اگرچہ آپ خرابی صحت کی وجہ سے نظامت تعلیمات کی خدمت سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے لیکن قومی خدمت کا شوق اور ملک و قوم کا درد آپ کو آرام لینے نہیں دے سکتا تھا۔ جب جامعہ اسلامیہ علیگڈھ کی نیابت امیر جامعہ کے لئے قوم نے آپ کا انتخاب کیا تو آپ بہ خوشی پھر خدمت قوم کے لئے کمربستہ ہوگئے۔ اس عرصہ میں سرکار عالی بھی معتمدی سیاسیات کے لئے آپ ہی کا انتخاب کیا اور اول الذکر خدمت کے انتخاب سے قبل ہی آپ کو معتمد سیاسیات بننے پر راضی ہو جانا پڑا لیکن معلوم ہوا ہے کہ قوم کی خدمت گذاری کیلئے آپ نے تحصیل جاہ و ثروت کا ایثار کر کے معتمدی سیاسیات کی کرسی پر جلوہ گر ہونے کی بجائے جامعہ علیگڈھ کی عنان انتظام اپنے ہاتھ میں لینے اور قوم کی واحد درسگاہ کو سنبھالنے کی جدوجہد کو پسند کیا۔

نہایت افسوس ہے کہ اس ماہ کی ۲۳ دین کو حیدرآباد کی ایک دیرینہ روزگار اور تجربہ کار و ہر دلعزیز بزرگ ہستی راجہ مرلیدھر فتح نواز دنت بہادر نے وفات پائی۔ بکنھم شائر جامعہ کلکتہ سے امتحان ایف اے پاس کر کے سرکار عالی کی ملازمت میں داخل ہوئے اور سوم تعلقداری کے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے محض اپنی کارکردگی اور اعلیٰ قابلیت سے صدر المہام مالگذاری و صرفخاص مبارک کے

بلندیوں تک پہنچے اور انتقال کے وقت تک صدر المہامی صرف خاص مبارک پر فائز رہے۔ آپ نے سررشتۂ مالگذاری میں ملک و حکومت کی جو شاندار اور اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں اس پر ملک و حکومت کی طرف سے بار بار خراج تحسین حاصل کیا اور اپنے وسیع اخلاق، غریب پروری رحمدلی اور قدر شناسی کے لئے تو سارے ملک ہی میں نہیں بلکہ بیرونی ممالک محروسہ سرکار عالی میں بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے کئی مرتبہ آپ کو اپنی ریاست کا دیوان بنانا چاہا مگر آپ نے اپنے آقائے قدیم سرکار عالی کی خدمت انجام دینے اور حق نمک ادا کرنے کو بھوپال کی وزارت عظمیٰ پر ترجیح دی۔ مہاراجہ صاحب کو علم و ادب اور بالخصوص شاعری سے جو خاص انس تھا وہ بہت کم لوگ جانتے ہیں آپ اپنے اوقات فرصت کا بہترین مصرف اردو فارسی شاعری کا خاموش مطالعہ ہی سمجھتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کی بعض علمی تصانیف بھی ہیں اور ابتدا میں آپ نے اپنے علمی کارناموں کو شائع بھی کیا تھا انشاء اللہ آپ کے علمی و ادبی کارناموں پر آئندہ روشنی ڈالی جائے گی۔

ہم معذرت خواہ ہیں کہ یہ نمبر غیر معمولی تعویق سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کا سبب اراکین مکتبہ ابراہیمیہ کا طاعونی پریشانیوں میں مبتلا ہو جانا ہے جس کی وجہ سے کارکنان رسالہ کوئی تین ہفتہ اس قدر پریشانیوں اور مصیبتوں میں گھیرے رہے کہ طباعت و اشاعت کی طرف توجہ ہی نہ ہو سکی۔ اس کی تلافی کے لئے ہم نے آئندہ نمبر بہت ہی جلد شایع کرنے کا اہتمام کیا ہے اور انشاء اللہ یہ نمبر متعدد تصاویر اور بہتریں مضمونوں سے مزین ہو کر ایک ہفتہ کے اندر ہی ناظرین کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ "س۔م"

"شبلی اور جدید شاعری"

از جناب احمد عبداللہ صاحب مسعودی بی اے،

رسکن (RUSKIN) اپنے ادبی دوست ہیارسن (HARRISON) کے متعلق ایک جگہ لکھتا ہے:-

"ادبیات کی دنیا کا آسمان جس پر مسٹر ہیارسن و مدار ستارے کی طرح خوب گردش کرتے، کبھی ایک ستارے کے اطراف اور کبھی دوسرے کے گرد بغیر کسی ذاتی صاف اور سرخ تابانی کے چکر لگاتے ہیں بالکلیہ تصنیف و تالیف کی اس ملکوتی حالت سے جداگانہ ہے جس کی شعاعوں سے آج کل ہماری آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں اور ہماری رہنمائی ہوتی ہے۔"

یہ قول بعینہٖ شبلی پر صادق آتا ہے۔

شبلی نے اتنے مختلف النوع مضامین اور فنون پر قلم اٹھایا ہے اور اس عجیب طریقے سے اس سعی میں کامیابی حاصل کی ہے کہ بے اختیار ہماری زبان پر تعریفی کلمات جاری ہو جاتے ہیں ان کا شہپ قلم جس طرح تاریخ کی سنگلاخ وادیوں میں فقہ، و اصول فقہ، حدیث و تفسیر کے صحرا میں کلام الٰہیات کے خشک اور چٹیل میدانوں میں فلسفہ کی بھول بھلیاں میں، ادبیات کے گلزاروں میں اور تنقید کے پل صراط پر سرپٹ دوڑتا ہے اسی طرح شعر و سخن کی مجلس میں بھی اپنی جولانی دکھلاتا ہے اور جس طرح ان کی نثر اپنے موضوع کی اہمیت، طرز بیان کی شگفتگی استدلال کی پختگی، نظر کی وسعت اور گہرائی کے لئے مشہور ہے اسی طرح ان کی نظم بھی ان تمام صفات کی کم و بیش حامل ہے جو کسی کامیاب کارنامہ کی جان کہی جاسکتی ہیں انکی تمام تصانیف کا مطالعہ کیجئے، زور، روانی، فصاحت و بلاغت اور صنعت و موضوع پر

کامل قدرت اور اس کے انتخاب میں صحیح مذاقی قدم قدم پر آپ کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرلیگی۔ آپ ان کی نثر پڑھتے ہیں اور الفاظ و محاورات کی برجستگی، خیالات کے اچھوتا پن، الفاظ و معانی کی ہم آہنگی اور اتار چڑھاؤ میں گم ہو جاتے ہیں، آپ ان کی نظم سنتے ہیں اور اس کی روح سے متاثر ہوتے ہیں اور محسوس کرنے لگتے ہیں کہ شاعر ہم سے کوئی کام کی بات ایسے پیرایہ میں بیان کرنا چاہتا ہے جس کی تعریف نہ کرنا ظلم ہے اور جس کا اثر یقینی ہے۔ الغرض شبلی اپنے مضامین کے تنوع اور مذاق کی ہمہ گیری کا لحاظ کرتے اردو کے مکالے اور والٹیر ہیں وہ کمانڈر کی طرح جو میدان جنگ میں فوج کے متعدد دستوں کی رہنمائی کرتا ہے، تاریخ، ادب، شاعری، تنقید، سیرت نگاری فلسفہ و کلام، تفسیر، حدیث اور فقہ و اصول فقہ کو اٹھاتے ہیں اور ان کے بے جان قالب میں مسیحا نفسی کے ذریعہ روح پھونکدیتے ہیں۔ ان کا ذوق ادب کان نمک ہے جس کے اندر جانے کے بعد ہر شئے "نمک شد" کے مصداق رنگین ہو جاتی ہے۔ ہر قسم کے علوم و فنون کو جیسی صاف اور رنگین زبان میں انھوں نے ادا کیا ہے اس سے جہاں ان کے کمال انشاپردازی کا ثبوت ملتا ہے وہاں اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ شعریت کا عنصر بھی ان کے اندر کس دریا دلی سے مبدء فیاض نے ودیعت کیا تھا ان کا ذوق ادب وہ جادو کی چھڑی ہے جس کے چھو لینے سے خشک سے خشک مضمون بھی اپنی لطافت و رنگینی کا دعویدار نظر آنے لگتا ہے اس سے اس امر کے پتہ چلانے میں بڑی آسانی ہوتی ہے کہ شبلی کا پایہ اردو شاعری میں کیا ہے۔ ؟

حقیقت یہ ہے کہ شبلی نے اپنی شاعری کو مہتم بالشان بنانیکی کوشش اس لئے نہیں کی کہ انہوں نے بذات خود اس کو اپنا قابل فخر کارنامہ نہیں قرار دیا" یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کوئی نظم اس خیال سے نہیں لکھی گئی کہ ان کو پبلک کے سامنے کبھی بہ حیثیت شاعر کے پیش کیا جائیگا جس طرح اور مختلف علوم و فنون پر انہوں نے اپنی معلومات اور طباعی سے مجبور ہو کر کتابیں لکھی ہیں اسی طرح کبھی کبھی جذبات دلی، شاعرانہ قوت یا زمانہ کی ضروریات سے مجبور ہو کر نظمیں کہی ہیں جن کو آج ہم تنقید کی کسوٹی پر کسکر ان کے حسن و قبح کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا لٹریچر کے اندر کیا پایہ ہے ؟ ان کے موجودہ کلام کی نوعیت اس امر کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ اگر وہ ادبیات

کی جانب ہر طرف سے لشکر ہمہ تن متوجہ ہو جاتے تو اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ اردو شاعری کو فائدہ پہنچا سکتے تھے' ان کے صحیح تنقیدی زاویہ نگاہ موازنہ اور شعرالعجم کا چوتھا حصہ ثبوت ہیں۔ مشرقی' عربی و فارسی شاعری کی تاریخ اس کے عہد بعہد کے تغیرات و خصوصیات کامل آگاہی اور موجودہ یورپی خیالات اور اصول سے فی الجملہ واقفیت اور اعلیٰ فلسفیانہ نکتہ سنجی و نکتہ آفرینی یہ تمام صفات کسی پر عظمت شاعری کی عمارت کی تیاری میں بنیاد' اینٹ' پتھر اور چونے کا کام دیتی ہیں۔ وہ دبستان علم و فضیلت کے وہ ذہین اور لمباع طالبعلم ہیں جو امتحان میں بحیثیت مجموعی اول ٹھہرنے کے علاوہ جداگانہ طور پر بھی ہر مضمون میں اول آتا ہے' ہر شعبہ کو اپنا آرزومند پانے کے بعد بالآخر کسی ایک شعبہ کو اپنے انتہائی امتحان کی تکمیل کے لئے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن جب دوسرے فنون میں اپنے سے کم تر درجہ کے طلباء کو مہارت حاصل کر کے برتری اور کمال کا دعویدار پاتا ہے تو یہ کہتے ہوئے کہ ؎

کہاں فطری ترقی کی امنگیں ——— کہاں ٹھوسی ہوئی چیزوں کا آماس

اپنی جولانی طبع کا ثبوت پیش کر دیتا ہے۔

شبلی کا مجموعی کلام اس امر کی کافی سند ہے کہ ان کو اردو شعراء کی صف میں ممتاز جگہ ملنی چاہیئے' جدید شاعری کی منزل کی تلاش میں شعراء کا جو قافلہ روانہ ہوا تھا وہ برسات کی اندھیری رات کی طرح اس آسیب زدہ جنگل اور میدان میں بھٹک گیا تھا جہاں شیطانی چراغ سائنس آج کل جس کو فاسفورس کی کرشمہ سازیوں سے تعبیر کرتی ہے۔ رات بھر بھٹکاتے اور ہر ہر قدم پر بستی کا دھوکہ دیتے ہیں۔ لیکن اس قافلہ میں صرف شبلی ہی ایسے ہیں جو تھوڑی دور ساتھ چلنے کے بعد لاحول پڑھ کر اس آفت سے رہائی پاتے اور بے فائدہ رات بھر کی تگ و دو سے بچنے کی خاطر اپنی جگہ پر ٹھیر جاتے اور پھر صبح صادق کی روشنی میں اپنے سفر کو جاری رکھتے ہیں۔ اگرچہ مقام افسوس ہے کہ پیام مرگ بہت جلد ان کو منزل مقصود تک پہنچنے سے روک دیتا ہے شبلی ابتر کارے دنیا کسے تمام نہ کرد تاہم وہ قافلہ کے اور افراد کی طرح اپنی طاقت کو ضائع ہونے سے بچاتے ہیں۔

علیگڈھ کی زیادہ تر تعلیمی اور کم تر اصلاحی تحریک نے جہاں ہماری جدید شاعری کے اولین طبقہ کیلئے تیار تصویر کی پشت کا کام دیا اور ان کے تخیل کو تلاش و جستجو کی مشکل سے بچا کر عارضی اور موقتی

کامیابی سے خوش کر دیا ہے وہاں ان کی زندگی کے لئے چیلنج بھی ہے۔

موقتی تحریکیں اور مخصوص العہد خیالات و معتقدات جہاں بے انتہا نظر فریب اور بادی النظر میں کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں وہاں اسی قدر وہ چھلاوہ اور دھوکہ ثابت ہو سکتے ہیں اس لئے شعراء کو زمانہ کے واقعات اور خیالات کی رنگ آمیزی میں بے انتہا محتاط رہنا چاہئے عارضی اور ناپائدار رنگ و روغن سے جو تصویریں تیار کی جائیں گی ان کے متعلق مصور کو خوب یقین کر لینا چاہئے کہ ان کی بہار چند روزہ ہے چاہے ان کے اندر کیسا ہی سہانا سماں اور جذبہ ظاہر کیا گیا ہو ملک الشعراء لارڈ ٹینی سن (TENNYSON) سے زیادہ دلکش اور دلفریب اور کس کی تصویریں ہو سکتی ہیں؟ مگر نقاد ان کے برباد جانے کی پیشین گوئی کرتے ہیں اور زوال کی علامتوں کو ان کے اندر نمایاں دیکھتے ہیں۔ دنیا کے تمام کامیاب شعراء نے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی شاعری میں اس اصول کو مرعی رکھا اور زمانہ کو اس پر حاوی کرنے کے بجائے اپنی شاعری کو اس پر حکمران کیا ہے۔

(۲)

شبلی کی شاعری کے دو دور ہیں پہلا دور حالی کی طرح علیگڈھ کی اصلاحی اور علمی تحریکات سے متعلق ہے اس لئے ان کی نوعیت پر زیادہ بحث کرنا فضول ہے البتہ اس کو پیش نظر رکھکر انکی شاعرانہ قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے یہ دور قدیم شاعری کے خلاف بغاوت ہے اور دوسرا دور جس کا آگے ذکر آئیگا جدید شاعری کی مخالفت یا اصلاح کا پہلا قدم ہے۔

ابتداً وہ علیگڈھ سے متعلق اور سرسید کے مشن کے بڑے سرگرم مؤید تھے اس کے لئے ان کی ان نظموں میں خلوص، درد، جوش اور اثر معلوم ہوتا ہے۔ حالی کی طرح ان کے الفاظ ویسے نرم اور ملائم نہیں ہوتے بلکہ ان میں ایک قسم کی کھلی ہوئی تڑپ اور بے چینی پائی جاتی ہے لیکن اس بے چینی اور تڑپ میں کبھی کبھی ان کی سنجیدہ مذاقی اور حکیمانہ طبیعت ہویدا ہو کر ایسے جواہر پاروں کی تخلیق کا باعث بن جاتی ہیں جو ذوق سلیم کا سامان ہیں۔ حالی کی طرح ان کی تصویریں بھڑکدار اور چمکیلی نہ سہی صاف اور گل بوٹوں سے عاری سہی لیکن ان میں زندگی اور پائداری کے آثار پائے جاتے ہیں مثلاً ان کی نظم "دعوت عمل" کے ان اشعار کو پڑھیئے۔

دوا ہر بار جب اپنا اثر الٹا ہی دکھلائے تو بس سمجھو کہ اب بیمار کوئی دم کا مہمان ہے

جو سچ پوچھو تو ہے اسلامیوں کی بس یہی حالت
مرض دونا بڑھا دیتی ہے خود وہ شے جو درماں ہے

سلف کا تذکرہ جو ہمت و غیرت کا ہے افسوں
ہمارے حق میں وہ سرمایۂ خواب پریشاں ہے

یہ افسانے بڑھاتے ہیں ہماری نیند کی شدت
یہ افسوں اپنے حق میں اور بیہوشی کا ساماں ہے

ہمیں احساس تک ہوتا نہیں اپنی تباہی کا
کہ سب پیش نظر اسلام کی وہ شوکت و شاں ہے

ہماری کلفتیں سب دور ہو جاتی ہیں یہ سنکر
کہ دنیا آج تک اسلام کی ممنون احساں ہے

مزے لیتے ہیں پہروں تک کسی سے جب یہ سنتے ہیں
کہ یورپ دولت عباس کا اب تک ثناخواں ہے

نہیں رہنے کو یاں گھر تک مگر چرچے یہ رہتے ہیں
کہ اب تک قصر حمرا قبلہ گاہ رہ نوردان ہے

ہیں خود ان پڑھ مگر اس زعم میں اتراتے پھرتے ہیں
کہ دنیا میں ہمیں سے زندہ اب تک نام یونان ہے

نظر آتے ہیں ہم کو عیب اپنے خوبیاں بنکر
ہم اپنے جہل کو بھی سمجھتے ہیں کہ عرفاں ہے

بسر ہوتی ہے گر اوقات فیاضی پہ غیروں کی
تو سمجھے ہیں کہ بس زہد اور توکل کی یہی شاں ہے

حمیت اور خودداری نہیں ہے گر طبیعت میں
تو اچھا ہے کہ مسکینی تو اول شرط ایماں ہے

تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر شگفتگی اور کیف بھی موجود ہے ان کی شاعری کا عام رنگ بھی ہے مسلسل نظموں میں ایک نہایت ضروری شرط ہموار ہے۔ غزل میں اگر دو تین شعر لطیف ہوں تو بہرتی کے کئی شعر بھی کھپ سکتے ہیں لیکن نظم میں ایسا نہیں ہو سکتا اگر ایک شعر بھی پایہ اعتبار سے گرا ہوا اور ادنیٰ پایا جائے تو نہ صرف اس کی دل کشی کو برباد کر دیگا بلکہ شاعر کی کامیابی میں بھی رخنہ ہوگا۔ غزل کو اس پہاڑی نالے سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو کبھی بلندیوں سے اچھلتا، کودتا اور شور کرتا ہوا بہتا ہے اور کبھی پستیوں میں خاموش اور گم ہو جاتا ہے اور نظم کو اس دریا سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو میدانوں میں چکتا، بل کھاتا اور نیچے سروں میں گاتا ہوا یکساں ہمیشہ نظروں کے سامنے اپنی منزل مقصود کی طرف بہتا چلا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے شبلی کی نظموں میں یکسانیت کا پایا جانا ان کے کلام کے لئے نیک فال ہے اور اسی بناء پر ہم ان کی مثنوی "صبح امید" کو حالی کی مسدس کا ہم پلہ ٹھہرانے پر مجبور ہیں حالی سرسید کے توجہ دلانے سے یاس و قنوط کے خیالات کی اشاعت کو روکنے کی خاطر جن کے پیدا ہونے کا ان کو "مسدس" سے ایک قوی شبہ پیدا ہو گیا تھا مسدس میں امید کا ضمیمہ زیادہ کرتے ہیں عنوان کا لحاظ کرتے حالی کا یہ ضمیمہ صبح امید کا مقابل ٹھہرتا ہے لیکن حقیقت میں یہ مثنوی مکمل مسدس کے مقابل کی

شئی ہے کیونکہ اس میں بھی فطری طور پہ ترقی کی امید کے آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے تنزل کی سیاہی اور یاس انگیز شام کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اس مثنوی اور مسدس کا بالمقابل مطالعہ کر کے ان دونوں عظیم الشان ادبی ہستیوں کی قابلیتوں اور شاعرانہ استعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس خاص زاویہ نگاہ سے مسدس پر جو قوی اور پہلا اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس کے دونوں حصے دوسرا اور تیسرا مناسب نہیں ہیں۔ تنزل و پستی کی ایسی طویل اور مفصل داستان کا علاج یہ ضمیمہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ بیماری جس درجہ مزمن و مہلک ہو اسی درجہ کی دوا ہونی چاہئے تریاق کو زہر کے اثر سے مناسبت ہونی چاہئے جس مایوسی اور حسرت کو محسوس کرنے سے وہ بھی نہ محفوظ رہے اس کو اتنی آسانی سے دفع کرنیکی کوشش بے سود ہے۔ چولھا جب بجھ جاتا ہے تو اسکو روشن کرنے کے لئے دوبارہ آگ اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن شبلی کی مثنوی میں یہ خامی نہیں ان کی نگاہوں کے سامنے سے کبھی اصل مقصد اوجھل ہونے نہیں پاتا اس لئے وہ اسلام اور مسلمانوں کی پستی کا اتنا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جتنا الاشیاء تعرف باضدادھا کے مدنظر ضروری ہے وہ چولھے کو روشن کرنے کے لئے اس کو بجھا نہیں دیتے بلکہ ہوشیار مالک کی طرح ٹھنڈا ہونے کا خوف دلا کر ملازم کو کوئلے جھونکنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ دوسرے حالی کی طرح جگہ جگہ پھر دوبارہ یاس انگیز خیالات کے اظہار سے جن کے لئے ان کا "قنوطی" زاویہ نگاہ ذمہ دار ہے اصل غرض کو کمزور نہیں کرتے ضمیمہ امید پر لکھا گیا تھا لیکن اس کا نصف سے زیادہ نہیں تو نصف کے قریب حصہ ایسا ہے جس میں امید کی جھلک کی بجائے یاس و ناامیدی کا ڈراؤنا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ اس سے مسدس پہ کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ وہ ایک غمناک اور المیہ نظم ہے اور اسی لحاظ سے جس کو عیب کہتے ہو وہی حسن ہے ضمیمہ کے اندر "رجائی" پہلو کا نمودار ہونا اور درد کی بات ہے جس کا رکھا پھیکا ہونا ہی شاعر کے کمال پر دلالت کرتا ہے تو بے شک یہ ایسی تاویل ہوگی جو اصل مسدس کے بچاؤ میں کی جا سکتی ہے لیکن جہاں تک ضمیمہ کا تعلق ہے کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا اور مان لینا پڑتا ہے کہ وہ ناکامیاب سعی ہے لیکن مثنوی صبح امید کا حال اس سے بالکل مختلف ہے اس میں بھی مسلمانوں کی پستی اور مذلت کے مرقع پیش کئے گئے ہیں اور ایسی خوبصورتی اور کمال سے پیش کئے گئے ہیں کہ داد دینی پڑتی ہے مثلاً ؎

سمجھے نہ ذرا کہ وقت کیا ہے؟ کس سمت زمانہ چل رہا ہے؟
نیرنگیوں پہ نہ کچھ نظر کی یعنے کہ ہوا ہے اب کدھر کی
کیا بیش ہے کیسی صورتیں ہیں کیا وقت ہے کیا ضرورتیں ہیں
رنگ و روش سپہر کیا ہے؟ اب طرز خرام دہر کیا ہے
ہیں چرخ کی اب نئی ادائیں چلنے لگیں اب نئی ہوائیں
چھیڑے جو گئے نئے فسانے نغمہ وہ رہا نہ وہ ترانے
پھولا ہے فلک نے اور افسوں اب رنگ زمانہ ہے دگرگوں
سیارے ہیں اب نئی چمک کے وہ ٹھاٹھ بدل گئے فلک کے
اب صورت ملک و دین نئی ہے افلاک نئے زمین نئی ہے
سب بھول گئے ہیں ماسبق کو گردوں نے الٹ دیا ورق کو
تیور جو بدل گئے قضا کے ڈھنگ اور ہیں چرخ فتنہ زا کے
میخانہ اولین ہمارا وہ جام وہ ساغر نگین ہمارا
وہ لطف کے تذکرے وہ فرصت وہ گرمیٔ انجمن وہ صحبت
وہ سحر و فسون گری زبان کی وہ طرز وہ شوخیاں بیان کی
وہ درج درسخن ہمارا گنجینۂ علم و فن ہمارا
جو زینت و تاج تھے ہمارے جو مایۂ ناز تھے ہمارے
جس باغ کے برگ و ساز تھے ہم یعنے کہ سر چمن طراز تھے ہم
جو دشت تھا سبزہ زار ہم سے جس باغ پہ تھی بہار ہم سے
جس بزم کے میگسار تھے ہم جس ملک کے تاجدار تھے ہم
جھونکے جو چلے نئی ہوا کے آغوش میں آ گئے فنا کے
وہ بزم رہی نہ جام و ساغر اک بار الٹ گیا وہ دفتر
از بسکہ ذلیل و خوار ہیں ہم افسانۂ روزگار ہیں ہم
ہے اوج پہ بخت بد ہمارا دیکھے کوئی جزر و مد ہمارا
اب عیب ہیں سب ہنر ہمارے ہیں پوت سے کم گہر ہمارے

کیا کوئی سنے فغان ہماری — دلدوز ہے داستان ہماری
ہم مایۂ عبرت جہاں ہیں — ہم ننگ زمین و آسماں ہیں
ناچار ہیں خستہ حال ہیں ہم — عبرت کدۂ زوال ہیں ہم
مٹنے پہ ہے اب نشان ہمارا — گم گشتہ ہے کاروان ہمارا

کس قدر دلدوز داستان ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بلبل باغ کے اجڑ جانے پر فریاد کر رہا ہے ایک کامیاب وکیل اور فطرت شناس مقرر کی طرح شبلی پہلے مخالفت کے تمام پہلوؤں پر جامعیت اور جوش سے اظہار خیال کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد اپنے مقصود کو ثابت کرنے کا فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں ان کی یہ فغان اس بلبل کی آہ و بکا ہے جو بہار کی آمد آمد پر خوش ہو کر بے اختیار ایک مرتبہ جذبات کے غلبہ کے عالم میں گل سے چمن میں فراق کے زمانہ کے مصائب کا ذکر شروع کر دیتی ہے۔ قوم کی تباہ حالی کا دکھڑا بیان کرنے کے بعد ان کے کان میں آواز آتی ہے ؎

ماتم یہی تھا کہ آئی ناگاہ — اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آئی دلگیر — پہلو میں اثر، بغل میں تاثیر
دل ہاتھ سے لینے میں تھی بلا تھی — جادو تھی؟ فسوں؟ جانے کیا تھی؟
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں — نشتر سی اتر گئی جگر میں

تو اس سمت بڑھتے ہیں جہاں ایک پیر دیرین باجاہ و تمکیں کے جلو میں دانش طلبان نکتہ دان اور عیسیٰ نفسان خوش بیاں" کا ایک گروہ نظر آتا ہے جو وہ یادگار ایام" مدرسۃ العلوم اسلام" قائم کرتا ہے جو صبح امید کی پہلی کرن ہے۔

قائم ہو باتفاق باہم — اک مدرسہ العلوم اعظم
جو قوم کا مامن و مقر ہو — درماں ہو طبیب چارہ گر ہو
وہ کعبۂ آرزو ہمارا — ہر غم میں ہو چارہ جو ہمارا
آئین و اصول فن بتائے — آداب معاشرت سکھائے
وہ درس گہ نجستہ انجام — ہو پشت و پناہ قوم اسلام
ہر عقدہ آرزو کرے وا — مرکز ہو ہماری جاجتوں کا

درماں ہو مریض خستہ جاں کا — مرہم ہو جراحت نہاں کا
نادار تھا بارِ اہلِ زر تھا — ہر اک کا یہ مطمحِ نظر تھا
روشن ہو یہ شمعِ راہ حاجت — تعمیر ہو قبلہ گاہ حاجت
آخر بہزار جاہ و اجلال — طالع ہوا آفتاب اقبال
روشن ہوئی بزم گاہِ امید — نکلا افق شرف سے خورشید
قائم ہوا یادگار ایام — وہ مدرسۃ العلوم اسلام
یہ حاصلِ نالہائے شبگیر — یہ قوم کی آرزو کی تصویر
یہ اوج وہ خیالِ امید — یہ قوم کا نونہالِ امید
صد شکر کہ آج بارآور ہے — جو شاخ ہے اس کی پرثمر ہے
لایا ہے وہ برگ و بار کیسا — اعدا کو ہے خار خار کیسا
بخت اس کا جو آج اوج پر ہے — ہر لحظہ برونق دگر ہے
یہ اس کی ترقیوں کا ہے طور — کل اور تھا آج ہو گیا اور
پہلے سے یہ آب و تاب ہے آج — کل شمع تھا آفتاب ہے آج
اس چشمۂ فیض سے سیراب — بنگال سے تا حدود پنجاب
دانش طلبان قوم اکثر — ہیں جمع ہر اک جگہ سے آکر
کس محفل کے یہاں ثمر نہیں ہیں — کس کان کے یاں گہر نہیں ہیں
اس باغ میں کوئی آکے دیکھے — اسلام کے ہونہار پودے

یہ نظم فی الحقیقت علیگڈھ کی تحریک کی تائید اور سرسید کی تعریف میں لکھی گئی ہے اور جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے وہ بے مثل ہے علیگڈھ کی تحریک اور سرسید کی کوششوں کا جو زبردست نقش اس مختصر سی مثنوی کو پڑھکر دل پر ثبت ہو جاتا ہے وہ ایسا ہے کہ ہمیشہ اس نظم کی کامیابی کا ذمہ دار بنا رہیگا۔ سرسید کے کریکٹر کو اس نظم میں اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر ان کی عظمت اور زبردست شخصیت کا لافانی اور امٹ اثر بیٹھ جاتا ہے، مشتاق حسین، مہدی علی، اور سید اشرف علی وغیرہ کا ذکر کرنا اور سرسید کے نام کو ختم مثنوی پر سرسری طور پر ظاہر کرنا وہ انتہائی

بلاغت اور موقع شناسی ہے جو اس نظم کی خوبیوں میں سے ہے وہ قوم کی تباہ حالی کے ذکر کے بعد پیر دیرینہ کا ذکر کرتے ہیں اور عوام کی مخالفت اور ناراضی کے مدنظر اس کا نام نہیں بتاتے ایک شعر کے بعد دوسرا شعر مطالعہ کرنے والے کے دل میں عظمت و احترام کی اینٹ بنکر عمارت تیار کرتا جاتا ہے تا آنکہ نظم ختم ہو جاتی اور وہ سرسید کے متعلق قائم کردہ رائے کی تبدیلی پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کردار نگاری ہماری شعاری میں مفقود ہے مراثی کے کیریکٹر کو مستثنےٰ کر دیجیے جن میں ترقی و اصلاح کی بڑی گنجائش ہے۔ تو اس کا خانہ خالی نظر آئیگا اردو زبان کو مستقبل میں خاص اس ضمن میں ترقی کی ضرورت ہے ایسی حالت میں ہم کو خلاف توقع اس بے مثل کردار نگاری کو شبلی کے کلام میں پاکر جو بے اندازہ خوشی حاصل ہوتی ہے وہ ہمارے سر کو فخر سے اونچا کر دیتی ہے۔ جتنی نظمیں سرسید اور علیگڈھ سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی وہ کیفیت اور عجیب و غریب سحر موجود نہیں ہے جو اس مثنوی میں پایا جاتا ہے شکسپیر کا سب سے بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے کیریکٹر کا غیر محسوس طور پر موقع بہ موقع اس طرح کردار نمایاں کر دیتا ہے کہ پڑھنے والے کو کبھی اس کی اس کوشش کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ جولیس سیزر میں بروٹس، کیاسیس اور انٹونی کے کردار کو اس طرح مختلف واقعات، حالات اور اعمال کے ضمن میں نمایاں کیا گیا ہے کہ شکسپیر کی اس سعی کی طرف کبھی پڑھنے والے کا دھیان نہیں جاتا لیکن باوجود اس کے غیر محسوس اور غیر ارادی طور پر دماغ کے خانہ میں ترتیب وار نام بنام یہ واقعات منسلک ہو کر اس کے کردار کو بناتے اور روشن کرتے ہیں اسی طرح اس مثنوی میں سرسید کے کردار کا حال ہے کہ کہیں پڑھنے والے کے دل میں خیال بھی نہیں گذرتا اور نہ شاعر کوشش کرتا ہے کہ اپنے ہیرو کی عظمت اور شخصیت کا سکہ بٹھائے بلکہ اپنے اصلی مقصود کو پیش نظر رکھکر چند خیالات کو جو زنجیر کی طرح ایک مقصد اعلیٰ کے تحت جکڑے ہوئے ہیں اور کتاب کے پراگندہ اوراق کی طرح ایک شیرازہ میں بندھے ہوئے ہیں۔ گھماتا ہے، قوم کی بے جان مشین کے اندر اپنے جسیم و ابرو کے ادنیٰ اشارے سے حرکت پیدا کرنا سرسید کے کیریکٹر کو اس طرح مکمل بنانا ہے جسطرح شکسپیر نے اپنے مشہور عالم رجل داستان کیاسیس کے کیریکٹر کو واضح اور مکمل کیا ہے ذیل کے اشعار جو

مکمل نہیں ہیں شاید اس تصویر میں رنگ بھر سکیں۔

دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکین — آیا نظر ایک پیر دیرین
صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرہ پہ فروغ صبح گاہی
وہ ملک پہ جان دینے والا — وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
اٹھتے ہوئے جوش سے برقت — ہے مرثیہ خوان قوم و ملت
اب وقت اخیر ہے خبر لو — جو کچھ کرنا ہے اب بھی کر لو
تا دیر وہ قوم کا فدائی — وہ خضر طریق رہنمائی
اٹھتے ہوئے جوش دل سے پیہم — عبرت کا دکھا رہا تھا عالم
افسانۂ غم سنا کے چھوڑا — سوتوں کو جگا جگا کے چھوڑا
جادو کی بھری ہوئی وہ تقریر — ہونٹوں سے ٹپک رہی تھی تاثیر
ترغیب کے ساتھ ساتھ تہدید — کچھ یاس تو کچھ نوید امید
کچھ لطف بھی تھا عتاب کے ساتھ — تھا زہر پہ قند نبات کے ساتھ
باتوں میں اثر تھا کس بلا کا — اک بار جو رخ پھرا ہوا کا
امید کی بڑھ گئی تگ و تاز — اونچی ہوئی حوصلوں کی آواز
خواہش کے بدل گئے ارادے — ہمت نے قدم بڑھائے آگے
جو تھا نہ عجیب جوش میں تھا — مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
وہ کشتۂ قوم وہ فدائی — اٹھا نئے کاسۂ گدائی
ایک ایک سے عرض حال کرتا — در در وہ پھرا سوال کرتا
ہر بزم میں ہر انجمن میں پہونچا — ہر باغ میں ہر چمن میں پہونچا
کاوش سے غرض تھی کچھ نہ کد سے — ملتا تھا ہر ایک تنگ و بد سے
مردان خدا پرست سے بھی — رندان سیاہ مست سے بھی
پستی سے ملا فلک کی صورت — ذروں میں رہا چمک کی صورت
دانش طلبان مکتہ آموز — کم حوصلگان حیلہ آموز
مطلب کا ہر اک سے تھا طلبگار — ہر خوان سے تھا وہ ذلہ بردار

گزرا وہ ہر ایک رہ گزر پہ — دی اس نے صدا ہر ایک در پہ
کس بزم میں یہ فغاں نہ پہونچی — آہ اس کی کہاں کہاں نہ پہونچی
ہر ایک کو یہ اجر سنایا — ہر بزم میں اپنا راگ گایا
نالے کئے داغ دل دکھا کر — رویا کبھی حال غم سنا کر
کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں — ہر طرح کی ذلتیں اٹھائیں
ناکام رہا صدائیں دے کر — دشنام سنی دعائیں دے کر
گو اک خلق کا ہدف تھا — وہ شیفتہ پھر بھی سرکیف تھا
یہ رحمتیں گو نہیں ساتھ اس کے — پر زور تھے پر جو ہاتھ اس کے
آگے وہ بڑھا ہٹا کے سب کو — طے کر کے رہا رہ طلب کو
آئے تھے جو سنگ راہ بنکر — سب اڑ گئے برگ کاہ بنکر
کی خس نے اگرچہ لاکھ تدبیر — صرصر کا نہ ہو سکا عنان گیر
آتش پہ ٹھہر سکا نہ سیماب — خاشاک سے رک سکا نہ سیلاب
باطل کو جو حق نے کر دیا پست — اب نیست نے پائی صورت ہست

آہوں نے دکھائی اس کی تاثیر — کام آئے وہ نالہائے شبگیر

علیگڈھ کی پیداوار میں یہ مثنوی ایک ایسا کارنامہ ہے جو مسدس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور اس کی ہم سری کا دعویٰ دار نظر آتا ہے ناول اور مختصر قصوں میں جو تعلق ہوتا ہے وہی نسبت مسدس کو مثنوی کے ساتھ ہے جس طرح ناول میں پھیلنے اور سمٹنے کا خداداد موقع رہتا ہے اور جس کی عدم تمہید اشت اکثر اوقات ناول نویس کی ناکامی کا سبب بن جاتی ہے اس طرح مسدس کے ناصیۂ جمال کے لئے پھیلنے اور سمٹنے کی خداداد قابلیت کی کمی اور نظر اندازی بدنما داغ ہیں اور جس طرح مختصر افسانوں میں بانغ نظری اختصار اور اصل قصہ کا ارتقاء فن کار کی مہارت کا غماز ہوا کرتا ہے۔ "صبح امید" اسی طرح شاعر کی ذہانت اور فن دانی کی نشانی ہے مسدس ایسے لاتعداد خوبصورت حلقوں سے مرکب ہے جو غیر متناسب اور بے جوڑ ہیں برخلاف اس کے مثنوی کے اندر چند محدود حلقے ہیں جو باہم دگر متناسب طور پر جڑے ہوئے ہیں اس لئے دیکھنے میں بہ حیثیت مجموعی خوبصورت نظر آتے ہیں۔

یہی حال اُن کی "تماشائے عبرت" کا بھی ہے یہ مسدس نہایت مختصر ہے لیکن باوجود اس کے اس کے اندر ڈرامائی خوبیان اور عناصر موجود ہیں سرسید کی سرکردگی میں ایک ڈرامہ کا اعلان کیا جاتا ہے۔ پبلک قومی رہنماؤں اور شریفون کی ایکٹنگ (ACTING) دیکھنے کے لئے جوق جوق آتی ہے عین وقت پہ اسٹیج کا پردہ گرتا ہے اور قوم کے لیڈر مسلمانون کے انجام اور قسمت کا ڈرامہ پیش کرتے ہیں غور تو کیجئے وہ کس قدر عبرت انگیز اور روح فرسا منظر ہوگا جب کہ ملت اسلامیہ کے چند چشم وچراغ ایکٹرون کے لباس میں اسٹیج پر جلوہ افروز ہونگے اور قوم کا مایہ ناز شبلی دردناک انداز اور حسرت بھری آواز میں ایکٹ کے بجائے سنا رہا ہوگا ؎

کوئی کھٹکا ہے کہ تھیٹر تو نہیں ہے لیکن ساز ونغمہ بھی نہ ہو ساتھ نہیں ہے لیکن
سامین کاٹی ہیں اسی شوق میں تارے گن گن دیکھیں کیا سیر دکھائیں یہ بزرگان سخن

کچھ نہ کچھ تازہ کرامات تو ہوگی آخر
بوڑھے غمزون میں کوئی بات تو ہوگی آخر

دوستو کیا تمہیں سچ مچ تھا تھیٹر کا یقین کیا یہ سمجھے تھے کہ پڑھ کوئی ہوگا رنگین
نظر آئیگی جو سوتی ہوئی ایک زہرہ جبین آئے گا پھول کے لینے کو ارم کا گلچین

قوم کی بزم کو یوں کھیل تماشہ سمجھے
ہائے گر آپ یہ سمجھے بھی تو بیجا سمجھے

نوحۂ غم ہے یہاں نغمۂ عشرت کیسا یہ ہے عبرت کا سماں جوش مسرت کیسا
ہے جنون خیز یہ ہنگامۂ عبرت کیسا قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیسا

ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشہ دیکھے

ہائے کیا سین ہے یہ بھی کہ گروہ شرفا صاحب افسر واورنگ تھے جن کے آبا
قوم کے عقدۂ مشکل کے جو ہیں عقدہ کشا ایکٹر بن کے وہ اسٹیج پہ ہیں جلوہ نما

قوم کے خواب پریشاں کی یہ تعبیریں ہیں
ایکٹر یہ نہیں عبرت کی یہ تصویریں ہیں

۳

شبلی کی شاعری کا دوسرا دور علیگڈھ کی تحریک سے علیحدگی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں وہ سرسید اور ان کے ہم مشربوں کے موافق ہو کر اس امر کی خوب تبلیغ کرتے ہیں تعلیم جدید ہی میں مسلمانوں کے مرض کا حقیقی علاج ہے اور ایک جوشیلے کارکن اور پیرو کی طرح اس تحریک کی کامیابی میں سرگرم حصہ لیتے ہیں تا آنکہ اس ہنگامۂ تعلیم کو ایک ربع صدی سے زیادہ زمانہ گزر جاتا ہے اور مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ تعلیم جدید کے زیور سے آراستہ ہو جاتا اور قوم کے خوابوں کی تعبیریں کر سامنے آتا ہے نوجوان طبقہ کی اخلاقی مذہبی معاشرتی حالت اس خواب کی ایسی مایوس کن اور ہمت شکن تعبیر ہوتی ہے کہ وہ اس علاج کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں ان کے نزدیک تعلیم جدید کے تحمل کے اندر یورپ کی ہر جائز و ناجائز بات کی اندھی تقلید نہیں بلکہ "خذ ما صفا و دع ما کدر" پر عمل داخل تھا جس کا نتیجہ اپنی قومی روایات مذہبی احکامات اور علوم دینیہ کی حفاظت کی صورت میں جلوہ گر ہو کر اسلام کے استحکام اور قوم کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہوتا لیکن تعلیم جدید کی شراب لالہ گوں کے اس خمار کو دیکھکر کہ نوجوان اپنے مذہب، اپنی روایات و خصوصیات اپنی تہذیب و تمدن سے دست بردار ہوتے جا رہے ہیں ان کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اور وہ خالص تعلیم جدید کی طرف سے بیزار ہو جاتے ہیں لیکن ان کی یہ بیزاری وہ بیزاری نہیں جو نادان ملاؤں کی جاہلانہ اور متعصبانہ بیزاری تھی بلکہ وہ بیزاری ہے جو ایک روشن خیال زمانہ شناس رہبر کی ہو سکتی ہے ورڈسورتھ کی طرح جو انقلاب فرانس کی مساوات آزادی اور حریت کے خوش آئند اصول سے مسحور ہو گیا تھا وہ بھی تعلیم جدید کے برکات و فوائد کے سبز باغ میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور جس طرح انقلاب فرانس کے بانیوں کی بے اعتدالی اور ظلم و سفاکی ورڈسورتھ جیسے سرگرم و مخلص مؤید کو بالآخر اپنی طرف سے بیزار کر دیتی ہے کچھ اسی طرح تعلیم جدید کے فرزندوں کی بے راہروی اور بے مہار آزاد خیالی پایان کار شبلی جیسے علیگڈھ کی تحریک کے مستعد کارکن کو اپنی آغوش سے علیحدہ کر دیتی ہے اس کے بعد شبلی کی زندگی گاتا رہا نئے جدید خیالات کی اشاعت اور اس کو روبکار لانے کی عملی جدوجہد کی جولانگاہ ہے۔ ندوۃ العلماء کا قیام فی الحقیقت اس خیال کا عملی مظہر ہے۔

وہ لوگ غلطی پر ہیں جو سمجھتے ہیں کہ شبلی علیگڈھ کی تحریک کے مخالف ہیں اور تعلیم کا وہ طریقہ جو ندوۃ العلماء کے اندر جاری ہے سرسید کے خلاف اعلان جنگ تھا برخلاف اس کے وہ آخر دم تک علیگڈھ کالج کی کامیابی اور بھلائی کے درپے رہے مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے سلسلہ میں انہوں نے جو زبردست اور انقلاب آفرین نظمیں لکھیں ہیں وہ اس پر شاہد عادل ہیں۔ ان کے ہر لفظ سے بے پایاں محبت اور گہری خلوص مندی کی بو آتی ہے وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ علیگڈھ کو حقیقی معنوں میں مسلمانوں کا کالج بنایا جائے جس کا لازمی جز و مذہبی تعلیم اور مشرقی روایات کا رکھ رکھاؤ اور پابندی ہو کیونکہ ان کے خیال میں بغیر اس کے مسلمان ترقی کے زینہ پر قدم نہیں دھر سکتے چنانچہ ایک نظم میں بعض کوتاہ فہموں کے خیال اور دلائل کا ذکر کرنے کے بعد ثابت کرتے ہیں کہ جاری پستی کا سبب اسلام نہیں ترک اسلام ہے ؎

لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات ہے آخر صریح — کہ زمانہ میں کہیں عزت اسلام نہیں
پس اگر غور سے دیکھو تو بجز مذہب دین — ہم مسلمانوں میں کوئی صفت عام نہیں
ان اصولوں کی بنا پر یہ نتیجہ ہے صریح — سبب پستی اسلام جز اسلام نہیں
ان مسائل میں ہے کچھ ژرف نگاہی درکار — یہ حقائق ہیں تماشائے لب بام نہیں
غور کرنے کے لئے فکر و تعمق ہے ضرور — منزل خاص ہے یہ رہ گزر عام نہیں
بحث مافیہ میں پہلی غلطی یہ ہے کہ آپ — جس کو اسلام سمجھتے ہیں وہ اسلام نہیں
آپ کھانے کو بنا دیتے ہیں پہلے سموم — پھر یہ کہتے ہیں کہ غذا موجب اسقام نہیں
اعتبارات میں ہے سب سے مقدم توحید — آپ اگر صف کو ڈھونڈیں تو کہیں نام نہیں
کون ہے شائبہ کفر سے خالی اس وقت — کون ہے جس پہ فریب ہوس خام نہیں
آستانوں کی زیارت کے لئے شد رحال — اس میں کیا شان پرستاری اصنام نہیں
کیجئے مسئلہ شرک نبوت پہ جو غور — کفر میں بھی یہ جہاں گیری ادھام نہیں
اب عمل پر جو نظر کیجے آئیگا نظر — کہ کسی ملک میں پابندی احکام نہیں
اغنیاء کی ہے یہ حالت کہ نہیں ہے وہ ئیں — جس کے چہرہ پہ فروغ مئی گلفام نہیں
قرآن سے مسلمان ہیں بھائی بھائی — اس اخوت میں خصوصیت اعمام نہیں

یاں یہ حالت ہے کہ بھائی کا ہے بھائی دشمن — کون سا گھر ہے جہاں یہ روش عام نہیں
نہ کہیں صدق و دیانت ہے نہ پابندی عہد — دل ہیں ناصاف زبانوں پہ جو دشنام نہیں
آیت فاعتبروا پڑھتے ہیں ہر روز مگر — علماء کو خبر گردش ایام نہیں
الغرض عام ہے جو چیز وہ بے دینی ہے — صاف یہ بات ہے دھوکہ نہیں ابہام نہیں
ان حقائق کی بنا پر سبب پستیٔ قوم — ترک پابندی اسلام ہے اسلام نہیں

دوسرے دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر ان کے سیاسی اور تعلیمی خیالات کے تقریباً ساتھ ساتھ کلام میں پختگی، تناسب، سنجیدگی اور تجربہ کاری آگئی ہے ان کی مسلسل دماغی اور ذہنی محنت اور معلومات اور خیالات کی وسعت اس وقت اس نقطہ پر پہونچ گئی ہے جس پر آج تک اردو کا کوئی ادیب اور انشاپرداز نہ پہونچا لگاتار علمی مشاغل اور مختلف مجلسوں، کمیٹیوں اور تحریکوں کو چلانے اور دیکھنے کا موقع ہاتھ آیا ہے اس لئے اس دور کے کلام میں ایک پختہ کار کا تجربہ اور دور اندیشی ابل پڑتے ہیں الغرض ان کے خیالات میں تبدیلی کا پیدا ہونا تھا کہ شاعری کا دریا بھی اپنا رخ بدل لیتا ہے تاریخی اور سیاسی مسائل جو ان کی آخری زندگی کی سرگرمیوں کے اصلی میدان قرار پاگئے تھے، شاعری پر قبضہ کر لیتے ہیں اور ان کی نکتہ رس طبیعت اور عظیم الشان شخصیت سے ایسی نظمیں لکھواتے ہیں جو بے نظیر ہیں مثلاً رواداری پر ایک نظم سنئے ؎

ہمارا طرز حکومت

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر — مگر وہ حکمرانی جسکا سکہ جان و دل پر تھا
قرابت راجگان ہند سے اکبر نے جب چاہی — کہ یہ رشتہ عروس کشور آرائی کا زیور تھا
تو خود فرمان دہ جے پور نے نسبت کی خواہش کی — اگرچہ آپ بھی وہ صاحب دیہیم و افسر تھا
ولیعہد حکومت اور خود شاہنشاہ اکبر — گئے اجمیر تک جو تخت گاہ ملک و کشور تھا
ادھر راجہ کی نور دیدہ گھر میں جملہ آراتھی — ادھر شہزادۂ پرچتر مدوسی سایہ گستر تھا
دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے — کہ کوسوں تک زمین پر فرش دیبائے مشجر تھا
دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر جو لائے تھے — وہ شاہنشاہ اکبر تھا وہ جہانگیر ابن اکبر تھا

یہی ہیں وہ شمیم انگیز یان عطر محبت کی — کہ جن سے بوستان ہند برسوں تک معطر تھا
تمہیں لے دیکے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا — کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

سنہ ۱۹۱۴ء میں مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں حکومت پرستوں اور احرار کے درمیان جو جنگ زرگری برپا تھی اس کا حال سنئے۔

جزر و مد

دیکھ کر حریت فکر کا یہ دور جدید — سوچتا ہوں کہ یہ آئین خرد ہے کہ نہیں؟
رہنماؤں کی یہ تحقیر یہ انداز کلام — اس میں کچھ شائبہ رشک و حسد ہے کہ نہیں؟
اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر — اس میں کچھ قابل تسلیم و سند ہے کہ نہیں؟
نکتہ چینی کا یہ انداز یہ آئین سخن — بزم تہذیب میں مستوجب رد ہے کہ نہیں؟
جس نئی راہ میں ہیں باد یہ پیما یہ لوگ — کوئی اس جادۂ مستقل کا بلد ہے کہ نہیں؟
شاعروں نے جو نئی آج بچھائی ہے بساط — آئین ان پہ بھی کہیں سے کوئی زد ہے کہ نہیں؟
پہلے گرشان غلامی تھی تو اب خیرہ سری — اس دورا ہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں؟
فیصلہ کرنے سے پہلے ذرا دیکھ تو لوں — جزر جیسا تھا اسی زور کا مد ہے کہ نہیں؟

یہ نظمیں اپنی نوعیت میں مستقل حیثیت رکھتی ہیں سیاست اور تاریخ کے خشک اور بے جان مسائل کو سامری کی طرح گویا کر دینا شبلی کا وہ امتیازی وصف ہے جس میں وہ اب تک مطلق العنان حکمران کی شان رکھتے ہیں۔ اقبال کی سحر بیانی بھی "صدیق اکبر" جنگ موک کا ایک واقعہ" میں جو یقیناً شبلی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں ان پر آگے بڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

سرسید کے ہمعصروں میں صرف شبلی ہی ایسے تھے جو اپنی معلومات قوت ارادی اور زبردست شخصیت کی بنا پر "درمع الربیر کیف ما دار" کی بنا پر مختلف تعلیمی سیاسی اور مذہبی مسائل میں اختلاف کی جرأت کر سکتے تھے چنانچہ تعلیمی اور مذہبی مسائل میں اختلاف کا روشن مظہر ندوۃ العلماء کا قیام اور ان کی تصانیف ہیں آخر زمانہ میں وہ سرسید کے سیاسی مسلک سے بھی بشرطیکہ اس راز دار اور گھر کے بھیدی کے بیان پر یقین نہ کیا جائے کہ ؎

کوئی پوچھے تو میں کہہ دونگا ہزاروں میں یہ بات — روش سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف — ان کی جو بات تھی آور دھی آمد تو نہ تھی

اعتراف کرکے ہندؤں سے ملکر ملک کی آزادی اور نجات کے لئے دوش بدوش سعی وکوشش کے حامی تھے اس تبدیلی نے ان کی شاعری کے دوسرے دور پر زبردست اثر ڈالا ہے ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ مسلمانان ہند کی تاریخ میں وہ عہد آفرین زمانہ اور عبوری دور ہے جب کہ ممالک اسلامیہ کی پیہم بربادی اور حکومت انگلستان کے دفتر خارجہ کی مسلم آزار پالیسی، طرابلس و بلقان کے ہنگامے، مسجد کانپور کا خونین واقعہ اور مسلم یونیورسٹی کے معاملات اور اختیارات میں خداوندان حکومت کی دخل دہی اور رخنہ اندازی سمند تازپہ اک اور تازیانہ ہر کر مسلمانوں کو خواب غفلت سے چونکاتی ہے یہی وہ عبوری دور ہے جب کہ جذبات کے تلاطم اور ہیجان کے باعث ہماری زبان کے اندر نثر اور نظم میں وہ کارنامے پیش ہوتے ہیں جو ۱۸۵۷ء کے غدر میں بھی حریت فکر، آزاد خیالی اور احساس کے فقدان کے سبب عالم وجود میں نہ آسکے تھے۔ اقبال و اکبر کی بعض بہترین نظموں کی طرح ان کی اکثر کامیاب نظمیں بھی اسی ہنگامہ وشورش کی پیداوار ہیں۔ ان نظموں نے اس طوفانی زمانہ میں مسلمانوں کی قومی کشتی کے لئے جو حوادث دہر کے منجدھار میں پھنس گئی تھی جس طرح ناخدا کا کام دیا ہے اس کا بیان ہمارے موضوع سے باہر ہے لیکن مختصراً اتنا اظہار کافی ہے کہ مسجد کانپور، جنگ بلقان کے حوادث، مسلم یونیورسٹی فنڈ، پیش اور مسلم لیگ کے معاملات کے اندر آزادی پسند فرقہ کی پالیسی کے لئے شبلی کی ان نظموں نے دستور العمل کا کام دیا ہے جس انتہائی خوبصورتی اور استادانہ مہارت کے ساتھ یہ پیغام اور لائحہ عمل قوم کے طبقۂ احرار کے گوش گزار کیا گیا ہے اور ان کو معاملات کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا گیا ہے وہ بے مثل ہے ان متہم بالشان مسائل پر ان کا کوئی قطعہ بیس پچیس اشعار سے زیادہ کا نہیں ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی نظموں میں سیاسی مسائل کو سلجھانا کہ حکومت اور حکومت پرستوں کی تضحیک و تمسخر کا سررشتہ بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے وہ قابل تعریف کارنامہ ہے جو اپنے طرز بیان کے سبب جدید شاعری میں منفرد ثابت ہوتا ہے۔

قطعہ لکھنے میں شبلی کو جیسا کہ ڈاکٹر لطیف[1] نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے خاص

---

[1] ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ مصنف غالب

کمال حاصل ہے چنانچہ ذیل کی نظم سے اس کا اندازہ ہو سکیگا۔

خطاب بہ احرار

یہ جو لبھڈر شکنی آپ نے کی خوب کیا — قوم اب طوق غلامی سے ہے بالکل آزاد
لوگ اب حلقۂ تقلید میں ہونگے نہ اسیر — ٹوٹ جائیگا طلسم اثر استبداد
ہاں مگر ایک گذارش بھی ہے قابل غور — یہ تو فرمائیے اس باب میں ہے کیا ارشاد
بت کدے آپنے ڈھائے بہت اچھا لیکن — شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی رکھیئے بنیاد
آبلہ قابل نشتر تھا یہ مانا لیکن — دیکھیئے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد
آپ کہتے ہیں کہ وہ مجمع ناجائز تھا — خیر جو کچھ تھا مگر جمع تو تھے کچھ آزاد
اب کوئی مرکز قومی ہے نہ توحید خیال — نہ کوئی جادۂ مقصد ہے نہ کچھ توشہ زاد
خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم — خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد
ذرے جسطرح سے ہو جاتے ہیں اڑ اڑ کے فنا — یونہی ہو جائیگی پھر قوم بھی آخر برباد
نکتہ چینی سے فقط کام نہیں چل سکتا — یہ بھی لازم ہے کہ کچھ کام بھی ہو پیش نہاد
بھاپ پر زور ہے لیکن کوئی انجن بھی تو ہو — کام کیا آئیگا نشتر جو نہ ہو گا فصاد

آپ نے ملاحظہ کیا کہ تعلیم و تہذیب جدید اور مغربی خیالات و جذبات کی طرف سے بیزاری یعنی مغرب پرستی کا ردعمل جو آگے چلکر اکبر و اقبال کے ہاں زیادہ نمایاں اور گہرا ہو گیا ہے سب سے پہلے شبلی کے ہاں نظر آتا ہے جس طرح انگریزی ادبیات میں احیاء رومانی کا (ROMIANTICREVIVAL) جو بعد میں ورڈس ورتھ کالبرج، کیٹس، شلی بائرن اور مٹنی سن وغیرہ کے ہاں زیادہ قوی اور جاندار ہو گیا ہے بانی بوس (
سمجھا جاتا ہے اسی طرح قومیت اور مذہبیت کے اولین بانی اور یورپین تہذیب کے ردعمل کا منور شبلی ہیں شبلی کی شاعری کا دوسرا دور وہ زرین عہد ہے جس نے جدید شاعری کے اندر مناسب تغیر پیدا کیا۔

نتیجۂ آزادی

از جناب سید علی شبیر صاحب شبیر سررشتہ دار انتظامی عثمانیہ عدالت العالیہ

زمین سے اڑ کے کوئی سو پچاس گز اونچی
پتنگ شیخی میں جامے سے ہو گئی باہر

ہوا یہ سر میں سمائی کہ میں بھی ہوں اک چیز
نہاں ہیں ذات میں میری بڑے بڑے جوہر

"نہ تا ساتھ اگر ڈور کا یہ پُن چھلا
دکھاتی اپنے کمالات چرخ پر چڑھ کر"

"لگاتی جا کے ابھی آسمان میں ٹھوکر
فلک پہ چاند ستاروں کو مارتی ٹھوکر"

"مگر غضب ہے کہ کم بخت ڈور نے ناحق
کیا ہے مجھکو جکڑ بند۔ باندھ کر شہپر"

تھا اس کے سر پہ جو اک بھوت حریت کا سوار
اسی خیال میں وہ بڑھ رہی تھی تن تن کر

کی جد جہد و کشاکش کہ پائے آزادی
گھٹی۔ بڑھی۔ کبھی نیچی ہوئی۔ کبھی اوپر

اکھڑ کے ہاتھوں سے آخر وہ ہو گئی آزاد
مگر وہ اگلی سی قوت رہی۔ نہ شور۔ نہ شر

کیا تھا نشۂ آزادی نے جو مست اسے
قدم قدم پہ لگی کھانے ہر طرف ٹھوکر

بجائے اس کے کہ کرتی وہ عرش پیمائی
رہیں پہ اوندھے منہ آئی بہ حالت ابتر

رہی نہ کانپ۔ نہ ٹھہڈ۔ نہ پرزے کاغذ کے
کہ تاک میں تھا لٹیروں کا اک بڑا لشکر

غلام قوم کی حالت بھی تم یہی سمجھو
ترقی کرتی ہے وہ بھی سب اور کے بل پہ

اگر نہ دیتے رہیں اس کو ٹھکیاں حکام
تو اپنی جھوک پہ قائم نہ رہ سکے دم بھر

کبھی علائقِ دنیا سے دور مت بھاگو
اسی میں دینی ترقی کا راز ہے مضمر

اور شلبی کے یہاں ٹھیرا ہوا تھا، ہیارس محنتی، جفاکش اور فرمانبردار غلام تھا، دوران قیام میں ایلینیرا سے اس کو محبت ہوگئی اور ایلینیرا بھی اس کو چاہنے لگی۔ طبیعتوں کا میلان دیکھکر شلبی نے ان دونوں کی شادی کردی، شادی بالکل رسمی تھی نہ تو کچھ رسوم و اہم ہی تھی اور نہ کسی قسم کا کوئی تکلف کیا گیا تھا۔ دولہا، دولہن اپنے روزمرہ کے لباس میں پادری کے سامنے آئے اور اس نے نکاح پڑھا دیا، کاش وہ کسی آزاد ملک میں پیدا ہوئی ہوتی تاکہ اس کے دل کی حسرت نکلتی مگر خیر وہ اس حال میں بھی خوش تھی اس نے آزاد دنیا کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا اس لئے وہ بہت ہی شاد و بشاش تھی، گاؤں کے بچے، بوڑھے اور نوجوان سب ہی خوش تھے، اس کی شادی اُن سب کی شادی تھی، ان کی خوشیوں میں حقیقی مسرت اور بے لوث محبت کے جلوہ نظر آرہے تھے جو متمدن ممالک کے آزاد گھرانوں میں مفقود نظر آتے ہیں۔

رات کے بارہ بجے تھے اور قمری مہینہ کی پندرہ تاریخ، چاندنی چھٹک کر پڑ رہی تھی اور گاؤں کا بچہ بچہ غلامی کی زنجیروں میں بھی قدرت کے دلچسپ نظارہ کا لطف اٹھا رہا تھا، ایلینیرا کی شادی نے آج ان کے لطف کو اور بھی دوبالا کردیا تھا، اور تمام غلام میدانوں اور جنگلوں میں خوشیاں مناتے اور شادی کے راگ گاتے پھر رہے تھے۔ دلہا دلہن بھی چاندنی کا لطف اٹھانے جنگل کی طرف چلے اور وہاں جاکر ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھ گئے جہاں ایک درخت تھا جس کے پتوں سے چاندنی چھن چھن کر ایلینیرا کے حسین چہرہ پر پڑتی اور منظر کی دلاویزی میں ایک گونہ اضافہ کر رہی تھی ایلینیرا اپنے مرکز محبت کے آغوش میں بانسری بجا رہی تھی، آج معمول سے زیادہ اچھے سُر نکل رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دل کی حسرتیں اور تمنائیں موسیقی کے دلچسپ ترانوں میں ظاہر ہو رہی ہیں، ہیارس اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہا ہے اور ایلینیرا کی گردن میں ہاتھ ڈالے عشق و محبت کے پیچیدہ راگنیوں میں گم تھا حسن کی تجلیات نے اس کی آنکھیں بند کردیں اور وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر تھا۔ اگرچہ ان کے جسم اب بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے لیکن ان کی روحیں آزادی کے ساتھ عیش منا رہی تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ خوشیاں بالکل عارضی ہوا کرتی ہیں۔ انہیں یہاں آئے ہوئے کامل آدھا گھنٹہ گذر گیا مگر انہیں اس کا احساس بھی نہ ہوا، وہ ایک عالم بے خودی میں تھی کہ یکایک ایلینیرا کو کسی کی آہٹ سنائی دی، وہ چونک کر کہنے لگی

"ہیارس دیکھو کوئی آتا ہے" ہیارس اپنے پرکیف خواب سے چونکر ادہر اُدہر دیکھنے لگا مگر جب کچھ نظر نہ آیا تو ہنستے ہوئے ایلینیرا کے رخسار کا ایک بوسہ لیا اور کہنے لگا "یہاں کون آتا ہے" لیکن وہ ابھی ہنس ہی رہا تھا کہ پھر کسی کی آہٹ قریب سنائی دی اب کی دفعہ تو وہ گھبرایا اور چوطرف دیکھنے لگا کہ ناگہاں اس کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی کہ اس کے ہوش اڑ گئے اور سارا لطف کرکرا ہو گیا یہ شخص اس کا آقا گریگوری تھا جو اتفاق سے اسی رات شلبی سے اپنا قرضہ وصول کرنے آیا ہوا تھا' ہیارس کی شادی کا حال سنکر وہ آگ بگولہ ہو گیا اور اب اس کو سزا دینے آیا تھا قریب آکر کہنے لگا "نیچ اتر حرامزادے! وہاں کیا کر رہا ہے؟"

ہیارس نیچے اترا اور ڈرتے ڈرتے گریگوری کے قریب گیا۔ "مردود تو نے بغیر میری اجازت کے کیسے شادی کی" یہ کھکر اس نے دو کوڑے رسید کئے۔ ہیارس تلملا کر رہ گیا مگر ایلینیرا کا ہاتھ تھامے تھا

"چھوڑ اس لونڈی کو اور میرے ساتھ چل"۔

"آقا مجھے ایک دن کی اجازت دیجئے" ہیارس نہایت عاجزی سے استدعا کرنے لگا "اجازت' مردود کے بچے مچلتا ہے یا مارے جوتوں کے سر توڑ دوں"

"آقا!.....

وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ گریگوری اس کو مارتا اور گھسیٹتا ہوا لیکر چلا گیا' اگرچہ شلبی نے بہت کچھ سفارش کی مگر اس کی کون سنتا' شلبی زیادہ اصرار بھی نہ کر سکا اس لئے کہ مقروض آدمی کی زبان قرض خواہ کے سامنے نہیں کھلتی' ایلینیرا بھی ہزار روئی چلائی مگر نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ نظروں سے غائب ہو گیا' شلبی ایلینیرا کو سمجھا منا کر گھر لایا اور گریگوری تھوڑی بہت رقم وصول کر کے چلتا ہوا۔

۲

اس واقعہ کو گذرے ہوئے کوئی دو سال کا عرصہ ہوتا ہے' اس اثنا میں زمانہ نے کئی کروٹ بدلے لیکن نہ بدلنے والی تھی تو وہ ایلینیرا کی قسمت' شوہر کی یاد میں وہ دن بدن گھلتے جا رہی تھی یوں کہئے کہ وہ زندگی کے دن پورے کر رہی تھی' اسے کیا امید تھی کہ اس کا

متاعِ زندگی شادی کے پہلے ہی دن لٹ جائیگا۔ مگر خدا سبب الاسباب ہے۔ اس نے اس کی دلبستگی کا سامان فراہم کر دیا تھا اس کو ایک لڑکی پیدا ہوئی جو اس کی زندگی کا سہارا تھی۔

ایک روز شام کے وقت وہ اپنے آقا کے کمرے سے ملحقہ کمرہ میں اپنی بچی کو گود میں لئے اپنی بدقسمتی پر آہ آہ آنسو بہا رہی تھی کہ اس کے کان میں آواز آئی۔

"اچھا میں نے دو ہزار کو بیچ ڈالا"

"بیچ ڈالا" کے الفاظ نے اس کے دل پر وہی اثر کیا جو بے گناہ مجرم کو حاکم کی زبان سے سزائے موت کا اعلان سنکر ہوتا ہے وہ دیوانہ وار اٹھی اور دروازہ کی سانڈیں سے جھانک کر دیکھنے لگی آہ یہاں وہی منظر تھا جس کو وہ دیکھنا پسند نہ کرتی تھی اور وہ یہ کہ گریگوری اور شلبی بیٹھے ہوئے بیع و شرح کر رہے تھے شلبی نے اپنے قرض کی ادائی میں ایلیزا کی لڑکی اور چچا ٹام کو بیچ ڈالا تھا۔

اپنے کو اس نازک ماحول میں پاکر ایلیزا کے ہوش پران ہو گئے اور وہ اپنی بچی کو لیکر مکان کے دوسرے دروازہ سے فرار ہو گئی۔

رات کا وقت تھا اور فضا کہر آلود، چو طرف برف باری ہو رہی تھی، ادھر قطرے جسم پر پڑے اور برف بن گئے۔ راستوں پر برف جم گئی اور ہوا بھی خوب زوروں پر چل رہی تھی، ایسی حالت میں ایک عورت کا اپنے معصوم بچے کو کلیجے سے لگائے اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے جانا حقیقت میں قابل رحم ہے! وہ پناہ کی تلاش میں جا رہی تھی، کوئی گھنٹہ بھر کی کوشش کے بعد وہ ایک جھونپڑی کے قریب پہونچی جس کے اندر دو حبشی غلام رات کا کھانا کھا رہے تھے، آواز دینے پر دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوئی، سردی کے باعث اس کا جسم سن ہو گیا تھا، چچا ٹام اس کو اس حالت میں دیکھکر ششدر رہ گیا اور دریافت کرنے لگا۔

"بیٹی ایلیزا خیر تو ہے ایسے وقت تو یہاں کیسے آئی؟"

"چچا" کیا کہوں، اول تو میرا متاعِ زندگی مجھ سے چھین لیا گیا" یہ کہکر وہ رونے اور سسکیاں بھرنے لگی، اور اب میری زندگی کا سہارا یہ بچی تھی اس کو بھی شلبی نے اپنے قرض کی

دائی میں گریگوری کے ہاتھ بیچ ڈالا اب میں کیا کروں کس کو دیکھکر زندہ رہوں" یہ کہکر ایلینیرا نے بچی کو ٹام کی گود میں دیدیا۔

ٹام بھی شلبی کا غلام تھا اور اپنی بے لوث محبت اور فرمانبرداری کے باعث وہ تمام غلاموں میں ممتاز حیثیت رکھتا اگرچہ وہ غلام تھا مگر فطرت نے اس میں وہ لطیف جذبات ودیعت کئے تھے کہ اس کو دنیا کے بہترین انسانوں میں شمار کیا جا سکتا تھا چنانچہ شلبی اکثر دفعہ اسے آزاد علاقوں میں بھیجتا تھا مگر کبھی اس نے اپنے مالک کو دھوکا نہ دیا اس کی محبت اور ہمدردی کے باعث سارا گاؤں اس کو چچا چچا کہکر پکارتا وہ گویا جگ چچا تھا۔ ایلینیرا کی اس قدر افسوس ناک حالت دیکھکر اس کا دل بھر آیا اور اس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "بیٹی اللہ مالک ہے، وہ کسی نہ کسی طرح سے دلبستگی کے سامان فراہم کردیگا میں تری ہر طرح سے مدد کرونگا اللہ پر بھروسہ کر"

ایلینیرا کے دل پر ایک چوٹ لگی اور وہ چلا کر کہنے لگی

"آہ چچا ٹام! اس نے تم کو بھی بیچ ڈالا"

"مجھکو"! ٹام نے حیرت سے پوچھا

"ہاں، ہاں، تم کو"

یہ سنکر ٹام ایک سناٹے میں آگیا اس کو پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ غلام خواہ کتنا ہی سنجیدہ اور وفادار ہو آخر غلام ہی ہے اس کی زندگی دوسرے کے ہاتھ ہے۔

باوجود خود پریشان ہونے کے ٹام نے ایلینیرا کو دلاسا دیا چچا ٹام کو اس مایوسانہ حال میں دیکھکر ایلینیرا نے اسے خدا حافظ کہا اور جھونپڑی سے باہر نکل گئی یہاں سے لوٹکر پھر مکان جانا گویا موت کے منہ میں جانا تھا جس کو کبھی وہ گوارا نہ کرتی تھی اس نے یہ ٹھان لیا کہ "چاہئے جان جائے یا جان رہے مگر میں کبھی اپنی معصوم بچی کو اس ظالم کے حوالے نہ کرونگی وہ میری زندگی کا نہیں بلکہ میری راحت میرے آرام کا دشمن ہے"

باہر برفانی رات کا بھیانک منظر اس کا استقبال کر رہا تھا اس نے خوشی سے اس کا نیر مقدم کیا اور آگے کی طرف چلنے لگی۔

سیر و شکار کے بعد جب شلبی لڑکی کو لینے اندر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ کمرہ خالی پڑا ہے

گریگوری نے کہا "ہاں میں سمجھ گیا، ہیاسن بھی میرے یہاں سے بھاگ گیا ہے، شاید اسی نے اس کو فرار کیا ہو، اچھا جاتا ہوں میں اس بدمعاش کو خود گرفتار کرونگا" یہ کہا اور اپنے ساتھ دو تین غلاموں اور چھ شکاری کتوں کو لیکر اس کے تعاقب میں روانہ ہوا، ایلینیرا نے دور سے ہی ان لوگوں کو آتے دیکھا راستہ برف سے اٹ گئے تھے، کتے اور گھوڑے بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہے تھے، ایلینیرا اب ہمت کرکے بھاگنے لگی مگر ہر ہر قدم پر ٹھوکر لگ رہی تھی، آگے آگے ایلینیرا اور پیچھے پیچھے کتے تھے اسی طرح افتاں وخیزاں کوئی دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے ایک مکان نظر آیا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا وہ بے تحاشا مکان کے اندر داخل ہوگئی اور اس کے بعد ہی بے ہوش ہوگئی، کوئی گھنٹہ بھر کے بعد ہوش آیا تو اس نے اپنے کو ایک گدے دار بستر پر پایا سامنے خادمہ چار لئے کھڑی تھی اور بچی پاس تھی اس کو ایک گونہ اطمینان ہوگیا اور وہ خیال کرنے لگی کہ ع رسید بود بلائے ولے بخیر گذشت"۔ وہ اب اپنی بچی کو گود میں لئے چار پی رہی تھی کہ یکایک کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی، ایلینیرا کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی اور وہ آنے والی مصیبت کا انتظار کرنے لگی، مالک مکان باہر گیا، اس کے بعد ہی گریگوری کی کرخت آواز سنائی دی، کیا تم نے کسی عورت کو اپنے مکان میں پناہ دی ہے؟"

"نہیں میں تو وکیل ہوں"

میں یہ نہیں دریافت کرتا کہ آپ وکیل ہے یا زمیندار مگر یہ بتلاؤ کہ کوئی عورت جس کے ساتھ ایک چھوٹی بچی ہے آپ کے ہاں پناہ گزین ہے"

"ٹھیک ہے، میں تو وکیل ہوں"

گریگوری اس کا منشا سمجھ گیا اور کہنے لگا اگر تم اس عورت کو میرے حوالے کردو گے تو میں تمہیں چار سو ڈالر دونگا، وکیل صاحب کے منہ میں پانی چھوٹ گیا اور اس نے رضامندی ظاہر کی۔

یہ سنتے ہی ایلینیرا گھبرائی اور اپنے ننھال کو گود میں لیکر کھڑکی سے فرار ہوگئی اور ابھی ایک فرلانگ بھی نہیں گئی تھی کہ اس کے راستہ میں ایک ندی حائل آئی جس میں برف کے بڑے بڑے تودے بہہ رہے تھے، اب ایلینیرا کی عجیب حالت تھی "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن"

گھوڑے اور کتے اس کا پیچھا کر رہے تھے' اب اس کو آنے والی مصیبت کا کامل یقین ہو گیا اور وہ بچی کو دونوں ہاتھوں میں لیکر دعا کرنے لگی "اے اللہ تو اس بے کس مظلوم پر رحم کر' یہ تیری امانت ہے" یہ التجا کر رہی تھی کہ کتے اس کے قریب پہونچ گئے اور وہ فوراً اللہ کا نام لیکر ندی میں کود پڑی اتفاق سے اس کا پیر برف کے تودے پر پڑا اور وہ اس پر کھڑی ہو گئی' کتے پانی کو دیکھکر جھجک گئے لیکن گریگوری کے دو چار کوڑوں نے انہیں سیدھا کر دیا اور وہ بھی برف کے تودوں پر قدم رکھتے ہوئے ایلینیرا کا تعاقب کرنے لگے ایلینیرا اب کافی فاصلہ طے کر چکی تھی' یہاں تک کہ وہ ایک آبشار کے قریب پہونچی اور اب قریب تھا کہ وہ گر گئی ہوتی لیکن گاؤں کے پٹیل نے جو اس طرف کسی کام کو آ نکلا تھا اسکی یہ حالت دیکھکر رسی پھینکی اور ایلینیرا اس کے سہارے کنارے پہونچ گئی۔ ایلینیر خشکی پر آ گئی اور کتے ڈوب مرے' گریگوری نا امید ہو کر واپس چلا گیا لیکن وکیل صاحب کے دل میں لالچ چٹکیاں لے رہی تھی' پٹیل ان کو اپنے گھر لے گیا اور خوب آگ جلا کر ماں اور بچی کو رات تمام گرم رکھا' تہک جانے کے باعث بستر پر پڑتے ہی ایلینیرا کی آنکھ لگ گئی۔

۳

صبح کا وقت ہے' آسمان پر بادل بکھر گئے ہیں اور کچھ دھوپ بھی نکلی ہے۔ سورج کی شعاعیں کھڑکی میں سے گذر کر جیسے ہی ایلینیرا پر پڑیں اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ محسوس کرنے لگی گویا اس نے کوئی وحشت ناک خواب دیکھا ہے' پہلے وہ تو اپنے کو اس اجنبی ماحول میں پاکر گھبرائی اور جو پلٹی تو بچی اس کی گود میں تھی اسے ایک گونہ اطمینان ہو گیا' وہ اٹھ بیٹھی اس کا محسن اس کے قریب ہی کھڑا تھا اس نے شکریہ ادا کیا "جناب میں آپکی مشکور ہوں کہ آپ نے میری زندگی کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دیا' یوں تو ہر حال میں اللہ مالک ہے لیکن آپ نے بُرے وقت میں میری اعانت کی..... کاش میں ڈوب گئی ہوتی" اس نے کچھ سوچکر آہ سرد بھرتے ہوئے کہا اور گذشتہ رات کے واقعہ پر غور کرنے لگی۔

مالک مکان نے جو ایک تاجر تھا اس کو تسلی دی اور کہا "ہاں خدا کا فضل تھا

بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم اب کسی بات کی فکر مت کرو مگر یہ تو بتلاؤ کہ تم کون ہو اور تمہارا اس اندھیری طوفانی رات میں دریا میں بہہ نکلنے کا سبب کیا ہے؟"

"میں ایک بدنصیب ہوں اور میرا..... وہ یہیں تک کہنے پائی تھی کہ سامنے والی کھڑکی میں وکیل صاحب کی بزرگ صورت دکھائی دی' اس کا دل سہم گیا اور وہ سمجھ گئی کہ روپیہ کی لالچ اسے یہاں کھینچ لائی ہے۔ وکیل اندر داخل ہوا اور ادھر ادھر کی باتیں بنا کر پیٹل سے ایلینیرا کو چھین لیا ایلینیرا ہزار انکار کرتی رہی مگر اس نے ایک نہ سنی اور اس کو لے جا کر گریگوری کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

دوسرے دن صبح کو جب کہ دریا ڈون میں برف پوری طور پر پگھل چکی تھی اور جہاز آسانی کے ساتھ نقل و حرکت کر رہے تھے' گریگوری مع اپنے غلاموں کے جن میں ایلینیرا اور اس کی بچی اور چچا رام شامل تھے جہاز میں بیٹھکر اپنے گاؤں کو روانہ ہوا۔ وکیل اور اس کا ایک دوست اس کے ہمراہ ہو گئے۔ ایلینیرا اپنے طور پر قید تھی' مگر اب بھی بچی اس کے ساتھ تھی' اس کے دل کو کسی قدر اطمینان تھا مگر ایک رات جب کہ وہ گہری نیند میں سو رہی تھی وکیل اور اس کا ساتھی بچی کو مٹھائی کی لالچ دیکر چرا لے گئے' جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے نونہال کو اپنی گود سے غائب پایا اس کے دل میں تیر لگی اس تیر کا زخم اب گہرا تھا کہ اس کا کوئی علاج ممکن نہ تھا' وہ دیوانہ وار جہاز کے اندر ادھر ادھر تلاش کرنے لگی جب کہیں پتہ نہ چلا تو بے آس ہو کر وہ جہاز کے سامنے والے حصہ پر آئی یہاں کیا دیکھتی ہے کہ بچی "اماں اماں" کہکر بلبلا رہی ہے مگر وکیل اس کو گود میں لیکر گاڑی پر سوار ہو رہا ہے' وہ چیل کی طرح لپکی اور چاہتی تھی کہ گاڑی کو پکڑ لے مگر وکیل نے ایک کوڑا اس زور سے مارا کہ ایلینیرا گر پڑی گاڑی آگے کی طرف نکل گئی ایلینیرا بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی وکیل کے ساتھی نے اس کو جہاز پر سوار کرا دیا' کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا غم واندوہ کی حالت میں بے ہوشی انسان کے لئے حد درجہ مفید ہے۔ یہی حال ایلینیرا کا تھا جب اسے ہوش آیا تو اسے تمام دنیا تاریک نظر آئی اس کے دل کا چراغ بجھ چکا تھا جس کے روشن ہونیکی کم از کم اس کے گھر میں تو امید نہ تھی "خیر اللہ کی شاید یہی مرضی ہوگی" کہکر خاموش رہ گئی۔

روپیہ کے لالچی وکیل نے اس کی بچی کو کسی دوسرے گاؤں میں دو ہزار ڈالر کو بیچ ڈالا۔

دو روز بعد جہاز گریگوری کے گاؤں کو پہونچا اور تمام غلام جن کو گریگوری نے خرید کئے تھے گھر پہونچائے گئے دو روز تک ان کی کسی نے کچھ خبر نہ لی، چچا ٹام اور ایلیزا اور دیگر غلام قید کی سرد مہریاں برداشت کر رہے تھے، ایک دوسرے کی حالت دیکھکر سہم جاتے تھے، مگر کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ منہ سے ایک لفظ بھی نکالے، دو دن تو اس طرح کس مپرسی کے عالم میں گذر گئے، تیسرے دن گریگوری اپنے کمرہ میں شراب پیتا ہوا بیٹھا تھا اس نے اپنے ایک غلام کو آواز دی، اس کے آنے میں ایک آدھ منٹ کی دیر ہوگئی بس کیا تھا، گریگوری کا خون جوش کھانے لگا اور اس نے غلام کو اتنے کوڑے رسید کئے کہ غریب نے کچھ دیر بعد دم توڑ دیا، پھر دوسرے غلام کو آواز دی، وہ آیا حکم دیا کہ جا، ایلیزا کو یہاں لے آ" وہ بھاگتا ہوا ایلیزا کے پاس گیا، اور اس سے چلنے کو کہا ایلیزا خوف و دہشت سے کانپ گئی اور ڈرتے ڈرتے گریگوری کے سامنے گئی، گریگوری جس کی آنکھیں غصہ کے مارے سرخ ہوگئیں تھی ایلیزا سے کہنے لگا "بیٹھ جا" اس مہربانی اور عنایت نے ایلیزا کے دل میں شک پیدا کر دیا اور بجائے بیٹھنے کے وہ خاموش کھڑی رہی گریگوری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بازو والی کرسی پر بٹھلا دیا اور گلے میں ہاتھ ڈالکر شراب پینے لگا، ایلیزا کا خون خشک ہوگیا، اب تک تو صرف جان پر بنتی آئی، مگر اب عصمت پر بھی دست اندازی کی نوبت آگئی، ایک مخفی جذبہ جو اکثر شریف عورتوں میں عصمت کی حفاظت کے لئے موجود ہوتا ہے بھڑک اٹھا اور وہ پھرتی کے ساتھ کرسی سے اچھلکر بازو کھڑی ہوگئی اور نفرت اور حقارت آمیز نگاہوں سے گریگوری کی طرف دیکھنے لگی، مگر اس ظالم اور بے حیا پر ان کا کیا اثر ہوتا، وہ اٹھا اور ایلیزا پر جبر و تشدد کرنے لگا کہ وہ کسی طرح اس کے ساتھ محبت کا اظہار کرے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور گریگوری کی ایک قدیم لونڈی جو اس کی معشوقہ بھی تھی کمرہ کے اندر داخل ہوئی گریگوری کو ایک دوسری عورت کے ساتھ محو اختلاط دیکھکر اس کے بدن میں آگ لگ گئی، وہ جھلا کر کہنے لگی:۔

"گریگوری یہ کیا ہے؟"

"تو یہاں کیسے آئی" گریگوری نے ڈانٹ کر کہا
"میں، مجھے حق حاصل ہے، تم اس عورت سے کیا باتیں کر رہے ہو؟"
"تجھے اس سے کیا کام؟ تو چلی جا"

اس کی معشوقہ نے آگے بڑھکر گریگوری کا ہاتھ پکڑ لیا، گریگوری نے اس کو جھٹک دیا اور پیٹتے ہوئے کمرہ سے باہر نکال دیا اور حکم دیا کہ اس کو خوب کوڑے لگائے، جائیں چچا ٹام نے سفارش کی مگر الٹے چچا ٹام کو اتنے کوڑے پڑے کہ غریب ہمیشہ کے لئے دنیا سے رخصت ہو گیا، اس کی معشوقہ وہاں سے بھاگ گئی اور چچا ٹام کے ساتھی سے اس کا ذکر کیا، اس کے آنکھ سے آنسو رواں ہو گئے اور اس نے پھر ایلینیرا کا قصہ کہا جس سے وہ پہچان لی کہ ایلینیرا اس کی لڑکی ہے، یہ معلوم کرنے کے بعد اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی وہ دوڑتے ہوئے کمرہ کے اندر داخل ہوئی اور ایلینیرا سے بیٹی کھکر لپٹ گئی، اور اب گریگوری چاہتا تھا کہ اپنے کوڑے سے کام لے، ماں اور بیٹی بھاگ کر بالاخانہ پر چلا گئے اور اندر سے کواڑ بند کر لی۔ گریگوری آدھ گھنٹہ کی کوشش کے بعد دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوا، ماں بیٹی ادھر اُدھر چھپتے رہے لیکن بالآخر گریگوری نے انہیں مارنے کے لئے پستول اٹھایا۔

۴

گریگوری کے پاس سے بھاگ نکلنے کے بعد ہیارس چھپتے چھپاتے آزاد علاقوں میں پہونچا اور وہاں کے بعض لوگوں سے ملکر اس نے اپنے غم کی پوری داستان سنائی، ان لوگوں کے دلوں میں نوع انسانی کی ہمدردی کا جذبہ بھڑک اٹھا اور انہوں نے اپنے ملک سے رسم غلامی کو مٹانے کا مصمم ارادہ کر لیا، ابراہام لنکن نے اس معاملہ میں حد درجہ دلچسپی لی، ملک کے اکثر لوگوں نے اس کی ہم نوائی کی اور ابراہام لنکن سے اس کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کا وعدہ کر لیا، آزاد علاقوں میں یہ خیال بہت جلد پھیل گیا، اس کام کے لئے فوجیں جمع کی جانے لگیں، دو سال کے عرصہ کے بعد جب کافی فوج جمع ہو گئی تو ابراہام لنکن اور دیگر بہی خواہان نسل انسانی نے ان علاقوں کا رُخ کیا جہاں غلام ظلم و ستم کی کڑی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، یہ فوج یکے بعد دیگرے ہر علاقہ میں پہونچتی اور وہاں

غلاموں کو آزاد کراتی جا رہی تھی، اصل فوج کے ساتھ غلاموں کی بھی کافی فوج جمع ہو گئی ہیارس بھی اسی فوج کے ہمراہ تھا، اگرچہ ایلینیرا کی مفارقت سے وہ مغموم تھا مگر آج اس کا دل ضرورت سے زیادہ خوش معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ ظالم آقاؤں سے اپنا بدلہ لے رہا تھا فوج ایک گاؤں میں پہونچی، سڑکوں، گلی کوچوں میں غلام دیوانہ وار پھر رہے تھے ہیارس کی نظر ایک چھوٹی لڑکی پر پڑی، اس نے فوراً پہچان لیا کہ یہ اسی کی لڑکی ہے کیونکہ ہیارس ایک دفعہ خفیہ طور پر ایلینیرا اور اپنی بچی سے مل چکا تھا، دوڑ کر بچی کو گود میں اٹھایا اور فرط مسرت سے اس کا منہ چومنے لگا، مختلف گاؤں طے کرنے کے بعد وہ گرگیوری کے گاؤں میں پہونچے، ہیارس بے انتہا خوش تھا فوج کے آگے آگے وہ اپنی بچی کو کندھے پر بٹھائے چل رہا تھا۔ فوج گاؤں کے اندر داخل ہو گئی۔

۵

ادھر اس نے پستول اٹھایا اور اُدھر فوجی باجوں کی آواز اس کے کان میں گونجنے لگی گرگیوری فوجی باجوں کی آواز سنکر گھبرا گیا، پستول اس کے ہاتھ سے گر پڑا، وہ دیوانے کتے کی طرح مکان کے اندر ادھر اُدھر نیچے اوپر بھاگنے لگا، ایلینیرا جو اس وقت کھڑکی سے لگ کر کھڑی تھی جھک کر باہر کی طرف دیکھنے لگی، فوجی نشان ہوا میں لہرا رہا تھا، کچھ غلام بھی اس فوج کے ہمراہ تھے۔ ایلینیرا کا دل خوشی سے پھول گیا کیونکہ وہ سمجھ گئی یہ وہی فوج ہے جس کے متعلق ہیارس نے اسے کہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فوج نے مکان کا محاصرہ کر لیا اور کچھ فوجی اندر داخل ہوئے گرگیوری کے ہوش اڑ گئے مگر غرور اور بدمزاجی اس کی فطرت ثانی بن گئی تھی وہ اسی لہجہ میں فوجیوں سے گفتگو کرنا چاہا مگر اب اس کی کون سنتا؟ اس کو گرفتار کر کے اتنا پیٹا گیا کہ اس کا جینا محال ہو گیا۔

ایلینیرا نے ہیارس کو دیکھا اور ہیارس نے ایلینیرا کو دونوں کی آنکھیں ملی اور دونو فرط خوشی سے رونے لگے، بچی نے امی، امی کہکر پکارا، ایلینیرا نے اس کو گلے سے لگا لیا۔

مائدۃ الاسلام

از جناب ابو السخا محمد سعید صاحب ہاشمی سالار

کی ودیعت مرے اللہ نے شرافت مجھ میں
بہر وی اس شان سے کچھ شان مروت مجھ میں
موج در موج ہے وہ بحر محبت مجھ میں
ٹھیر سکتی نہیں کشتی عداوت مجھ میں
سم روانی ہے مری نفس شرارت کے لئے
ایک طوفان ہوں خاشاک حماقت کے لئے

چشمۂ فیض خدا شان ہدایت میں ہوں
جس کو اللہ نے چاہا وہ شریعت میں ہوں
تم ہو عزت سے زمانہ میں وہ عظمت میں ہوں
جو ملاتی ہے خدا سے وہ محبت میں ہوں
شان حق مجھ میں ہے اور جان صداقت مجھ میں
للہ الحمد ہے توحید کی قوت مجھ میں

وہ کلام آج سناؤں ہیں تمھیں غیرت تاب
یاد آجائے تمہارا وہ سبق پھر نایاب
پھر بڑھیں تم میں وہی حوصلہ آموز آداب
پھر اُٹھے تم سے ہی نیرنگ زمانہ کا حجاب
پھر کرے بحر کمالات کو پایاب خدا
پھر ہوں بہبودئ اسلام کے اسباب خدا

تم اگر دوست ہو میرے تو حکومت کیا شے
تاج شاہان زمانہ کی حقیقت کچھ ہے
میں وہ ساقی ہوں پلا کر تمھیں توحید کی مے
شان صفدرؓ کی خالدؓ کی دکھادوں پھر سے
میری خاطر جو بخالت نہ کریں جانوں کی
اب ضرورت ہے مجھے ایسے مسلمانوں کی

تم جو مسلم ہو تو ہے تم میں محبت میری
ہر مسلمان پہ ہے فرض شریعت میری
کس پہ روشن نہیں دنیا میں حقیقت میری
تاب کیا لائے کوئی ہے وہ جماعت میری

برق تو حمد بھری ہے مرے ہر شارون میں
بحر میں چھوڑیں کسی کو نہ یہ طیارون میں

فرض ہے تم پہ مری جان موحد ہونا بس یہی ہے میرا ارمان موحد ہونا
تم کو ہونا ہے جو انسان موحد ہونا آدمیت کی ہے یہ شان موحد ہونا

متفق ہو کے ذرا دیکھو تماشہ اپنا
ساری دنیا پہ نظر آئیگا قبضہ اپنا

راضی اللہ کو کرنا ہے اطاعت سے کرو رونق بزم عمل شمع شریعت سے کرو
اپنے ہر کام کو قرآن کی حجت سے کرو جو عمل چاہو وہ پیمانۂ حکمت سے کرو

تم اگر حصن اماں چاہو روا داری ہے
گہن ترقی کا تعصب کی یہ بیماری ہے

باغ عالم میں بنی نوع کے ہمدرد بنو ہو نسیم سحری تو نہ دم سرد بنو
آئینہ ہو کے کدورت کی نہ تم گرد بنو بھائی کے بھائی بنو اور جواں مرد بنو

بنو انصار و مہاجر قوی بازو ہو جاؤ
بات انصاف کی یہ ہے کہ ترازو ہو جاؤ

دور اللہ کرے تم سے یہ آپس کا ملال ایک معبود تمہارا ہے رہے ایک خیال
تم میں سالار جو قائم ہے صحابہ کی مثال تا ابد تم کو نظر آئے نہ خورشید زوال

پھر تو اسلام ملے نام ملے کام ملے
تم کو جنت ملے راحت ملے آرام ملے

رباعی

از جناب ابو الاعظم اعجل حیدرآبادی

یاں سے جو چلے گئے نئی دنیا میں آفاق سے پہنچے انفسی دنیا میں
"مرنا" کہتے ہیں، جس کو دنیا والے پیدا ہونا ہے، دوسری دنیا میں

ایثارِ حیات

از جناب نبی الحسن صاحب شمیم

شمیم صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے متعلم ہیں۔ آپ نے ایثارِ حیات کے عنوان سے ایک کتاب لکھنے کا قصد کیا ہے جو ان بزرگ ہستیوں کے حالات پر مشتمل ہوگی جنہوں نے قوم ملک یا صداقت کی خاطر اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ یہ اس کی پہلی قسط ہے۔ باقی حصے بھی "مکتبہ" ہی میں دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

"مکتبہ"

مادر گیتی کا وہ پہلا فرزند تھا جس نے انسانی کیفیات کا مطالعہ کیا حق و ناحق کو استدلال کے ترازو میں تولا ان کا ایک معیار قائم کیا۔ اس کی زبان امر حق کے کہنے سے کسی حال میں بھی نہ رکی، مذہب، اخلاق، تمدن، معاشرت، سیاست غرض ہر شعبۂ زندگی کے متعلق اس کے ذاتی خیالات تھے، مخصوص دلائل تھے، نیا طرزِ بیان تھا، جو دنیا کو نرالا معلوم ہوا۔

وہ چاہتا تھا کہ لوگوں کے پاس ہر فعل کی وجہ ہونی چاہئے۔ ضمیر کے خلاف کام کرنا گناہ ہے۔

زبان حق کا جوش برابر بڑھتا ہی گیا لوگ اس کی گفتگو سے اکتانے لگے لیکن پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی، راستہ چلتے اس نے تقریریں شروع کیں خود لوگوں کی زبان سے ان کے اصولوں کو غلط ثابت کرایا۔ قدامت پرستوں کو یہ باتیں کیسے بھاتیں یہ پہلی آواز تھی جو انھوں نے اپنے اصولوں کے خلاف سنی تھی خاموش کیسے رہتے۔ ایک طرف

تحقیق و مطالعہ کا یہ عالم کہ انسان کے ہر فعل پر نقص نظر آتا ہے اس کے دلائل موجود ہیں، نکات سمجھائے جا رہے ہیں الفاظ کا ایک طوفان ہے جو امنڈ امنڈ کر آ رہا ہے، دوسری طرف تغافل کا یہ حال کہ اگر چہ جوابات سے زبان قاصر ہے پھر بھی دل یہی کہتا ہے کہ یہ دروغ گو ہے کاذب ہے اسلاف کے طریقوں سے ہٹ گیا ہے۔ ایسی حالت میں تباہ ہو تو کیسے لوگوں نے کان بند کر لئے تاکہ آواز حق ان تک نہ پہونچے راستہ میں اس کو دیکھ کر چپکے سے چل دیتے کہ کہیں یہ بلا پیچھے نہ لگ جائے آخر حکومت کو بھی اس کی طرف توجہ کرنی پڑی اس کے تمام خیالات مہیا کئے گئے۔ پانچ ہزار آدمیوں کی جمہوری کے روبرو مقدمہ کی سماعت ہوئی، حق گوئی اور اظہار خیال کو جرم قرار دیا گیا۔ سزا بھی ایسی دی گئی جو دنیا میں سب سے پہلا امتحان صداقت قرار پائی۔ زہر کا ایک پیالہ اس کے ہاتھ میں دیا گیا اور کہا گیا کہ اسے پی لو یا عہد کرو کہ جو کچھ تم کہتے ہو پھر کبھی نہ کہو گے" صداقت کے دیوتا نے خوشی خوشی زہر کا جام پی لیا۔ یہ پہلا امتحان تھا جو علم کی اشاعت میں کیا گیا یہ پہلا واقعہ تھا جس نے خود داری اور استحکام سیرت کی مثال قائم کی۔ دنیا میں ایمان پر مرنے والے بہت ہوئے لیکن بات پر مرنے والا یہ پہلا شخص سقراط تھا جسے ہم شہید اول کہہ سکتے ہیں۔

تیغ خوں آشام کے جوہر دکھانے والو اپنی آنکھیں بند کر لو نہیں تو ایسا خونین منظر دیکھو گے کہ بے اختیار ہو جاؤ گے۔

آفتاب اسلام طلوع ہوئے ابھی ایسا زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ دنیا کے ہر گوشہ سے تاریکیاں بڑھنے لگیں، فسق و فجور پھیلنے لگا احکام شریعہ کو بالائے طاق رکھدیا گیا آخر ایک جماعت اس حالت کو روکنے پر آمادہ ہوئی اور امام وقت سے التجا کی کہ وہ ان کا ساتھ دیں، غیرت کے تقاضے سے خاموش نہ بیٹھا گیا حق کی جنگ پہ آمادہ ہو گئے۔ بیوفائی غداری جو چاہے کہو ساتھیوں نے ساتھ نہ دیا ایک بیابان میں تنہا چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ عرب کا ریگستان تھا گرمیوں کا زمانہ، لوؤں کا چلنا اسپر پانی کا ایک قطرہ نہ ملنا۔ تمام عزیز و اقارب دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کے آگے دشمنوں نے خاک و خون میں ملا دئے۔ اس بے بسی کی حالت میں شرط صلح یہ پیش کی گئی کہ دشمن کی بیعت کی جائے۔ ہائے کیا برا وقت تھا ایک

طرف اپنی جان کا خیال، دوسری طرف آن کا اندیشہ آخر خدا کی راہ میں سر جنگ کیا دشمن نے وہ دکھایا جو دنیا کی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ امام حسینؑ جو دوش نبی صلعم پر بیٹھتے تھے آج خاک و خون میں غلطاں تھے جواہر کا ٹکڑا ریت میں پڑا تھا پھر بھی آب و تاب وہی تھی۔ تسلیم و رضا کا اب کوئی باب دنیا کی تاریخ میں نہ لکھا جائیگا اسی کو پڑھو اور سبق سیکھو۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔

شہد الشہدا نے راہ حق میں کیسے کیسے مصائب اٹھائے صبر و ثبات استقلال رواداری اور ایثار کی وہ مثال پیش کی جسکی مثال نہیں ملتی اُن سے جو کچھ ہوا کیسے نہ ہوتا آخر کس کے بیٹے تھے اور کس کے نواسے۔

"جان کا صدقہ مال اور ایمان کا صدقہ جان" اس مقولے پر دنیا نے بہت دنوں عمل کیا اور ایسے ایسے سرفروش پیدا کئے جن کے نام صفحۂ ہستی سے کبھی نہ مٹیں گے مذہب کا جذبہ ہی کچھ ایسا ہے کہ تمام جذبوں پر غالب ہے خود بخود اس کے نام پر مٹنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسی آگ ہے جو کبھی نہیں بجھتی۔

اے ایمان پر مرنے والوں کا تماشہ دیکھنے والو یورپ کے اسٹیج کی طرف نظر میں اٹھاؤ۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے جھگڑوں کو دیکھو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مذہب کی ایک چنگاری کہاں تک آگ لگا سکتی ہے۔ تم اسے جنون کہو یا وارفتگی سودا کہو یا عقیدہ حقیقت یہ ہے کہ ایسا عبرت ناک منظر کبھی نہ دیکھو گے۔

تخت انگلستان پر ملکہ میری جلوہ گر ہے۔ پاپائے روم کا اثر ملک میں از سر نو پھیل رہا ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کے پیرو ہزاروں کی تعداد میں قتل ہوئے ہزاروں کو نذر آتش کیا گیا، ان میں سے دو کا حال سنو ان کی ہمت جرأت اور قربانی کا اندازہ کرو خدا دنیا میں ویسا برا وقت نہ لائے۔ پادریوں کا افسر اعلیٰ کرنمر جو نئے مذہب کا پیرو تھا اس نے پہلے تو میری کے کہنے سے پاپا کو اپنا مذہبی رہنما تسلیم کر لیا لیکن بعد کو اُسے پشیمانی ہوئی اعتقاد تبدیل کرنے کے بعد ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب آدمی اپنے ماضی اور حال پر غائر نظر ڈالتا ہے کبھی وہ اپنے جدید خیال میں مستحکم ہو جاتا ہے اور کبھی اسے ندامت ہوتی ہے

اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے اور اس کی تلافی کے لئے وہ بہت کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

کربنمر بھی اپنے مذہب پر جان دینے کو تیار ہو گیا جب اس کے جلانے کے لئے آگ روشن کی گئی تو یہ کہکر کہ "اس نکمے ہاتھ نے معافی کے لئے معروضہ لکھا تھا" اس نے اپنا سیدھا ہاتھ شعلوں میں جلا ڈالا اور بعد کو خود بھی خوشی خوشی جلکر خاک ہو گیا، آگ کو وہ گلشن ابراہیم سمجھا اور کیوں نہ سمجھتا جو وہ زندگی حقیقی زندگی نہیں اگر اسے چھوڑ کر دائمی حیات ملے تو کون ہے جو انکار کرے، خیر خواہان تقدیر وہ مسکرائے اور آپس میں بشارت دی کہ اب انسان زندگی کی حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں۔ ملکہ میری کا مذہبی تعصب اپنے انتہائی جوش پر تھا نئے مذہب والے سیکڑوں کی تعداد میں روزانہ قربان ہو رہے تھے۔ مصیبت کا وقت ایک بڑے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ انسانی طبائع اور سیرتوں کا اندازہ اسی وقت پورے طور پر ہوتا ہے جو لوگ مصیبت کے کمزور ہوتے ہیں ہاتھ پاؤں ڈال دیتے ہیں مضبوط دل والے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں ان کا قول ہوتا ہے کہ چاہے جان جائے آن نہ جائے۔

ملکہ میری جبراً مذہب تبدیل کرانا چاہتی تھی لوگ کیسے مان لیتے اتنی قربانیوں کے بعد بھی مطلب خاطر خواہ پورا نہ ہوا اور آخر جس مذہب کے مٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی وہی غالب ہوا یہ نتیجہ تھا اس تمام ایثار کا جو ایسے وقت میں ہر فرد سے ظاہر ہوا۔ بچوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ شمع سے ہاتھ جلا جلا کر کہتے تھے کہ ہم آگ میں اس طرح جلیں گے۔ جوان بوڑھے مسکراتے ہوئے آگ میں گود پڑتے تھے۔

لیٹمر نے جلتے وقت جو پر جوش الفاظ کہے تھے آج تک انگریزی قوم کو یاد ہیں۔

"مرے دوستو مردانگی دکھانا ہم خدا کی مہربانی سے آج ایسی شمع روشن کریں گے جو کبھی خاموش نہ ہوگی"

رولنڈ ٹیلر کا حال سنو یہ شخص سفوک کے ایک گرجے میں ملازم تھا۔ ملکہ نے حکم دیا کہ اس کو جلد از جلد سزا دیجائے ایک روز جب کہ ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی رولنڈ ٹیلر قید خانہ سے باہر لایا گیا اور چند کانسٹیبلوں کے ہمراہ سفوک روانہ ہوا۔ راستہ میں اسکی بیوی بچے اس کے گذرنے کے منتظر تھے ایک لڑکی چلا اٹھی "امان امان وہ دیکھو ابا کو

سپاہی پکڑے لئے جارہے ہیں۔ ماں نے بغور دیکھا تو شوہر پر نظر پڑی۔ قیدی نے تھوڑی دیر بیوی بچوں سے گفتگو کرنے کی اجازت مانگی جو اسے مل گئی۔ رولینڈ نے اپنے بال بچوں کے ساتھ پتھروں پر بیٹھکر درگاہ خداوندی میں کچھ اس طرح سے دعا مانگی کہ سرکاری سپاہی بھی بغیر متاثر ہوئے رہ نہ سکے

چلتے وقت بیوی بچوں کی گریہ وزاری کا ٹیلر پر کچھ اثر نہ ہوا اس نے بہادرانہ الفاظ میں بیوی کو نصیحت کی "ہمت ہرگز نہ ہارنا۔ آج سے خدائے تعالیٰ تمہارے بچوں کی خبرگیری کریگا" رولینڈ سفوک پہونچ گیا اس کے جلانے کے لئے ہیزم کا انبار موجود تھا۔ اس نے ذری بھی ہمت نہ ہاری وہ پھانسی کے کھمبے سے باندھ دیا گیا۔ بدذات جلاد نے شرارتاً اس کی طرف ایک لکڑی پھینکی رولینڈ کو غصہ نہیں آیا بلکہ ہنسی آئی اس نے کہا "اے میرے دوست خدا کا قہر میرے لئے کافی ہے تم نے لکڑی پھینکنے کی بیکار تکلیف کی" لکڑی کے انبار میں آگ لگادی گئی اور چند لمحوں میں رولینڈ کا جسم جلکر خاک ہوگیا اس طرح ان جانبازوں نے اپنی زندگی کا مقصد پالیا' دنیا سے بامراد گئے مرتے ایک روز ضرور لہذا اس طرح کیوں نہ مرتے کہ دنیا میں ایک غیر فانی نام باقی رہ جاتا؛

راجپوتوں کی بہادری اور کارناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے ہیں یہ قوم نہ صرف جنگ کے وقت بہادری دکھاتی تھی بلکہ اس کا ہر فعل بہادرانہ ہوتا تھا ہمارے لئے ممکن نہیں کہ اس مختصر مضمون میں پورے طور پر ان کے حالات پر روشنی ڈالیں صرف ایک ہی مثال پیش کرتے ہیں جو ان کے کارناموں کی نمائندگی کریگی اور اسی مثال سے واضح ہوجائے گا کہ ہم کن لوگوں کو اپنی بزم ایثار میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔

اکبر کے پاس دو راجپوت سوار آتے ہیں دریافت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج میں ملازمت کے خواستگار ہیں اکبر کی زبان سے نکلتا ہے کہ کچھ بہادری کے جوہر بھی تمہیں معلوم ہیں

یہ الفاظ نشتر بنکر راجپوتوں کے سینوں میں لگے راجپوتی غیرت کو حرکت ہوئی دونوں نے اپنے نیزے ایک دوسرے کے سینوں میں مارے اور وہیں ختم ہوگئے۔

اکبر کو راجپوتی آن کا تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا اس مرتبہ محو حیرت رہ گیا خود بھی بہادر تھا ایک جوش اٹھا نیزے کو دیوار میں نصب کر کے چاہا کہ خود بھی جوہر دکھائے نمکخوار لپٹ گئے اور باز رکھا۔

ایک انگریز مورخ کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ کے پیرو بُرے وقت میں اپنے پیغمبر کا ساتھ نہ دے سکے اور الگ ہو گئے لیکن محمد صلعم کے ساتھیوں نے جس خلوص اور محبت سے آپکا ساتھ دیا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس قول کے ثبوت کے لئے واقعات کے دفتر موجود ہیں۔ ہمارے مضمون سے جس واقعہ کا تعلق ہے اس کی اہمیت یہی ہے کہ ایک محبت کی قربانی ہے جس سے شیدائیانِ اسلام کی اس وقت کی حالت کا پتہ چلتا ہے۔

عضل اور قارۃ کے قبیلوں کے لئے دربار نبوی سے دس آدمی اس لئے روانہ کئے گئے کہ ان کو راہ ہدایت پر لائیں۔ مقام رجیع پر قبیلہ بنو لحیان سے مقابلہ ہو گیا دس میں آٹھ اسی وقت شہید ہو گئے اور دو غلام بنائے گئے ان دو میں ایک حضرت خبیب تھے اور دوسرے زید خبیب کو جب قتل کیا جا رہا ہے تو آپ نے نماز پڑھنے کی اجازت مانگی قاتلوں نے اجازت دی انہوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد کہا "دیر تک نماز پڑھنے کو جی چاہتا تھا لیکن تم کو خیال ہو گا کہ موت سے ڈرتا ہوں" پھر چند اشعار پڑھے جس کا مطلب یہ تھا۔

"جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھکو اس کی پروا نہیں کہ کس پہلو پر قتل کیا جاؤنگا یہ جو کچھ ہے خالصتاً خدا کے لئے ہے اور وہ چاہے گا تو جسم کے ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل کریگا۔" الفاظ ابھی ختم نہ ہوئے تھے کہ جام شہادت نوش فرمایا۔

دوسرے صاحب زید تھے ان کو صفوان بن امیہ نے قتل کے ارادہ سے خریدا تھا قتل کے وقت قریش کے معزز سردار تماشہ دیکھنے آئے جن میں ابوسفیان بھی تھے جب قاتل نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابوسفیان نے کہا سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد صلعم قتل کئے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ خیال کرتے" بولے "خدا کی قسم میں تو اپنی جان کو

اس کے برابر بھی عزیز نہیں رکھتا کہ رسول اللہ صلعم کے تلووں میں کانٹا چبھ جائے" صفوان کے غلام قسطاس نے آپ کا سر مبارک کاٹ لیا۔ زید دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کے الفاظ ہمیشہ کے لئے رہ گئے۔ آج بھی ان کے نام میں وہی شان ہے وہی دبدبہ ہے۔

عباسی خلفائے اہلبیت کے نام سے فائدہ اٹھایا خلافت پر متمکن ہونے کے بعد انھوں نے پورے طور پر بنی امیہ کا خاتمہ کر دیا لیکن علوی خاندان ابھی موجود تھا جسکو فنا کر دینا ان کے اختیار سے باہر تھا پھر بھی دل کے پھپھولے وقتاً فوقتاً پھوٹتے رہے خاندان علوی کا سب سے بڑا دشمن متوکل تھا جس نے کربلا کے تمام مزارات منہدم کرا دئے لاشوں کو نکلوا کر پھکوا دیا، برسوں مزارات کی جگہ ہنریں رواں رہیں اور کاشت ہوتی رہی۔ ایسے ظالم بادشاہ کے دربار میں بھی حق گو اشخاص کی کمی نہ تھی ایک روز اس نے ایک عالم ابن سکیت سے دریافت کیا کہ بتاؤ میرے بچے اچھے ہیں یا حضرت علی کے ابن سکیت کے منہ سے وہی نکلا جو اس کا ضمیر کہہ رہا تھا۔ اس نے جان کی پروا نہ کی اور صاف کہدیا کہ وہ حضرت علی کی اولاد کو ترجیح دیتا ہے، متوکل نے اسے قتل کرا دیا۔ حق بات ہمیشہ ناگوار گذرتی ہے لیکن خون ناحق بھی ضرور رنگ لاتا ہے۔ دیکھا گیا کہ باطل کو حق پر ترجیح دینے کے لئے ہمیشہ خون کے دریا بہائے گئے لیکن جتنا خون بہایا گیا اسی قدر جلدی حق کی فتح ہوئی متوکل کو بھی اپنے اعمال کی سزا ملی اور خود اس کے بیٹے نے سازش میں شرکت کر کے اسے قتل کرا دیا۔

حق بات پر جان دینے والوں میں سری سن مورکا درجہ بہت بلند ہے اس کے قتل میں ایک خاص شان نظر آتی ہے وہ ایک غیر متعلق بات کے لئے صرف ہاں کہدینے سے نہ صرف اپنی جان بچا سکتا تھا بلکہ دنیاوی اعزاز میں بھی ترقی ہو سکتی تھی لیکن اس نے وہ نہیں کہا جس پر اس کو دل کی ملامت سہنی پڑتی۔

ہنری ہشتم نے اپنے بھائی کی بیوی کیتھرائن سے شادی کر لی تھی کچھ روز ہنسی خوشی گذرے لیکن تھوڑے عرصہ میں ہنری کا دل اس کی طرف سے ہٹ گیا اس نے چاہا کہ

اسے طلاق دے لیکن پوپ نے اجازت نہیں دی اس پر کرنمیر نے انگلستان کے گرجے کا اعلیٰ افسر ہونیکی حیثیت سے خود مقدمہ ہنری کی موافقت میں فیصل کر دیا۔ اب ہنری نے سب لوگون سے اس بات کی قسم لینی شروع کی کہ کھترائن کے ساتھ جو شادی ہوئی تھی وہ ناجائز تھی سر تھامس مور سے بھی قسم کھانے کو کہا گیا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس انکار پر کچھ دنون اسے قید کی سزا ملی اور کوشش کی گئی کہ وہ اپنی زبان سے کہدے کہ ہنری کا طرز عمل بجا اور درست تھا لیکن اس نے نہیں کہا بہ آخر اسے پھانسی کی سزا دی گئی اس نے قتل کے وقت مسکرا کر جلاد سے کہا "مجھے مہربانی کر کے اوپر چڑھا دو نیچے میں خود چلا آونگا تمہیں تکلیف کرنی نہ پڑیگی" جب سر کٹنے کا وقت آیا تو اس نے پھر ہنسکر کہا کہ ذرا مجھے ڈاڑھی اتار لینے دو اس نے کوئی قصور کسی کا نہیں کیا اس کے ساتھ ہی گردن جسم سے کٹ کر دور جا گری۔

ایسے مرنے والے دنیا میں کاہیکو پیدا ہوں گے، حق کی قوت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ بزدل کو بھی طاقتور بنا دیتی ہے، انسانون کے جینے جینے میں فرق ہے اور مرتے مرتے میں فرق ہے ایسے بھی ہیں جن کو نہ مرنا آتا ہے نہ جینا وہ ہماری بزم ایثار سے خارج ہیں لیکن جن کو صحیح طور پر مرنا آتا ہے ان کا کیا کہنا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

اربابِ نثرِ اردو

مولوی سید محمد صاحب قادری ام اے مدوگار سٹی کالج

فورٹ ولیم کالج کے اردو نویسوں اور موجودہ اردو نثر کے بانیون کی محققانہ تاریخ قیمت (عا)

ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

دیوان غالب قلمی سنہ ۱۲۳۷ ہجری

مترجمہ

جناب سید محمد صاحب ایم اے مدگار سٹی کالج

ادبستان ہند میں مرزا غالب اور ان کی اردو شاعری کے متعلق آج تک اتنا لکھا گیا کہ ان مضامین کے مجموعے سے کچھ اور نہیں تو ہیں کم سے کم منکرین پر اردو شاعری کی فضیلت نہایت آسانی کے ساتھ ثابت کر دی جا سکتی ہے، ہمارے ملک کی ایک مستند ہستی ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب بی اے، پی، ایچ، ڈی پروفیسر ادبیات انگریزی عثمانیہ یونیورسٹی نے غالب پر غالب کے نام سے انگریزی زبان میں ایک مقالہ لکھا ہے اس کے ساتھ ہی غالب کے اردو کلام کی جدید طور پر ترتیب بھی شروع کر دی ہے، مقالہ انگریزی میں ہونے کے باوجود غالب کے دیوان کو ہندوستان عشرت نشان کی "الہامی" کتاب سمجھنے والی جماعت اتنی "برگشتہ" معلوم ہوتی ہے کہ الامان والحفیظ!

یہ مقالہ دیوان کے ساتھ ترجمہ ہو کر طبع ہوگا تو اس وقت اس کے اصلی جوہر کھلیں گے مسلم ریویو میں ڈاکٹر صاحب ممدوح نے دیوان غالب جدید (نسخۂ حمیدیہ) بھوپال پر ایک مختصر سا تنقیدی مضمون سپرد قلم کیا ہے جس کی اہمیت آپ کو "مترجم" کے نوٹ سے معلوم ہوگی، نسخۂ حمیدیہ کے اضافات کلامی اور ان کے تعلیقات علمی پر اگر غور و توجہ سے کام لیا جائے تو بہت سی باتیں محل نظر بن جاتی ہیں کہ خود غالب نے اپنے احباب باصوابکے اصرار پر اپنے کلام کا جو انتخاب کیا تھا وہ کیا ہے؟

اس پر نوٹ لکھتے ہوئے ہماری نظر نسخۂ حمیدیہ کے صفحہ ۳۶ پر پڑتی ہے نشستن گسستن کے قافیہ کے ساتھ رفتن، کا بھی ایک قافیہ ہے۔ علامت مصدر "تن" کے پہلے نشستن گسستن، رفتن، کیا غالب کی شاعری کے آپس میں قافیے ہیں؟

ہمارے ایک محترم دوست نے ہم سے بیان کیا کہ غالب نے اپنے دکنی شاگرد مولوی حبیب اللہ ذکا کے پاس تختہ اپنا اردو دیوان بھیجا تھا، شاگرد نے اس کا انتخاب کر کے

فارسی میں دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ دیوان ان کے پاس آیا اور انہوں نے نسخۂ حمیدیہ سے مقابلہ بھی کیا، بعض بعض دیوانوں میں کئی کئی غزلیں زائد ہیں، اب ان کے پاس سے یہ دیوان واپس ہو گیا ہے ہمارے اصرار پر پھر منگوانے کی کوشش میں ہیں، اگر یہ دیوان ہمارے قبضے میں آجائے تو ممکن ہے کہ کچھ اور بھی حقیقت کھل جائے۔ (مجلۂ مکتبہ)

"مندرجہ ذیل مضمون جو کلکتہ کے انگریزی سہ ماہی مسلم ریویو بابتہ جنوری ۱۹۲۹ء سے ترجمہ کیا گیا ہے، ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب بی اے پی ایچ ڈی پروفیسر ادبیات انگریزی جامعہ عثمانیہ کی دقیقہ رس طبیعت اور فاضلانہ تحقیق و موشگافی کا نتیجہ ہے۔ مفتی انوارالحق صاحب مدیر نسخۂ حمیدیہ نے بھوپال کے مخطوط دیوان غالب کی نسبت اپنے نظریہ سے جو عجیب ادبی غلط فہمی پیدا کر دی تھی یقیناً اس کا اندفاع ڈاکٹر صاحب جیسے نکتہ رس محقق ہی کا کام تھا۔ کلام غالب کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے لئے ڈاکٹر صاحب کی یہ سعی انکی کتاب غالب سے کچھ کم موجب تشکر نہیں البتہ ایسے پرستاران غالب جو ہر رطب و یابس کو مقدس سمجھتے ہیں اس نہدی کی چندی کو بے مزا سمجھیں گے مگر طالبان تحقیق کے نزدیک یہ مختصر مضمون کئی بے خود انہ محاسن سے بہتر ہے۔ س۔م

راقم الحروف جن دنوں غالب کی اردو نظموں کو تاریخی سلسلہ سے ترتیب دے رہا تھا مرزا غالب کے اس مخطوط دیوان کو دیکھنے کا موقع ملا جو ۱۲۳۷ھ م ۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا ہے اور حکومت بھوپال کی عنایت سے مجھے مستعار ملا تھا[1]۔ جس وقت یہ دیوان قلمی ہوا مرزا غالب کی عمر (۲۴) برس کی تھی اور اگر ہم یہ باور کر لیں کہ مرزا نے (۱۵) برس کے سن سے ریختہ یا اردو غزل گوئی شروع کی تو اس مخطوط دیوان میں ان کی شاعرانہ زندگی کے دس برس کا سرمایہ مندرج ہونا چاہیے[2]۔

---

[1] یہ دیوان زیر طبع ہے عنقریب شایع ہوگا۔ صہ ۹۰۶۸

[2] غالب از مولوی سید عبداللطیف حیدرآباد دکن ۱۹۳۸ء صہ ۱۱ نیز نسخۂ حمیدیہ صہ ۱۱ یادگار غالب کمیٹی پریس لاہور ۱۹۳۸ء

یہ قلمی دیوان ریاست بھوپال کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ میں اس عنایت پر کہ یہ نسخہ میرے مطالعہ کیلئے حیدرآباد بھیجا گیا اظہار امتنان کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس کو اچھی حالت میں نہیں رکھا گیا ہے۔ اس کی جلد اس قدر فرسودہ ہوگئی ہے کہ اوراق نہایت آسانی سے علحدہ کر لئے جا سکتے ہیں۔ اس کی موجودہ جلد صرف یہ بتاتی ہے کہ کبھی یہ مجلد تھا۔

مفتی انوار الحق صاحب ساکن بھوپال کا جنہوں نے کلام غالب کے ایک جامع ایڈیشن میں اس نسخہ کی تمام تضمین شریک کر لی ہیں[1] یہ بیان ہے کہ یہ نسخہ ابتداً میاں فوجدار محمد خاں رئیس بھوپال کے لئے لکھا گیا تھا۔ یہ بیان بظاہر مندرجہ ذیل عبارت پر مبنی ہے جو ایک سادہ ورق ۱ ب متن کے آغاز میں جلد بندی کے کچھ دن بعد لکھی گئی ہے۔

"دیوان ہذا من تصنیف مرزا نوشہ، دہلوی المتخلص بہ اسد، از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالیجاہ، عالم پناہ، میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہ قلمی خوش خط"

اس عبارت کے بالمقابل ایک اور لمحقہ ورق پر میاں فوجدار محمد خان کی مہر مورخہ ۱۲۶۱ھ ثبت ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ جو بات اخذ کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے کہ یہ قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ میں میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ یہ نسخہ اس تاریخ سے کوئی (۲۴) برس پہلے ان کے لئے قلمی ہوا تھا۔

نسخہ کا متن (۷۵) اوراق (۱۱ ½ × ۷) پر مشتمل ہے اور اس کے ہر دو جانب چار چار ورق اسی قسم کے کاغذ کے جو متن کا ہے اور ہندوستان ہی میں ہاتھ کا بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے موجود ہیں۔ ان چار ورقوں کے علاوہ ہر ایک جانب دو دو ورق انگریزی کاغذ کے ہیں۔ ابتداء میں یہ ورق اوراق ۳ اور ۴ کے درمیان اور آخر میں اوراق ۷۴ اور ۷۵ کے درمیان ہیں۔ متن کے ہر صفحہ پر (۱۰) سے (۱۱) تک ابیات صاف نستعلیق خط اور چینی روشنائی میں لکھی گئی ہیں۔ سب سے پہلے چار قصیدے ہیں پھر غزلیات ہیں جن کی تعداد (۲۷۶) ہے۔ آخر میں (۱۱) رباعیات درج ہیں۔ قصیدوں اور غزلوں کے لئے علحدہ علحدہ دو لوحیں ہیں جو سنہری کام سے مزین ہیں۔ سارا متن بھی سنہری حاشیہ کے خط سے

[1] نسخۂ حمیدیہ

آراستہ ہے۔ متن کے آخر میں کاتب نے اپنا اختتامی نوٹ اس طرح لکھا ہے۔

"دیوان من تصنیف مرزا صاحب و قبلہ التخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین۔ تباریخ شہر صفر المظفر سنہ ۱۲۳۷ من الہجرہ النبویہ بصورت انجام یافت۔"

متن کا حاشیہ گوناگون اصلاحوں اور اضافوں سے مملو ہے۔ بعض جگہوں پر نئی غزلیں جو متن میں شریک نہیں درج کی گئی ہیں چند جگہوں پر کئی غزلیں متن سے دوبارہ نقل کی گئی ہیں۔ حاشیہ کی تحریریں بعض خوشنما نستعلیق خطوں میں ہیں اور بعض شکستہ خطوں میں۔ حاشیہ پر متعدد جگہوں پر فوجدار محمد خاں کی ایک چھوٹی مہر مورخہ ۱۲۴۸ھ (۶۶۲ سم × ۸۶۱) ثبت ہے۔

متن کے ورق سے پہلے سادہ اوراق ہیں سے ورق ۱ الف کے بائیں گوشہ کے سرے پر ق ۶۶/۶ درج ہے۔ اس سے ایک حرف نیچے سرخی سے ادب ۱۱ اردو اور پھر کچھ نیچے ۵۸/۶ اور اس کے قریب ہی شکستہ خطوں میں (محمد حسین) لکھا ہوا ہے اور اق ۱ ب، ۲ الف اور ۲ ب خالی ہیں۔

ورق ۳ الف پر غالب کا ایک مکتوب (؟) بے نقط فارسی میں کسی قدر ناصاف شکستہ خطوں میں درج ہے۔ یہ مکتوب ورق ۳ الف پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ورق ۶ ب تک مسلسل ہے اور وہاں محمد اسد و اللہ کے ساتھ ختم کیا گیا ہے۔ یہاں نام میں حرف و کا اضافہ قابل غور ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے اوراق ۳ و ۴ کے درمیان دو ملحقہ ورق ہیں یہ جلد کے متصل ورقوں سے چسپاں کر دئے گئے ہیں یہ ورق کب شریک کئے گئے اور کس نے شریک کئے معلوم نہیں ہو سکتا ان ورقوں میں سے جو ۴ اور ۵ کھلائے جا سکتے ہیں ۴ الف اور ۵ ب بالکل خالی ہیں ۴ ب پر صاف نستعلیق خط میں وہ عبارت درج ہے جو ہم نے ابتدا ہی میں نقل کی ہے۔

ورق ۵ الف پر فوجدار محمد خاں کی بڑی مہر (۸۶۵ سم × ۵۶۴) ثبت ہے اور انگریزی کے چکنے کاغذ سے محفوظ کی گئی ہے۔ یہی مہر آخر کے ملحقہ ورقوں میں سے ایک پر بھی ثبت ہے متن کے بعد جو چار سادہ ورق شریک ہیں ان پر غالب کی کئی غزلیں جو متن میں شریک نہیں درج کی گئی ہیں اور ان کے اختتام پر کاتب نے رسمی طور پر بتایا ہے کہ اس کا کام انجام کو پہنچا

نسخۂ حمیدیہ کے مدیر مفتی انوار الحق صاحب کا استدلال ہے کہ یہ نسخہ وقتاً فوقتاً غالب کے زمان ان نظموں کے اندراج کے لئے روانہ کیا جاتا تھا جو ۱۲۳۷ھ کے بعد لکھی گئی ہیں۔ مگر مفتی صاحب اس استدلال کے لئے کوئی سند اور ثبوت پیش نہیں کرتے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ حاشیہ کے اضافے اور اصلاحیں خود مرزا غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ راقم الحروف نے سرکار عالی کے محکمۂ اسناد تاریخی میں ماہرین کی مدد سے نہایت احتیاط کے ساتھ ان کی تنقیح کی اور غالب کے اصلی خطوط سے مقابلہ کیا اور ان اصلاحوں اور اضافوں کو اصل خطوط سے ذرا بھی مشابہ نہیں پایا۔ علاوہ ازیں جگہ جگہ املا کی سخت غلطیاں ہیں۔ یہ اغلاط غالب جیسے محتاط مصنف سے کسی طرح منسوب نہیں کی جا سکتیں۔ اس کے سوا کاتب نے حاشیہ پر غزلیں نقل کرتے ہوئے نہایت بے پروائی کے ساتھ دوسری غزلوں کی بیتوں اور مصرعوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ کئی غزلیں باوجود متن میں مندرج ہونے کے ایک سے زیادہ مرتبہ لکھی گئی ہیں۔ نیز کئی ابیات کے آگے طفلانہ رائیں بھی درج ہیں۔

ان واقعات کے پیش نظر راقم ہرگز اس نظریہ کو باور کرنے تیار نہیں جو نسخۂ حمیدیہ کے مدیر نے قائم کیا ہے۔ حاشیہ کے اضافے یقیناً غالب کے خط میں نہیں بلکہ یہ دو مختلف ہاتھوں کے ہیں بعض غزلوں کے آخر میں جو صاف نستعلیق خط میں ہیں اسی خط میں عبد العلی کا نام لکھا ہوا ہے شکستہ خط کی غزلیں محمد حسین کی دستخط سے جو ابتدائی سادہ ورق ۱ الف پر ثبت ہے بہت ہی مشابہ ہیں۔

یہ دونوں کون تھے معلوم نہیں شائد میاں فوجدار محمد خاں کے اتالیق یا ادبی مددگار رہے ہونگے جنہوں نے غالب کی تازہ غزلیں جیسے ہی وقتاً فوقتاً ملتی گئیں حاشیہ پر درج کر دیں۔ یہ یقینی ہے کہ ۱۲۴۸ھ میں جو فوجدار محمد خاں کی چھوٹی مہر کا سنہ ہے، غالب نے اپنی غزلیات کا ایک انتخاب مرتب کیا اور اس پر فارسی میں دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ ناممکن نہیں اگر حاشیہ کی غزلیں اسی انتخاب مرتبہ ۱۲۴۸ھ کے کسی نسخہ سے نقل کی گئی ہوں۔

باقیاتِ فانی

از جناب ابوالفہم مولوی محمد احمد صاحب فانی مرحوم المخاطب نواب احمد نواز جنگ بہادر
سابق معتمد کمیٹی صرف خاص مبارک

اب اپنے دل سے پوچھئے کس پر فدا ہے یہ
ہم کو جو نام رکھتے تھے اس کی سزا ہے یہ

اک دھوم تھی جارے تڑپنے کی زیر بام
تم نے ذرا نہ جھانک کے دیکھا کہ کیا ہے یہ ؟

لکھے ہوئے ہیں کب کے امیر و گدا کے نام
اللہ کس غضب کی پرانی سزا ہے یہ !

کہتا ہوں ایک بات مگر اس قرار پر
پھر مجھ سے یہ نہ پوچھنا کس سے سنا ہے یہ" ؟

گھبرا گئی بوس و تمنا سے جان زار
دی عشق نے ندا کہ ابھی ابتدا ہے یہ

ایک بے خودی سی چھا گئی پوچھا جو اس نے حال
نکلا نہ میرے منہ سے مرا مدعا ہے یہ

غیروں نے چھیڑ چھاڑ کی بزم میں کچھ آج
شائد سمجھ گئے تھے کہ بگڑا ہوا ہے یہ

ساقی کو پوچھتا ہوں کبھی جام کو کبھی
شب کا سماں نگاہوں میں چھایا ہوا ہے یہ

میں تو فقط صنم ہی سمجھتا ہوں اس کو شیخ
تو دیکھ لے تو بول اٹھے بیشک خدا ہے یہ !

واعظ کا کچھ کلام ہے رندوں کا کچھ بیان
اللہ جانتا ہے کہ سچ وہ ہے یا ہے یہ

دل سے زیادہ آنکھ تمہاری ہے مہربان
اس کو سراہتے تھے ہم اس سے سوا ہے یہ

کہنا وہ نامہ بر کا کچھ آہستہ کان میں
وہ میرا اضطراب کہ کس سے سنا ہے یہ

رکھا ہے فانی اپنا تخلص اسی لئے
تا لوگ سمجھیں عشق میرا اس کے فنا ہے یہ

پردہ

نتیجۂ فکر مولانا مرزا علی رضا صاحب ماہر لکچرار فارسی سٹی کالج

عرض و جوہر کا ہے شرعاً جو نگہبان پردہ
دیکھ لو کرتے ہیں انسان سے بنی جاں پردہ

پردے سے دولتِ امکان نے خصومت برتی
سروسامان سے ہوا بے سروساماں پردہ

شعلۂ عشقِ ارو پا نہ مگر بر خیزد
اس لیے کرتے ہیں غیروں سے مسلماں پردہ

بے حجابی کے جو عادی ہیں مبارک اُن کو
نہیں اُلٹے گا کوئی صاحبِ عرفاں پردہ

ناطقِ وحی کے احکام کا گر قائل ہے
شرطِ ایماں ہے کرے صاحبِ ایماں پردہ

پردۂ شرم سے ہوتی نہ زلیخا باہر
رکھتے جائز جو کبھی یوسفِ کنعاں پردہ

بے نقابی میں فسادوں کی ہوا ہے مضمر
سچ اگر پوچھو تو ہے حامیِ عصیاں پردہ

لے اُڑی چادرِ مشرق کو ہوائے مغرب
پھر تا موڑ میں ہے اب با سرِ عریاں پردہ

بات پردہ کی ہے اب شرم خدا ہی رکھے
دستِ تہذیب سے ہے دست و گریباں پردہ

حامیِ شرع ہیں اللہ سلامت رکھے
لازمی جانیں نہ کیونکر شہ عثماں پردہ

بے خطر کہہ دو حسینانِ جہاں سے ماہر
صاحبِ عفت و عصمت کے ہے شایاں پردہ

تنقیدیں

غالب

مصنفہ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب بی اے پی ایچ ڈی لندن پروفیسر جامعہ عثمانیہ
مجلد ضخامت (۱۰۴) صفحات قیمت (۴) پتہ دفتر مجلۂ عثمانیہ، عثمانیہ یونیورسٹی کالج

ڈاکٹر لطیف صاحب کی یہ انگریزی کتاب جس کا دنیائے ادب میں ایک عرصہ دراز سے انتظار تھا اور جس پر موافق و مخالف ہر قسم کی رائے رکھنے والوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں بالآخر زیور طباعت سے آراستہ ہو کر پبلک کے آگے آگئی۔ ڈاکٹر صاحب ادبیات کے بلند پایہ عالم ہیں اور آپ کی اصابت رائے اور دقیقہ رس طبیعت اور باریک نظر سے اردو کی خوش قسمتی کہنا چاہئے کہ اس کو استفادہ کا موقع نصیب ہوا۔ اس سے ایک عرصہ قبل ڈاکٹر صاحب کا فاضلانہ مقالہ "اردو ادب پر انگریزی ادب کا اثر" اہل اردو کے سربرآوردہ حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تنقیدی قابلیتوں سے اردو کی نہایت شاندار خدمات انجام دے رہے ہیں۔ محولۂ بالا مقالہ میں اردو کے بعض مصنفین اور ادیبوں کی نسبت ڈاکٹر صاحب نے جو تنقیدی خیالات ظاہر کئے ہیں وہ خاص و عام ہر طبقہ میں نہ صرف مقبول ہوئے بلکہ ان سے تنقید نگاروں کی وسیع رہنمائی بھی ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب خدا نخواستہ غالب کی شاعرانہ عظمت کے سرے سے منکر نہیں ہیں اور نہ ہی آپ اپنی رائے کو قول فیصل کی طرح تسلیم کرنے پر ہر شخص کو مجبور کر رہے ہیں۔ "غالب" میں آپ نے نہایت باقاعدہ طریقہ پر کلام غالب کے مطالعہ کے بعد اپنے تاثرات اور اصول تنقید کے تحت شاعر کے کلام سے اس کے نظریہ حیات اور اس کی شاعرانہ قدر و منزلت کے تعین کی مبارک کوشش کی ہے "غالب" کے سات ابواب ہیں۔ پہلے باب میں آپ نے غالب کے سوانح نگاروں میں دو ممتاز ہستیوں مولوی حالی اور ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے نتائج تحقیقات کی تنقیح کی ہے۔ اس میں آپ نے بلا رو رعایت مولوی حالی اور ڈاکٹر بجنوری کے طریقہ کار کی غلطی بتائی ہے اور اس کے ساتھ ہی دوسرے باب میں غالب کی زندگی نثر و نظم دونوں کی ترتیب مطالعہ کا وہ صحیح اور اصولی طریقہ پیش کیا ہے جس کی عمدگی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور غالب اور حالی کی کورانہ پرستش کرنے والے بھی اس کا کوئی جواب سوائے ناک بھوں چڑھانے کے نہیں رکھتے اور ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے بعد بھی کوئی سقم نہیں نکال سکے۔ تیسرے

باب میں غالب کے کلام نظم و نثر کی تاریخی ترتیب کی کوشش کی ہے اور اس خصوص میں یہ جز تمام اردو دان اور قدر دانان کلام غالب کے لئے موجب مسرت ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب نے دیوان غالب کو تاریخی ترتیب سے مرتب کیا ہے اور یہ دیوان زیر طبع ہے۔ قریب میں شایع ہوگا اس باب میں خطوط غالب کو بہ لحاظ تاریخ و اسم مکتوب الیہ سائنٹیفک طور پر ترتیب دیکر یہ بتایا ہے کہ کس شخص کو غالب نے کتنے خطوط لکھے اور یہ خطوط کس سال سے کس سال تک لکھے گئے اس سے مطالعہ کنندگان خطوط غالب کی لائن میں بڑی مدد لے سکتے ہیں چوتھے باب میں مطالعہ غالب کے مسائل اور پانچویں باب میں غالب کے نظریہ حیات کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اس خصوص میں بعض لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ ضرور نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے جو نظریہ حیات غالب سے منسوب کیا ہے وہ قطعی اور یقینی ہی ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی رائے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے اور مستحکم دلائل و براہین پر مبنی ہے۔ اگر کوئی ایسے ہی غور و فکر سے کام لے اور اصولی طریقہ پر مطالعہ کر کے کوئی اور نظریہ حیات ثابت کرے تو اس کے قبول کرنے سے کسی کو انکار نہ ہوگا اور ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب بھی اس کی واقعی قدر کرنے تیار رہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اردو کے دلبند بانگ مفکر ایسی کوشش کے لئے آمادہ ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کتاب کی تصنیف سے ڈاکٹر صاحب کا مقصد اول اردو دانوں میں صحیح تنقیدی ذوق پیدا کرنا اور انھیں شاعری اور اس کے مطالعہ کا اصولی طریقہ بتانا ہے ایک اصول و نظام سے ڈاکٹر صاحب نے کلام غالب کا مطالعہ کیا اور اپنے نتائج مطالعہ سپرد قلم کر دیئے۔ اسی طریقہ پر دوسرے شاعروں کے کلام اور ان کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اردو میں بہت جلد نہایت اعلیٰ درجہ کا تنقیدی ادب پیدا ہو جائے گا اور خالی واہ واہ کی بجائے تنقید و تبصرہ کا شوق انگریزی کی طرح اردو میں عام ہو سکیگا۔ آخری دو باب میں ڈاکٹر صاحب نے شاعری میں عظمت و بلندی پیدا کرنے والی کیا چیزیں ہیں ان پر فاضلانہ بحث کر کے غالب کی شاعری کو انہی اصول پر دیکھا ہے۔ اس خصوص میں ان کی بعض رائیں تو ایسی صاف اور سنجیدہ ہیں کہ ہر شخص بلا کسی مخالفت کے قبول کر لیگا۔ بعض اشعار کی نسبت ان کے خیالات سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان میں بھی ان کے اعتراضات کی وجاہت تسلیم کرنی ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب شستہ اور بلیغ انگریزی میں ہے۔ اس سے کلام غالب کے ایسے

مطالعہ کرنے والے جو انگریزی زبان جانتے ہیں اچھی طرح محظوظ ہو سکتے ہیں البتہ انگریزی نہ جاننے والے اس کے اعلیٰ خیالات سے محروم ہیں۔ ہم نے نہایت مسرت سے سنا کہ ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی تیار ہو گیا ہے اور زیر طبع ہے۔ اس کا ترجمہ شاعری اور اعلیٰ شاعری کے ترجمہ سے کم نہیں۔ اگر اردو ترجمہ شایع ہو جائے تو بہت اچھا ہے اس سے قدر دانان و پرستاران غالب بہت محظوظ ہونگے اور عام اردو دانوں کی اچھے تنقیدی ذوق کی طرف رہنمائی ہوگی۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی اس ادبی کوشش کو اردو کے تنقیدی ادب میں ایک معرکتہ الآرا اضافہ اور ایک اہم رہنما سمجھتے ہیں۔ اب تک بدقسمتی سے ان یونیورسیٹیوں میں جہاں اردو ادب اعلیٰ جماعتوں میں شریک نصاب ہے تنقیدی مطالعہ کا تقریباً رواج نہیں۔ زیادہ سے زیادہ مقدمۂ حالی موازنہ شبلی اور آب حیات کی پرانی لکیروں کو پیٹا جاتا ہے اور ان سے ایک انچ آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی جاتی اگر اردو کے بڑے بڑے مدعیان ترقی اس خصوص میں توجہ سے کام لیکر ریسرچ اور تنقید کا ذوق جیسا کہ اس کتاب سے متصور ہے پیدا کرنے کی کوشش کریں تو اردو کی حقیقی معنوں میں بڑی خدمت ہوگی۔ (س۔م)

قوم پرست طالب علم

مصنفہ مولوی عبدالغفار صاحب حیدرآبادی مدرس مدرسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی قیمت (۴ر) (۱) مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی (۲) قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور (۳) مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن اور (۴) اہل بک ڈپو پرنس بلڈنگ بمبئی سے مل سکتی ہے۔"

مدرسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک حیدرآبادی معلم کی یہ علمی کوشش قابل قدر ہے اس میں مصنف نے ڈرامہ کے ذریعہ طلبا میں ہندو مسلم اتحاد اور حقیقی قوم پرستی کی موثر تعلیم دی ہے چونکہ یہ ڈرامہ خاص طلبہ ہی کے لئے ہے اس کی زبان بالکل صاف اور سلیس ہے کمسن بچوں اور مدارس ثانویہ کے طلبہ کو اس کا مطالعہ کرایا جائے۔ جن مدارس میں اس کو اسٹیج کرنے کی سہولتیں ہوں وہاں اس کا اسٹیج کرنا بھی نہایت دلچسپ اور موثر چیز ہوگا۔

فہرس مضامین مجلۂ مکتبہ

(جلد دوم)

مضمون	مضمون نگار	مضمون	مضمون نگار
۱۔ سائنس		اشارات الجام پر ایک تفصیلی نظر	محمد محسن خان متین
قطبی نور	محمد عبدالوہاب	قہرمانیت	حمید اللہ بی اے
۲۔ فلسفہ اور مذہب		شبلی اور جدید شاعری	احمد عبداللہ المسدسی بی اے
انسان اور کائنات	میر غوث الدین علی		
کھیل کی نفسیات	محمد مظہر حسین بی اے	دیوان غالب قلمی ۱۲۳۶ھ	سید محمد ام اے
۳۔ تاریخ و معاشیات		**۵۔ افسانے**	
ہندوستانی کاشتکار و نکی معاشی حالت	قاضی فصیح الدین احمد بی اے	محب وطن (ٹیگور)	یس بی اننتا
گنبد خضرا	سید علی شبیر	قصۂ ناتمام	آپا لو
حدیقۃ العالم	سراج الدین طالب	حسن کار	غلام رسول
عبرانی خط	میر مظہر علی مولوی کامل	ہنگامۂ چشمک	شبیر حسن قیس
اثبات حیات	نبی احسن شمیم	کفارہ	غلام رسول
۵۔ زبان و ادب		زنجیر غلامی	فیض محمد صدیقی بی اے
گلستان بوستان کا موازنہ	محمد محسن خان متین	**۶۔ دکھنیات**	
ٹالسٹائے اور عوام الناس	حضرت حسین زبیری	بہرام گور دکن میں	سید غلام محی الدین زور ام اے
حالی اور جدید شاعری	احمد عبداللہ المسدسی بی اے	کلام لچھمی نارائن شفیق	عمر یافعی
دکھیاری بلبل	شبیر حسین قیس	**۷۔ متفرقات**	
خاقانی	محمد محسن خان متین	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	عمر یافعی
چیخوف اور راشد الخیری	عبدالقیوم باقی بی اے	پردہ نیسر جمال الدین لوزی	محمد جعفر مولوی کامل
		ساگر و ہمایونی	مدیر

۹۔ تنقیدیں

سفرنامہ مصر جدید	ملا رموزی	تندرستی
سرفریدون الملک آنجہانی	مدیر	حمایت المصلیین

۸۔ منظومات

دور افتادہ	محشر عابدی	حمایت العقائد
نوحۂ غم	ابوالافتخار فخر	جیون چرتر
رنجیتی	عابد مرزا بیگم	عروج عثمانی
احساسات	پروفیسر ظفر تابان	انشائے جدید
خیالات آزاد	محمد حسین آزاد	شیب وشباب
کلام الملوک ملوک الکلام	اعلیحضرت سلطان العلوم	العراقی
فکر عالیہ	ابو محمد ثاقب	رسالہ کیمیا ماہوار
آمد شاہ	پرنسپل عبدالرحمن خاں	مبادی نباتات
عمل	علامہ نواب عینیا یار جنگ بہادر	مقنن
عشق	عبدالقادر وفا	کلیات وطن
امداد باہمی	صفی اورنگ آبادی	شہنشاہ دوجہان
جذبات حبیب	حبیب رامپوری	رسالہ ارشاد
عید کی ثنا	میر ثامن علی ہیسان	رپورٹ سلم لیڈیس کلب نرمس
جواب دیا	قادر حسین قادر	غالب
ماضی وحال	عمر عبدالکریم گل	قوم پرست طالبعلم
تاثرات لطیف	جوش حیدرآبادی	
غزل	شاہ عبدالعزیز عزیز	
نغمۂ آزادی	سید علی شبیر شبیر	
مائدۃ الاسلام	ابو السخا سالار	
رباعی	مولانا ابوالاعظم امجد حیدرآبادی	
باقیات فانی پردہ	احمد نواز خنگ فانی مرحوم مرزا اعلیٰ ضامر	

۱۰۔ تصاویر

مولانا وحیدالدین سلیم
نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز
علامہ جمال الدین نوری
اعلیحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ
سرفریدون الملک بہادر آنجہانی
حضرت مفتی اعظم علی شائق
نواب سر امین جنگ بہادر
نواب سر سود جنگ بہادر صدر اعظم سابق
راجہ مرلیدھر بہادر

اورینٹل کالج میگزین

اغراض و مقاصد۔ اس رسالہ کے اجراء سے غرض یہ ہے کہ احیاء و ترویج علوم مشرقیہ کی تحریک کو تا حد امکان تقویت دی جاوے اور خصوصیت کیساتھ اُن طلبہ میں شوق تحقیق پیدا کیا جائے جو سنسکرت عربی۔ فارسی اور دیسی زبانوں کے مطالعہ میں مصروف ہیں ؛

کس قسم کے مضامین کا شائع کرنا مقصود ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ اس رسالہ میں ایسے مضامین شائع ہوں گے جو مضمون نگاروں کی ذاتی تلاش اور تحقیق کا نتیجہ ہوں۔ غیر زبانوں سے مفید مضامین کا ترجمہ بھی قابل قبول ہوگا۔ اور کم ضخامت کے بعض مفید قلمی رسالے بھی باقساط شائع کئے جائینگے ؛

رسالے کے دو حصے۔ یہ رسالہ دو حصوں میں شائع ہوتا ہے۔ حصہ اول عربی۔ فارسی اردو اور پنجابی (بحروف فارسی) حصہ دوم سنسکرت ہندی اور پنجابی (بحروف گورمکھی) ہر ایک حصہ الگ الگ بھی مل سکتا ہے ؛

وقت اشاعت۔ یہ رسالہ بالفعل سال میں چار بار یعنی نومبر۔ فروری۔ مئی اور اگست میں شائع ہوگا ؛

قیمت اشتراک۔ سالانہ چندہ مکمل رسالہ کے لئے ۸ ہے۔ ہر حصے کے لئے ۴ ؛

خط و کتابت و ترسیل زر۔ خریدار رسالہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کے نام ہونی چاہئے۔ مضامین کے متعلق جملہ مراسلات چیف ایڈیٹر کے نام بھیجنے چاہئیں ؛

محل فروخت۔ یہ رسالہ اورینٹل کالج لاہور کے دفتر سے خریدا جاسکتا ہے ؛

قلم تحریر۔ چیف ایڈیٹر کے فرائض پروفیسر محمد شفیع ایم۔ اے اورینٹل کالج سے متعلق ہیں حصہ عربی و فارسی و اردو ڈاکٹر محمد اقبال۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعانت سے مرتب ہوتا ہے ؛

حصہ سنسکرت و ہندی کے ایڈیٹر لکشمن سروپ ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی اور حصہ پنجابی کے بھائی بے انت سنگھ بی۔ اے ہیں

المعلن۔ منیجر اورینٹل کالج میگزین اورینٹل کالج لاہور

افتخار الحکما نواب حاذق جنگ مرحوم سابق افسر الاطبا فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت و بڑی خوشی کے ساتھ مخلص بیماروں کی شفا کی غرض سے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں برص منتشر (یعنی کوڑ اور پھیلا داغ) کا علاج نہایت مشکل ہے یہ مرض عموماً بڑھتا ہی جاتا ہے حکیم مولوی محمد عبدالقادر صاحب دگا صدر محرر الادویہ یونانی سرکار عالی و رکن دارالتشخیص انجمن اطبا یونانی حیدرآباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولیٰ رکھتے ہیں صاحب موصوف نے اکثر مریضان برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قلیت سے کیا اور بفضلہ کامیاب ہوئے میں نے بچشم خود مریض برص کا معائنہ کیا ہے۔ بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہو جاتا ہے حکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور مجرب دواکا اثر ہے میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے کٹھن مرض کی دوائے مجرب کی ایجاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہئے کہ وہ اس موقع کو غنیمت سمجھکر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور اس مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

شرحہ مستخط (افتخار الحکما رحاذق جنگ)

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے۔ جو اقسام کے عصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد علیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔ اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اسکو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پراثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے۔ کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل۔ دمہ۔ دردسر۔ درد سول۔ بچھو کے زہر کے لئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال ۔ تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور صاف کریں جو صاحب غرض امتحان دوا طلب فرمائیں بخوشی تعمیل کی جائے گی۔ نوٹ ۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے اور نسخجات نہایت عمدہ طور تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر۔ جیمس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹاک روڈ قریب تحصیل مالگزاری حیدرآباد دکن

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کرکے سینکڑوں سرٹیفکیٹ عطا کئے۔ زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آناً فاناً یہ طلسمی اثر دکھاتا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار پیچش۔ متلی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر۔ خارش۔ سانپ بچھو کے زہر اور ہر اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمائے ایک بار ضرور آزمائیے۔ پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے شیشی نمبر (۱) عہ نمبر (۲) ۸ نمبر (۳) ۴ ایک درجن کے خریدار کو نرخ پر دی۔ پی معاف ہوگا۔

خط اور تار کا پتہ

"زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

منزل ہزار سخت و ہمت نہ ہارئیے

ملکی آزادی کی مہم عظیم کو سر کرنے کے لئے اہل ہند میں "ہمت" پیدا ہونے کی ضرورت ہے اور مسلمان صرف اپنی "ہمت" سے ہندوستان میں اپنی قومی پوزیشن کو مستحکم کر سکتے ہیں، لکھنؤ کے جدید گرانقدر اخبار

"روزنامہ ہمت"

کا یہی شعار ہے جس کے ذریعہ سے ملک کے سربرآوردہ و ممتاز ترین اخبار نویس و ادیب **سید جالب دہلوی**

(بانی و سابق مدیر روزنامہ ہمدم لکھنؤ)

کو پوری آزادی کے ساتھ اپنے ہم قوموں اور ہموطن کی وہ گرانقدر خدمت جاری رکھنے کا موقعہ ملے گا جو کامل تہائی صدی سے برابر مختلف صحایف کے ذریعہ سے سرانجام دی جارہی ہے،

شرح چندہ سالانہ بارہ روپئے — قیمت فی پرچہ دو روپئے

ابتدائی نمبر تعداد کثیر تمام صوبوں خاصکر ممالک متحدہ کے تمام اضلاع میں بھیجے جائینگے، لہذا اہل اشتہار کو اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور تمام درخواستیں خریداری انجنسی اور اشتہارات درج کرانے کے لئے

سید عشرت حسین "منیجر روزنامہ ہمت" ۱۸۶ نیا گاؤں لکھنؤ کو ارسال کرنی چاہئیں۔

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اُردو مؤلفہ مولوی محی الدین ہاشمی صاحب فاضل نوابی بنڈ میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی دور کے ادبی دور میں اُردو نظم و نثر کی حالات اور شعرائے اُردو کا تذکرہ موجود ہے ضخامت ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا بار دوم قیمت عمدہ

بیانِ اُردو مرتبہ جناب احمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اُردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد عہ

روحِ تنقید مصنفہ مولوی ابو الحسنات سید غلام محی الدین قادری نور اُردو میں فنِ تنقید کے متعلق اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۰۰ سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

تنقیدی مقالات مصنفہ نور صاحب یہ روحِ تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روحِ تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی فارسی اور اُردو زبانوں کے شہرہ آفاق قلمکاروں پر تنقید کر کے اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اُردو انشا پردازوں کے طرزِ تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد ساڑھے

اُردو کے اسالیب بیان مصنفہ نور صاحب نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرزِ تحریر و انداز بیان کا تذکرہ خاص طرزِ تحریر کے اُردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ساڑھے

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ نور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی و ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ر

دنیا کے افسانے مصنفہ مولوی محمد عبد القادر سروری ایم اے۔ ایل ایل بی افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات اُردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادی فلسفہ مؤلفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی، ڈاکٹر اے یس راپورٹ پی۔ ایچ۔ ڈی کی پراگریس آف فلاسفی کا ملخص بامحاورہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۴ر

ارباب نثر اُردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اُردو داں قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اُردو نثر نگاری کی تاریخ لکھی ہے ۲۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس العلما رضی جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ایم اے۔ ایس۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی مستند تاریخ ضخامت ۴۴۰ صفحے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

جواہر کلیات نظیر منتخب جناب مولانا ذہین و سید مختار احمد نظیر اکبر آبادی کے طبیات سے اخلاقی۔ ادبی نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۰۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی نہایت عمدہ قیمت عہ

عقائد امام مترجمہ مولوی محمد عبد الغفور مادری صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور با محاورہ اردو ترجمہ۔ قیمت ۴ر

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی احمد عبد اللہ مسدوسی بی اے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ر

دکنی لغت مؤلفہ مولوی سید شعار احمد شعار ہاشمی۔ اردوئے قدیم یعنی دکھنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ر

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبد الغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحب دل صوفی عالم کے حالات ضخامت ۴۸ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵ر

خزینۂ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبد العزیز صاحب عہ اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶ر

سیرت خیر البشر و سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱ر

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بد خو شوہر کو ٹھیک کر سکتی ہے۔ قیمت ۲

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ۔ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ روبرو محکمۂ مالگذاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

اردو ادب کا پہلا رسالہ

مخزن لاہور

اس صدی کے آغاز سے اُردو زبان کی سچّی خدمت کر رہا ہے

شیخ سر عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا

کے

شاندار دور کے بعد

صرف ایک ہی شخصیت تھی جو اس رسالے کو از سر نو اس بلندی پر لے جا سکتی تھی چنانچہ دو سال سے مخزن کی ادارت مستقل

حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری

(مصنف شاہنامۂ اسلام)

نے سنبھال لی ہے۔ اور آج مخزن اردو کے رسائل کا سرتاج بن گیا ہے۔

مخزن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بغیر امتیاز مذہب و ملّت بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں مرد بے تامل اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ اس میں کوئی مخرب اخلاق مضمون نظم یا تصویر نہیں ہوتی۔ تصاویر میں بلند جذبات، نظموں اور مضمونوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ زبان نہایت آسان اور عام فہم چندہ سالانہ صرف بذریعہ وی پی

مینیجر مخزن بھاٹی گیٹ لاہور سے منگائیں

مطبوعہ مطبع مکتبہ آصفیہ سٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام مرام کشن لیتھوگرافر منیجر مطبع

جلد ۲ ۹۹۱۵۲۳۰۵
محکمہ تعلیم
درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔
8 SEP 1970 V

کتب خانہ

جامعہ عثمانیہ

۱۔ [illegible]

۲۔ [illegible]

۳۔ [illegible]

۴۔ [illegible]

۵۔ [illegible]

۶۔ [illegible]

۷۔ [illegible]

۸۔ [illegible]

۹۔ [illegible]

۱۰۔ [illegible]

۱۱۔ [illegible]

۱۲۔ [illegible]

۱۳۔ [illegible]

۱۴۔ [illegible]

۱۵۔ [illegible]

۱۶۔ [illegible]

۱۷۔ [illegible]

۱۸۔ [illegible]

۱۹۔ [illegible]

۲۰۔ [illegible]